# قیدی

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

PDFBOOKSFREE.PK

2

Courtesy www.pdfbooksfree.pk


نگینہ میری محبت تھی۔ اس کی خاطر میں دنیا کی ہر قوت سے ٹکرا سکتا تھا۔ لیکن اپنی ماں سے ٹکرانا، اس کے حکم سے روگردانی کرنا..... میں خود کو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ محبت کا تقاضا مجھے ماں سے بغاوت پر اُکسا رہا تھا۔ مگر ایسا کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ دوسری طرف نگینہ کو چھوڑ دینا، اسے بھول جانا بھی میرے اختیار سے باہر تھا۔

میں ان خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور دوسری طرف سے نگینہ اپنی جاں فزا آواز میں ''ہیلو..... ہیلو!'' کر رہی تھی۔ میری خاموشی کا وقفہ طویل ہو رہا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' اس کے لہجے کی تشویش نے مجھے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔

''آں..... ہاں۔'' میں نے بے خیالی میں کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک کہاں ہو؟'' اس کے انداز میں شکوہ اترنے لگا تھا۔ ''تم کہاں کھو گئے تھے؟''

''اوہ..... کہیں نہیں۔ بس ذرا اپنے ملازم کو اشارے سے کچھ سمجھا رہا تھا۔'' میں نے اپنی خاموشی کا بھونڈا جواز پیش کیا۔ ''خیر، تم بتاؤ..... کبیر کا کچھ پتہ چلا؟ وہ کیلاش سے واپس لوٹ آیا ہے یا.....؟''

''وہ ابھی لوٹا تو نہیں ہے۔ تاہم اس کی خیریت کا فون آیا تھا۔'' نگینہ نے بتایا تو میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''کب آیا تھا؟..... اور کس کے پاس آیا تھا؟''

''انکل نظر حیات آئے تھے ہمارے ہاں۔'' وہ بتانے لگی۔ ''انہوں نے ہی پپا کو بتایا تھا کہ کبیر کا پشاور سے فون آیا تھا اور اس نے اپنی خیر خیریت سے اپنے باپ کو مطلع کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بہت جلد اور کسی بھی وقت بائی ایئر پنڈی پہنچنے والا ہے۔ اور نادر! مجھے اس کی آمد سے جانے کیوں ایک ڈر سا لگ رہا ہے۔'' وہ آخر میں شاید فکر مند ہو گئی تھی۔

میں اس کی بات کا اصل مطلب سمجھے بغیر اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''نگینہ! تمہیں اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''مجھے اپنا کوئی ڈر نہیں ہے۔'' وہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ ''ڈر تو مجھے اس بات کا ہے کہ کہیں وہ بدخصلت شخص تمہارے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہ کر ڈالے۔ پہلے ہی پپا، انکل نظر حیات اور انسپکٹر اعجاز شمس تم پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔''

اس کی بات معقول تھی، جس نے ایک لمحے کے لئے مجھے بھی سوچ میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ وادی کیلاش کی مہم میں اس مردود عامل عاروب کے ساتھ اعصاب شکن جنگ کے دوران کبیر کا دستِ راست کالا ناگ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو گیا تھا جبکہ خود کبیر میری ہی گولی سے زخمی ہوا تھا۔ اب اس کی واپسی کے بعد عین ممکن تھا کہ دونوں باپ بیٹے (نظر حیات اور کبیر) میرے خلاف کوئی نیا فساد کھڑا کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



دیتے جس میں نگینہ کا باپ شاہ میر پیش پیش ہوتا۔ جب تک میں اور ماں زندہ تھے، ان تینوں خبیث شیطانوں کی نظروں میں کھٹکتے ہی رہتے۔ کیونکہ وہ میرے اور ماں کے منتقمانہ عزائم سے اچھی طرح واقف تھے۔ میں نے یہ سب سوچا تھا تاہم اس کا اظہار کئے بغیر نگینہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''نگینہ! تم اس کی فکر مت کرو۔ آنے دو اسے۔ میں یہاں بھی اس سے نمٹ سکتا ہوں۔''

دوسری جانب چند ثانیے خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد نگینہ نے کہا۔

''نادر! میرا بہت دل کرتا ہے آنٹی سے ملنے کو۔ کبھی ملاؤ نا ماں سے۔ سچ نادر! میں تو بچپن میں ہی ماں کے پیار سے محروم ہو گئی تھی۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں نادر! کہ مجھے تمہاری صورت میں اپنے محبوب کے پیار کے ساتھ ماں کی ٹھنڈی چھاؤں بھی میسر آنے والی ہے۔'' وہ جیسے خواب ناک سے لہجے میں بولے جا رہی تھی۔

میری ماں سے اس کی محبت کا یہ جذبہ یقیناً اس کے اندر ممتا سے محرومی کے خلا کو پُر کرنے کی دیرینہ خواہش کا ہی باعث تھا۔ مگر میں اسے کیا بتاتا کہ ماں کو اس سے کس قدر نفرت ہے۔ وہ اسے دشمن کی بیٹی سمجھے ہوئے تھیں۔ حالانکہ ایسا نہ تھا۔ لیکن یہ سب نگینہ کی میری طرف سے ذہنی کایا کلپ کے بعد سے ہوا تھا۔ جس نے ماں کے دل میں اس کی طرف سے غلط فہمی پیدا کر دی تھی کہ نگینہ نے اپنے باپ شاہ میر کے کہنے پر ہی مجھ سے منہ موڑا تھا جس کے باعث نگینہ نے اپنے باپ کے خلاف عدالت میں جو بیان دیا تھا، وہ واپس لے لیا تھا۔ ماں کو تب سے ہی نگینہ سے نفرت ہو گئی اور ساتھ ہی یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ نگینہ نے یہ سب اپنے باپ کے ایماء پر اور اسی کے سمجھانے بجھانے اور اشاروں پر ہی کیا تھا۔ لیکن اصل حقیقت تو میں ہی جانتا تھا کہ نگینہ کے ساتھ کس قسم کی پراسرار ٹریجڈی ہوئی تھی۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا نادر! پھر کب ملوا رہے ہو ماں سے؟'' میری طول پکڑتی خاموشی پر نگینہ نے مجھ سے کہا تو میں اسے ذرا ٹالنے کے انداز میں بولا۔

''ہاں..... ہاں، کیوں نہیں۔ میں تمہیں ضرور ملواؤں گا ماں سے۔ لیکن بس، تھوڑے دن ٹھہر جاؤ۔ ذرا حالات کو معمول پر آنے دو۔'' پھر موضوع بدل کر بولا۔ ''اچھا تم بتاؤ، تمہارے پپا کا تمہارے ساتھ کیا رویہ ہے؟''

''ہوں، ٹھیک ہے، بس کچھ خفا خفا سے رہتے ہیں۔'' وہ مسکراتے لہجے میں بولی۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے گہری متانت سے بولی۔ ''لیکن نادر! انہوں نے تمہاری ماں کے ساتھ انکل نظر حیات سے مل کر جو ظلم کیا تھا، میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس لئے تو میں کہتی ہوں کہ مجھے تم ماں سے ایک بار ملوا دو۔ میں ان کے قدموں میں گر کر اپنے ڈیڈی کی طرف سے رو رو کر ان سے معافی مانگوں گی۔ مجھے یقین ہے نادر! وہ ہمیں معاف کر دیں گی۔''

نگینہ کی اس معافی والی بات پر مجھے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی ماں نگینہ کے باپ کا اتنا بڑا جرم معاف کر دیں گی؟..... پھر یہی سوال میں نے خود سے بھی کیا مگر کوئی جواب ذہن میں نہیں آیا۔

''تم خاموش کیوں ہو نادر؟'' اس نے مجھے خاموش پا کر دوبارہ کہا تو میں نے اسے یہ تلخ حقیقت بتا دینا ہی ضروری سمجھا اور سنجیدگی سے بولا۔

''نگینہ! میرا خیال ہے کہ تمہارے پپا اور نظر حیات کا جرم اس قدر گھناؤنا اور ناقابل تلافی ہے کہ وہ اب معافی تلافی سے کوسوں دور ہو چکا ہے۔ تمہاری یہ کوشش فضول ہی ثابت ہو سکتی ہے۔''



''نادر! تم مجھے ایک بات بتاؤ۔''

''ہاں..... پوچھو۔''

''کیا تم میرے پپا کو معاف کر سکتے ہو؟''

مجھے اس کی بات پر ایک اور جھٹکا لگا تاہم صاف گوئی سے بولا۔ ''شاید نہیں..... لیکن کیا تم خود بھی یہی چاہتی ہو کہ تمہارے باپ نے میری ماں کے ساتھ جو بھیانک جرم کیا ہے، اس کی سزا تمہارے باپ کو نہ ملے؟''

چند ثانیے کی اسرار بھری خاموشی کے بعد نگینہ نے کہا۔ ''انہیں قانونی سزا ملنی چاہئے۔ لیکن شاید اب اس کا وقت بھی گزر چکا ہے۔''

''ہاں نگینہ! مگر یہ تم نے کیا بحث چھیڑ دی ہے؟ یہ بتاؤ، فون کس لئے کیا تھا؟'' میں نے اُسے اس گمبھیر موضوع سے ہٹاتے ہوئے کہا تو وہ مترنم ہنسی کے ساتھ بولی۔

''میں ماں جی سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھے وقت دے دو۔ کیا کل صبح میں آ جاؤں؟''

میں اس کی بات پر یکدم گھبرا کر بولا۔ ''نن..... نن..... نہیں، ابھی نہیں آنا۔''

''کیوں بھئی، آخر کیا بات ہے؟ بس..... یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میں اس معاملے کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''کون سا معاملہ؟''

''میں کل گرین لاج آ کر ہی بتاؤں گی۔ بائی بائی!'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں اپنے ہاتھ میں ریسیور پکڑے جانے کتنی دیر تک ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ اس کے بعد ایک گہری سانس لے کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اگلے دن صبح بیدار ہو کر ماں کی ہدایت کے مطابق میں سیدھا ٹال پہنچا۔

میں صبح نو بجے ٹال پہنچا تھا۔ منیجر مشتاق مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا۔

میری غیر موجودگی میں اس نے ہی یہاں کے کاروباری امور سنبھالے ہوئے تھے۔ ماں بھی وقتاً فوقتاً وہاں آتی رہتی تھیں۔

گیارہ بجے تک میں شدید اضطراب میں مبتلا رہا۔ نگینہ نے آج پنڈی سے مری گرین لاج آنا تھا۔ میرے لئے پریشانی کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ نہ جانے ماں نگینہ کو دیکھتے ہی اس کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ دوم یہ کہ میں نگینہ پر ابھی ماں کی اس کے بارے میں غلط فہمی اور ناراضگی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ گرین لاج فون کر کے ذرا پتہ تو کروں۔ لہٰذا یہ سوچ کر جیسے ہی میں نے ساگوان کی میز پر دھرے ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا، یکدم اس کی بیل گونج اُٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''ہیلو!''

''ہیلو نادر!..... میں نگینہ بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے اس کی آواز اُبھری تو میں یکدم لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''نن..... نگینہ!..... تت..... تم کہاں سے بول رہی ہو؟''

''کیوں؟..... تم پریشان کیوں ہو گئے بھئی؟'' وہ بولی۔ ''ویسے میں گرین لاج سے بول رہی ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



اس کی بات پر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ ''تت.....تم.....کک.....کب آئیں؟..... ماں کہاں ہیں؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں یہاں آئی تو ماں جی نہیں تھیں۔ سکینہ نے بتایا تھا کہ وہ کہیں باہر گئی ہوئی ہیں اور تم ٹال پر ہو۔''

''میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے جلدی سے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ اس کے بعد منیجر مشتاق سے کہا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں اپنی نئی جیپ میں آ بیٹھا اور گرین لاج کی طرف روانہ ہو گیا۔ گرین لاج پہنچا تو ایک ناقابل یقین منظر میرا منتظر تھا۔ نگینہ اکیلی گرین لاج نہیں آئی تھی، اس کے ہمراہ شاہ میر بھی تھی۔ اس کا باپ.....اور میرے باپ کا قاتل شاہ میر۔ اسے اپنے گھر میں دیکھ کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ کنپٹیاں جیسے بری طرح سلگنے لگیں۔

وہ دونوں باپ بیٹی صوفے پر ایک ساتھ براجمان تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نگینہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آؤ نادر!.....دیکھو میں ساتھ کسے لائی ہوں؟''

''اسے کیوں لائی ہو تم؟''

میں نے سامنے صوفے پر براجمان شاہ میر کو غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے نگینہ سے کہا تو وہ مجھ سے بولی۔

''نادر! تمہیں ایک زبردست خوشخبری سنانے آئی ہوں۔''

جواباً میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اس شخص کی موجودگی میں مجھے کون سی خوشخبری سنا سکتی ہو نگینہ!..... تم نے اسے یہاں لا کر بہت غلطی کی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے اس مردود سے کس قدر شدید نفرت ہے۔ اور ماں.....اگر میری ماں نے اسے یہاں اپنی چھت کے نیچے دیکھا تو وہ اسے گولی مارنے سے دریغ نہیں کرے گی۔''

''نادر! پہلے میری بات تو سن لو.....میں.....'' نگینہ نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ کر اٹل لہجے میں کہا۔

''نگینہ! پلیز، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس شخص کو میری نظروں سے دور لے جاؤ۔''

''نادر! تمہیں میری بات سننا ہو گی۔'' دفعتہً نگینہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے نرم اور ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ''نادر! پپا یہاں تم سے اور تمہاری ماں سے اپنے جرم کی معافی مانگنے آئے ہیں۔ وہ اس جنگ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اب تو بتاؤ، ہے نا کتنی بڑی خوشی کی بات۔''

نگینہ کا خیال تھا کہ میرے چہرے اور میرے لہجے کی برف پگھل جائے گی۔ مگر وہاں بدستور ایک گلیشیئر تھا۔ میں نے کہا۔

''نگینہ! میں نے تم سے کل ہی فون پر کہہ دیا تھا کہ اب یہ معاملہ معافی تلافی سے کوسوں دور جا چکا ہے۔ واپسی اور معافی کے تمام در بند ہو چکے ہیں۔''

''ایسا مت کہو نادر!.....کم از کم تم تو ایسا مت کہو۔'' نگینہ یکدم روہانسی ہو گئی۔ ''میں تو..... میں تو تمہیں بہت فراخ دل سمجھتی تھی۔ تم ایک پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے انسان ہو۔ میری خاطر ہی پپا کو معاف کر دو۔ معاف تو خدا بھی کر دیتا ہے۔''

نگینہ کی بات پر میں اپنے اندر کے کھولتے ہوئے اُبال پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر نگینہ کو دوسرے طریقے سے سمجھاتے ہوئے بولا۔



''نگینہ! بات صرف میرے معاف کرنے کی نہیں ہے۔ اس شخص نے میری ماں کو جو زخم دیا ہے، اس کا ازالہ کرنا ناممکن ہے۔ اور ماں کے لئے اپنے شوہر کے قاتل اور بیوگی کے زخم کے بعد بے گناہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلے جانے کے ذمہ داروں کو معاف کرنا ناممکن ہی ہو گا۔''

اس بار شاہ میر نے مداخلت کی اور وہ صوفے سے اٹھ کر چند قدم چلتا ہوا میری طرف آیا۔ پھر نادم سے لہجے میں مجھ سے بولا۔ ''میں تم سے اتنا کہوں گا نادر! کہ کیا تمہارے بس میں مجھے معاف کرنا نہیں ہے؟''

''ہرگز نہیں.....'' میں نے بلا تردّد اور انتہائی سرد مہری سے کہا تو وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر دھیرے سے بولا۔

''نگی بیٹا! ہمیں پھر یہاں سے چلنا چاہئے۔ بلاوجہ یہاں بدمزگی نہ ہو جائے۔ تمہیں پہلے نادر علی کو اعتماد میں لے کر قائل کرنا چاہئے تھا۔ آؤ چلو۔''

مجھے اس کے شاطر لہجے میں مکارانہ طنز کی جھلک صاف محسوس ہوئی۔ نگینہ نے اپنی گھنیری سیاہ پلکوں کی چلمن اٹھا کر درد بھری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ اس کے بعد وہ ہولے سے اپنے باپ کو مخاطب کر کے بولی۔

''پپا! آپ باہر جا کر گاڑی میں بیٹھیں، میں ابھی چند منٹ میں آتی ہوں۔''

''او کے بیٹا!'' شاہ میر نے ہولے سے کہا اور پھر خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

''نادر!.....نادر! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہمارے اندر کسی نادم شخص کو معاف کرنے کا، عفو و درگزر کا جذبہ کیوں نہیں ہوتا؟ اگر کسی کو اپنی غلطی کا اعتراف ہے تو اسے.....اسے آخر کیوں معاف نہیں کیا جاتا؟ کیا.....کیا دشمنی کا جذبہ اسی قدر طاقت ور ہوتا ہے یا ہماری تنگ نظری اور تنگ ذہنیت اسے طاقت ور بناتی ہے؟''

باپ کے باہر جانے کے بعد نگینہ نے آزردہ لہجے میں مجھ سے کہا اور پھر سسکیاں بھرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس وقت چاچا فضل مرحوم کی بیوہ سکینہ بھی وہاں موجود تھی۔ ذرا دیر بعد باہر گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز اُبھری۔ میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی اور باہر آ کر اپنی جیپ میں آ بیٹھا اور دوبارہ ٹال کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹال سے میں دو بجے بعد دوپہر واپس گھر لوٹا تو ماں کو بڑی بے چینی کے عالم میں کمرے کے وسط میں ٹہلتے دیکھا۔ ان کے شاداب چہرے پر غصے اور طیش کی سرخیاں مترشح تھیں۔ جبکہ بڑی بڑی کالی آنکھوں سے نفرت و غیظ کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔

انہوں نے سیاہ پھول دار سوٹ کے اوپر لمبا ''چیسٹر'' چڑھا رکھا تھا جو ان کے دراز قد و قامت والی شخصیت کو مزید پُروقار بنا رہا تھا۔ پیروں میں لانگ بوٹ تھے اور گھنیرے مہندی رنگ کے ریشمی بال، جن میں چاندی کا اِکا دُکا تار بھی جھلک رہا تھا، شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایسے میں ایک بھرپور پہاڑی عورت نظر آ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ رک گئیں اور برماتی ہوئی نگاہوں سے مجھے گھور کر گویا دانت پیستے ہوئے بولیں۔

''نادر! میں جو پوچھوں، مجھے صرف اس کا جواب چاہئے۔''

میں خاموشی سے ماں کا چہرہ تکنے لگا۔

''شاہ میر یہاں آیا تھا؟''

''ہاں ماں!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''نگینہ بھی اس کے ساتھ تھی؟''

''ہاں ماں!''

''اور تم نے اپنے باپ کے قاتل کو یہاں سے جانے دیا؟ تم نے اس کے سینے میں گولی کیوں نہ ا دی؟ محض اس لئے کہ وہ نگینہ کے ساتھ یہاں آیا تھا؟''

''ماں! یہ بات نہیں ہے۔ وہ یہاں معافی مانگنے آیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''معافی..... یہ کون سا لفظ ہے؟ میں تو اس لفظ سے واقف ہی نہیں ہوں۔ کیا تمہاری لغت : دشمن کو معاف کرنے کا لفظ ہے؟ اگر ہے تو مجھے بھی بتا دو۔''

ماں نے جھٹکے دار لہجے میں مجھ سے کہا۔

''ماں! وہ مجھ سے بھی معافی مانگ رہا تھا لیکن مجھ سے وہ مایوس ہو کر یہاں سے گیا ہے۔''

''ہونہہ..... مایوس ہو کر.....'' ماں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ پھر ناگن کی طرح پھنکار بولی۔ ''نادر! اس کی صرف یہاں سے لاش جانی چاہئے تھی اور وہ بھی اس حرافہ نگینہ کے کاندھوں پر..... سمجھے تم؟''

''ماں! میں نے شاہ میر کو معاف نہیں کیا ہے۔ میں نے کہا نا، وہ یہاں سے بری طرح مایوس ہو کر گ ہے۔'' میں نے پُرزور لہجے میں کہا تو ماں اپنے لانبے قد پر جھولتے ہوئے براؤن ''جیسٹر'' کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر چند قدم چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ وہ میرے اتنے قریب آ گئی تھی کہ اس پھنکارتی ہوئی، جلتی سلگتی سانسوں کی تپش مجھے چہرے پر محسوس ہونے لگی۔ پھر جیسے ایک ایک لفظ چبا مجھ سے بولی۔

''نادر! حقیقت یہ ہے کہ تم نے اسے معاف کر دیا ہے۔''

''نہیں ماں! نہیں..... میں نے اسے ہرگز معاف نہیں کیا ہے۔'' میں بھی ماں کے جلتے سلگ چہرے پر نظریں گاڑ کر بولا۔

میں نے دیکھا، ماں کے ہونٹوں پر بڑی اسرار بھری مسکراہٹ اُبھری۔ جانے کیا ہوا، انہوں نے مجھ فوراً اپنے سینے سے لگا لیا۔ بے اختیار میں نے بھی ماں کو اپنے ساتھ بھینچ کر لپٹا لیا۔ ماں نے میری پیشا کو چوما اور میں نے اس کے گال کو بوسہ دیا۔

ماں کے ممتا بھرے وجود کی قربت نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

وہ مجھ سے الگ ہوئیں اور اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے میرے چہرے کا بڑے والہانہ انداز میں جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹا! تم اپنے بہادر باپ قادر علی خان کا دوسرا روپ ہو۔ وہ مجھ سے ہمیشہ سچ بولتا تھا۔ مجھے بھی تم پر بھروسہ ہے کہ تم اپنی ماں سے ہرگز جھوٹ نہیں بولو گے۔ بے فکر رہو، مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ تم کبھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے۔ اور شاہ میر یقیناً تم سے مایوس ہو کر ہی یہاں سے لوٹا ہوگا۔ لیکن میں تمہاری زبان سے اس کے علاوہ ایک اور سچ بھی سننا چاہتی ہوں۔''

ماں کے اس غیر معمولی رویے میں پیار بھری لچک کو محسوس کرتے ہی میرا پورا وجود مسرت سے سرشار ہو گیا اور میں جوش بھرے یقین کے ساتھ ماں سے بولا۔

''ماں! اپنے بیٹے پر بھروسہ کرو۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے، آپ کا یہ بیٹا کبھی دشمنوں کو معاف نہیں کرے گا اور نہ ہی ان سے کسی قسم کی مفاہمت کرے گا۔''

ماں نے مجھے تفاخر آمیز مسکراہٹ سے دیکھا اور اسی لہجے میں بولی۔ ''نادر بیٹے! مجھے تم پر فخر ہے اور



پورا بھروسہ بھی۔ پر تُو ایک بات بتا، کیا واقعی تجھے نگینہ اچھی لگتی ہے؟''

ماں کا اس طرح نگینہ سے متعلق میرا عندیہ لینا، میرے لئے عجیب بھی تھا اور خوشی کی بات بھی۔ لہٰذا میں نے بھی ماں سے کچھ نہیں چھپایا اور صاف گوئی سے دل کی گہرائیوں سے بولا۔ ''ہاں ماں! نگینہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔''

میری بات پر ماں کے چہرے پر چند ثانیے پُرسوچ خاموشی کے آثار طاری رہے اس کے بعد وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''نادر بیٹے! باوجود اس کے کہ وہ ہمارے دشمن کی بیٹی ہے، وہ تم سے نباہ کر لے گی؟''

''ہاں ماں! کیونکہ وہ بھی واقعی اپنے باپ کو ہمارا مجرم سمجھتی ہے۔''

''مگر بیٹا! وہ اپنے باپ کی محبت سے مجبور ہو کر، تمہارا کسی وقت ساتھ تو نہیں چھوڑ دے گی؟''

''نہیں ماں! میں نگینہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گی۔''

''تب بیٹا! پھر وہ یہ آس لے کر ہمارے پاس کیوں آئی تھی کہ ہم اس کے باپ شاہ میر کو معاف کر دیں گے؟''

''ماں! نگینہ فطرتاً ایک نرم خو اور صلح جو طبیعت کی لڑکی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اگر ہم اس کے باپ کو معاف کر دیں گے تو زیادہ اچھی اور خوشی کی بات ہوگی۔ مگر اب وہ مایوس ہو گئی ہے ہم سے۔''

''میں تم سے یہی پوچھنا چاہتی تھی نادر بیٹے! کہ اب مجھ سے اور بالخصوص تم سے مایوس ہونے کے بعد نگینہ کیا واقعی تمہارے ساتھ شادی پر آمادہ ہو جائے گی؟'' ماں نے گہرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں ماں! مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس سب کے باوجود مجھ سے منہ نہیں موڑے گی۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

''کیا تمہاری اور نگینہ کی شادی میں اس کے باپ شاہ میر کی مرضی بھی شامل ہوگی؟''

''شاید نہیں۔'' میں نے گومگو سے لہجے میں کہا اور مزید بولا۔ ''لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ نگینہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور وہ اپنے مجرم باپ کی مرضی کے خلاف میرے ساتھ ضرور شادی پر رضامند ہو جائے گی۔''

''تو ٹھیک ہے پھر۔'' دفعتہً ماں نے گمبھیر لہجے میں انتہائی متانت سے کہا۔ ''تم نگینہ سے فوراً اس سلسلے میں حتمی بات کر لو۔ تم دونوں کی شادی پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' ماں نے اتنا کہا اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میں ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا۔ ماں کے رویے میں نگینہ سے متعلق اچانک نرمی جہاں میرے لئے خوشی کی بات تھی تو وہیں مجھے ایک عجیب سی اُلجھن آمیز حیرت بھی ہو رہی تھی۔

میں اس سارے معاملے پر گہرائی سے سوچنے لگا۔ جانے کیوں مجھے یوں لگا جیسے ماں کچھ اخذ کرنا چاہ رہی ہو، نگینہ کو آزمانا چاہتی ہو کہ وہ واقعی باپ سے متنفر تھی یا پھر اس کے اشاروں پر ہم ماں بیٹے کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ یقیناً اب نگینہ کا میرے ساتھ شادی کے لئے ''ہاں'' یا ''نہ'' کہنا بہت اہم ہو گیا تھا۔

بہرطور کچھ بھی تھا، مجھے پورا یقین تھا کہ نگینہ کبھی مجھ سے شادی سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ ماں نے مجھے ایک موقع دیا تھا۔ وہ یا تو اپنے تئیں نگینہ کا اصل چہرہ میرے سامنے بے نقاب کرنا چاہتی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی۔ بہرحال کچھ بھی سہی، اگر ماں کے دل میں یہی کرید یا کسی قسم کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



تشکیک تھی تو یہی سہی۔ مجھے ماں نے ایک موقع دیا تھا۔ کیا خبر، اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی نے اسے پگھلا دیا ہو۔

بہرطور ماں کا رضامند ہونا میرے لئے کم خوشی کی بات نہ تھی اور میں یہ خوش خبری جلد سے جلد نگینہ کو بھی سنانا چاہتا تھا۔ گویا اب میں اپنی محبت کو نگینہ کی شادی کی صورت میں پانے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نگینہ سے فون پر بات کرنا چاہتا تھا مگر پہلے مجھے اس کے فون کا انتظار تھا۔ اگلے روز میں ٹال پہنچا۔ معمولات کے کام نمٹائے اور بارہ بجے تک قدرے فارغ ہو کر بیٹھ گیا۔ اچانک میری نظر آفس کیبن کے شیشے والے دروازے سے باہر ٹال کے وسیع و عریض احاطے پر پڑی۔ ایک سیاہ رنگ کی ٹویوٹا پراڈ تیزی سے اندر داخل ہوئی اور ایک جھٹکے سے میرے آفس کیبن کے سامنے رک گئی۔

میں قدرے چونک سا گیا۔ پھر جس شخص کو میں نے تیزی کے ساتھ کار سے اترتے دیکھا، وہ نظ حیات تھا۔ اسے دیکھ کر میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں۔ اس کے ہمراہ دو افراد بھی تھے۔ نظر حیات نے گر کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔

''یہ مردود یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

میں ہولے سے زیرلب بڑبڑایا۔ تاہم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے دونوں آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر پریشانی، غیظ اور تفکرات کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔

''نادر! میرا بیٹا کبیر کہاں ہے؟'' اندر داخل ہوتے ہی مجھے گھورتے ہوئے غیظ آلود لہجے میں بولا۔ اس اثناء میں میرے دو مسلح گارڈز جو باہر چوبی گیٹ میں متعین تھے، ایک کار کو رکے بغیر تیزی سے اند داخل ہوتے دیکھ کر فوراً وہاں آن پہنچے تھے اور ساتھ ہی چند مزدور بھی۔ برابر والے کمرے سے منیجر مشتاق بھی دوڑا چلا آیا تھا۔ میں نے اپنے مسلح گارڈز اور منیجر مشتاق کو تو وہیں کھڑے رہنے دیا البتہ مزدوروں کو واپس جانے کا حکم دیا۔

''تم نے یہاں آنے کی جرأت کس طرح کی ہے نظر حیات!'' اس کے سوال کو سر بہ سر نظر انداز کرتے ہوئے میں نے بھی خونخوار غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے کہا۔

''ابھی میں نے اپنی جرأت تمہیں دکھائی کب ہے نادر!'' وہ دانت پیس کر غصیلے لہجے میں بولا۔ اگر دوران میرے مسلح گارڈز نے اس کی بدتمیزی اور درانہ وار اندر داخلے پر نظر حیات سے کچھ جاننا چاہا تھا مگ میں نے اشارے سے انہیں خاموش کھڑے رہنے کو کہا۔

''نادر! اگر تمہاری ماں اسی طرح کی بزدلانہ حرکتیں کرے گی تو وہ بھی ایسی ہی حرکت کا نشانہ بن سکتی ہے۔ وہ شاید بھول رہی ہے کہ وہ میری طرح خود بھی ایک جوان اور اکلوتے بیٹے کی ماں ہے۔''

اگرچہ کبیر کے سلسلے میں مجھے تھوڑی بہت اس کی بات کی بے چینی تو تھی کہ نہ جانے عامل عاروب کی خانقاہ میں میرے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا تھا؟ تاہم نظر حیات کی اس تہدید پر میرا خون جیسے کنپٹیوں تک اچھال مارنے لگا۔ مگر میں بھی سرد دست زبانی کلامی ہی اسے دق کرنا چاہتا تھا۔ اسے گھور کر بولا۔

''نظر حیات! مجرم باپ کی اولاد کے سلسلے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے، اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے والے بیٹے کا بھیانک انجام اپنے باپ سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ایک مظلوم مگر بہادر ماں کے بیٹے سے ایسی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔''

''کسی خوش فہمی میں مت رہنا تم دونوں ماں بیٹا۔ سمجھے تم۔'' نظر حیات نے غیظ و غضب سے لرزیدہ



لہجے میں کہا۔ ''مجھے صرف اپنے سوال کا جواب چاہئے۔ میرا بیٹا کہاں ہے؟''

''میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا رذیل کتے! دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔'' میرے اندر کا اُبال عروج پر پہنچ گیا اور میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

نظر حیات کا چہرہ احساسِ ذلت اور طیش کے مارے مزید سرخ ہو گیا۔ اس کے ساتھ کھڑے دو کرخت رو آدمیوں کی آنکھوں میں مجھے گھورتے ہوئے عجیب سی چمک اُبھری جو یکلخت معدوم بھی ہو گئی۔ اس کے بعد نظر حیات اپنے دانتوں تلے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔

''نادر! ایک بات یاد رکھو۔ اگر میرے بیٹے کا ذرا بھی بال بیکا ہوا یا وہ مجھے اگلے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر نہ ملا تو میں اس کی ذمے داری تمہارے سر سمجھوں گا۔'' تہدیدی انداز میں یہ کہہ کر وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔

میں دوبارہ اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ دونوں گارڈز کو میں نے واپس جانے کا اشارہ کیا البتہ منیجر مشتاق مسمسی سی صورت بنا کر مجھ سے تفکیر بھرے لہجے میں بولا۔

''سر جی! یہ تو اتنا ہنگامہ کر گیا ہے۔ ہمارے ٹال کو پھر سرخ سیل نہ لگوا دے، جی کڑا کے۔''

''اب اگر ایسا ہوا تو میں اس کے خلاف اختیارات سے متجاوز ہونے کی محکمہ جاتی کارروائی کر ڈالوں گا۔''

''بالکل..... بالکل۔'' وہ اپنا سر دھننے لگا۔

میں نے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی ذرا مال کی خرید و فروخت میں احتیاط برتنا، خیال سے۔ کوئی ٹھیکے دار ہمیں چوری کا مال پلینے کی کوشش نہ کرے۔ بالخصوص نئے ٹھیکیداروں کے سلسلے میں احتیاط کرنا۔''

''ٹھیک ہے سر جی! میں اس بات کا خیال رکھوں گا، جی کڑا کے۔''

''کیا مطلب جی کڑا کے؟..... کیا تمہارا کام کرنا دوبھر ہو گا؟'' میں نے دانستہ اس کے نئے تکیہ کلام پر مصنوعی غصے سے گھور کر پوچھا۔ وہ گھبرا کر بولا۔

''اونن..... نہیں جی..... سر جی! میرا مطلب تھا کہ میں زیادہ اچھے طریقے سے خیال رکھوں گا۔ جی کڑا کے.....'' وہ اچانک چپ ہو گیا۔

''اچھا ٹھیک ہے ..... تم جا سکتے ہو۔'' میں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ میں ریوالونگ چیئر کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

ہمارے ازلی دشمن شاہ میر اور نظر حیات کو میں جب بھی کسی پریشانی یا مصیبت میں تلملاتا ہوا دیکھتا تھا تو مجھے بڑی ذہنی آسودگی ملتی تھی۔ اس طرح نظر حیات کا اپنے نقشِ قدم پر چلنے والے بیٹے کی گمشدگی پر پریشان اور متفکر ہونا میرے لئے باعث مسرت تھا۔

اگرچہ وہ اس کی گمشدگی کا الزام میرے سر پر تھوپ کر مجھے دھمکی بھی دے کر گیا تھا لیکن مجھے اس کی گیدڑ بھبکیوں کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ میں تو فقط کبیر کے بارے میں یہ سوچ رہا تھا کہ زخمی ہونے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا تھا؟ اور وہ کہاں تھا؟ عین وقت پر جہنم واصل کالا ناگ کی ترغیب پر اس نے عامل عاروب کے پیروکاروں کے سامنے مجھ پر بے دریغ گولیاں چلا دی تھیں اس لئے اس کا تو یقین تھا کہ عامل عاروب کے پیروکاروں کو یہ خوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کبیر بہرحال ان کا دشمن نہ تھا۔ تاہم میرے اندازے کے مطابق اسے اب تک یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ تو پھر آخر وہ گیا کہاں؟ ایک خیال یہ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



دوئم

میرے ذہن میں آتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ عامل عاروب کے پیروکاروں نے اپنے روحانی پیشوا (عاروب) کی ہلاکت یا زخمی ہونے کے بعد مشتعل ہو کر کبیر کو بھی زندہ نہ چھوڑا ہو۔ کیونکہ بہرحال عین وقت پر کالا ناگ اور کبیر نے ہی بھری خانقاہ میں مجھ پر فائرنگ کی تھی اور اس ''تڑابڑی'' میں عامل عاروب بھی زخمی یا ہلاک ہو گیا تھا۔

بہرطور وہ دن خیریت سے گزرا۔ مجھے بھوک نہیں تھی اس لئے میں نے کھانا ہی نہیں کھایا تھا اور شام پانچ بجے تک ٹال میں بیٹھا رہا۔

ٹھیک ساڑھے پانچ بجے میں ٹال سے گھر رخصت ہونے کے لئے اٹھا۔ باہر آ کر اپنی جیپ میں بیٹھا اور جیسے ہی ٹال کے احاطے والے بڑے سے چوبی گیٹ سے باہر نکلا، اچانک ایک انگوری رنگ کی الیف ایکس کار بالکل میری جیپ کے سامنے رکی۔ میں نے بھی بریک لگا دیئے۔ میں نے کار سوار کو دیکھا جو تنہا تھا بلکہ تھی۔ وہ ایک فیشن طراز عورت تھی۔ میں اسے پہچان کر بری طرح چونکا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ مسز جواد تھی جس کے کبھی کبیر کے ساتھ خفیہ تعلقات تھے مگر بعد میں میری اس سے ''ون ٹو ون'' ملاقات کے بعد بالکل منقطع ہو گئے تھے۔

وہ مجھے جیپ میں سوار دیکھتے ہی فوراً اپنی کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتری اور بڑی بے تابانہ انداز میں جیپ کی طرف بڑھی۔ ناچار مجھے بھی نیچے اترنا پڑا۔ مجھے اس کا چہرہ مضطرب سا محسوس ہوا۔ بہرطور وہ میرے قریب آ کر ملتجی لہجے میں بول۔

''نادر صاحب! مجھے یقیناً آپ نے پہچان لیا ہو گا؟'' میں نے دھیرے سے محض سر اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا تو وہ مزید بولی۔ ''مم..... مجھے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ پلیز! آپ ذرا دیر کے لئے میرے ساتھ چل سکتے ہیں؟'' وہ پنڈی میں رہتی تھی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''خیریت تو ہے؟..... کیا آپ ابھی سیدھا پنڈی سے آ رہی ہیں؟''

''ہاں..... میں بہت مشکل میں ہوں نادر صاحب! پلیز میری مدد کریں۔ اس مشکل وقت میں مجھے یقین ہے کہ آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔''

''آخر بات کیا ہے محترمہ! کچھ تو بتائیں۔'' میں نے بالآخر پوچھا۔

''پلیز، آپ کو میرے ساتھ میرے بنگلے پر چلنا ہو گا۔''

میں پریشان ہو گیا۔ ''کیا اس وقت؟''

''ہاں..... اسی وقت۔ اور وہ بات ایسی ہے کہ میں یہاں آپ کو نہیں بتا سکتی۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اتنی زیادہ واقفیت تھی۔ وہ بہرحال میرے لئے ایک طرح سے مانوس اجنبی ہی تھی۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے خاتون.....''

''میرا نام غزالہ ہے۔'' اس نے میری بات کاٹ کر اپنا نام بتایا۔

''ہاں..... لیکن میں آپ کے ساتھ کیسے چل سکتا ہوں؟ اگر آپ کسی پریشانی میں مبتلا ہیں تو آپ کو وہیں، متعلقہ تھانے کی پولیس سے مدد لینی چاہئے تھی۔''

میری مسلسل بے اعتنائی اور بے رخی پر اس کے چہرے پر ایک لمحے کو مایوسی کی رمق اُبھری، پھر دوسرے ہی لمحے اس کی جگہ ایک التجا نے لے لی۔

''پلیز!..... پلیز نادر صاحب! میں..... میں آپ کے پاس بڑی امید لے کر آئی ہوں۔ م



دوئم

ت پولیس کو بھی بتانے کی نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں، میری آپ کے ساتھ کوئی زیادہ پرانی شناسائی نہیں ہے۔ مگر مختصر شناسائی سے مجھے آپ کے اچھے اور ہمدرد انسان ہونے کا اندازہ ہو چکا ہے..... اور نہ سہی تو انسانی ہمدردی کے ناتے ہی سہی۔ پلیز! میں اس وقت بہت مجبور ہوں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

اس غزالہ نامی عورت نے مجھے عجیب سی اُلجھن آمیز پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے تھے۔ مجھے ایسے میں اس پر بڑا ترس آیا۔ میں یوں بھی نرم خو اور ہمدرد طبیعت کا مالک تھا اور خدائی فوجداری کا جذبہ تو جیسے میرے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا لیکن اس وقت شام گہری ہونے لگی تھی۔

یوں بھی سردیوں کی شام کو رات کی تاریکی میں بدلتے ہوئے دیر ہی کتنی لگتی ہے؟ مری سے پنڈی کا فاصلہ 64 کلومیٹر یعنی 40 میل کے لگ بھگ تھا۔ بل کھاتے اندھیرے جنگلوں کے درمیان بنی سڑک پر قدرے بھرتیز رفتاری کے ساتھ بھی پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ سکتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ لگ سکتے تھے۔ گویا رات آٹھ بجے ہم وہاں پہنچتے۔ اور پھر میری واپسی کا مسئلہ بھی تھا۔ وہاں نہ جانے کیا حالات تھے۔ کیا بات تھی؟ یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد میں نے غزالہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے محترمہ! گھر میں میری والدہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ وہ پریشان ہو جائیں گی۔''

''آ..... آپ اپنی والدہ صاحبہ کو انفارم کر سکتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''کیا کہوں انہیں..... کہ میں رات گئے ایک اجنبی عورت کے ساتھ پنڈی جا رہا ہوں۔ اور کیوں جا رہا ہوں، یہ میں بھی نہیں جانتا۔''

''آپ کوئی بہانہ بنا سکتے ہیں۔ کسی دوست کی شادی میں شرکت وغیرہ کا یا کسی اور مجبوری کا۔''

گویا وہ مجھے ہر قیمت پر آج ہی اور اسی وقت اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی اور میرے لئے یہ ہرحال مشکل تھا۔ میں اگر ماں سے کہتا بھی تو کس طرح؟ میں تو اس سے مصلحتاً بھی جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ یہ میری مجبوری تھی۔ نہ جانے وہ کیا سمجھتیں؟ مگر باوجود ان ساری باتوں کے میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس عورت کی مدد سے انکار کروں۔ جانے یہ بے چاری کس مصیبت کا شکار تھی۔ عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا میں۔

یوں تو مجھے مسز جواد سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا اور نہ ہی میری اس سے کسی قسم کی کوئی دشمنی تھی۔

تب میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا اور میں اس سے بولا۔ ''آپ ایسا کریں، اگر آپ کی جان کو اس وقت فوری طور پر کوئی خطرہ ہے تو میرے ساتھ گھر چلیں۔ وہاں میری والدہ ہیں۔ میں ان سے کوئی نہ کوئی بہانہ کر لوں گا۔ پھر اگلے روز صبح سویرے پنڈی کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ سردست یہی ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے۔''

میری بات پر اس کا چہرہ مزید تاریک ہو گیا۔ پھر وہ بڑی آزردہ سی سانس خارج کر کے غم زدہ سی مسکراہٹ سے بولی۔ ''نادر صاحب! اگر ہمیں صبح چلنا ہوتا تو میں اس وقت بھلا آپ کے پاس کیوں آتی؟ ر کوئی بات نہیں، میں آپ کی لگتی ہی کیا ہوں؟ بس ایک ملاقات میں آپ نے مجھے متاثر کیا تھا کہ آپ پنے اندر انسانیت کا درد رکھتے ہیں۔ سو اسی امید کے سہارے چلی آئی تھی۔ آپ کا شکریہ! مجھے آپ سے وئی گلہ نہیں۔''

وہ یہ کہہ کر مایوسانہ انداز میں واپس پلٹی۔ مجھے بے اختیار اس پر ترس آ گیا۔ وہ جب اپنی کار کا دروازہ کھولنے لگی تو میں نے بے اختیار اسے آواز دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''ٹھہریئے ذرا.....'' میری بات سن کر وہ پلٹ کر امید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا میں نے کہا۔ ''آپ اپنی کار میں بیٹھیں، میں اپنی جیپ میں آتا ہوں۔''

میری بات سن کر وہ خوشی سے نہال ہوگئی اور اگلے لمحے ہی وہ اپنی کار میں سوار ہوگئی اور میں نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

ذرا دیر بعد ہی ہم دونوں پنڈی کی طرف رواں تھے۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ پہلے پنڈی تو پہنچوں، صورتِ حال کیا ہے؟ اس کے بعد ضرورت پڑی تو ماں کو وہیں سے فون کر کے کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔ بلکہ بہانہ کیا، حقیقت ہی بتاتا کہ اس طرح کوئی مصیبت کا مارا دوست ملا تھا اور میں اس کی ہمدردی سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ ہولیا۔ سوا آٹھ بجے رات ہم پنڈی پہنچے۔

بنگلے کے سامنے پہنچ کر ہم نے اپنی گاڑیاں روک دیں اور نیچے اُتر آئے۔ بنگلے پر ویرانی اور عجیب پراسرار خاموشی کا راج تھا۔ غزالہ نے جلدی سے آہنی گیٹ کا تالا کھولا اور مجھے اندر داخل ہونے کو کہا۔ پھر میرے بعد وہ بھی اندر آ گئی۔

ہم مرکزی دروازے سے اندر کمرے میں پہنچے اور ایکا ایکی میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا لیکن میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ وجہ یہی تھی کہ میری غزالہ سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس نے مسکرا کر ایک صوبے پر بیٹھنے کا کہا۔

میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ذرا دیر میں آنے کا کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اچانک ایک سرد نال میری گردن سے آن لگی۔

''خبردار! کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ اس خاموش پستول کی گولی گردن سے پار ہو جائے گی۔''

ایک سرسراتی ہوئی یکسر اجنبی، سفاک آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ دل جیسے یکدم سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔

جب اس نامعلوم شخص کو یہ تسلی ہوگئی کہ میں کسی مزاحمت کے موڈ میں نہیں تو اس نے مجھے دوسرا حکم دیا۔ ''اب پیچھے دیکھے بغیر اٹھ کر آگے بڑھو۔''

میں تعمیل حکم میں ہونٹ بھینچ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے سامنے والے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے کو کہا۔ میں نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ مجھے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ غزالہ کی عورت نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ مگر کیوں؟.....اس کا جواب سوچنے کا یہ موقع نہ تھا۔ مجھے سردست گلوخلاصی کے بارے میں سوچنا تھا۔ حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے کسی خطرناک جال میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ جبکہ مجھے پھنسنے سے پہلے ہی یہ جال توڑنا تھا۔

مجھے یہ تو بخوبی اندازہ ہو چلا تھا کہ مجھے حکم دینے والے شخص کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ وہ وہاں اکیلا تھا لہٰذا میں مذکورہ کمرے کے بند دروازے تک پہنچ کر دانستہ رکا تو حسب توقع اس نے عقب سے غرا کر کہا۔

''دروازہ اندر دھکیلو۔''

میں نے فوراً آگے بڑھ کر دروازے کے ''لٹو'' پر ہاتھ رکھا اور اسے گھما کر دانستہ یوں جھکے دروازے کو دھکیلا کہ میری گدی سے پستول کی سرد نال ہٹ گئی۔ گن پوائنٹ سے ''آؤٹ'' ہوتے میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ جھکائی دی۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے غیر ارادی طور پر خاموش، سائلنسر لگے پستول کا ٹرائیگر دبا دیا۔ ''ٹھک'' کی آواز سے گولی چلی لیکن میں جھکائی دے چکا تھا اور ساتھ ہی اپنے دائیں بازو کی کہنی کا زوردار وار اس کے پہلو پر کیا۔ ضرب کی شدت نے بے اختیار



اسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے حلق سے اوغ کی آواز نکلی۔ یقیناً میری کہنی نے اس کے حواس بگاڑ کر رکھ دیئے تھے۔ میرے لئے یہ لمحاتی وقفہ ہی کافی تھا۔ میں بجلی کی طرح پلٹا اور ایک مُکا اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پر رسید کر دیا۔ نتیجتاً پستول ہاتھوں کے طوطے کی طرح اُڑ کر اس کے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔ اس نے نقاب چڑھا رکھا تھا۔

میں نے دوسرا گھونسا اس کے درباری انداز میں جھکے ہوئے چہرے پر رسید کرنا چاہا مگر شاید اسے میرا زیادہ پھیلنا پسند نہیں آیا تھا، لہٰذا اس نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے اپنے جھکے ہوئے سر سے میرے پیٹ میں ٹکر رسید کر دی۔ وہ خاصا تنومند شخص تھا۔ ڈیل ڈول میں مجھ سے زیادہ تھا مگر قد و قامت میں نہیں۔ اس لئے اپنی اور میری کمزوری کو ایڈجسٹ کرتے ہوئے اس نے اپنے فٹ بال نما سر سے ہی کام لیا تھا جسے میرے پیٹ پر رسید کرتے ہی وہ مجھے کمرے کے اندر تک دھکیلتا چلا گیا۔ پیٹ پر زوردار ٹکر اور پھر اچانک دھکیلے جانے پر میرے قدم غیر ارادی طور پر پیچھے لڑکھڑاتے چلے گئے۔ اور بالآخر میں بیڈ پر جا پڑا۔ بیڈ پر کمر کے بل گرتے ہی مجھے اپنے نیچے ایک انسانی وجود کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ میرے اس طرح اس پر سوار ہونے سے اس کی حالت خراب ہوگئی ہوگی تاہم وہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں اس کی حالت کی فکر کرتا۔ مجھے تو اپنی فکر کرنی تھی۔ میرا دشمن میری جان کے درپے تھا۔ لہٰذا اس نے جیسے ہی مجھے بیڈ پر دھکیلا تو گویا اس نے مجھے دوبارہ وار کرنے کا ایک سنہری موقع پلیٹ میں سجا کر پیش کر دیا۔ میری دونوں ٹانگیں بیک وقت حرکت میں آئیں اور پوری قوت سے اس کے سینے پر ضرب لگانے میں کامیاب ہوگئیں۔ وہ غالباً زمین سے چند انچ اُڑتا ہوا اپنے عقب میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ خود کو بیڈ پر سے اسپرنگ کی طرح اچھالا اور سیدھا اس نقاب پوش پر جھپٹا۔ اس نے دیوار سے اپنی پشت ٹکاتے ہوئے مجھ پر لات رسید کرنی چاہی اور پھر تو جیسے مجھے اس پر کاری وار کرنے کا موقع مل گیا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور اپنی دوسری ٹانگ زمین پر ٹکی اس کی اکلوتی ٹانگ پر سویپ کے انداز میں رسید کر دی۔ مگر اس کی پہلی ٹانگ میں نے مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے رکھی۔ نتیجتاً جیسے ہی وہ زمین بوس ہوا، میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹانگ مروڑ کر اسے اوندھا کر دیا۔ پھر اس کی دونوں ٹانگوں کو اس کے کولہوں کی طرف فطری انداز میں موڑ کر اس پر اپنے پورے وزن کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اس کے حلق سے بیل کے ڈکرانے جیسی آواز خارج ہوئی۔ میں نے زوردار مُکا اس کی ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے پر رسید کیا تو وہ اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ چکا تھا۔ وہ ہوش میں تھا مگر اس کا نچلا دھڑ بے کار ہو چکا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے دونوں بازوؤں کی مدد سے سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے میری نظر غیر ارادی طور پر سامنے بیڈ پر پڑی اور میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ بیڈ پر ایک انسانی وجود پشت کے بل پڑا ہوا تھا مگر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر دستے تک خنجر پیوست تھا۔

بیڈ پر خون پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا جو کافی حد تک اس کے میٹرس میں جذب ہو چکا تھا۔ میں اس شخص کو پہچان چکا تھا جو اب یا جانے کب کا مردہ ہو چکا تھا۔ وہ غزالہ کا معذور شوہر جواد احمد تھا جو اب لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اچانک خواب گاہ کے دروازے پر غزالہ نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا وہی پستول دبا ہوا

تھا جو نقاب پوش کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔ اس نے جو سامنے بیڈ پر اپنے شوہر کی خون آلود لا
دیکھی تو ایک زوردار چیخ ماری۔ مجھے اس کی چیخ کا مطلب و مقصد سمجھ میں نہ آ سکا۔ پھر دوسرے ہی
میں نے دیکھا، وہ زمین بوس پڑے اس نقاب پوش کو غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے ہذیانی اند
میں چلّا کر بولی۔

''ذلیل!.......خونی!........تت........تُو نے........تُو نے میرے شوہر کو مار ڈالا۔'' یہ کہہ کر اس
اپنے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ میں غزالہ کو روکنے کی کوشش کے بارے میں ابھی غور ہی کر رہا
کہ اس نے تلے اوپر دو تین بار ٹرائیگر دبا کر اسے ہلاک کر ڈالا۔

اس کے بعد پستول ایک جانب پھینک کر وہ بیڈ کی طرف لپکی اور اپنے شوہر کی لاش سے لپٹ
رونے لگی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا تھا اور کیوں تھا؟

میرے جی میں تو آئی کہ میں اس سارے نہ سمجھ میں آنے والے پراسرار خونی کھیل پر لعنت بھیجو
اور جل تُو جلال تُو، صاحبِ کمال تُو، آئی بلا کو ٹال تُو کا ورد کرتے ہوئے فوراً یہاں سے نکل جاؤں۔ لیکن
میں غزالہ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اسے مجھ سے کس بات کی دشمنی تھی؟ یا کیا اس نے میرے ا
احسان کا بدلہ چکایا تھا کہ میں نے اسے کبیر جیسے کمینے اور کینہ پرور شخص کے شیطانی چنگل سے بچایا تھا۔

مگر میں خود حیران تھا کہ اگر یہ سارا کیا دھرا مسز جواد کا ہی تھا تو پھر وہ تو پہلے ہی یہاں موجود تھ
اس کا اپنے معذور شوہر کی لاش سے لپٹ کر رونے کا کیا مطلب تھا؟

بالآخر میں نے ذرا قریب آ کر اس سے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔ ''یہ سب کیا ڈرامہ ہے محترمہ!
آپ اس خونی ڈرامے میں میرا کردار بھی شامل کرنا چاہتی تھیں؟''

اس نے بین کرنا بند کیا، پھر سیدھی کھڑی ہو کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لب
تھیں۔ چہرہ نہایت آزردہ نظر آ رہا تھا مگر مجھے یہ سب مصنوعی لگا تھا۔ اس کے آنسو مگر مچھ کی یاد دلا ر
تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی صفائی میں بڑا خوبصورت اور رُلا دینے والا جھوٹ بولے گی۔ مگر اس
چہرے پر ایسے ملتجیانہ تاثرات نہیں تھے۔

''نادر صاحب!........آ........آپ یہاں سے چلے جائیں۔'' میں اس کے ان اکھنڈ سنجیدہ جملو
پر ششدر رہ گیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اسے گھور کر درشت لہجے میں بولا۔

''نہیں........تمہیں مجھے بتانا پڑے گا، یہ سب کیا تھا؟ آخر تم میرے ساتھ کون سی دشمنی نکالنا چا
ہو؟''

''آپ کا کام ختم ہو گیا۔ آپ جائیں۔ اس میں ہی آپ کی بھلائی ہے۔ ورنہ اس چکر میں آپ
گناہ پھنس کر رہ جائیں گے۔''

وہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی۔ آنسو بھی خود بخود اس کے خشک ہونے لگے تھے۔

''کون سا کام لیا ہے تم نے مجھ سے؟'' میں نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس سے پوچھا۔

''جو کام میں آپ سے لینا چاہتی تھی، وہ میں نے لے لیا ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''
شاید مجھے دیر ہو گئی۔ کاش میں پہلے ہی یہ کام کر دیتی۔''

مجھے اس کی عجیب و غریب باتوں پر حیرت ہوتی جا رہی تھی۔ مگر میں بھی اڑ گیا تھا۔ ''میں ایسے نہ
جاؤں گا۔ پہلے تمہیں مجھے بتانا پڑے گا۔ آخر تم مجھے یہاں خود ضد کر کے لائی تھیں اور مزید کہ یہاں
لاشیں بھی موجود ہیں۔ ایک تمہارے شوہر کی، دوسری اس نقاب پوش کی جسے تم نے ہلاک کر ڈالا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



میرے لہجے میں خود بہ خود تندی اور درشتی آ گئی تھی۔

''نادر صاحب!........پلیز، ضد نہ کریں۔ ابھی آپ جائیں۔ بعد میں آپ کو ساری حقیقت بتا دوں
گی۔ مجھے ان دونوں لاشوں کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔''

''یہ کوئی مشکل کام نہیں تمہارے لئے۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''تم بآسانی پولیس میں یہ
بیان دے دو گی کہ اس شخص نے تمہارے شوہر کو خنجر مار کر قتل کر ڈالا ہے، تم نے اپنے دفاع میں اس کے
پستول سے اسے مار ڈالا۔ لیکن میں یہاں پر موجود ہوں، عینی گواہ کی صورت میں۔ پولیس میرے بیان کو
زیادہ اہمیت دے گی۔'' میں نے اسے دوسرے طریقے سے دھمکی دی۔ میری توقع کے برخلاف وہ زہریلی
مسکراہٹ سے بولی۔

''پولیس کے سامنے آپ کے نہیں بلکہ میرے بیان کی زیادہ اہمیت ہو گی نادر صاحب! کیونکہ اس
وقت آپ میری چھت کے نیچے موجود ہیں۔ آپ اس نقاب پوش کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔''

اسے ڈرانے کی بجائے الٹا میں ڈر گیا۔ کسی نے درست ہی کہا، عورت واقعی چالباز ہوتی ہے۔ اپنے
چلتر پر اتر آئے تو اچھے اچھوں کو تگنی کا ناچ نچا دیتی ہے۔ مگر میں بھی اس کی دھمکی سے مرعوب ہونے والا
نہیں تھا۔ میں نے اسے سیدھا کرنے کے لئے ٹیڑھی انگلی سے کام لیا اور جھپٹ کر اس کی نرم و نازک
گردن دبوچ لی، وہ کراہ کے رہ گئی۔

''مجھے سیدھی طرح سے بتاؤ، یہ سب کیا چکر تھا؟........ورنہ میں تمہارا ابھی برا حشر کر کے رکھ دوں
گا۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن ذرا ڈھیلی چھوڑی تو اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''آپ کو اجازت ہے۔ میرا جو حشر چاہے کریں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔''

میں بھنا کر رہ گیا۔ ''لعنت ہے تجھ پر۔'' میں نے دانت پیس کر کہا اور ایک جھٹکے سے اس کی گردن
چھوڑ دی۔ پھر نقاب پوش کی لاش کی طرف بڑھا۔ جھک کر میں نے اس کے چہرے سے نقاب نوچ لیا۔
اس کا چہرہ میرے لئے اجنبی تھا۔

پھر میں نے ایک غصیلی نظر جواد کی بیوہ پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ میرے
وجود میں جانے کیوں پھریری سی اترنے لگی۔ میں نے پھر واقعی اس سارے پراسرار معاملے پر ایک عدد
لعنت بھیجی اور باہر نکل آیا۔ اپنی جیپ میں بیٹھا اور واپس ہو لیا۔

رات کے آخری اور دم توڑتے پہر میں، میں ''گرین لاج'' پہنچا۔

مجھے اس بات کی حیرت تھی کہ ابھی تک ماں نے میرے ٹال سے گھر نہ پہنچنے پر مجھ سے موبائل پر
رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟ بہرطور میں جیپ سے اترا اور دروازے کی طرف بڑھا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔
میں نے دروازہ تھوڑا کھلا ہوا پایا۔ خطرے کی بُو محسوس کرتے ہی میں ادھ کھلے دروازے کو زور سے دھکیلتا
ہوا اندر داخل ہوا تو مجھے در و دیوار سے چمٹے وحشتوں بھرے سناٹے چیختے محسوس ہوئے۔

''ماں!........ماں!'' میں پکارتا ہوا ماں کے کمرے کی طرف بڑھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئیں۔ پھر
میں سکینہ کو پکارنے لگا۔ اپنے شوہر (فضل چاچا) کے مرنے کے بعد وہ مستقل یہیں رہتی تھی۔ کبھی کبھار وہ
اپنے عزیزوں سے ملنے نیچے وادی میں چلی جاتی تھی۔ میں باہر آیا اور چوکیدار کو آواز دی مگر وہ بھی موجود
نہیں تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور دل جیسے کنپٹیوں پر بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ میں واپس پلٹا اور اندر آیا تو اچانک
ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو!'' میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک اجنبی اور کھرکھراتی ہوئی آواز اُبھری۔

''مسٹر نادر!'' لہجے میں استفسار تھا۔

''ہاں..... بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟''

''تمہاری ماں کا یار۔'' دوسری طرف سے انتہائی زہریلے لہجے میں کہا گیا اور اس لغو گوئی پر جیسے میرے سارے وجود کا لہو آنکھوں میں سمٹ آیا۔

''..... کی اولاد!..... تُو بھول رہا ہے، تیری ماں کا یار تو میں ہوں۔ تُو ہے کون کمینے انسان جوشِ غیظ میں مجھے مجبوراً اس کی سطح تک اترنا پڑا۔

''ہا..... ہا..... ہا..... میری تو ماں ہی نہیں ہے۔ خیر چھوڑو، تمہاری تو ہے نا۔'' دوسری جانب سے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''اچھا سنو، پولیس کو بالکل خبر نہ ہونے پائے کہ تمہاری خوبصورت اور حسین، پُرشباب مگر پکی عمر کی ماں ہمارے قبضے میں ہے۔ سمجھے۔''

''ذلیل!..... کتے!..... کمینے! مجھے اپنا نام بتا۔ تجھے پولیس نہیں، میں سبق سکھاؤں گا۔''

اس کی بہ دستور لغو بیانی اور گھٹیا گفتگو پر میرے اندر آتش فشاں ابلنے لگا۔

''ہاں، ہاں..... بتاتے ہیں۔ لیکن بس ہمارا ایک چھوٹا سا کام کر دو۔ غفورے کو چھوڑ دو۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''مجھے نہیں معلوم غفورا کہاں ہے؟''

''اپنی ماں کا تو معلوم ہے نا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟'' وہ پھر کمینے پن پر اترنے لگا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ بہ ہم میں نے اپنی خوں ناک کیفیات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''وہ پولیس کی قید سے فرار ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے وہ پولیس کی قید میں ہی تھا۔''

''مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو نادر علی خان!'' دوسری طرف سے اس نے دانت پیس کر غراتے ہوئے کہا۔ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں، غفورے کو کس نے اور کیوں پولیس کی حراست سے فرار کرایا ہے۔ اور یہ حقیقت تم بھی جانتے ہو اور تمہاری ماں بھی، کیا بتاؤں نام؟'' دوسری طرف سے طنزیہ کہا گیا۔ جواباً میں نے دانستہ خاموشی اختیار کی تو وہ دوبارہ بولا۔ ''اعظم خان نام ہے اس شخص کا۔ ویسے میں نے اسے بھی فون کر کے ہوشیار کر دیا ہے۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' میں نے کہا۔

''فضول باتوں میں وقت ضائع کرو گے تو غفورے کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ غفورے کی موت تم تینوں کے لئے کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ اگر غفورے کو کچھ ہو گیا سمجھو، میں تمہاری ماں کا وہ حشر کروں گا کہ اسے خود اپنے خوبصورت سے وجود سے گھن آنے لگے گی۔''

''کتے!..... بکواس بند کر اپنی۔ تُو نہیں جانتا کہ تُو نے کس کی ماں کو اغواء کرنے کی جرأت کی ہے۔ اگر تُو نے.....''

''بس، بس۔ گیدڑ بھبکیاں دینے سے بہتر ہے کہ کام کی بات کرو یا پھر میں فون بند کر رہا ہوں۔''

''بولو..... کیا چاہتے ہو؟'' بالآخر میں نے دانت بھینچ کر مجبوراً ذرا معقولیت کا مظاہرہ کیا۔

''غفورے کی واپسی۔ زندہ اور صحیح سلامت۔''

میں جانتا تھا کہ اب اس سے جھوٹ بولنا بے کار ہے۔ کیونکہ وہ اپنی معلومات کا رعب مجھ پر ڈال چکا تھا۔ اس سے بحث کرنے کا مطلب اپنی ماں کو مزید ذہنی کرب میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا۔ اور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے اس خبیث اور نطفۂ خنزیر کا پتہ بھی تو چلانا تھا، لہٰذا بولا۔

''غفورا تم کو مل جائے گا۔ مگر میری ماں.....''

''یہ ہوئی نا کام کی بات۔'' دوسری طرف سے تاؤ دلانے والی مسرت سے کہا گیا۔ ''اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والا معاملہ ہو گا۔''

''کب اور کہاں؟''

''یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم اعظم خان سے بات کر لو۔ اور جب میں دوبارہ فون کروں تو غفورے کی آواز سنوں گا۔ او کے، بائی!'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرا پورا وجود غصے کی آگ میں بری طرح سلگنے لگا۔ میں نے اپنی جلتی سلگتی کیفیات پر بہ مشکل قابو پایا، کریڈل دبا کر خان صاحب کے نمبر پنچ کرنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے ریسیور رکھا۔ جیب سے اپنا موبائل نکال لیا۔ اسکرین پر اعظم خان کا نمبر اُبھرا ہوا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ موبائل کان سے لگا کر کہا۔

''ہیلو انکل!'' میں نے دانستہ اتنا ہی کہا تو دوسری طرف سے ان کی مضطربانہ آواز اُبھری۔

''نادر بیٹے! تمہارے پاس..... کسی کا فون آیا تھا؟''

''ہاں..... ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''کون تھا وہ؟..... کیا کہہ رہا تھا؟''

میں نے جواباً انہیں ساری بات بتا دی۔

''تم ابھی گرین لاج میں ہی ہو نا؟''

''جی۔''

''میں آ رہا ہوں۔''

''کیا غفورے کو لے کر؟''

''نہیں، میں اکیلا آ رہا ہوں۔''

''نہیں انکل! اب غفورے کو ساتھ لانا ہو گا۔ میں نے اسی طریقے سے نمٹنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے غضب ناک انداز میں کہا۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ میں آ رہا ہوں۔'' انہوں نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

نصف گھنٹے بعد وہ میرے سامنے تھے۔

''انکل! اس نے کہا تھا کہ ذرا دیر بعد دوبارہ فون کروں گا اور..... اب میں صرف غفورے کی آواز سننا چاہتا ہوں۔'' میرے لہجے میں تشویش تھی۔

''آنے دو اس کا فون۔ میں خود بات کروں گا۔'' خان صاحب بولے۔

''انکل! وہ بڑا خبیث آدمی ہے۔ بڑے نازیبا الفاظ استعمال کر رہا تھا ماں کے بارے میں۔''

''ہوں.....'' اعظم خان نے ایک پُرسوچ ہنکارا بھرا مگر بولے کچھ نہیں۔

''انکل! ویسے غفورا زندہ تو ہے نا.....؟'' میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے ایک اندیشے کے تحت پوچھا۔

''بے فکر رہو۔ وہ زندہ ہے۔ دراصل میں اس سے ایک ''کمٹ منٹ'' کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں خود کلامی کے انداز میں بولے۔

''ویسے وہ ہے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے میں نے جہاں یرغمال بنا کر رکھا ہے، وہ جگہ یہاں سے بہت دور ہے۔''

''انکل! ایک بات بتائیں۔'' میں نے کسی خیال کے تحت ان سے کہا۔

''کہو!'' وہ استفسار طلب لہجے میں بولے۔

''آفٹر آل، غفورا آپ ہی کا آدمی تھا۔ کیا آپ اس کے دوسرے ساتھیوں کو یا اس کے ٹھکانے کو نہیں جانتے؟'' میں نے اپنے تئیں ایک اہم سوال پوچھا۔

وہ جواباً بولے۔ ''نادر بیٹے! غفورا میرا ہی آدمی تھا۔ وہ درحقیقت ایک فلم مافیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے کسی معروف اداکارہ کو بھی قتل کیا تھا مگر اس کے خلاف ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باعث وہ رہا کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ اس میں میری کوششوں کا بھی دخل تھا۔ اس اداکارہ کا نام سپنا تھا۔ رہی بات اس کے دیگر ساتھیوں اور اس کے ٹھکانے کی تو میں صرف اسے فلم پروڈیوسر اشفاق شاہین کے ساتھ ہی دیکھا کرتا تھا۔ لیکن میرا انہیں خیال تھا کہ یہ حرکت اس فلم پروڈیوسر اشفاق شاہین کی ہو سکتی ہے۔''

وہ اتنی ہی صراحت کرنے کے بعد خاموش ہوئے تو میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ ''کیا اس فلم پروڈیوسر اشفاق شاہین کا تعلق بھی فلم مافیا سے ہے؟''

''شاید.........'' وہ بولے۔ مگر پھر جیسے میرے سوال کا مطلب سمجھ کر دوبارہ بولے۔ ''ویسے یہ عین ممکن ہے کہ اس کا تعلق فلم مافیا سے بھی ہو۔''

میں جیسے اس جواب کا منتظر تھا، لہٰذا فوراً ہی بول اٹھا۔ ''انکل! پھر تو مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ یہ حرکت غفورے کے اس گرو گھنٹال پروڈیوسر اشفاق شاہین کی ہی ہو سکتی ہے۔ ہمیں اسے ٹریس کر کے ٹریپ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔''

میری تجویز پر وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن پھر فوراً میں نے خود اپنی ہی تجویز رد کر دی اور خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ لیکن نہیں.........اس طرح تو وقت ضائع ہو گا اور یہ بات بھی حتمی نہیں کہ ماں اس کی قید میں ہو سکتی ہے۔ یہ بات اغواء کنندگان کو طیش دلانے کے مترادف ہو گی۔''

یہ کہہ کر میں نے اپنے ذہن میں پہلے پہل اُبھرنے والے منصوبے کے بارے میں غور کیا جس کا ابھی میں نے ان سے ذکر بھی کیا تھا

''انکل! ان نامعلوم اغواء کنندگان سے نمٹنے کا ایک یہی طریقہ کارگر ہو سکتا ہے کہ سرِ دست ان کی بات مان لی جائے۔ پہلے غفورے سے ان کی بات کرا دی جائے، اس کے بعد سیدھے سیدھے ان سے اس ہاتھ لے اور اس ہاتھ دے والا سودا کریں۔ اس دوران وہ جو کوئی بھی ہو گا، ہمارے سامنے آ جائے گا اور پھر اس پر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش بھی کروں گا۔''

''مگر نادر بیٹے! اس میں خطرہ بہت زیادہ ہو گا۔ تم اس سے نمٹو گے یا اپنی ماں شبینہ کو بچاؤ گے؟ اور پھر ہماری ناکامی کی صورت میں غفورا بھی ہاتھ سے نکل جائے گا اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اگر غفورا ہاتھ سے نکل گیا تو.........''

''انکل! مجھے اس وقت اپنی ماں کی جان پیاری ہے اور بس.........میں کسی اگر مگر میں نہیں پڑ سکتا۔'' میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ''ماں جس کمینے کی قید میں ہے، اس کے خباثت بھرے لہجے اور کمینگی نے مجھے اندر سے لرزا کر رکھ دیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر غفورے کو میرے حوالے کر دیں، میں خود ان لوگوں سے نمٹوں گا۔''


Courtesy www.pdfbooksfree.pk


''مجھے تم، تمہارے حوصلے اور بہادری پر پورا یقین ہے۔'' وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ ''لیکن ھیان رہے کہ تمہاری کوشش یہی ہو کہ غفورا بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔''

''آپ کو آخر اس کی فکر کیوں کھائے جا رہی ہے انکل! جاتا ہے تو جائے جہنم میں۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا؟''

میری بات پر انکل اعظم خان یوں حیرت سے میرا چہرہ تکنے لگے جیسے میں نے کوئی چگانہ بات کہہ ڈالی ہو۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو نادر بیٹے!'' ہ حیرت سے بولے۔ ''تم تو اچھی طرح جانتے ہو، وہ آزاد ہوتے ہی پولیس کی گرفت میں بھی جا سکتا ہے اور اس کا پولیس کی گرفت میں جانے کا مطلب اپنے دیرینہ دشمنوں شاہ میر اور نظر حیات کو اپنے خلاف ہتھیار دینا ہو گا۔ مجھے اپنی فکر تو نہیں لیکن تمہاری ماں شبینہ اور تمہارے لئے اچھا نہ ہو گا۔''

''انکل! یہ بعد کی باتیں ہیں.........غفورا اتنا تر نوالہ نہیں ثابت ہو سکتا۔'' میں نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ خود ایک بہت بڑا گینگسٹر ہے۔ پولیس کے ہتھے اتنی آسانی سے نہیں چڑھ سکتا۔''

میری بات پر انکل اعظم نے ایک طویل سانس خارج کی، پھر اٹھتے ہوئے بولے۔ ''ٹھیک ہے پھر۔ میں کسی طرح غفورے کو یہاں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا مگر جواباً خاموش ہی رہا۔ انکل اعظم خان رخصت ہو گئے۔

میرا دل بری طرح بے چین تھا۔ نامساعد حالات کے تھپیڑے اس تواتر کے ساتھ مجھے اپنی زد میں لئے ہوئے تھے کہ میرا دل و دماغ گنجلک ہو کر رہ گیا تھا۔

کہاں تو میں نگینہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے بے چین ہو رہا تھا کہ ماں ہم دونوں کی شادی پر رضامند ہو چکی ہے، ماں کے اندر کی برف پگھلنے لگی تھی۔ یہ تقدیر کی طرفہ کاری ہی تھی کہ حالات مجھے ایک جگہ ٹکنے نہیں دے رہے تھے۔ میں اس نامعلوم شخص کے فون کا منتظر تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اتنی دیر میں انکل اعظم خان غفورے کو یہاں لے آئیں۔

پھر وہ تو نہ آئے البتہ ذرا ہی دیر میں ان کا فون آ گیا۔ ''نادر بیٹے! میرا غفورے کو لانا مناسب نہیں ہے۔ تم ایسا کرو، اس نامعلوم شخص کا فون آئے تو اسے میرا موبائل نمبر دے دینا۔ میں غفورے سے اس کی ات کرا دوں گا اور معاملہ بھی طے کر کے تمہیں بتا دوں گا۔ مجھے پولیس کے مخبروں کا خدشہ ہے۔''

مجھے ان کی بات مناسب لگی۔ میں فون کا انتظار کرتا رہا لیکن فون نہ آیا۔ میں اونگھتا، سر جھٹکتا ہوا بالآخر دگیا۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی۔ میں ڈرائنگ روم میں ہی صوفے پر سو گیا تھا۔ مجھے بعد میں سکینہ نے ا جگایا تھا۔ بہ قول اس کے وہ کل شام اپنے کسی بیمار عزیز کی مزاج پرسی کرنے نیچے وادی میں گئی تھی بلکہ چوکیدار بابا نے صبح ہی سے چھٹی لے رکھی تھی۔ میں نے انہیں ماں کے اغواء کے بارے میں کچھ یں بتایا تھا۔

میں نے ان سے کسی کے فون وغیرہ کے آنے کا دریافت کیا تھا مگر ان کا جواب نفی میں تھا۔ میں نے ں وغیرہ کیا اور ٹال فون کر کے منیجر مشتاق سے بات کی۔

''میں آج ٹال نہیں آ سکوں گا۔ تم سنبھال لینا۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں ہوں نا.........جی کڑا کے۔'' اس کی مخصوص آواز ابھری۔ اس سے پہلے ل وہ طویل گفتگو کرے، میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



میں اس وقت ماں کی وجہ سے سخت پریشان ہو رہا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ماں ایک کمینے شخص کی میں تھی۔ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ یہ نگینہ کی کال تھی۔

''ہیلو نادر! کیسے ہو؟'' اس کی مترنم آواز اُبھری۔ میرے دل میں یاس زدہ ہوک اُٹھی۔ کاش اسے خوشخبری سنا سکتا۔ تاہم بولا۔

''خیریت نہیں ہے نگینہ!''

''کیوں؟..... کیا ہوا؟..... تم..... ٹھیک..... تو ہو نا؟'' اس کے لہجے میں ایکا پریشانی در آئی۔

''ماں کو چند نامعلوم افراد نے اغواء کر لیا ہے۔'' بالآخر میں نے بتایا۔

''اوہ گاڈ..... کب؟..... کیسے؟'' وہ بری طرح پریشان ہو گئی۔

''یہ ابھی میں نہیں جانتا۔ شاید کوئی اغواء برائے تاوان کا معاملہ ہو گا۔'' میں نے اصل حقیقت چھ بات بنائی تو اس نے پوچھا۔

''کیا انہوں نے اب تک رابطہ نہیں کیا؟''

''کیا تھا۔''

''کیا کہا پھر..... کوئی مطالبہ پیش کیا؟''

''نہیں، ابھی اطلاع دی ہے اور دوسرے فون کا انتظار کرنے کو کہا۔''

دوسری طرف چند ثانیے پُرسوچ خاموشی چھائی رہی، پھر نگینہ کی آواز اُبھری۔ ''نادر! ایک بات کہ برا تو نہیں مناؤ گے؟''

''نہیں..... بھلا میں تمہاری بات کا برا کیسے منا سکتا ہوں؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اگر تم کہو تو میں پپا سے اس سلسلے میں مدد لوں؟'' اس نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔ مجھے واقعی کی یہ بات انتہائی ناگوار گزری۔ تاہم میں نے ہموار لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں نگینہ! یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں اپنے باپ کے قاتل اور اپنے دیرینہ دشمن سے مدد کی مانگوں گا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے معتدل لہجے میں زہر کی کاٹ اُبھر آئی تھی۔

''اچھا..... جیسے تمہاری مرضی۔''

''اپنے باپ سے بھول کر بھی اس کا ذکر نہ کرنا۔'' میں نے لمحہ بھر توقف کے بعد اسے تنبیہہ کی۔

''اچھا ٹھیک ہے..... مگر کم از کم..... پولیس سے ہی مدد لے لو۔'' وہ بولی۔

''اس سے معاملہ مزید خراب ہو جائے گا اور ماں کی جان کو الگ خطرہ لاحق ہو گا۔'' میں نے ''میں خود اس معاملے سے نمٹوں گا۔''

''اللہ کرے ماں جی خیریت سے ہوں۔'' وہ دعائیہ لہجے میں بولی۔ مجھے اس کا یہ انداز پسند آیا۔ توقف کے بعد وہ دوبارہ بولی۔ ''تم سے ایک بات کہنا تھی۔ مگر تم خود ہی پریشان ہو۔''

''نہیں..... کہو، کیا بات ہے؟ یہ پریشانیاں تو اب شاید ہم ماں بیٹے کا مقدر بن چکی ہیں۔'' نے کہا۔

''نادر! نظر حیات اپنے بیٹے کبیر کے سلسلے میں ہمارے ہاں آتے رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے کبیر بارے میں پوچھتے ہیں۔ میں انہیں کیا جواب دوں؟''

مجھے نگینہ کے یوں مشورہ لینے کا انداز پسند آیا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ وہ میری مرضی کے خلاف کوئی



نہیں اٹھاتی تھی۔

''تم نے اب تک انہیں کیا بتایا؟'' جواب دینے کے بجائے الٹا میں نے اس سے سوال کیا۔

''یہی..... کہ..... میں کچھ نہیں جانتی۔''

''گڈ! تم اس بیان پر قائم رہنا۔''

''لیکن..... نادر! نظر حیات کو اس بات کا بھی پورا یقین ہے کہ میں کبیر کے متعلق جانتی ہوں کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔'' وہ بولی۔

اچانک میرے ذہن میں اپنے دونوں مہا دشمنوں کو آپس میں لڑانے کا شاطرانہ منصوبہ اُبھرا، لہٰذا بولا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ کیا تم نے اپنے باپ کو اب تک ساری حقیقت بتائی ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر تم ایک کام کرو۔'' میں نے کہا۔ ''اپنے باپ شاہ میر کو ان کے یار نظر حیات کے بیٹے کے بارے میں صاف صاف بتا دو کہ اس نے کس طرح کالا ناگ کے ساتھ مل کر تمہارے خلاف سازش کی تھی، جس میں تمہاری جان کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔''

''نہیں..... ابھی تو میں نے انہیں یہ بات نہیں بتائی۔'' وہ بولی۔

''یہ تمہاری بھیانک غلطی ہے۔ تمہیں اپنے باپ کو کبیر کی تمہارے خلاف سازشوں کے بارے میں آگاہ کر دینا چاہئے۔''

''لیکن نادر! یہ بھی تو سوچو، اس طرح کیلاش والی مہم آشکار ہو جائے گی اور انہیں کبیر کے بارے میں بھی علم ہو جائے گا کہ وہ کہاں ہے؟''

''یہ ساری باتیں تم اپنے باپ کو اعتماد میں لے کر بتا سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔

''میں نے کہا نا، کہ انہیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' وہ اپنی پہلی بات دہراتے ہوئے بولی۔ ''پپا میری بات کا بالکل اعتبار نہیں کریں گے نادر! میرے ساتھ تمہارے جیسا معاملہ ہے۔ جس طرح ماں جی کو میرے حوالے سے تم پر بعض باتوں کا یقین نہیں آتا، اس طرح میرے پپا بھی اپنے دوست نظر حیات کے بیٹے کبیر کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے۔ تم نہیں جانتے ہو نادر! کہ پپا اور نظر حیات کے درمیان کس قدر گہری اور پرانی دوستی ہے۔ بلکہ پپا تو اس دوستی کو مزید مضبوط بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اشاروں کنایوں میں مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ میں کبیر کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ آگے تم سمجھ جاؤ۔ مگر وہ مجھ پر کسی قسم کا دباؤ اب نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ درمیان میں تمہاری پوزیشن اور ان کے گھناؤنے جرم نے انہیں مجھ سے کافی حد تک خفیف کر رکھا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ اسی وقت ٹیلی فون کی بیل چیخ اُٹھی۔ میں چونکا اور نگینہ سے بولا۔

''ایک فون آیا ہے، میں تم سے بات کرتا ہوں۔ ٹھیک ہے۔''

''اوکے، خدا حافظ!'' نگینہ نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے موبائل فون آف کر کے جلدی سے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ اس اغواء کنندہ کا فون ہو گا۔ مگر دوسری جانب سے انکل اعظم خان کی آواز پر میں چونک اٹھا۔

''ناور بیٹے! اس کا فون تو نہیں آیا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں انکل! میں خود بے چینی سے فون کا منتظر ہوں۔''

''مجھے فون کیا تھا اس نے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''پھر.....کیا کہا اس کمینے نے؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''میں نے غفورے سے اس کی بات کرادی تھی۔ وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ باقی معاملات میں نے طے کر لئے ہیں۔ اب ہمیں غفورے کو ساتھ لینا ہوگا۔'' وہ تفصیل بتانے لگے۔ میں نے بے چینی سے درمیان میں کہا۔

''انکل! انہوں نے کب اور کہاں آنے کا کہا؟''

''لالہ زار سنگم پر پرانے ریسٹ ہاؤس کا پتہ بتا دیا ہے۔'' لالہ زار کے علاقے سے میں واقف تھا۔ یہ ڈونگا گلی اور نتھیا گلی کے درمیان میں واقع تھا۔ جبکہ یہاں سے لالہ زار کا جنگلاتی علاقہ بہ مشکل اڑھائی کلومیٹر فاصلے پر تھا۔ ''انہوں نے آج رات ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان کا وقت دیا ہے۔'' انکل اعظم خان نے وقت بتایا۔

''ٹھیک ہے انکل! آپ نے ان سے ڈن کر لیا؟'' میں نے فرطِ جوش سے تیز ہوتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں.....لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولے۔

''کون سی بات؟''

''وہ بضد ہیں کہ غفورے کو تم ہی لے کر آؤ۔ حالانکہ میں نے خود یہ قدم اٹھانے کا سوچ رکھا تھا۔''

''نہیں انکل! آپ کا غفورے جیسے اشتہاری مجرم کے ساتھ جا کر یہ ڈیل کرنا یوں بھی مناسب نہ ہو گا۔ انہوں نے میرا انتخاب کر کے گویا اپنی موت کا انتخاب خود کیا ہے۔'' میں آخر میں دانت پیس کر بولا۔

''تو ٹھیک ہے .....تم آج شام ہی آ جاؤ میرے پاس۔'' وہ بولے اور رابطہ منقطع کر دیا۔ میری کنپٹیاں جوشِ غیظ سے سنسنانے لگیں۔ شام اور پھر رات تک کا انتظار مجھ سے نہیں ہو پا رہا تھا۔

غفورے اور اغواء کنندگان کا یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس میں مجھے اپنے دونوں دیرینہ دشمنوں شاہ میر اور نظرِ حیات کی شمولیت کا شبہ نہیں ہو رہا تھا۔ یہ ساری کارروائی غفورے کے اپنے ساتھیوں کی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے غفورا یقیناً طویل عرصے تک اپنے انہی ساتھیوں کے پاس پناہ گزین رہا ہوگا۔

وقت گزاری کے لئے میں اخبار منگوا کر اس کا مطالعہ کرنے لگا تو اچانک ایک خبر پر میں بری طرح ٹھٹکا۔ یہ خبر مسٹر جواد کے بارے میں تھی۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔

اخبار میں رات والے واقعے کی تفصیلی خبر شائع ہوئی تھی، جب میں بھی وہاں موجود تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ بہ غور اس سنسنی خیز خبر کی تفصیلات پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ تفصیل پڑھنے کے بعد میں بے اختیار ایک گہری ہنکاری بھر کر رہ گیا تھا۔

سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا جو مسز غزالہ نے کہا تھا۔ اس نے پولیس کو یہی روایتی سا بیان دیا تھا کہ وہ نامعلوم نقاب پوش چوری کی غرض سے ان کے بنگلے میں داخل ہوا لیکن مقتول جواد کی عین موقع پر آنکھ کھل گئی۔ وہ معذور تھا مگر اپنے تکیے کے نیچے پستول رکھتا تھا۔ اس نے پستول نکالنے کی کوشش کی مگر بدقسمتی سے قاتل کو اس پر خنجر سے وار کرنے کا موقع مل گیا۔ پھر اس نے میدان صاف پا کر غزالہ کی عزت پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی تو مزاحمت کے دوران کسی طرح اس نقاب پوش کا پستول غزالہ کے ہاتھ لگ گیا اور یوں اس نے اپنے دفاع میں اسے بھی ہلاک کر ڈالا۔ تاہم پولیس کی تفتیش جاری تھی اور ابھی بہت سے سوالات جواب طلب تھے اور پولیس نے مسز جواد کو گرفتار کر لیا، وغیرہ۔

میں نے اس عجیب و غریب اور پراسرار معاملے پر ایک اور لعنت بھیج کر اخبار ایک طرف پھینک دیا۔



میں اس وقت اپنے مسئلے کی طرف الجھا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے زیادہ توجہ نہ دی۔

شام ہوئی تو میں جیپ میں انکل اعظم خان کی طرف روانہ ہو گیا۔ پندرہ منٹ بعد میں ان کے پاس تھا۔ انکل خان میرے ہی منتظر تھے۔

انکل خان بھی میرے ساتھ جانا چاہتے تھے مگر میں نے منع کر دیا۔

''انکل! آپ صرف یہاں بیٹھ کر میری کامیابی کے لئے دعا کریں اور وزیر خان کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ میں وہاں سے غفورے کو اپنی جیپ میں لے کر اغواء کنندگان کے پاس جاؤں گا، تنہا۔ وزیر خان کو راستے سے لوٹا دوں گا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''تمہارا اکیلے جانا مناسب نہ ہوگا۔ میں بھی ساتھ چلوں گا۔'' انکل خان بولے۔

''نہیں انکل! آپ کا جانا مناسب نہ ہوگا۔ میں خود ان سے نمٹ لوں گا۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔ ''وزیر خان کو ہی لے جاؤ۔''

''اس کی بھی ضرورت نہیں۔ میں تن تنہا یہ کام بہ حسن و خوبی انجام دوں گا۔ یہ معاملہ نازک ہے، زیادہ بھیڑ بھاڑ مناسب نہ ہوگی۔''

''کیا تم غفورے کو ان کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟'' انہوں نے بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''یہ حالات پر منحصر ہے۔ ماں کی جان کو خطرہ ہوا تو مجھے غفورے کو ان کے حوالے کرنا پڑے گا۔'' میں نے گہری متانت سے کہا۔ وہ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولے۔ ''ٹھیک ہے ..... جیسے تم مناسب سمجھو۔ مگر اپنا خیال رکھنا بیٹا! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

اغواء کنندگان نے مجھے آج رات غفورے کو لے کر لالہ زار سنگم پر ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان آنے کی تاکید کی۔

رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب میں وزیر خان کے ساتھ جیپ میں انکل خان کی رہائش سے نکلا۔ غفورے کو یہاں سے دور جس جگہ یرغمال بنا کر رکھا تھا، وہ آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ وزیر خان کی نشاندہی پر ہم وہاں پہنچے۔

یہ ایک چھوٹا سا خوب صورت کاٹیج تھا۔ بلکہ اریب قریب میں ایسے کئی کاٹیجز بنے ہوئے تھے، جن کا مقصد سیاحوں کو اس پُرفضا مقام پر آرام اور پُرسکون رہائش فراہم کرنا تھا۔

میں نے مذکورہ کاٹیج کے سامنے جیپ روک دی۔ جب ہم دونوں نیچے اتر آئے، کاٹیج میں ملازموں کے عقب میں دو عدد مسلح افراد موجود تھے۔

وزیر خان نے ان سے کچھ کہا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیئے۔ غالباً انکل خان بھی انہیں میری آمد کے مقصد سے آگاہ کر چکے تھے۔ غفورے کو رسن بستہ میرے سامنے پیش کیا گیا۔ میں نے بہ غور اچھی طرح سیکڑ کر غفورے کا جائزہ لیا۔ وہ دبلے کی طرح پلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر ذرا بھی پریشانی یا خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے البتہ دونوں ٹانگیں آزاد تھیں۔ وہ بھی میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے رسٹ واچ پر وقت دیکھا۔

میرے پاس آدھا گھنٹہ باقی بچا تھا۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر غفورے کو ساتھ لیا اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے سوار کرایا۔ اس کے بعد خود بھی جلدی سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

دوئم

ذرا دیر بعد میری جیپ طوفانی رفتار سے لالہ زار سنگم کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔

❄ ❄ ❄

اغواء کنندگان نے جس دھڑلے سے مجھے ''اس ہاتھ لے، اس ہاتھ دے'' کی ڈیل کے لئے بلا
اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ غفورے کا پولیس کے نرغے میں جانا ہم دونوں کے لئے ہی مناسب نہ
بہرطور، میں مقدور بھر کیل کانٹوں سے لیس مہم سفر تھا۔

میری جیپ نتھیا گلی اور ڈونگا گلی کے درمیان سے گزرنے والی سڑک پر خاصی تیز رفتاری کے س
دوڑی چلی جا رہی تھی۔ ہر سُو سناٹے اور تاریکی کا راج تھا۔ سڑک کے دو رویہ دیودار کے درختوں
قطاریں تھیں۔ دن کی روشنی میں یہ علاقہ بہت زیادہ خوب صورت اور سرسبز تھا۔ یہاں سرسبز ڈھلوانوں
ہزاروں رنگ برنگے جنگلی پھول اپنی بہار دکھا رہے ہوتے ہیں۔

دو کلومیٹر تک سفر کے بعد سوا ایک بجے میری جیپ لالہ زار کی حدود میں داخل ہو گئی۔ غفورا خا
کے ساتھ میری برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

لالہ زار کے دائیں بائیں بیس بیس گز کے فاصلے پر لگے لیمپ پوسٹ کی روشنی میں سبزہ زارو
چوبی بنچیں اور لوہے کے سائبان، تنہائی کے طلب گار سیاحوں کے لئے مخصوص نظر آ رہے تھے۔

انکل خان کی زبانی اغواء کنندگان نے مجھے جس پرانے ریسٹ ہاؤس پر پہنچنے کی تاکید کی تھی، و
سبزہ زار کی ایک ذیلی سڑک کے ساتھ واقع تھا۔

انکل خان نے مجھے اس کا پتہ تفصیلی سمجھا دیا تھا۔ یوں بھی یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ ا
میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے جیپ آہستہ کر لی۔ موبائل کی اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر اُ
تھا۔

''ہیلو.....!'' میں نے کہا تو دوسری طرف سے اسی کمینے شخص کی آواز اُبھری۔

''تم پہنچ گئے..... گڈ! جیپ فوراً روک دو اور اپنے دائیں جانب جو سائبان نظر آ رہا ہے
غفورے کو لے کر خاموشی سے بینچ پر بیٹھ جاؤ۔''

اس کی آواز سن کر جوشِ غیظ سے میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ اس کی گفتگو سے میں
اندازہ لگا لیا کہ وہ کہیں قریب ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھات لگائے چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے ا
میں جواب دے کر جیپ سبزہ زار پر چڑھا دی۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ جیپ روکنے کے بعد میں نے اپنی جیب سے میگا
لیا۔ ایک عدد شکاری خنجر بھی میرے دائیں ہاتھ کی آستین کے اندر پوشیدہ تھا۔ میں نے میگارد کی مہیب
غفورے کی کنپٹی سے لگا دی اور اسے لے کر جیپ سے نیچے اُتر گیا اور چند ثانیے رک کر جیپ کی آ
گرد و پیش میں نظریں دوڑانے لگا۔ اس کے بعد ایک چوبی بینچ کا انتخاب کر کے اس پر براجمان ہو
میرے آس پاس لیمپ پوسٹ کی دودھیا لائٹیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے وہاں بیٹھنے کی
اچانک میرے دائیں بائیں جانب سے پانچ چھ کے قریب مسلح افراد نمودار ہوئے۔ ان سب کے ہا
سیاہ رنگ کے پستول چمک رہے تھے۔ میں بہ غور ایک ایک کا جائزہ لے رہا تھا۔

یہ سب تیسرے درجے کے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے جنہیں عرفِ عام میں ''کھڑتال گ
کہا جاتا تھا۔ ان میں جو نسبتاً چھریری قامت اور دراز قد کا گورا چٹا مگر لمبوترے چہرے والا شخص
مجھے ان کا گروپ لیڈر محسوس ہوا تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوئم

اس کے ہونٹ بھی پتلے پتلے اور عجیب وضع کے تھے۔ اس کی زردی مائل آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ گلے میں چین جھول رہی تھی۔ اپنے دُبلے پتلے مگر دراز جسم پر سستا سا جیسٹر چڑھا رکھا تھا۔ اس کے باقی ساتھی تنومند تھے۔ وہ چست ٹی شرٹ اور پینٹ پر سیاہ اور براؤن رنگ کی لیدر جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان سب کی خونخوار نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کا انداز کسی پرانی گھسی پٹی پنجابی فلم کے بدمعاشوں کا سا تھا۔

''غفورے کو چھوڑ دو۔'' اس چھریری قامت اور زردی مائل گورے چٹے شخص نے چند ثانیے مجھے استہزائیہ نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد درشت لہجے میں حکم دیا اور اس کی آواز پہچان کر میرا وجود ایک زبردست جوار بھاٹے کی زد میں آنے لگا۔ یہ وہی کمینہ شخص تھا جس نے فون پر مجھ سے رابطہ کرتے ہوئے میری ماں کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے اور غفورے کو یہاں لانے کا حکم دیا تھا۔

اب میری نظریں اس چھپکلی نما شخص پر خنجر کی طرح پیوست ہو گئی تھیں۔ میں نے بہ مشکل اپنے اندر کے ابال پر قابو پایا اور بدستور اسے غضب ناک نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

''میری ماں کہاں ہے؟''

میرے سوال پر اس چھپکلی نما شخص کے باریک ہونٹوں پر بڑی کمینی مسکراہٹ اُبھری اور وہ بولا۔

''بے فکر رہو۔ وہ خوب صورت عورت.....''

''حرامی کی اولاد! اپنی زبان کو لگام دے اور مطلب کی بات کر۔'' ایک تھرڈ ڈگری کے بدمعاش گروپ لیڈر کے منہ سے اپنی ماں کے بارے میں اغو بیانی نے ایکا ایکی میرے لہجے کو آتش فشاں بنا دیا تھا۔

میرے گالی دینے پر وہ سنسناتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے غفورے کی گردن کے گرد اپنے بازو کا شکنجہ کس رکھا تھا۔ اسے اپنی ڈھال بناتے ہوئے اس کی کنپٹی سے میگارد کی نال لگا رکھی تھی اور ساتھ ہی ان پانچوں کو اپنی نظروں کے ٹارگٹ پر رکھنے کی غرض سے اپنی پوزیشن بھی بدل لی تھی۔

اس چھپکلی نما شخص نے چند قدم میری جانب بڑھائے۔ اس کی یک ٹک گھورتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر جیسے ثبت ہو کر رہ گئیں۔ وہ رک کر سرسراتے لہجے میں بولا۔

''تمہاری ماں ادھر ہی ہے۔ پہلے غفورے کو ہمارے حوالے کر دو۔''

''نہیں ..... پہلے میری ماں کو میرے سامنے پیش کرو۔'' میں نے بھی اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

''پہلے ہمیں یہ تسلی ہو جائے کہ تم اپنے ساتھ کسی اور کو نہیں لائے ہو تو ہم تمہاری ماں کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔''

''تم تسلی کر سکتے ہو۔ میں تنہا ہی آیا ہوں۔'' اس کے معتدل لہجے پر میں نے بھی ہموار لہجے میں کہا تو اس نے چند ثانیے پُرسوچ خاموشی کے بعد اپنے دو ساتھیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ وہ دونوں الٹے قدموں واپس پلٹ گئے۔ باقی دو اس کے ساتھ کھڑے رہ گئے۔ وہ ان سے تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''تم دونوں آس پاس کا جائزہ لے کر آؤ۔ کہیں یہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہ لایا ہو۔'' اس کے حکم پر باقی دونوں بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اب وہ تنہا کھڑا تھا۔ سیاہ پستول ہنوز اس کے دائیں ہاتھ میں چمک رہا تھا اور وہ جھکا ہوا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پل کے پل میں اندازہ لگا چکا تھا کہ میں تھوڑی سی محنت کے بعد اس ''کھڑتالی'' گروپ پر قابو پا سکتا ہوں۔ لیکن ابھی مجھے ماں کے سامنے آنے کا شدید بے چینی سے انتظار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



تھا۔ ماحول پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ذرا دیر بعد اس کے پہلے والے ساتھی نمودار ہوئے۔ انہوں نے میرا ماں کو دونوں بازوؤں سے دبوچ رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف بندھے ہوئے تھے گ چہرے سے پریشانی کا ذرا بھی اظہار نہ ہوتا تھا۔ البتہ اس کی جگہ غصے اور طیش کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔

ماں کو دیکھ کر میرے جوشِ غیظ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میرا جی چاہا ان سب کو اسی وقت گولیوں سے بھون کر رکھ دوں۔ مگر اس وقت ان تیسرے درجے کے بدمعاشوں کی مثال ایسے گیدڑوں کی سی تھی ایک شیر کو غول کی صورت میں گھیر لیتے ہیں۔ میں نے ایک بات محسوس کی تھی کہ جن دو بدمعاشوں نے ماں کو دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا، ان کے ہاتھوں میں اب پستول نظر نہیں آ رہے تھے۔ جبکہ باقی ساتھی ہنوز اپنے چھپکلی مارکہ گروپ لیڈر کے حکم پر آس پاس کا جائزہ لینے گئے ہوئے تھے۔ میں نے ا تہیہ کر لیا تھا کہ غفورے کو ان کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔

''تم غفورے کے ہاتھوں کی رسّی کھولو گے اور میں تمہاری ماں کو رسیوں سے آزاد کروں گا۔'' چھپکلی مارکہ بدمعاش بولا۔ ''دونوں ایک ساتھ آگے بڑھیں گے۔''

''ٹھیک ہے.......... مجھے منظور ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر ہم دونوں اپنے اپنے یرغمالیوں کے ہاتھو کی رسیاں کھولنے لگے۔ اس کے بعد انہیں آزاد کر دیا گیا۔ ادھر غفورے نے اپنے ساتھیوں کی جانب ایک قدم بڑھایا اور ادھر ماں نے بھی میری طرف ایک قدم اٹھایا۔

میرے پستول کی نال اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے غفورے کی پشت کی سمت اُٹھی تھی۔ ا طرح چھپکلی مارکہ بدمعاش نے ماں پر پستول تان رکھا تھا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی

پھر جب غفورا اور ماں دھیرے دھیرے ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے درمیان میں پہنچ کر ایک دوسرے کے بالکل قریب سے گزرنے لگے تو اچانک دم بہ خود سناٹے میں کہیں قریب ہی گولی چلنے آواز اُبھری۔ گولی چلنے کی یہ آواز اس سمت سے آئی تھی جس طرف چھپکلی مارکہ بدمعاش کے وہ دونو ساتھی غائب ہوئے تھے۔ ہم بری طرح ٹھٹک گئے۔ غفورا اور ماں کے بڑھتے ہوئے قدم یکلخت رک گئے۔ چھپکلی مارکہ بدمعاش اور اس کے دونوں نہتے ساتھیوں نے چونک کر غیر ارادی طور پر مذکورہ سمت طرف دیکھا تو میں نے بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھپکلی مارکہ بدمعاش پر گولی چلا دی جو اس گردن کے آر پار ہو گئی۔ وہ گھٹی گھٹی کراہ آمیز چیخ کے ساتھ سبزے پر گرا۔ وہاں موجود اس کے دونو ساتھیوں نے پھرتی سے اپنے پستول نکالنے کی کوشش کرنی چاہی تو میں اپنی پستول کا رخ ان کی طرف کے حلق کے بل دھاڑا۔

''خبردار!.......... کوئی حرکت مت کرنا۔ اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لو.......... جلدی۔'' یہی درشت میں نے غفورے کو بھی دیا تھا۔ وہ وہیں جم گیا اور اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔ ماں نے لپک کر ز بوس چھپکلی مارکہ بدمعاش کے گھاس پر گرے پستول کو اٹھا لیا۔

اسی وقت مجھے اپنے داہنی جانب دو گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔

''ماں بھاگو۔'' کسی انجانے اور ممکنہ خطرے کی بُو محسوس کر کے میں زور سے چلّایا۔ اور پھر ہم دونو ماں بیٹا ایک جانب تیزی کے ساتھ دوڑتے چلے گئے۔ بھاری بھرکم گاڑیوں کے انجن کی مخصوص گھر گھرا لمحہ بہ لمحہ ہمارے قریب آتی آتی جا رہی تھی۔ اچانک بدلتی ہوئی انجانی خطرناک صورتِ حال میں ہم غفورے کا بھی خیال نہ رہا تھا۔

میں اور ماں اب دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے تاریکی میں پراسرار ہیولوں کی طرح اپنے



درختوں کے درمیان بے تحاشا دوڑ رہے تھے۔

دونوں گاڑیاں غراتی ہوئی ہمارے تعاقب میں دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ ہم دونوں ماں بیٹا گاڑیوں کی تیز روشنی کی زد میں تھے۔ اچانک عقب میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔

گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی۔ میں نے ماں کا ہاتھ تھاما اور سوچے سمجھے بغیر دائیں جانب مڑ گیا۔ اس میں پھرتی کا کوئی دخل نہ تھا۔ ہمیں یا تو اتفاقاً کوئی گولی نہیں لگی تھی یا پھر وہ فائرنگ جیسے محض ہمیں خوف زدہ کرنے کے لئے کی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دوسری صورت زیادہ قرینِ قیاس تھی۔ کیونکہ بیک وقت اتنی ساری گولیوں کے چلنے پر ہمارا زد میں نہ آنا ''اتفاق'' نہیں ہو سکتا تھا۔

میں ماں کا ہاتھ پکڑے جس سمت کو مڑا تھا، وہاں چیڑ کے درختوں کی بہتات تھی۔ لیکن بیک وقت دو گاڑیوں کے تعاقب سے ہم کب تک خود کو بچا سکتے تھے؟ اس کی امید کم ہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ دونوں گاڑیاں لمحوں میں دندناتی ہوئی ہمارے بالکل قریب پہنچ گئیں۔ ہمارے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ میں نے دیکھا، وہ ایک سنگل ڈور پجیرو تھی اور دوسری سرخ رنگ کی انٹرکولر تھی۔ وہ دونوں ہمارے دائیں بائیں گویا عین سر پر پہنچ کر رک گئی تھیں اور ان میں سے چار پانچ مسلح افراد چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے اُتر آئے تھے۔ میری اور ماں کی سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ ہمارے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ تھا۔ پھر دفعتہً میری آنکھوں نے چونکا دینے والا منظر دیکھا۔

شاہ میر اور نظر حیات، میرے باپ قادر خان کے قاتل اور میری ماں کو دربدر کرنے والا خطرناک ناگوں کا ٹولا وہاں موجود تھا۔

''خبردار! حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا نادر علی خان!'' نظر حیات نے مجھے چوکنا نظروں سے گھورتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ''ہمارے ساتھی ذرا بدلحاظ واقع ہوئے ہیں۔ کیوں شاہ میر؟'' اس نے آخر میں اپنے حلیف شاہ میر سے بھی تائید چاہی تھی۔

''بالکل نادر علی خان! بالکل۔ نظر حیات ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' جواباً شاہ میر نے بھی اپنے ساتھی کی تائید میں گویا لطف اندوز ہوتے ہوئے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔

دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آ رہے تھے۔ ان کے پانچ چھ کے قریب مسلح ساتھی اپنی گنوں کا رخ ہماری جانب کئے خونخوار نظروں سے کھڑے ہمیں گھورے جا رہے تھے۔

میرے اندر بری طرح ہلچل مچی ہوئی تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ بدمعاشوں کے اس ٹولے کو آخر کس نے ہماری مخبری کر دی؟.......... کیا نگینہ نے؟.......... نہیں تو پھر؟.......... اس ''پھر'' کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ ماں کی آنکھوں میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اس کے برعکس اس کی بڑی بڑی دہکتی آنکھوں میں ایکا ایکی نفرت کا الاؤ بھڑک اُٹھا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اپنے دیرینہ دشمنوں کو دیکھ کر بری طرح تپ رہا تھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو جنون خیز انداز میں یوں بار بار بھینچے جا رہی تھیں جیسے شاہ میر اور نظر حیات کی گردنیں دبوچنے کے لئے بے چین ہوں۔ پھر دوسرے ہی لمحے میرے کچھ بولنے سے قبل ہی منتقم ناگن کی طرح ان دونوں کو وحشت بھری لہو رنگ نظروں سے گھورتے ہوئے پھنکار کر بولی۔

''شاید تقدیر کو ابھی تمہاری زندگیاں مقصود ہیں.......... لیکن میں تقدیر سے زیادہ بے رحم ہوں تم دونوں کے لئے۔''

''ہا.......... ہا.......... رسّی جل گئی مگر بل نہیں گئے شبینہ بیگم!'' نظر حیات نے ماں کی شعلے برساتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



آواز پر استہزائیہ انداز میں ایک قہقہہ اگلتے ہوئے ماں سے کہا تو ماں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا اپنے انتقام کا سارا زہر ان میں انڈیلتے ہوئے ترکی بہ ترکی کہا۔

''ہاں، نظر حیات! ہاں..... رسّی تو واقعی جل گئی ہے مگر اس کی راکھ میں دبی چنگاری اب ایک آتش فشاں کا روپ دھار چکی ہے جس کی جھلک تم دونوں دیکھ ہی چکے ہو۔ مگر افسوس ..... خوش فہمی میں پڑ کر تم دونوں اپنے بھیانک انجام کو اور قریب کر رہے ہو۔''

''واہ..... واہ شبینہ بیگم! واہ..... موت کے سامنے اچھے اچھوں کے حواس ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ تمہاری اس دیدہ دلیری کی داد دینی چاہئے۔'' یہ شاہ میر تھا۔ وہ ڈرامائی انداز میں تالیاں بجاتا ہوا قدم چلتا ہوا ماں کے قریب آیا۔ اپنا ریوالور اس نے جیب میں ڈال لیا تھا۔ میں اس وقت جلتی سلگتی کیفیات میں مبتلا دونوں شیطانوں کو گھورے جا رہا تھا۔

شاہ میر ہمارے قریب پہنچ کر رکا اور پھر اپنی جیب سے دوبارہ پستول نکال کر اس کی نال کا رخ میری طرف کر دیا اور دھاڑ کر غضب ناک لہجے میں ماں سے دوبارہ مخاطب ہو کر بولا۔

''شبینہ! تمہیں اپنے اس لاڈلے پر فخر ہے نا؟..... میں آج اسے زندہ نہیں رہنے دوں گا۔'' یکایک میری ٹھنکی ہوئی نظریں شاہ میر کے پستول والے ہاتھ پر جم گئیں۔

''نہیں شاہ میر! نہیں۔ میرے دلیر سپوت کو اتنا کمزور مت سمجھنا کہ وہ تیرے جیسے گیدڑ کے ہاتھوں یوں آسانی سے ڈھے جائے گا۔'' ماں کے لہجے میں عجیب طرح کا تیقن تھا کہ جس نے میرے وجود کو فوراً میں ڈھال دیا تھا۔

دفعتہً ایک جانب سے مزید دو مسلح افراد دوڑتے، ہانپتے ہوئے وہاں آن پہنچے۔ میں پہلے یہی سمجھا کہ شاید یہ اس چھپکلی مار کہ زرد رو بدمعاش کے ساتھی تھے مگر جب میں نے انہیں نظر حیات اور شاہ میر سے مؤدبانہ مخاطب ہوتے دیکھا تو بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ایک نے کہا۔ ''جناب! غفورا بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔''

نظر حیات نے دانت بھینچ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

''حرام زادو! تم سے ایک آدمی نہیں پکڑا گیا۔ کہاں گیا آخر وہ؟'' نظر حیات نے باؤلے کتے کی طرح غرا کر کہا۔

وہ دونوں خاموش رہے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر اپنی ناکامی کی داستان کا ایک لفظ بھی مزید کہا تو دوسرا تھپڑ بھی کھانا پڑے گا۔

''لگتا ہے ہمیں خود تلاش کرنا پڑے گا۔'' بالآخر نظر حیات نے غصیلے لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے کہا شاہ میر نے میری طرف اٹھا ہوا پستول والا ہاتھ نیچے گرا دیا۔ نظر حیات کی طرف مڑ کر بولا۔

''کوئی فائدہ نہیں نظر حیات! یہ بتاؤ، اب ان دونوں کو ادھر ہی ختم کر کے کسی اندھیری کھائی میں پھینک دیں یا.....''

اس نے آخر میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

نظر حیات بولا۔ ''نہیں شاہ میر! ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جانا ہوگا۔ اتنی آسان موت ان کا مقدر نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے اس سنپولئے سے اپنے بیٹے کبیر کے بارے میں اُگلوانا ہے۔'' اس کا اشارہ میری جانب تھا۔

''تو یہیں اُگلوا لو نظر حیات! انہیں اپنے ساتھ لے جانے کی زحمت کیوں اٹھاتے ہو؟..... میں



اس ناگن اور اس کے سنپولیے کا قصہ یہیں پاک کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے میری اور میری بیٹی نگینہ کی زندگی میں زہر گھولا ہے۔'' شاہ میر نے ہم دونوں ماں بیٹے کو غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے نظر حیات سے کہا۔

''کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو شاہ میر! میں بھی اب ان دونوں کا قصہ جلد نمٹانا چاہتا ہوں۔'' جواباً نظر حیات نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد میری جانب غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''نادر! میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ بتاؤ میرا بیٹا کبیر کہاں ہے؟''

ماں اس وقت مارے طیش اور جوشِ غضب کے اپنے آپے میں نہیں تھی۔ اس کی وجہ اپنے دشمن دیرینہ کی موجودگی تھی۔ مگر میں اس نازک صورتِ حال میں سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا نظر حیات کے سوال کے جواب میں معتدل لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم اپنے بیٹے کبیر کی گمشدگی کی وجہ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو نادر!'' نظر حیات غرا کر بولا۔ ''جب تم نگینہ کو اغواء کر کے دھوکے سے اسے پشاور اور پھر چترال کی طرف لے گئے تھے تو میرا بہادر بیٹا نگینہ کو تمہارے خونی پنجے سے چھڑانے کے لئے تمہارے تعاقب میں گیا تھا۔ پھر تم نے نگینہ کو ورغلا کر اپنا ہم خیال بنا لیا اور اس کے ساتھ واپس لوٹ آئے۔ مگر کبیر اب تک کیوں نہیں لوٹا؟''

''کیا خبر وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا ہو کہ ہم واپس نہیں لوٹے ہیں۔ اور وہ وہیں ہمیں تلاش کرتا پھر رہا ہو۔'' میں نے جھوٹ بول کر اسے الجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھی ایک کائیاں تھا، فوراً بولا۔

''بکواس بند کرو اپنی۔ میرا بیٹا اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ وہ یونہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے۔ تم نے ہی اسے کہیں غائب کیا ہے۔''

پھر اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، ماں نے یکدم اس سے کہا۔ ''یہ سوال تم میرے بیٹے سے ہی کیوں پوچھ رہے ہو؟ جبکہ تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ نگینہ بھی میرے بیٹے کے ساتھ تھی۔ تو وہ بھی اچھی طرح یہ بات جانتی ہوگی کہ کبیر کہاں ہے۔''

ماں کا یہ سوال ایسا تھا جس نے مجھے دھڑکا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اب تک اس اہم بات کی طرف توجہ نہ دی تھی یا پھر شاید ضرورت ہی نہیں محسوس کی تھی۔ تاہم مجھے پورا یقین تھا کہ نگینہ نے میری ہدایات کے مطابق کبیر کے سلسلے میں نظر حیات کو اور شاہ میر کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ چنانچہ نظر حیات کے جواب دینے کی بجائے شاہ میر ماں سے غرا کر بولا۔

''میں نے سب سے پہلے اپنی بیٹی نگینہ سے ہی کبیر کے بارے میں پوچھا تھا..... وہ اس بارے میں لاعلم ہے۔''

ماں کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوگئی اور وہ اسی لہجے میں اس سے بولی۔

''اچھا..... کیا تمہاری بیٹی نگینہ اندھی تھی؟''

''بکواس بند کرو اپنی۔ ورنہ ادھر ہی گولی مار دوں گا تجھے۔'' جواباً شاہ میر غضب ناک لہجے میں بولا۔

ماں سے اس کے طرزِ تخاطب پر مجھے غصہ تو بہت آیا تھا مگر ابھی میں اپنے اندر کا لاوا انہیں اُگلنا چاہتا تھا بلکہ خاموشی سے ماں کی اس چال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ میں نے ماں کی مداخلت کے بعد نظر حیات کے چہرے پر پُرسوچ اور اُلجھن کے تاثرات بھانپ لئے تھے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا

''نظر حیات! کیا تم اتنے ہی بے وقوف ہو کہ اتنی بڑی اور اہم بات کو یکسر فراموش کر بیٹھے؟'' ماں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



نے شاہ میر کی پرواہ کئے بغیر نظر حیات سے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''حیرت ہے نظر حیات! تم نے کیا یہ بات اس لئے فراموش کر ڈالی کہ نگینہ تمہارے دوست کی بیٹی ہے۔ کیا تمہارے بیٹے کی اہمیت تمہاری نظروں میں نہیں؟''

''میں کہتا ہوں اپنی بکواس بند کر ذلیل کتیا!'' شاہ میر آپے سے باہر ہو گیا اور اس کے منہ سے ماں کے لئے گالی کے الفاظ نے میرے آتش فشاں کو جیسے بھڑکا کر رکھ دیا۔ میں کسی غضب ناک شیر کی طرح دھاڑ کر اس پر جھپٹا۔ وہ اپنا پستول والا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اسے دبوچ لیا اور پستول بھی اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ دوسرے ہی لمحے پستول کی نال میں اس کی کنپٹی سے لگا چکا تھا۔

''کمینے!.....ذلیل! دل تو میرا یہی چاہتا ہے کہ اپنی ماں کو گالی دینے کی گستاخی پر تیری کھوپڑی میں ابھی سوراخ کر دوں۔'' میں دانت پیس کر خون رنگ لہجے میں بولا۔ ''لیکن اگر تو اپنی زندگی چاہتا ہے تو اسی وقت اپنے کتوں کو ہتھیار پھینکنے کا حکم صادر کر۔ ورنہ تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' یہ سب اتنا اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا تھا کہ وہاں موجود نظر حیات اور اس کے چیلے ہکا بکا رہ گئے تھے۔

''نادر!.....شاہ میر کو چھوڑ دو۔'' نظر حیات نے کمزوری سی آواز میں کہا۔ جبکہ شاہ میر کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ وجہ یہی تھی کہ میرے دائیں بازو کا شکنجہ مضبوطی سے اس کی گردن کے گرد جکڑا ہوا تھا جبکہ بائیں ہاتھ میں پستول تھا جس کی نال میں نے اس کی کنپٹی کے ساتھ لگا رکھی تھی۔

پھر میں نے اسے بولنے کا موقع دیتے ہوئے اس کی گردن کو ذرا ڈھیلا چھوڑا تو وہ پھنسی پھنسی آواز میں نظر حیات سے بولا۔

''نن.....نظر حیات! ان.....ان دونوں کو جانے دو۔ خ.....خدا کے لئے.....ان دونوں کو جانے دو۔''

میں نے کن انکھیوں سے نظر حیات کی طرف دیکھا۔ وہ بری طرح شش و پنج میں مبتلا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ساتھیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ انہوں نے ایک طرف قطار بنا لی۔ میں نے ماں سے چلا کر اسے گاڑی کی طرف بڑھنے کو کہا۔ ماں نے فوراً ایسا ہی کیا۔

میں نے بھی شاہ میر کو ڈھال بنائے اپنے ساتھ گاڑی کی طرف کھینچا۔ ماں ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر سوار ہو چکی تھی۔ چابی اگنیشن سوئچ میں موجود تھی جسے ماں نے فوراً ہی گھما دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ یہ شاہ میر ہی کی سنگل ڈور جیپ وتھی۔ پھر میں نے پستول والے ہاتھ سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا تو اچانک شاہ میر نے میرے پیٹ میں کہنی رسید کر ڈالی۔ یہ حملہ اچانک تھا۔ میرے حلق سے بے اختیار اوغ کی آواز نکلی۔ اس کی گردن پر میرے بازو کی گرفت ازخود ڈھیلی پڑ گئی تو اس نے ایک وار میرے پستول والی کلائی پر رسید کیا۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تو میں نے خود کو سنبھال لیا اور اسے دھکیل کر صورت حال کی خطرناکی کو بھانپتے ہی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ماں نے فوراً گیئر بدلا، جیپ کو تیزی سے یوٹرن دیا۔ نتیجے میں شاہ میر سامنے آ گیا۔ اس کے عقب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ کئی گولیاں ٹھک ٹھک کی آواز سے جیپ کی باڈی میں پیوست ہو گئیں اور کھڑکی کے شیشوں پر بھی لگیں جو چھناکے کی آواز سے ٹوٹ گئے۔ ہم دونوں ماں بیٹے نے فوراً سر جھکا دیئے تھے مگر ماں نے ایکسیلیٹر سے پاؤں نہیں ہٹایا تھا۔

اس لمحے شاہ میر میری جیپ کے بونٹ سے ٹکرایا اور اچھل کر دور جا گرا۔ ماں نے دوبارہ سر ابھارا اور



جیپ کو طوفانی رفتار سے دوڑاتی ہوئی ایک طرف تاریکی کے بطن میں گھس گئی۔

جیپ کے بونٹ سے ٹکرانے کے بعد شاہ میر کا کیا حشر ہوا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا مگر مجھے اس کی پرواہ بھی نہیں تھی۔

ماں جیپ کو بدستور دوڑائے چلی جا رہی تھی اور میرے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر شاہ میر اور نظر حیات کو کس طرح یہ پتہ چلا تھا کہ لالہ زار کے مقام پر اغواء کنندگان کے ساتھ غفورے کے بدلے ماں کی رہائی کی ''ڈیلنگ'' ہو رہی ہے؟.....ایک گمبھیر سوالیہ نشان تھا جو ہتھوڑے کی طرح میرے حلق میں اٹک گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



تقدیر کا بے رحم کھیل جاری تھا۔ میں اور میری ماں دشمنوں کے لگائے اس پھندے سے تو
آئے تھے مگر وہ سوال ابھی تک اہم تھا، ہماری اس ڈیلنگ کا شاہ میر اینڈ کمپنی کو کیسے علم ہوا تھا۔ گھوم
کر ایک ہی شخصیت میرے ذہن کے پردے پر اُبھر رہی تھی۔ عقل اس کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔
دل.....دل بھلا ایسی بات کیوں کر مانتا؟..... عقل کا کہنا تھا، یہ کام نگینہ نے کیا اور دل کا فر
تھا، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ وہ میری محبت ہے اور یہ محبت یک طرفہ نہیں، دو طرفہ ہے۔ اگر میں اس
چاہت میں ہوش وخرد سے بیگانہ ہوں تو وہ بھی میری خاطر پہاڑوں سے ٹکرانے کا عزم رکھتی ہے۔ مج
کے مہکتے شگوفوں نے میری جان کے مساموں کو اپنی دلفریب خوشبو سے مہکا رکھا ہے تو یہی محبت اس بد
کے رگ و پے میں حیات کا پیغام بن کر دوڑ رہی ہے۔ اسی لئے یہ بات تسلیم ہی نہیں کی جا سکتی تھی
نگینہ میرے خلاف اپنے باپ سے مخبری کر سکتی ہے۔ میری سوچیں گاڑی کی رفتار کے ساتھ دوڑ ر
تھیں۔ اچانک ماں کھانسی اور میں خیالات کی دنیا سے حقیقی دنیا میں آ گیا۔ ہم نے اپنے دشمنوں
خلاف ایک معرکہ جیت لیا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہم دونوں ماں بیٹے نے شاہ میر اور نظر حیات جیسے دیرینہ دشمنوں کے روبرو
آزمائی کی تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ فتح ہمارے حصے میں ہی آئی تھی۔ لیکن ماں تو اس سے بھی مطمئن نہ تھیں
وہ تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہتی تھیں۔ جبکہ اغواء کنندگان کے مقابلے میں بھی مجھے فتح حاصل تو ہ
تھی مگر نصف۔ یعنی میں ماں کو حاصل کر چکا تھا لیکن غنورا فرار ہو چکا تھا۔ اگرچہ میں نے غنورے
چھاپ رکھا تھا مگر شاہ میر اور نظر حیات کے اچانک ٹپک پڑنے کی وجہ سے غنورا ہاتھ سے نکل گیا تھ
بہرطور مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ ماں کو میں آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرے لئے یہی بہت تھا

اچانک مجھے احساس ہوا کہ جیپ کا رخ بتدریج بدل رہا ہے۔ یہ کوئی چونکنے والی بات نہ تھی۔ مگر
ٹھٹکا اس وقت جب ماں نے پکی سڑک چھوڑ کر کچے میں جیپ اتار لی اور اسے بریک لگا دیئے اور سو
آف کر دیا۔

''کیا ہوا ماں.....؟'' میں نے قدرے چونک کر ماں سے پوچھا۔ ماں کے چہرے پر جوشِ غیظ
سرخی مترشح تھی۔ پھر وہ پُرتپش لہجے میں بولیں۔

''نادر! وہ ضرور اس سڑک سے گزریں گے۔''

میں ماں کی بات کا مطلب سمجھ کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دوبارہ بولی۔ ''دشمنوں سے نمٹنے کا یہ سنہ
موقع میں ضائع نہیں جانے دوں گی۔''

''ماں ماں!.....ہم نہتے ہیں اور وہ.....''

ماں نے یکدم میری بات کاٹ کر کہا۔ ''تم کب سے کھلونوں کے محتاج ہو گئے ہو نادر بیٹے! ہمار



پاس عزم وحوصلے کا ہتھیار ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے ماں! مگر ہمیں.....''

''تم جا سکتے ہو۔'' ماں نے روکھے لہجے میں یہ کہتے ہوئے میری بات کاٹی اور میرا وجود کٹنے لگا۔

''ماں! میں بھلا تمہیں تنہا چھوڑ سکتا ہوں؟''

''بس تو پھر تیار رہو۔'' ابھی ماں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک بائیں جانب عقب سے کسی گاڑی کی تیز روشنی نظر آئی۔ ماں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''وہ آ رہے ہیں۔''

میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے ماں سے کہا۔ ''ماں! تُو گاڑی سے نیچے اتر جا۔ میں دشمنوں کا راستہ روکوں گا۔''

''نہیں..... میں کچھ اور کرنا چاہتی ہوں۔ تم بس ذرا محتاط ہو کر بیٹھے رہو۔''

ماں نے کہا اور پھر اس نے اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائی۔ رات کے دم بہ خود سکوت میں جیپ کا انجن ہولے سے غرا کر اسٹارٹ ہو گیا۔ ماں نے ہیڈ لیمپس گل کر دیئے تھے۔ پتہ نہیں ماں کیا کرنا چاہتی تھیں؟ مگر میں اب ان کی ہدایات کے مطابق محتاط ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

گاڑی لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ نظر حیات کی سرخ انٹرکولر ہی تھی۔ پکی سڑک بل کھاتی ہوئی تھی اس لئے ایک محتاط اندازے کے تحت انٹرکولر کی رفتار ساٹھ ستر سے زیادہ نہ تھی۔ مگر اس بل کھاتی سڑک پر یہ رفتار بہت تیز تھی۔ پھر جیسے ہی وہ ہمارے ذرا قریب پہنچی، ماں نے گیئر بدلا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ ہماری جیپ کا انجن وحشی درندے کی مانند غرایا اور جیپ ایک جھٹکے سے پختہ سڑک کی طرف دوڑی۔ ماں کا اندازہ نہایت درست ثابت ہوا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جیسے ہی وہ انٹرکولر نزدیک پہنچ کر ہمارے قریب سے گزرنے لگی، ہماری جیپ دھاڑتے ہوئے درندے کی طرح اچھل کر پختہ سڑک کی طرف بڑھی اور سامنے سے گزرتی ہوئی انٹرکولر کے عقبی حصے کے ساتھ زوردار دھماکے سے ٹکرائی۔ شیشے ٹوٹنے کی چھناکے دار آواز گونجی۔ ہمیں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ انٹرکولر کے عقبی حصے سے ہماری جیپ ٹکرانے کے نتیجے میں انٹرکولر کا توازن بگڑ گیا۔ اس کا عقبی حصہ پختہ سڑک پر گھوما تو انٹرکولر بے قابو ہو گئی۔ اس کے ڈرائیور نے بدحواسی میں اپنی ڈولتی انٹرکولر کے بریک لگا دیئے۔ نتیجتاً انٹرکولر الٹ کر ایک دھماکے سے پختہ سڑک پر گر کر دور تک گھسٹتی چلی گئی اور کچے میں جا اتری۔

''ماں!..... نیچے اُترو.....جلدی۔'' میں نے ماں سے کہا اور پھر ہم دونوں نہایت پھرتی کے ساتھ نیچے اتر آئے۔ انٹرکولر خاصی دور جا کر سڑک کے کنارے الٹ کر قدرے نشیبی کچے میں جا گری تھی۔ میں اور ماں چیڑ اور صنوبر کے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے احتیاط سے مذکورہ سمت کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھ رہے تھے۔

صاف اور روشن آسمان کی وجہ سے ہمیں ذرا دور اُلٹی ہوئی انٹرکولر صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ بالکل الٹ چکی تھی۔ ہم دونوں ماں بیٹا تیز تیز قدموں اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ذرا ہی قریب پہنچے تھے کہ انٹرکولر ایک ساعت شکن دھماکے سے شعلوں کی زد میں آ گئی۔ میں نے اور ماں نے خود کو غیر اختیاری طور پر زمین پر گرا دیا۔ انٹرکولر دھڑ ادھڑ جل رہی تھی۔ آگ کے شعلے اسے نگل رہے تھے۔ شاید فیول ٹینک نے آگ پکڑ لی تھی۔ شعلوں کی تپش ہم تک پہنچ رہی تھی۔

''ماں! واپس پلٹو۔'' میں نے ماں سے کہا اور وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر ہم دونوں جلتی سلگتی انٹرکولر سے ذرا دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ ''ماں! یہاں سے نکل چلو۔ ورنہ آبادی کے لوگ ادھر کا رخ کریں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



اور ہم ان کی نظروں میں آ جائیں گے۔'' میں نے ماں سے دوبارہ کہا۔

شعلوں کی آتشی دہک میں اس کا چہرہ آسودہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ ایسا ہی لگتا تھا کہ نظر حیات اور شاہ (جس کے بارے میں ہم دونوں ماں بیٹے کا یہی خیال تھا کہ زخمی ہونے کے بعد نظر حیات نے اسے ہسپتال پہنچانے کے لئے اپنی انٹرکولر میں ہی سوار کرا دیا ہوگا بشرطیکہ وہ زندہ ہو) بھی جل مرے تھے۔

ہم دونوں دوڑتے ہوئے اُس جگہ پہنچے جہاں ہماری (شاہ میر کی) جیپ پختہ سڑک پر ترچھی کھڑی تھی۔ انٹرکولر کے عقبی حصے کو ٹکر مارنے کے بعد اس کے بونٹ کی حالت قدرے خستہ ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں اب وہ اسٹارٹ بھی ہوتی کہ نہیں۔ تاہم قریب پہنچ کر ہم دونوں اس میں سوار ہو گئے۔

ڈرائیونگ سیٹ اس بار میں نے سنبھالی۔ میں نے اگنیشن سوئچ میں چابی گھما دی مگر انجن ہولے۔ گھر گھرا کر خاموش ہو گیا۔ دو ایک بار مزید کوشش کر کے دیکھ لی مگر بے سود۔

''نہیں ہو رہی اسٹارٹ؟'' ماں نے استفسار کیا۔

''اتر کر دیکھنا پڑے گا۔'' میں نے کہا اور دروازہ کھول کر نیچے اُترا۔ بونٹ کی طرف بڑھا مگر بونٹ اس طرح چیک کر ٹائٹ ہو چکا تھا کہ پوری کوشش اور طاقت کے باوجود اوپر نہ اٹھا۔ میں پریشان سا ہو گیا۔ دور انٹرکولر سے ہنوز شعلے بلند ہو رہے تھے۔ مجھے قریب کی آبادی سے لوگوں کی ''ہنگامی آمد'' کا بھی خدشہ لاحق تھا۔ ماں بھی نیچے اتر آئی تھی۔

''ماں! ہمیں پیدل ہی نکلنا پڑے گا۔ ورنہ ہم مقامی لوگوں کی نظروں میں آ جائیں گے۔''

''لیکن نادر!..... پیدل ہم کہاں تک چلیں گے؟'' ماں نے کہا۔ ان کے لہجے میں پریشانی شائبہ تک نہ تھا۔

''لالہ زار تک تو جانا ہی پڑے گا۔ وہاں ہماری جیپ یقیناً موجود ہو گی۔ کیونکہ میں غفورے کو اس میں بٹھا کر وہاں تک پہنچا تھا۔''

میری بات پر ماں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

وہ مقام وہاں سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم دونوں ماں بیٹے جیسے تیسے، گرتے پڑتے لالہ زار کے مقام پر پہنچے۔

وہاں چھپکلی مار کہ بدمعاش کے ساتھیوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے اپنا میگارو تلاش کیا۔ اس کے بعد مجھے قریب ہی اپنی جیپ کھڑی نظر آ گئی۔

تقدیر ہم ماں بیٹے کا ساتھ دے رہی تھی۔ ہم اس میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی۔ ذرا ہی دیر بعد ہم گرین لاج کی طرف گامزن ہو گئے۔

گرین لاج پہنچتے ہی ماں نے مجھ سے کہا کہ میں اعظم خان کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کر ڈالوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ماں نے بھی ان سے تفصیلی گفتگو کی۔

اعظم خان نے غفورے کے فرار پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اس کے جواب میں، میں نے اپنی پرانی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔

''انکل! میرا خیال ہے کہ غفورا ہمارا کام خود ہی آسان کر ڈالے گا۔ کیونکہ وہ پولس کو انتہائی مطلوب مجرم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور وہ ہمارے خلاف پولیس کے پاس ہرگز نہیں جائے گا۔ بلکہ وہ پولیس سے دور رہنے کی ہی کوشش کرے گا۔''

''لیکن نادر بیٹے! تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہمارے دشمن اس کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور وہ



اسے تم دونوں ماں بیٹے کے خلاف ہتھیار کی صورت میں استعمال کر سکتے ہیں۔''

اعظم خان کی بات پر مجھے سخت اچنبھا ہوا۔ میں نے کہا۔ ''انکل! ہمارے دشمن کون ہیں؟ میرا نہیں خیال کہ نظر حیات اور شاہ میر زندہ بچے ہوں؟''

''ہاں..... ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی اس کی تصدیق تو نہیں ہوئی۔'' وہ بولے۔ ''بہرحال، تم ماں بیٹا اپنے معمولات پر توجہ دو اور خفیہ طور پر نظر حیات اور شاہ میر کی سن گن بھی لیتے رہو کہ آخر ان کا کیا بنا؟ کیا وہ واقعی ہلاک ہو چکے ہیں یا پھر.....''

انہوں نے آخر میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد دوبارہ بولے۔ ''تم دونوں ماں بیٹا محتاط رہو۔ ابھی پولیس کارروائی ہو گی اور پولیس کا شبہ لامحالہ تم دونوں پر ہی ہو گا۔ ویسے تم نے اپنی موجودگی کا جائے وقوع پر کوئی ثبوت تو نہیں چھوڑا ہے نا؟''

''نہیں انکل.....!'' میں نے مختصراً کہا۔ اس کے بعد انہوں نے ماں سے بھی چند باتیں کیں اور رابطہ منقطع کر دیا۔

❄ ❄ ❄

ہم ماں بیٹے کی زندگی کا گزشتہ شب والا واقعہ اہم ترین تھا۔ میں نے آج زندگی میں پہلی بار ماں کے چہرے پر ایک انوکھا اور خاص رنگ دیکھا تھا۔ ایسا رنگ اور ایسا انوکھا پن جو آج تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ماں کو خوش دیکھ کر میں بھی یک گونہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن جانے کیوں میرے دل کو وہ خوشی، وہ مسرت نہیں مل رہی تھی جو ماں کی طرح ہونی چاہئے تھی۔ میری خوشی اور مسرت کے آگے کوئی ان دیکھی رکاوٹ تھی جو ایک تشنگی سی پیدا کر رہی تھی۔ کھل کر خوش ہونے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ ایک سوچ تھی، ایک اُلجھن تھی، کوئی پھانس تھی۔

'کیا اس کی وجہ..... نگینہ تھی؟' اچانک میں نے خود سے سوال کیا۔ 'نہ..... نہ..... نہیں۔ بھلا..... بھلا نگینہ اس کی وجہ کیسے ہو سکتی ہے؟' میں گھبرا سا گیا۔

'ہاں نادر!..... اگر شاہ میر واقعی مر گیا تو نگینہ کا رویہ تمہارے ساتھ کیا ہو گا؟' میرے اندر کوئی سرد مہری سے بولا۔

'کیا نگینہ کو دکھ نہ ہو گا؟ وہ یتیم ہو جائے گی۔ اس کا باپ کے سوا کون ہے؟' دوسرے ہی لمحے میرے دل نے توجیہہ پیش کی۔

'نگینہ اپنے باپ کے کالے کرتوت سے واقف ہے۔ وہ اسے اپنے باپ کے منطقی انجام پر محمول کرتے ہوئے خاموش ہو جائے گی۔ اور پھر وہ اکیلی کب ہے؟ میں اس کے ساتھ ہوں..... اُس کا نادر۔ اس کی پہلی اور آخری محبت!'

'ہونہہ.....' دماغ نے استہزائیہ کہا۔ 'اچھا بہانہ ہے۔ لیکن نادر میاں! یہ کیوں بھول رہے ہو کہ نگینہ نے تم سے ایک عاجزانہ درخواست بھی کی تھی۔ انتہائی عاجزانہ درخواست ..... کہ اس کے باپ کو معاف کر دیا جائے۔'

دل بھلا دماغ کو خاطر میں لاتا ہے۔ فوراً ہی جواب آیا۔ 'لیکن معافی کا اختیار تمہیں کب تھا نادر؟ تم کون ہوتے اپنی ماں کے شوہر کے قاتل کو معاف کرنے والے؟ تم اپنے باپ کے قاتل کو معاف کر سکتے ہو لیکن مہیں ستم گزیدہ عورت کے شوہر کے قاتل کو معاف کرنے کا بہرحال کوئی اختیار نہ تھا۔'

'بے شک.....!' دماغ نے حسب معمول غیر جذباتی انداز میں کہا۔ 'مگر تم نے اپنی منتقم مزاج ماں کا

بہر حال ساتھ دیا۔'

'میں اس کا بیٹا ہوں ......... ' میں چیخ پڑا۔

'تم نگینہ کی محبت بھی تو ہو۔' دماغ چلّایا۔

دل و دماغ کی اس تکرار نے مجھے بری طرح تہہ تیغ کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے آزمائش کی ایک کٹھن گھڑی میری منتظر تھی۔ میں نگینہ اور ماں کے بیچ معلق ہو گیا تھا۔ میں ''محبت'' اور ''ممتا'' کے درمیان گویا پل صراط پر کھڑا تھا۔ ایک طرف نگینہ کی محبت تھی تو دوسری طرف ماں کی ممتا.........ایک طرف محبت کی پاسداری تو دوسری طرف ممتا کی قرض داری۔

ایک طرف فرض تھا تو دوسری جانب قرض تھا.........اور میں درمیان میں ایک لاعلاج مریض کی طرح معلق تھا۔

یہ کشمکش نہ جانے کب تک جاری رہنے والی تھی۔ اور مجھے کوئی اندازہ نہ تھا، فتح کس کی ہو گی۔ محبت کی یا فرض کی۔

میں نے سر جھٹکا اور اپنی توجہ دوسرے معاملات کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے لمحے میرے تصور میں جلتی ہوئی انٹرکولر کا منظر روشن ہو گیا۔ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے انٹرکولر کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھے۔ عموماً ایسی صورت میں کسی کا زندہ بچ جانا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، شاہ میر اور نظر حیات اس تصادم کے بعد بھی بچ گئے تھے۔ میرے پاس اپنے اس خیال کی کوئی دلیل نہیں تھی مگر کہیں اندر سے کچھ ایسی ہی صدا اُٹھ رہی تھی۔ تیرے دشمن ابھی اس دھرتی سانس لے رہے ہیں۔

میں ان سوچوں میں تھا۔ پھر میرے تصور میں اپنی ماں کا ہشاش بشاش اور شگفتہ چہرہ جگمگایا۔ رات والے واقعے کے بعد سے اس کی پژمردگی اور افسردگی دور ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا گویا اس نے اپنے دونوں دشمنوں کی موت کا یقین کر لیا ہو۔

'مگر میں کیوں بے چین ہوں؟' میں نے خود سے سوال کیا۔ 'جب کہ ماں مطمئن ہے۔ میرے چہرے پر بھی اس خوشی و مسرت کا رنگ جھلکنا چاہئے تھا۔ میں ان دونوں کی موت پر خوش ہونے کی بجائے بے چین اور افسردہ کیوں ہوں؟......... کیوں ہوں؟' میں نے کئی بار اپنے آپ سے یہ سوال کیا اور پھر اچانک نگینہ کی صورت میں مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

'ہاں.........شاید اس لئے کہ وہ نگینہ کا باپ تھا۔'

کیا میں نہیں چاہتا تھا کہ نگینہ یتیم ہو؟.........کیا میں شاہ میر کی متوقع موت سے بے چین تھا؟ کیا نگینہ کی محبت نے مجھے اتنا ہی خود غرض بنا دیا تھا کہ میں اپنے دوست کے قاتل کی موت نہیں چاہتا تھا؟ کیا میں اس ستم گزیدہ ماں کے دُکھوں کو فراموش کر چکا تھا جسے عین جوانی میں بیوگی کا داغ سہنا پڑا تھا اور جس نے.........جس نے اپنی جوانی جھوٹے الزام کی پاداش میں خشتِ زنداں ہو کر گزار دی تھی۔ میں اس کے شوہر کے قاتل کی متوقع موت پر بے چین تھا ......... مجھے تو خوش ہونا چاہئے تھا۔ پھر ایسا کیوں تھا میرے لہو کی آگ کیوں بجھنے لگی تھی؟

شاید اس کی وجہ چند روز پہلے نگینہ کی مجھ سے وہ پُر سوز التجا تھی جس نے بڑی حسرت و یاس کے ساتھ مجھ سے معافی کی درخواست کی تھی......... معاف تو خدا بھی کر دیا کرتا ہے۔ بھلا اسے بڑھ کر اور انتقام ہو سکتا ہے؟ لیکن میں نے نگینہ سے یہ بھی کہا تھا کہ میری معافی تو بعد کا معاملہ ہے، کیا میری ماں اس کے باپ کو معاف کرے گی؟


Courtesy www.pdfbooksfree.pk


پھر نگینہ نے اپنے باپ کو بھی منا لیا تھا اور نہ صرف یہ بلکہ اسے گرین لاج بھی لے آئی تھی۔ شاہ میر اپنی بیٹی کے ساتھ خود چل کر مجھ سے اور ماں سے معافی مانگنے آیا تھا۔ ماں اس وقت گرین لاج میں نہ تھی مگر شاہ میر اور نگینہ کو گرین لاج سے مایوس ہو کر لوٹنا پڑا تھا۔

بعد میں ماں کو نگینہ اور شاہ میر کی اس طرح اچانک گرین لاج میں آمد پر خاصا طیش آیا تھا اور میرے تشفی دینے کے باوجود کہ ان دونوں باپ بیٹی کو مایوس لوٹنا پڑا تھا، ماں مجھ پر برہم ہوئی تھیں کہ میرے ہوتے ہوئے شاہ میر گرین لاج سے زندہ کیوں واپس لوٹا تھا؟

رات دھیرے دھیرے سرکتی جا رہی تھی۔ ہر لمحہ آئندہ آنے والے روشن دن سے قریب کر رہا تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں ہی صوفے پر لیٹ گیا کہ ماں اپنے ہاتھوں میں کافی کے دو مگ لئے اندر داخل ہوئیں۔

''ماں! آپ نے کیوں زحمت کی؟ کافی میں بنا لیتا۔'' میں نے کھڑے ہو کر احتراماً کہا مگر ماں نے میری بات کو یکسر نظر انداز کر دیا اور ایک مگ میری جانب بڑھاتے ہوئے متانت سے بولیں۔

''نادر! تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ دونوں خبیث جل مرے ہوں گے؟''

''آں ......... ہاں.........شاید نہیں۔'' ماں کے اس اچانک سوال پر میں ذرا گڑبڑا کر بولا۔

''ہمیں اس وقت وہاں ٹھہر کر یہ اطمینان کر لینا چاہئے تھا۔'' ماں نے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ کافی کا مگ انہوں نے اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ کافی کے مگ سے اٹھنے والی بھاپ کے عقب سے ان کی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''اگر ہم وہاں مزید تھوڑی دیر ٹھہرتے تو مقامی لوگوں کی نظروں میں آ سکتے تھے۔'' میں نے ہولے سے کہا اور کافی کا ایک گھونٹ لیا اور مزید بولا۔ ''کل صبح تک معلوم ہو جائے گا۔''

''تمہیں شاہ میر کی اس موت پر دکھ تو نہیں؟'' ماں نے گمبھیر لہجے میں اچانک مجھ سے پوچھا۔

میرے اور ماں کے درمیان جاری غیر محسوس جنگ میں یہ سوال نہایت خطرناک تھا۔ مگر مجھے اس کی توقع تھی۔ مزید یہ کہ اس ضمن میں میری آنا کانی اس سرد جنگ کو طول دے سکتی تھی۔ اس لئے میں نے ایک گہری ہمکاری بھر کر صاف گوئی سے کہا۔

''ماں!.........دکھ کی بات نہیں ہے.........''

''تو پھر خوشی کی ہو گی۔'' ماں نے یکدم میری بات کاٹ ڈالی۔ مجھے ان کا لہجہ طنزیہ لگا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''ماں! اگر ایک شخص کو اپنے گھناؤنے جرم کا احساس ہو جائے اور وہ خود چل کر ہمارے دروازے پر معافی کے لئے آئے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟'' میں نے گیند ماں کے کورٹ میں پھینکی۔ مجھے پورا یقین تھا، ماں طیش میں آ جائیں گی۔ مگر وہ خلافِ توقع بے تاثر مسکراہٹ سے بولیں۔

''میں اپنے شوہر کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتی۔ اگر تم اپنے باپ کے قاتل اور ماں کے مجرم کو معاف کر سکتے ہو تو یہ تمہارا اپنا فعل ہو گا۔''

''ماں! معاف تو خدا بھی کر دیا کرتا ہے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تم پہلے خود سے پوچھو نادر! کیا تم اپنے باپ کے قاتلوں کو معاف کر سکتے ہو؟''

''ماں! میں صرف شاہ میر کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''اس لئے ..... کہ وہ نگینہ کا باپ ہے؟''

''یہ بات نہیں..... رہا سوال آپ کے پہلے سوال کا، میری معافی آپ ہی کی مرضی پر ا کرتی ہے۔''

''میں تمہیں شاہ میر کو معاف کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔'' ماں نے حتمی لہجے میں کہا۔ پھر م چہرے پر اپنی نگاہیں جماتے ہوئے مستفسر ہوئیں۔ ''کیا تم نے ہی نگینہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے شاہ میر کو مجھ سے معافی طلب کرنے کے لئے مجبور کرے اور وہ اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر یہاں چلا آ تمہارے ہوتے ہوئے وہ اپنے پیروں پر واپس چلا گیا۔''

''نہیں ماں! میں نے نگینہ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

چند ثانیے اعصاب شکن توقف کے بعد ماں نے کہا۔ ''نادر! شاہ میر بڑی مکاری کے ساتھ اپ نگینہ کو ہمارے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ تم اس کی یہ چال سمجھنے کی کوشش کرو سازش میں نگینہ برابر کی شریک ہے۔ اس کا ثبوت شاہ میر اور نظر حیات کا عین اس وقت لالہ زار پہنچ جب تم غفورے کے بدلے مجھے اغواء کنندگان سے حاصل کرنے والے تھے۔''

''ہاں ماں! اس بات پر مجھے بھی تعجب ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تعجب نہیں کہو نادر بیٹا! یقین کر لو، نگینہ نے تم سے اگلوا لیا تھا کہ ہمارے درمیان اغواء کنندگا کب اور کہاں ''ڈیل'' ہونے والی ہے اور یوں دونوں نے ایک پنتھ دو کاج کے مصداق غفورے ک کرنا چاہا۔'' ماں نے جیسے خود ہی خود بے لاگ تجزیہ کر ڈالا۔

''یہ غلط ہے ماں! میں نے تو نگینہ سے اس سلسلے میں کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کی تھی۔'' میں نے کہا۔

''تم نے نگینہ سے میرے اغواء کا ذکر تو کیا ہوگا؟'' ماں نے اچانک دوسرا سوال کیا اور میں ایک سانس لے کر رہ گیا۔ پھر جواباً بولا۔

''ہاں ماں! صرف اتنا کہ ماں کو چند نامعلوم افراد نے اغواء کر لیا ہے اور میں.....''

''بس..... اتنی اہم بات کو تم معمولی سمجھ رہے ہو۔'' ماں نے طنز آمیز حیرت سے کہا۔

''لیکن ماں! میں نے اسے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ ان نامعلوم اغواء کنندگان نے غفورے کے عوض اور کہاں ہم سے ڈیل کرنی ہے؟''

''تم آدھا سچ اور آدھا جھوٹ بول کر مجھے چکر نہیں دے سکتے نادر بیٹا! میں تمہاری ماں ہوں او سمجھتی ہوں۔ اس لئے مجھ سے بحث نہ کرو اور اپنی دنیا میں مگن رہو۔'' ماں کے زہریلے جملوں نے جگر چھلنی کر دیا۔

''ماں! میری بات کا یقین کریں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔

''سچ ثابت ہو چکا ہے۔'' ماں نے سرد مہری سے کہا اور خالی مگ تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں کے بعد چند ثانیے مجھے عجیب اور پُرسوچ نگاہوں سے تکتی رہیں۔ پھر جب بولیں تو مجھے ان کا لہجہ نہیں بلکہ ایک مغتم عورت کا محسوس ہوا۔

''نادر! ایک بات میری دھیان میں رکھنا..... میں اگر ایک ماں ہوں تو ایک زخم کھائی عورت بھی ہوں اور مجھے اپنا زخمی عورت والا روپ زیادہ عزیز ہے اور رہے گا۔ میرے شاطر اور شمنوں نے پہلے میرے شوہر کا بے دردی سے قتل کیا اور پھر مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل د ان کی چیرہ دستیوں میں کمی نہ آئی۔ اور اب انہوں نے میرے خلاف ایک اور گھناؤنی سازش



ہوئے ماں بیٹے کے درمیان بھی دراڑ ڈال دی۔ ٹھیک ہے، اگر دشمنوں کے ظلم کا یہ حال ہے تو میرا حوصلہ بھی کمال ہے۔ اس لئے میں اپنی ممتا کا گلا گھونٹ سکتی ہوں۔ مگر اس زخمی عورت کو نہیں مار سکتی کہ مجھے اپنے اس روپ پر تا عمر فخر رہے گا۔ مجھے اب تمہارے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ کوئی حتمی اور سخت فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ دشمن بڑی مکاری کے ساتھ ایک خوب صورت ہتھیار کے ذریعے میری ممتا پر سیندھ لگا چکا ہے۔ مگر ہمیشہ کی طرح انہیں اس بار بھی ناکامی ہوگی۔'' یہ کہہ کر ماں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

میں اپنی جگہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ ماں کے لہجے کی گھن گرج ابھی تک میری سماعتوں میں گونج رہی تھی۔ میرا پورا وجود گویا آندھیوں کی زد پر تھا۔ میرے اندر کوئی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہا تھا۔ میں..... نادر علی خان، جس نے آج تک نامساعد حالات کی تیز و تند آندھیوں کا ڈٹ کر اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا تھا اور بڑے بڑے نامی گرامی بدمعاش میرے سامنے ریت کی دیوار بن کر ڈھیر ہو چکے تھے، آج ماں کے ان بے رحم جملوں سے خود ٹوٹ کر ڈھیر بن رہا تھا۔ مجھ پر آج یہ ہولناک انکشاف ہوا تھا کہ ماں..... میری پیاری ماں مجھ سے بدظن ہو چکی تھی۔ وہ مجھے دشمنوں کا آلہ کار سمجھ رہی تھی۔

نگینہ کے حوالے کو وہ دشمنوں کی خوب صورت سازش اور ہتھیار سمجھ رہی تھی۔ میں ماں کے دل و دماغ سے یہ کریہہ غلط فہمی دور کرنے کی جس قدر سرتوڑ کوشش کر رہا تھا، حالات کی طرفہ کاری ہم ماں بیٹے کے درمیان اتنی ہی تیزی سے خلیج وسیع کر رہی تھی۔

ماں کے آخری الفاظ کہ ''مجھے اب تمہارے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ کوئی سخت اور اٹل فیصلہ کرنا ہو گا'' نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

ماں میرے بارے میں کون سا سخت فیصلہ صادر کرنے والی تھی؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ تاہم مجھے حالات کی ہولناکی کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا۔

کیا میرے اور ماں کے درمیان سرد جنگ کا خاتمہ کسی تکلیف دہ فیصلے پر منتج ہونے والا تھا؟ یہ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔

میرے جی میں تو آئی کہ اسی وقت ماں کے سامنے جا کر اس کے قدموں میں سر رکھ دوں اور رو رو کر اسے یقین دلاؤں کہ میں اپنے باپ کے قاتلوں کو بھولا ہوں اور نہ ہی میں نادانستگی میں ان کا آلہ کار بن چکا ہوں۔

لیکن ماں نے میرے لئے بولنے، کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں چھوڑی تھی۔ گزشتہ شب والے واقعے کے دوران شاہ میر اور نظر حیات کا عین وقت پر نازل ہو جانا، ماں کے شبہے کو تقویت دینے کا باعث بنا تھا۔ اس پر میرا نگینہ سے ماں کے اغواء کا ذکر کرنا بھی ماں کی غلط فہمی میں اضافے کا سبب بنا تھا۔ حالانکہ بات وہ نہیں تھی جو ماں سمجھ رہی تھی کیونکہ نگینہ کو جب میں نے پوری بات سے آگاہ ہی نہیں کیا تھا اور کر بھی دیتا تو مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میری ہدایت کے بعد اپنے باپ شاہ میر سے ہرگز اس کا ذکر نہیں کرتی۔

تو پھر..... آخر شاہ میر اور نظر حیات کو کیسے پتہ چلا اس بات کا؟ یہی ایک پھانس تھی جو مجھے بے چین میں مبتلا کئے ہوئے تھی۔

کیا مجھے اس سلسلے میں نگینہ سے استفسار کرنا چاہئے؟..... میں نے خود سے پوچھا۔ جواب اثبات میں تھا۔ مگر امید مجھے پھر بھی نہ تھی۔ اس نے میرے منع کرنے کے باوجود اپنے باپ سے ماں کے اغواء کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



مختصراً بھی ذکر کیا ہو۔ اور کیا بھی ہوتا (جس کا مجھے بہر حال یقین نہ تھا) تو انہیں بھلا کیسے معلوم ہوا ماں بیٹا انہیں مری اور نتھیا گلی کے اس لالہ زار سنگم پر ملیں گے۔ یہ بات الجھن آمیز تھی۔

بہر طور اس وقت تو یہ دیکھنا تھا کہ طلوعِ سحر اپنے ساتھ کون سے رموز آشکار کرنا چاہتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کوشش کے باوجود بیڈ پر دراز ہونے کے بعد نیند میری آنکھوں کوسوں دور تھی۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی اُبھرا تھا کہ کیا مجھے اس وقت نگینہ سے رابطہ کرنا چ تھا؟ میں نے بے اختیار دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ پانچ بجنے والے تھے۔ میں اٹھا، موبائل نکا بہ قول نگینہ کے اس کا موبائل خراب تھا اس لئے جب میں اس کے رہائشی ٹیلی فون نمبرز پنچ کرنے کچھ سوچ کر رک گیا۔

میرے اندر کسی نے چلاّ کر پوچھا۔ 'نادر! تم نگینہ کو طلوعِ سحر سے پہلے کون سی خوش خبری سنانا ہو؟ اپنے اور اپنی ماں کے کارنامے کی؟......... یا پھر......... اس کے باپ کے انجام کی؟'

میں نمبر ملاتے ملاتے رک گیا۔

ابھی شاید نگینہ سے رابطہ کرنا قبل از وقت تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شاہ میر اور نظر حیات کا کیا ہوا تھا؟ کاش دونوں ہی جہنم واصل ہو چکے ہوں۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے یکلخت ایک لرزا دینے تشویش ناک خیال نے مجھے بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ماں نے مجھے جس امتحان میں ڈالا تھا، ابھی اس کا نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اور اگر شاہ میر اور نظر ہلاک ہو چکے تھے تو پھر ساری عمر میں ماں کے دل سے یہ غلط فہمی دور نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ ا ذریعہ ہی نہ بچتا غلط فہمی دور کرنے کا۔ شاہ میر اور نظر حیات کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی ایک نظروں کے سامنے اس کا بیٹا بھی جیتے جی مر جاتا اور میں ساری عمر شاید ماں کے دل سے یہ غلط کرنے میں ناکام ہی رہتا کہ وہ جو میرے بارے میں سوچ رہی تھی، وہ سراسر غلط اور ایک ہولناک کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک پھانس ماں کے دل و دماغ میں میری طرف سے اٹک کر رہ جاتی جو مج درگور کر کے رکھ دیتی۔

بے اختیار میرا دل دشمنوں کی زندگی کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔

❄❄❄

میں نے وہ رات آنکھوں کے بجائے سُولی پر کاٹی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں بیڈ سے اتر کمرے سے نکلا۔ ماں شاید سو رہی تھیں۔ بڑھ کر ریسیور میں نے ہی اٹھایا۔

"ہیلو! کون؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"نادر!......... تم نے آخر پپا سے انتقام لے ہی لیا نا........." دوسری طرف سے نگینہ اُبھری۔ گلوگیر اور جانکاہ آواز۔ جس میں شکایت بھی تھی اور خفگی بھی۔ محبت کی پاسداری کا درد بھی ا التجا کو ٹھکرا دینے کا کرب بھی۔ میری بے ترتیب سانسیں سینے میں ہی اٹک کر رہ گئیں۔ پھر بڑی سے میں نے اپنے شکستہ وجود کی طاقت کو زبان پر سمیٹا اور اتنا ہی بول سکا۔

"کک.........کیا ہوا؟"

"اوہ.........کیا ہوا؟ جیسے تم جانتے ہی نہیں۔" نگینہ کے غم ناک لہجے میں طنز کی بڑی زہر تھی۔ پھر جیسے وہ حقیقت جان لینے کے انداز میں دوبارہ بولی۔ "کل رات......... تم نے اور تمہا نے......... پپا پر قاتلانہ حملہ کیا تھا؟"



اس سوال پر میں نے خود کو فوراً سنبھالنے کی کوشش کی اور بولا۔ "ہاں......... مگر یہ حملہ براہِ راست نہ تھا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اسے گزشتہ شب کے خونی معرکے سے مختصراً آگاہ کر دیا اور آخر میں بولا۔ "تمہارے پپا اور نظر حیات نے اچانک وہاں پہنچ کر ہم پر حملے میں پہل کی تھی۔"

"اور تم ماں بیٹے نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی؟" نگینہ نے تلخ لہجے میں گویا اپنے تئیں بات مکمل کر دی۔

میں نے بھی سپاٹ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "پھر تمہارا کیا مطلب تھا کہ ہم دونوں ماں بیٹا تمہارے پپا اور نظر حیات کے مسلح آدمیوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے؟"

میرے اس جچے تلے جواب پر نگینہ کو ایک لاجواب سی چپ لگ گئی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے دوسری طرف سے نگینہ کے بے اختیار سسک کر رونے کی آواز سنائی دی۔ میں پریشان ہو گیا اور بے اختیار بولا۔

"نگینہ! کیا ہوا؟.........تت.........تم رو رہی ہو؟"

"ہاں نادر! میں رو رہی ہوں......... کہ اب رونا ہی تو میرے مقدر میں لکھا ہے۔" اس کی گلوگیر آواز اُبھری اور میری پریشانی بڑھ گئی۔

"نادر! میں......... میں آخر کب تک دو پاٹوں کے درمیان پستی رہوں گی؟ میں......... میں آخر کب تک باپ اور محبوب کی سُولی پر جھولتی رہوں گی؟......... سُولی پر چڑھنے والوں کو تو ایک ہی جھٹکے سے موت آ جاتی ہے۔ پھر......... پھر مجھے موت کیوں نہیں........."

"خدا نہ کرے نگینہ! یہ......... یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟" میں چیخ پڑا۔ "آخر ہوا کیا ہے؟......... کچھ تو بتاؤ۔"

"نادر! مم......... میں اور پپا......... خود چل کر......... تم سے اور تمہاری ماں سے معافی مانگنے آئے تھے نا؟" اس کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا اور میں بکھر رہا تھا۔

"ہاں، ہاں۔" بے اختیار میرے لرزیدہ لبوں سے نکلا۔

"اور......... اور پپا کو بھی......... اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا......... ہے نا......... وہ......... وہ مجھ سے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ......... اگر تم اور تمہاری ماں انہیں اپنے ہاتھوں سے سزا دینا چاہیں بھی تو میں خود کو تم دونوں کے سامنے سر جھکا کر حاضر کر دوں گا۔"

"یہ میں نہیں جانتا۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"مگر میں جانتی ہوں نادر!" نگینہ ہسٹریائی لہجے میں چلاّئی تو میں نے بھی تلخی سے کہا۔

"تو پھر اس رات انہوں نے ہم ماں بیٹے پر کیوں قاتلانہ حملہ کیا تھا؟ اس لئے کہ تمہارا باپ شاہ میر خود کو تمہاری نگاہوں میں مجرم ثابت کر کے صبح کا بھولا بن جانا چاہتا تھا۔ تاکہ......... تاکہ ہم دونوں کی محبت میں دراڑ ڈال سکے۔ میرے اور میری ماں کے بیچ تو دراڑ پڑ ہی چکی ہے۔"

"خدا نہ کرے نادر! کہ ہمارے پیار میں کوئی خلیج حائل ہو۔" دفعتہ نگینہ نے یہ جملہ کہا اور جیسے میرا پورا وجود سرشار ہو گیا۔

"نگینہ! آخر تم بتاتی کیوں نہیں کہ........."

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ نگینہ میری بات کاٹ کر سسکتے ہوئے بولی۔ "نادر! پپا کا شمار نہ زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اٹکی ہوئی سانس تلے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



دوئم

''وہ کوما میں جا چکے ہیں۔''

اس نے دل گرفتہ لہجے میں بتایا اور میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ مزید بتانے لگی۔ ''پپا کو انتہ نازک حالت میں کچھ مقامی لوگوں نے ہسپتال تک پہنچایا تھا۔ ڈاکٹروں کی پوری ٹیم انہیں بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ پپا کے بچنے کی امید کم ہے۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتا رہی تھی اور میں اسے غم زدہ محسوس کر کے اندر سے پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ کیسی عجیب گھڑی تھی، کیا عجیب امتحان تھا اسے غم زدہ کرنے کا سبب بھی میں ہی تھا۔ مگر اس کے پسِ پردہ جو حقیقت تھی اس سے نہ صرف میں نگینہ بھی واقف تھی اور سب کچھ جاننے کے باوجود وہ مجھ سے متنفر نہ تھی۔ یہ اس کا بڑا پن تھا۔ وہ اس کی اور عجیب وغریب معاملے میں مجھ سے شیئر کر رہی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے اسے یہ بات بھی بتا دی تھی کہ اس کے باپ شاہ میر اور نظر حیات نے ہی ہم ماں بیٹے پر قاتلانہ حملے میں پہل کی تھی وجہ وہی پرانی دشمنی تھی۔

''نظر حیات کا کیا بنا؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''ان کی حالت قدرے بہتر ہے۔'' نگینہ نے جیسے مجھے مژدہ جانفزا سنایا۔ کیونکہ ماں نے مجھے دہرے تہرے کڑے امتحان میں ڈالا تھا۔ نظر حیات کی زندگی بچ جانے کی خوشخبری نے میرے اس میں کامیابی کی نئی امید جگا دی تھی جس کا میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ نظر حیات پر زندگی کا عرصہ اب خود تنگ کروں گا تاکہ ماں کے دل میں میرے بارے میں جو غلط فہمی لاحق ہے، وہ دور ہو سکے۔ اگر اس میں اہم فرد شاہ میر تھا جو نگینہ کا باپ تھا۔ اس کی زندگی بچ جانے کے لئے بھی میں اس حوالے دعا گو تھا۔

''ہوں.....'' میں نے ایک پُرسوچ ہمکاری لی اور نگینہ سے بولا۔ ''نگینہ! ہم دونوں کے ساتھ بڑا المیہ ہے کہ ادھر تم بیٹی اور محبوب کی سُولی پر لٹکی ہوئی ہو، بالکل اسی طرح میں بھی محبت اور ممتا درمیان معلق ہوں۔''

''لیکن نادر! میں اس مشترکہ دکھ سے اب خوف زدہ رہنے لگی ہوں۔ کک..... کہیں ہم دونوں بھی کسی دردناک المیے کا شکار نہ ہو جائیں۔ نن..... نادر! ہماری محبت کہیں خود بڑے المیے کا شکار جائے۔'' وہ دل شکستہ لہجے میں بولی تو میں نے اسے تسلی دینے کی غرض سے کہا۔

''نگینہ! تم حوصلہ رکھو۔ ہم دونوں مل کر اس بحران کا کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔''

اس نے فون بند کر دیا۔

''اب کون سا بھید دے رہے تھے نگینہ کو؟'' اچانک عقب سے ایک سنسناتی آواز میری سماعتوں ٹکرائی۔ میں نے قدرے چونک کر گردن موڑی۔ عقب میں ماں کھڑی تھیں۔ چہرے پر طنز کی گہری لئے ہوئے۔ میں نے ریسیور رکھا اور ماں کی طرف مڑ کر بولا۔

''ماں! نگینہ کا فون تھا۔''

''وہ تو میں بھی جان گئی ہوں۔''

''وہ کہہ رہی تھی کہ..... اس کے باپ کا شمار نہ زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔ اپنی زند آخری سانسیں گن رہا ہے وہ۔''

میری بات پر ماں کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ چہرہ بے پایاں احساسِ مسرت سے کھل اُٹھا۔ جیسے ان کے اندر جلتے کھولتے لاوے پر سمندروں کا پانی الٹ گیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے ماں نے



ئم

پوچھا۔

''اور..... نظر حیات.....؟''

''وہ زندہ ہے اور بالکل ٹھیک ٹھاک۔'' میں نے بتایا۔

''ہوں.....'' ماں نے ایک طویل اور پُرسوچ ہمکاری لی۔ پھر غضب ناک لہجے میں بڑبڑائی۔ قریب وہ بھی اپنے بھیانک انجام کو پہنچ جائے گا۔'' یہ کہہ کر ماں واپس اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

میرا دل نگینہ سے ملنے کو میں بھی بے چین ہو رہا تھا۔ میں تصور میں اسے اپنے باپ کی زندہ لاش کے پاس بیٹھا آنسو بہاتے دیکھ رہا تھا اور بے چینی سے سوچ رہا تھا کہ اس وقت ان کے پاس کون ہو گا جو سہارا دے سکے؟ اس کی دل جوئی کر سکے؟ کیا مجھے جانا چاہئے؟

''نہیں..... یہ مناسب نہ ہو گا۔'' دوسرے ہی لمحے میں نے سوچا۔ ''نگینہ کو یہ تلخ گھونٹ اکیلے ہی پینا

اب دیکھنا یہ تھا کہ پولیس کیا کرتی ہے۔ اور نظر حیات انہیں کیا بیان دیتا ہے؟ غالب امکان تو یہی تھا وہ ہمارے خلاف ہی پولیس کو بیان دے گا۔ مجھے اور ماں کو اس سلسلے میں پہلے سے محتاط رہنا ہو گا۔ میں نے ماں سے ڈسکشن کی تو انہوں نے مجھے تیار ہو کر ٹال جانے کی نصیحت کرتے ہوئے یہ بھی ت دیں کہ میں رات والے واقعے کا کسی سے بھی کوئی ذکر نہ کروں۔

چنانچہ میں نے غسل وغیرہ کر کے جیسے تیسے ناشتہ زہر مار کیا اور جیپ میں سوار ہو کر ٹال کی طرف ہو گیا۔ ٹال پہنچا تو منیجر مشتاق سے پہلے ملاقات ہوئی۔ اس کے ساتھ ذرا گھوم پھر کر مزدوروں اور لڑوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا، اس کے بعد آرا مشین کے ہال کا جائزہ لیا اور اپنے آفس روم کی ونگ چیئر پر آ کر دھنس گیا۔

مشتاق میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر کچھ اُلجھن آمیز شکنیں محسوس کر میں نے خود ہی پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے؟..... تم کچھ پریشان ہو؟''

''او جی، پریشانی کیسی جی کڑا کے۔'' میرے جیسے پوچھنے کی دیر تھی اور اس کے بولنے کی۔ ''رضوی ب اصرار کر رہے ہیں کہ اعلیٰ درجے کے شیشم اور شاہ بلوط کے دوٹرک درکار ہیں۔''

''تو پھر کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے اس کے اول جلول چہرے پر نظر مرکوز رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی پوچھتا کہ وہ پٹڑی سے نہ اترنے پائے۔

''دو مسئلے ہیں جی..... جی کڑا کے.....'' وہ بولا۔ ''پہلا تو یہ ہے کہ شاہ بلوط کی دوسری اور ا کھیپ ٹھیکے دار رب نواز نے ابھی تک نہیں بھیجی ہے۔ جبکہ وہ کم بخت پے منٹ بھی لے چکا ہے۔ ا اہم بات یہ ہے جی کڑا کے کہ..... رضوی صاحب نے اس کی سپلائی خالصتاً ہمارے ذمے لگا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے..... بھتہ اور اخراجات کی مد میں جو رقم بنتی ہو، وہ اس سے پیشگی لے لو اور مال سپلائی

لیکن سر جی! ٹھیکے دار رب نواز نے ابھی تک وعدے کے مطابق شاہ بلوط کی آخری کھیپ نہیں بھیجی جی کڑا کے۔''

کب تک بھیجنی تھی اس نے لکڑی؟'' میں نے دریافت کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''او جی دو دن پہلے کا وعدہ تھا۔ آج چوتھا دن جا رہا ہے۔ ادھر رضوی صاحب نے بھی مقرر
مال نہ ملنے پر سودا منسوخ کرنے کی دھمکی دے ڈالی ہے، جی کڑا کے۔''
''تو اس نے آخری تاریخ کون سی مقرر کی ہے اب؟''
''پرسوں دوپہر تک کی مہلت دی ہے۔''
''تو کل کا دن ہے ہمارے پاس..... ٹھیک ہے، میں کل ٹھیکے دار رب نواز سے بات کروا
''اونہیں جی سر! اس سے آج ہی رابطہ کرنا پڑے گا۔ پورا ایک دن تو کٹائی اور شہتیر بنانے
جائے گا۔ پھر دو ٹرکوں میں لوڈ بھی کرانا ہے جی کڑا کے۔''
''تم ایسا کرو جی کڑا کے ..... اونہہ.....'' میرے منہ سے بے اختیار اس کا تکیہ کلام
گیا۔ کمبخت بار بار جو اس لفظ کی گردان کر رہا تھا۔
''تم ایسا کرو کہ اسی وقت ٹھیکے دار رب نواز سے میری بات کراؤ۔ اس کے بعد رضوی سے
کروانے کا کرایہ وغیرہ تم خود طے کر لینا۔''
''بہت بہتر جی۔'' وہ ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھانے لگا۔
''موبائل نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟''
''ہے جی..... مگر.....''
''اگر مگر چھوڑو..... مجھے اس کا نمبر بتاؤ۔ میں بات کرتا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کا
اور ساتھ ہی اپنی جیب سے موبائل بھی نکال لیا۔ پھر منیجر مشتاق نے مجھے ٹھیکیدار رب نواز کا نمبر
موبائل پر پنچ کرنے کے بعد میں نے اپنا موبائل کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف رنگ جا رہی تھی
اس کے بعد خلاف توقع ایک کھنکتی ہوئی زنانہ آواز اُبھری۔
''ہیلو!..... کون؟''
میں ذرا گڑبڑا سا گیا اور گھور کر سامنے بیٹھے منیجر مشتاق کو دیکھا۔ اس کمبخت نے شاید غلط نمبر
''کیا چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے یا پھر میری آواز کے سحر میں کھو گئے ہو؟..... بولتے کیو
کون ہیں آپ؟'' مجھے خاموش پا کر دوسری طرف پُر شوخ آواز مگر تند لہجے میں پوچھا گیا تو
بات کرنا پڑی۔
''میں دراصل ٹھیکے دار رب نواز صاحب سے بات کرنا چاہتا تھا مگر.....'' میں نے دانستہ
ادھورا چھوڑا تو دوسری طرف کھلکھلاتی ہوئی ہنسی کی آواز اُبھری۔
''اوہ..... آئی سی۔ شاید رانگ نمبر مل گیا ہے۔ لیکن کہیں آپ مجھ سے ڈر کر تو نہیں
ہیں؟'' آواز میں تازگی اور لہجے میں پُر شوخ اُٹھان تھی۔ تاہم میں اب گفتگو کو طول دینے کے
تھا اور اول جلول منیجر مشتاق کی خبر لینے کی غرض سے بات ختم کرتے ہوئے اس طرح دار، د
والی لڑکی سے بولا۔
''آئی ایم سوری.....'' یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور منیجر مشتاق کی طرف گھو
''بے وقوف!''
''کیا فون پر ہے، جی کڑا کے؟'' منیجر مشتاق نے اُلّوؤں کی طرح دیدے پھاڑ کر مجھ سے
''فون کے بچے! تم نے غلط نمبر دے دیا تھا۔ دوبارہ چیک کرو۔'' میں نے گھورتے ہو
جھڑکا۔ وہ بوکھلا گیا اور جلدی سے گڑبڑا کر بولا۔



''اونہیں جی! یہی نمبر ہے۔ میں نے خود دو مرتبہ بات کی تھی ٹھیکے دار رب نواز سے۔ لو جی، میں ابھی
کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے وہی نمبر اپنے موبائل سے ملایا اور کان سے لگا لیا۔
''ہیلو جی! ٹھیکے دار رب نواز صاحب..... جی کڑا کے..... او جی نہیں، یہ میرا تکیہ کلام ہے۔
لیں جی، نادر صاحب سے بات کریں۔''
یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے موبائل اپنے کان سے
لگا دیا اور ہیلو کہا تو دوسری جانب سے وہی نسوانی اور پُر شوخ آواز اُبھری۔
''اوہ..... تو گویا آپ کو میری آواز پسند آ گئی ہے جو اب کسی اور موبائل کے ذریعے مجھ سے
دوبارہ رابطہ کیا ہے۔ ویسے میری آواز کے ساتھ میرے سینڈل بھی پیارے ہیں۔ اس کا نمبر بتاؤں؟''
میں نے بری طرح بوکھلا کر فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر منیجر مشتاق سے دھاڑ کر بولا۔
''یہ کیا بے ہودگی ہے منیجر! اس عمر میں تمہیں یہ شوخیاں زیب نہیں دیتیں۔'' منیجر مشتاق کی حالت
دیدنی ہو گئی۔ وہ واقعی جی کڑا کے لرزتی آواز میں بولا۔
''جی..... جی کڑا کے..... سر جی! وہ..... وہ.....''
''کیا وہ، وہ..... تم ہر بار وہی رانگ نمبر ملا رہے ہو۔'' میں نے آنکھیں نکال کر غصے سے سرخ ہو
کر کہا۔
''اونہیں جی! ابھی ابھی ٹھیکے دار رب نواز نے مجھ سے اپنی بھاری اور مردانہ آواز میں بات کی تھی، جی
کڑا کے..... لائیے، میں دیکھتا ہوں دوبارہ۔''
میں نے اسے گھورتے ہوئے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دوبارہ نمبر ملانے لگا۔ پھر رابطہ
ہوتے ہی دوسری طرف سے غالباً مطلوبہ آواز سن کر بولا۔
''یہ کیا مذاق کر رہے ہیں آپ ٹھیکے دار جی! آپ بات کیوں نہیں کرتے نادر صاحب سے؟.....
یہ لیں جی۔'' منیجر مشتاق نے ڈرتے ڈرتے اپنا موبائل پھر میری جانب بڑھایا اور میں نے موبائل اپنے
کان سے لگاتے ہی ہیلو کہا۔
''بتائے دیتی ہوں۔ میری سینڈل کا نمبر نو ہے اور بہت تیزی سے سرگنجا کر کے رکھ دیتی ہے۔''
دوسری جانب سے پھر وہی پُر شوخ نسوانی آواز ابھری اور میں نے غصے سے چراغ پا ہو کر موبائل منیجر
مشتاق کو کھینچ مارا۔ وہ بے چارہ پہلے ہی ڈرا ہوا تھا لہٰذا موبائل باؤنسر کی طرح اس کی ناک پر لگا۔ اس کی
آنکھوں میں پانی اتر آیا۔
''نان سنس!..... دفع ہو جاؤ یہاں سے، گدھے!..... اُلّو!'' میں چراغ پا ہو کر دھاڑا۔ منیجر
مشتاق کی حالت دیکھنے والی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی گود میں گرے ہوئے موبائل کو اٹھایا۔ حیران پریشان
سا اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اسے آواز دی۔
''سنو.....!''
وہ رک گیا۔
''ٹھیکے دار رب نواز کے دفتر یا رہائش گاہ کا کوئی ٹیلی فون نمبر ہو گا تمہارے پاس؟'' میں نے پوچھا۔
وہ بے چارہ ڈرتے ڈرتے منمناتی آواز میں بولا۔ ''ہے تو سہی..... مم..... مگر.....'' وہ
کہتے کہتے رک گیا اور میں اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بے اختیار ہنس دیا۔
''مجھے نمبر بتاؤ۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk





اس نے نمبر بتایا۔ نمبر دفتر کا تھا۔ میں نے اپنے سامنے میز پر دھرے ٹیلی فون سیٹ سے نمبر ملایا۔ وہ وہیں موجود تھا۔

"ہیلو.........!" اس کی بھاری آواز اُبھری۔

"ٹھیکے دار رب نواز صاحب؟" میں نے استفسار طلب لہجے میں کہا۔

"ہاں، ہاں......... بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟" گمبھیر آواز میں کہا گیا۔

"مری ٹال سے نادر علی خان بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں، بولیں۔ کیا بات ہے؟" رکھائی سے پوچھا گیا۔

میں نے بھی سپاٹ لہجہ اختیار کیا اور جواباً اسی رعونت سے بولا۔ "میرا منیجر بتا رہا تھا کہ آپ نے منٹ لینے کے باوجود ابھی تک شاہ بلوط کی دوسری کھیپ نہیں بھیجی ہے؟"

دوسری طرف چند ثانیے پُرسوچ خاموشی طاری رہی اور پھر ٹھیکے دار رب نواز کی آواز اُبھری۔

"ہاں......... بھیج دیں گے......... دو تین روز میں......... دراصل........."

میں نے اس کی بات کاٹ کر قدرے تلخی سے کہا۔ "رب نواز صاحب! ہمیں مال آج ہی چاہئے ہمارا ایک پارٹی سے سودا ڈن ہو چکا ہے۔ آپ کو یہ مال وعدے کے مطابق تین روز پہلے ہی بھیج دینا چاہئے تھا۔ اب تاخیر ممکن نہیں رہی۔ ہمیں لاکھوں کا نقصان ہوگا۔"

"میں آپ کی مجبوری سمجھ رہا ہوں۔" دوسری طرف رب نواز کی آواز اُبھری۔ "دراصل ہم نے خود لکڑی ہزارہ سے منگوائی تھی......... بارشوں کی وجہ سے ٹرک پھنس کر رہ گئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟"

"کون سے علاقے میں ٹرک پھنسے ہیں آپ کے؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

اس نے فوری جواب نہ دیا۔ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولا۔ "حویلیاں سے آتے ہوئے طوفانی بارشوں سے ایک پُل ڈھے گیا تھا۔"

"تو گویا ٹرک وہیں کھڑے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً۔"

"آپ نے ٹرک نکلوانے کے لئے کیا انتظامات کروائے ہیں؟"

"ظاہر ہے، اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو ہم نہیں بیٹھے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کر ہی رہے ہیں۔" وہ ہو کر بولا۔

میں اب کیا کہہ سکتا تھا۔ ناچار رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد رضوی صاحب سے بات کی معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"جناب! معافی چاہتے ہیں......... بات دراصل یہ ہے کہ........."

میں نے اسے مجبوری بتائی۔ میرا خیال تھا وہ ناک بھوں چڑھائے گا۔ مگر وہ خوش اخلاقی سے

"تم نادر علی خان!......... مرحوم حیدر گل کے بھانجے تو نہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔

"اللہ بخشے حیدر گل کو۔ بڑا ہی نفیس اور بھلا مانس تھا۔ میرے اس سے محض کاروباری روابط ہی نہیں بلکہ برادرانہ تعلقات بھی تھے۔ کوئی بات نہیں......... دراصل مجھے مال جلدی چاہئے تھا اور میں تھا اس لئے میں نے غصے میں آ کر تمہارے منیجر کو سودا منسوخ کرنے کی دھمکی دے ڈالی تھی۔





دو تین روز کی تاخیر قابلِ برداشت ہو سکتی ہے۔"

مجھے وہ بڑا ہی نفیس انسان لگا۔ چنانچہ میں نے بھی انکسار سے کہا۔ "نہیں جی رضوی صاحب! یہ آپ کا بڑا پن ہے۔ درحقیقت قصور ہمارا بھی نہیں ہے۔ جس ٹھیکے دار نے ہمیں لکڑی سپلائی کرنا تھی، اس کے ٹرک حویلیاں میں تیز طوفانی بارشوں کے باعث پُل ٹوٹنے سے وہیں پھنس کر رہ گئے ہیں۔"

"اوہ، اچھا......... ویسے کون سے ٹھیکے دار سے منگوائی ہے لکڑی؟" رضوی صاحب نے پوچھا۔

"رب نواز سے۔" میں نے بتایا۔

"رب نواز........." رضوی صاحب نے عجیب لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ایک نمبر کا چیٹر آدمی ہے۔ تمہارے ماموں حیدر گل نے تو اس سے سودے بازی ہی منسوخ کر رکھی تھی۔ تمہیں شاید نہیں معلوم، اس نے تمہارے ماموں کو ایک دفعہ دیمک زدہ لکڑی فراہم کر دی تھی اور صاف مُکر گیا تھا۔"

"کیا.........؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

"ہاں۔ تمہارے منیجر مشتاق کو بھی اچھی طرح علم ہوگا۔ پورے ساٹھ لاکھ تمہارے ماموں سے وصول کرنے کے باوجود انہیں دیمک زدہ لکڑی دے ڈالی تھی۔ تمہارے ماموں بے چارے امن پسند آدمی تھے، اس بات کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی گئے۔ کیونکہ رب نواز کچھ اچھی شہرت کا آدمی نہیں ہے۔ اس نے تو غنڈے بھی پال رکھے ہیں۔ خیر، تم ڈرنا مت بیٹا!"

رضوی صاحب نے کہا اور میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا۔ پھر گم صم سے لہجے میں ان کا شکریہ ادا کر کے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے سامنے بیٹھے منیجر مشتاق کو گھورنے لگا۔ وہ اٹھ کر کھسکنے لگا۔

"بیٹھو!" میں اسے گھورتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔ "رضوی صاحب بتا رہے تھے کہ اس مردود ٹھیکے دار رب نواز نے ہمیں کچھ عرصہ پہلے ساٹھ لاکھ کے عوض دیمک زدہ لکڑی دے دی تھی؟"

"نن......... نہیں......... جی کُڑا کے۔" وہ منمناتی آواز میں بولا تو میں غصے سے چلّا کر بولا۔

"بھاڑ میں گیا تمہارا، جی کُڑا کے......... ہاں یا نہ میں جواب دو۔"

"وہ......... وہ......... جی، یہ......... بہت پرانی بات ہوگئی۔ آپ کے ماموں حیدر گل نے معاملہ طے کر دیا تھا۔" وہ جواباً ڈرتے ڈرتے بولا۔

میں نے اس کے چہرے سے صاف محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا تھا۔ لہٰذا گھورتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "کس طرح معاملہ طے کیا تھا ماموں نے؟"

"چھوڑیں سر جی! مٹی ڈالیں۔ یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔" وہ بولا تو میں نے دانت کچکچا کر اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں مٹی تمہاری قبر پر ڈالوں گا منیجر! اور وہ بھی زندہ تمہیں زمین میں گاڑ کر۔" میری بات پر اس کے ہونق سے چہرے پر ایسے تاثرات اُبھرے جیسے اسے پرانی قبض کی تکلیف ہو۔

"جب تمہیں معلوم تھا کہ رب نواز نے پہلے بھی ہم سے دھوکا کیا تھا تو پھر تم نے اس سے دوبارہ کیوں کاروباری مراسم استوار رکھے؟......... اور ٹھیکے دار مر گئے تھے؟"

"سر جی! شاہ بلوط اور شیشم جیسی قیمتی لکڑی کی سپلائی کا واحد ٹھیکے دار رب نوز ہی ہے۔ اور پھر فوری طور پر یہی ہمیں مال دے سکتا تھا۔" وہ منمناتی آواز میں بولا۔

"بے وقوف!" میں دانت پیس کر بولا۔ "اچھا اب مجھے یہ بتاؤ کہ ماموں حیدر گل نے ٹھیکے دار رب نواز سے رقم واپس لی تھی یا نہیں؟"

وہ سمجھ گیا کہ بات اب میرے کان میں پڑ چکی تھی لہٰذا بولا۔ ''نہیں جی! وہ حرام کا جنا سارے ہڑپ کر گیا تھا، جی کڑا کے۔''

''جی کڑا کے نہیں، بغیر ڈکار لئے۔'' میں نے دانت پیس کر گویا تصحیح کی۔

وہ مزید گھبرا گیا۔ ''آپ کے ماموں نے اس کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی تھی۔ مگر سوائے پیشیاں بھگتنے کے انہیں کچھ نہ ملا۔''

''تو اور ہماری عدالتوں میں کیا ہوتا ہے؟......... فریادی کو ہی جائز و ناجائز کیس بھگتنا پڑتا میں تلخی سے بڑبڑایا۔ ''خیر......... اس کے دستاویزی ثبوت یا کوئی تفصیلات؟''

''جی ہاں۔'' اس نے سر ہلایا تو میں نے تحکمانہ کہا۔

''کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر میری ٹیبل پر پیش کرو۔''

میری بات پر وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔ ''سس......... سر جی! وہ......... وہ رب نواز بڑا ڈ خطرناک آدمی.........''

''تم اپنی کھال میں رہو۔ ورنہ مجھ سے اتروا لو۔'' میں پُرطیش لہجے میں دھاڑا۔

''جی......... جی اچھا......... ابھی لایا۔'' وہ یکدم گھبرا کر اُٹھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں غصے کے مارے بری طرح پھنک رہا تھا۔ ٹھیکے دار رب نواز نے ماموں حیدر گل کے ساتھ لاکھ کا دھوکا کیا تھا اور انہوں نے مجھے بتایا تک نہیں تھا۔ درحقیقت اس میں ماموں حیدر گل کی بد دخل نہ تھا۔ وہ اپنے تئیں دغاباز رب نواز سے نمٹنے کی کوشش کرتے بھی رہے ہوں گے۔ مگر انہوں گمبھیر معاملہ اپنے تک ہی محدود رکھا تھا۔ جس طرح شاہ میر اور نظر حیات کے سنگین معاملے سے مجھے رکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ مجھے اب پورا یقین تھا کہ ٹھیکے دار رب نواز اس بار مجھ سے بھی فرا چاہتا تھا اور اس نے یقیناً مجھ سے جھوٹ بولا ہوگا کہ اس کے ٹرک حویلیاں کے مضافات میں پھنس گئے ہیں۔

میں سوچنے لگا کہ مجھے نہ صرف اس بات کی تصدیق کے لئے کوئی عملی قدم اٹھانا پڑے گا بلکہ لاکھ کی رقم بھی اس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر نکلوانا پڑے گی۔ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ نگینہ کی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔

''ہاں نگینہ! کہو، خیریت تو ہے؟'' خیریت کہاں تھی، یہ تو روا روی میں میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ اُس کی پژمردہ آواز اُبھری۔ ''نادر! ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ مجھے پپا کو لے کر ا جانے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کا (SPINAL CORD) حرام مغز متاثر ہوا ہے۔'' وہ غمزدہ لہجے میں میں پریشان ہو گیا۔

''تت......... تو پھر......... تم کیا کرو گی؟'' میں نے مرتعش لہجے میں پوچھا۔

''نادر! تم جانتے ہو کہ پپا کے سوا میرا اس دنیا میں اور کون ہے ......... میں نے سیٹیں کنفرم ہیں۔ آج شام کی فلائٹ سے میں اسٹیٹس روانہ ہو رہی ہوں۔''

میں جامد ہو کر رہ گیا۔ نگینہ کی غم ناک آواز میرے دل و جگر پر آرے چلا رہی تھی۔ پھر اپنے ا رقت آمیز کیفیت پر قابو پا کر میں اس سے بولا تو مجھے اپنی آواز دل کے عمیق گوشوں سے اُبھرتی ہوئی۔ اس میں شکست خوردگی بھی تھی، ندامت بھی اور درد آگیں کسک بھی۔

''نگینہ! میں بری طرح پس رہا ہوں۔ میں تم سے محبت کا بھی دعوے دار ہوں اور تمہیں زخمی زخ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہا ہوں۔ نن......... نگینہ! یہ......... یہ کیسا امتحان ہے؟......... یہ کیسی آزمائش ہے؟ کیا......... کیا ہمیں ایک دوسرے کے دشمنوں کے گھر میں ہی پیدا ہونا تھا؟ کاش......... کاش نگینہ! ہم ترائیوں میں آباد کسی غریب کی جھونپڑی میں پیدا ہوتے۔'' میری آواز رندھ گئی۔ لہجہ لرزش زدہ تھا۔ ''نگینہ! مم......... مجھے معاف کر دو گی؟......... مم......... مجھے معاف کر دو گی نا؟'' میں رو پڑا۔

''نادر! میں سمجھتی ہوں، تمہارا بھی کوئی دوش نہیں۔'' نگینہ کی مہین آواز اُبھری۔ ''مجھے تمہاری آزمائش، تمہاری پوزیشن کا احساس ہے اور شاید تمہاری مجبوری سمجھنے کے لئے ہی تقدیر مجھے ایسی آزمائش سے گزار رہی ہے۔ جہاں تم ایک ماں کے بیٹے ہو تو وہاں میں بھی ایک باپ کی بیٹی ہوں مگر......... میرا باپ تمہارا اور تمہاری ماں کا مجرم ہے۔ یہ میں بھی سمجھتی ہوں۔ مگر......... مگر نادر! کبھی کبھی بس مجھے یہ بات اندر سے بے چین کر دیتی ہے کہ ہم لوگوں کے رویوں میں لچک، ایک دوسرے انسان کے لئے کیوں نہیں آتی؟ ہم ایک دوسرے کو معاف کرنے کا حوصلہ کیوں نہیں رکھتے؟''

''نگینہ! تم صحیح کہہ رہی ہو۔'' میں نے ماں کی طرف سے اس کا اشارہ سمجھ کر اعترافاً کہا۔ ''مگر نگینہ! معافی بھی تو درپردہ اعتماد اور بھروسے پر مشروط ہوتی ہے۔ اگر تمہارا باپ شاہ میر سچے دل اور سچی نیت سے اس روز تمہارے ساتھ ہم ماں بیٹے سے معافی مانگنے آیا تھا تو پھر اس نے نظر حیات جیسے کمینے کے ساتھ مل کر ہم ماں بیٹے پر اس رات شب خون کیوں مارنے کی کوشش کی تھی؟''

میری اس بات پر نگینہ نے پہلے کی طرح خاموشی اختیار کر لی اور پھر جیسے موضوع بدل کر بولی۔

''نادر! میں پپا کو لے کر امریکہ جا رہی ہوں......... کیا میں تم سے اپنے پپا کی صحت یابی کے لئے دعا کی درخواست کر سکتی ہوں؟''

میں اس کی بات پر خاموش رہا تو نگینہ نے ہی شاید میری خاموشی بھانپ کر کہا۔ ''نادر! میری محبت کی قسم، جو مجھے تم سے ہے اور تا ابد رہے گی کہ خدا تم دونوں ماں بیٹے کو لمبی عمر دے کہ شاید میرے سچے دل سے نکلی ہوئی دعا پلٹ جائے۔ اچھا، خدا حافظ!''

''نگینہ! خدا تمہارا حامی و ناصر ہو......... خدا حافظ!'' میں نے بھی کپکپاتے لہجے میں کہا۔ اچانک نگینہ نے پوچھا۔

''تم مجھے سی آف کرنے آؤ گے؟''

''تم کیا کہتی ہو؟''

''تمہاری مرضی۔''

''تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو نگینہ؟''

''ہرگز نہیں......... کیونکہ ہم نے عہد کر رکھا ہے کہ کڑی آزمائش کے پل صراط سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گزریں گے۔''

''اوہ، نگینہ!......... آئی لو یو......... ایکسٹریملی آئی لو یو ٹو مچ۔'' میں نے مسرت آگیں لہجے کی گہرائیوں سے کہا۔

''آئی لو یو ٹو۔'' نگینہ نے بھی ایسے ہی لہجے میں کہا۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔

ریسیور رکھ کر میں نے تھکے تھکے انداز میں ریوالونگ چیئر کی چوڑی پشت گاہ سے کمر ٹکا دی اور آنکھیں موند لیں۔

''سر جی!......... یہ فائل۔'' منیجر مشتاق کی آواز پر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



وہ فائل میرے سامنے لئے کھڑا تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تو اس نے فائل میری طرف بڑھا
میں نے ایک گہری سانس لی۔ نگینہ سے گفتگو کے بعد میرے دل و دماغ پر قنوطیت سی چھانے لگی۔
امریکہ جانا مجھے گہرے تفکر میں مبتلا کئے ہوئے تھا۔ لیکن میں اسے روک بھی تو نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے
کے علاج کی غرض سے جا رہی تھی۔ اس لئے میری طبیعت بوجھل سی ہو رہی تھی۔ میں نے فائل
کھولے بغیر میز پر رکھ دی اور منیجر مشتاق سے چائے کا کہا۔

اس نے فوراً چائے منگوا لی۔ ایک کپ میری جانب بڑھایا۔ میں نے ایک چسکی بھری اور ایک
ہنکاری لی۔ منیجر مشتاق بہ غور میرے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ میرے چہرے کے تھکے تھکے، فکرمند تا
کی وجہ کو اپنے تئیں بھانپ کر بولا۔

''سر جی! اس مسئلے کی وجہ سے اللہ بخشے آپ کے ماموں مرحوم بھی بڑے پریشان رہتے تھے...
پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے جی، دفع کریں اس پرانے مسئلے کو۔ کیوں گڑے مُردے اُکھاڑ کر مزید پریشا
رہے ہیں؟''

میں نے اسے گھور کر دیکھا اور جھڑک کر بولا۔ ''تم اپنی چونچ بند رکھو۔''

میری بات پر اس نے یکدم ایک ہاتھ سے اپنے ہونٹوں کو چھوا۔ گویا اسے ڈر ہو کہ کہیں واقعی
چونچ تو نہیں اُبھر آئی۔ مجھے اُس کی اس حرکت پر ہنسی تو آئی۔ تاہم میں نے ضبط کرتے ہوئے فا
جانب ہاتھ بڑھایا۔

اس میں چند کاغذات تھے۔ میں بہ غور ان کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ ٹھیکے دار رب
کی ماموں حیدر گل سے دغا بازی والا معاملہ زیادہ پرانا نہ تھا، ان کی موت سے صرف دو ایک ماہ پہ
کی بات تھی۔ اور عدالت سے بھی رجوع کیا گیا تھا مگر ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کیس داخل د
چکا تھا یا پھر خارج کر کے رب نواز کے حق میں فیصلہ ہو گیا تھا۔ ایک کاغذ میں ٹھیکے دار رب نواز کی ر
گاہ اور دفتر کے فون نمبرز بھی درج تھے۔ موبائل نمبر بھی تھا اور مکمل ایڈریس بھی۔ میں نے یہ سب
نشین کئے تو موبائل نمبر پر میں چونکا۔ یہ واقعی درست تھا، جو منیجر مشتاق نے مجھے دیا تھا۔ مگر میرے ما
پر ہر بار اس شوخ لڑکی کا رانگ نمبر مل جاتا تھا۔

میری پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ ''نمبر تو وہی ہے..... پھر کیوں رانگ نمبر لگ رہا تھا؟''
گومگو انداز میں بڑبڑایا تو منیجر مشتاق میرے بڑبڑانے کا مطلب سمجھتے ہوئے بہ یک جنبش بولا۔

''دیکھا سر جی! آپ بلاوجہ مجھے ڈانٹ رہے تھے۔ یہی رب نواز کا موبائل نمبر تھا۔''

''ہاں، ہے تو یہی۔'' میں پُرسوچ لہجے میں تائیداً بولا۔ ''تو پھر ..... ہر بار لڑکی کی کیوں آ
رہی تھی؟ حالانکہ بہ قول تمہارے، تم نے رب نواز کی آواز بھی سنی تھی اور دوبارہ موبائل میری جانب ک
تو پھر اس لڑکی کی آواز مجھے سنائی دی تھی۔

''میں خود پریشان ہوں سر جی!'' وہ بولا۔ ''سر جی! مجھے تو لگتا ہے رب نواز ہی آپ کو ٹالنے کی
لڑکی کی آواز میں بول رہا ہوگا۔''

''نہیں..... یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ خیر، بھاڑ میں ڈالو۔'' میں نے بیزار ہو کر کہا پھر اس
معاملے کی ساری تفصیل پوچھنے لگا۔ اس کے بعد میں نے ایک لائحہ عمل تیار کیا۔ فوری طور پر، سب
پہلے بہ قول رب نواز کے اس کے تین ٹرک حویلیاں کے قریب اچانک پل ٹوٹ جانے کی وجہ سے
رہ گئے تھے، میں اس کی تصدیق کر کے یہ معاملہ حل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد ساٹھ لاکھ والے دھوکا



کے مسئلے پر توجہ دینے کا ارادہ کیا۔

اس کے بعد میں اپنی جیپ میں بیٹھ کر اسی وقت ٹھیکے دار رب نواز کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔
منیجر مشتاق سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس دغا باز ٹھیکے دار رب نواز کا دفتر نتھیا گلی کی طرف
جاتے ہوئے کلڈانہ چوک کے دائیں ''جھیکا گلی'' کی طرف تھا۔

چنانچہ کلڈانہ چوک میں پہنچ کر میں بغیر رکے دائیں جانب جھیکا گلی کو مڑ گیا۔ اب میں شاہ بلوط، صنوبر اور
چیڑ کے گھنے اور خوب صورت درختوں کے بیچ بل کھاتی پختہ سڑک سے گزر رہا تھا۔

تقریباً چھ سات کلومیٹر تک خوبصورت ہوٹلوں کی قطار میں ایک عدد گالف کورس اور دیدہ زیب پارک
سے گزرتا ہوا جب میں ''بھوربن'' جانے والے راستے پر آیا تو دائیں جانب مجھے ایک خاصے وسیع و عریض
سرسبز مسطح قطعہ اراضی پر سفید رنگ کی عمارتی لکڑی کے دفاتر نظر آئے۔

میں اپنے مطلوبہ دفتر کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیپ سے اتر کر میں احاطے پر بنے گیٹ پر پہنچا تو
ایک چوکیدار نے مجھے بتایا کہ رب نواز اپنے گھر جا چکا تھا۔

میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ابھی دن کے گیارہ ہی بجے تھے۔ پھر چوکیدار کی طرف
دیکھ کر حیرت سے بولا۔ ''تمہارے صاحب اتنی جلدی گھر چلے گئے؟''

''جی ہاں..... آج انہیں گھر پر ضروری کام تھا۔'' چوکیدار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

مجھے رب نواز کی رہائش گاہ کا پتہ معلوم تھا۔ میں واپس لوٹ کر اپنی جیپ میں آ بیٹھا۔ چند ثانیے
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ مجھے آج ہر حالت میں اس دغا باز ٹھیکے دار سے ملنا تھا۔ چنانچہ میں
نے اس کے گھر پر ہی ملاقات کرنے کی ٹھانی اور جیپ اسٹارٹ کر کے ریورس لے گیا۔ اس کی رہائش گاہ
پاڑیاں سے خیرہ گل میں چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔

میں جیپ دوڑاتا ہوا خیرہ گل جا پہنچا۔

ٹھیکے دار رب نواز کی کوٹھی دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ نسبتاً بلند اور آبادی سے ہٹ کر ایک
وسیع قطعہ اراضی پر واقع تھی۔ کوٹھی اگرچہ ایک منزل پر ہی مشتمل تھی مگر اس کا رقبہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔
مجھے دور سے ہی کوٹھی کی پیشانی پر درج جلی حروف میں ''کاشانہ پیلس'' نظر آ گیا تھا۔ میں ابھی جیپ میں
بیٹھا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے تفصیلی جائزہ لے رہا تھا اور دانت پیس کر دغا باز ٹھیکے دار رب نواز کے بارے
میں سوچ رہا تھا کہ ضرور اس مردود اور دھوکے باز انسان نے اپنی زندگی ہیرا پھیری کے سہارے ہی
گزاری ہے۔ ورنہ میں نے کسی لکڑی کے ٹھیکے دار کو یوں طمطراق اور شاہانہ زندگی بسر کرتے ہوئے آج
تک نہیں دیکھا تھا۔

میں نے گیٹ پر پہنچ کر جیپ روک دی۔ وہاں دو گن مین چوکس کھڑے نظر آئے۔ میں نے ایک
سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میرا نام نادر علی خان ہے۔ اور میں رب نواز صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

دونوں دراز قامت تھے اور ہلکے نیلے رنگ کی مخصوص وردی میں ملبوس تھے۔

''کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو؟'' اس نے جواباً پوچھا۔

''مجھے ان سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ میں ان کے دفتر بھی گیا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ
آج جلد ہی اپنے گھر جا چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔

دونوں نے بہ غور میرا جائزہ لیا۔ پھر دوسرے نے کہا۔ ''صاحب کی آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ
آرام کر رہے ہیں۔ آپ کسی اور وقت آ جانا۔''

میں سمجھ گیا کہ دونوں ہی جھوٹے تھے، اپنے صاحب کی طرح۔ یعنی دفتر کا چوکیدار اور گھر کا چوکیدار
اُس نے مجھ سے کہا کہ رب نواز کو گھر پر ضروری کام تھا اور یہ کہہ رہے تھے کہ اس کی طبیعت خراب تھی
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں ..... میں مری سے آیا ہوں اور ان سے ضروری بات کرنی ہے۔ اس بہانے ان
مزاج پرسی بھی کرلوں گا۔ میرے ان سے کاروباری روابط کے علاوہ دوستانہ تعلقات بھی ہیں۔''

دونوں کچھ سوچنے لگے۔ پھر ایک نے کہا۔ ''آپ کے پاس ان کا موبائل نمبر تو ہوگا ہی۔ کیا آ
نے ان سے رابطہ نہیں کیا تھا؟''

''ان کا موبائل شاید آف ہے۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے مجھ سے کہا۔ ''پھر تو آپ کا ان سے ملنا مشکل ہے
آپ ایسا کریں، پھر کل ان سے دفتر میں ہی ملاقات کر لیجئے گا۔ ہم مجبور ہیں۔''

میں ہونٹ بھینچے چند ثانیے کچھ سوچتا رہا۔ پھر میں نے رب نواز سے موبائل پر رابطہ کرنے کا ارادہ
اور ابھی میں اپنی جیب سے موبائل نکالنے ہی لگا تھا کہ اچانک عقب سے کسی گاڑی کے ہارن کی آو
اُبھری اور ساتھ ہی ایک چوکیدار نے مجھ سے کہا۔

''آپ ذرا ایک طرف ہو جائیں۔ چھوٹی بی بی کی گاڑی آ رہی ہے۔''

میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ایک نئے ماڈل کی چمچماتی کرولا رینگتی ہوئی آ رہی تھی۔ چوکیداروں
گیٹ کھول دیا تھا اور دائیں بائیں دست بستہ مؤدبانہ کھڑے ہو گئے۔

میری نظریں کار پر پڑیں۔ ایک خوش جمال، پری وش چہرہ نظر آیا۔ رنگت گوری تھی، بال بوائے کٹ
تھے، آنکھوں پر ''رے بن'' چشمہ تھا۔ خاصی الٹرا ماڈرن اور جوان لڑکی نظر آتی تھی۔ بالوں کا رنگ
براؤن تھا یا پھر ڈائی کئے ہوئے تھے۔

اس نے میری طرف دیکھا تھا، پھر کار اندر لے جانے کی بجائے اس نے گیٹ پر ہی روک دی تھی
ایک چوکیدار چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا اور گولی کی طرح اس کی طرف بڑھا۔

''کون ہے یہ؟'' لڑکی نے چوکیدار سے بڑی سریلی آواز میں پوچھا۔ مگر میں اس مترنم آواز پر بر
طرح چونکا تھا۔ یہ وہی کھنکتی اور شوخ و شنگ آواز تھی۔ مجھے یاد آیا تھا، جب میں رب نواز سے موبائل
رابطہ کرنے کی کوشش کرتا تو رانگ نمبر مل جاتا اور یہی کھنکتی ہوئی آواز میرا استقبال کرتی۔ مجھے شدید حیرت
ہوئی۔ میں قریب ہی کھڑا تھا۔ چوکیدار جواباً مؤدبانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''بی بی جی! وہ..... وہ دراصل صاحب سے ملنا چاہتے تھے۔''

لڑکی نے پھر میری طرف دیکھا اور عینک اوپر کر دی۔ اس کی آنکھیں پُرکشش اور ہلکی نیلاہٹ مائل
تھیں۔ اچھی طرح مجھے بہ غور دیکھنے کے بعد وہ اسی باادب کھڑے چوکیدار سے بولی۔

''مگر رب نواز تو گھر پر نہیں ہے۔ یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

اس کے انداز تخاطب پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں اسے رب نواز کی بیٹی سمجھا تھا۔ مگر یہ اس کا یوں نا
لے رہی تھی جیسے وہ کوئی معمولی ملازم ہو۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''میرا نام نادر علی خان ہے..... اور میں ٹھیکے دار رب نواز سے ملنے پہلے دفتر ہی گیا تھا۔ مگر وہا
چوکیدار نے مجھے بتایا کہ وہ گھر جا چکے ہیں اس لئے میں یہاں آیا تو یہ دونوں حضرات فرما رہے ہیں کہ و
اندر موجود ہیں مگر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے دانستہ لب کشائی کی تھی تاکہ میری طرح وہ بھی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری ''رانگ نمبر'' والی آواز پہچان جائے۔ اور وہی ہوا، وہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے پہلے تو اپنا
خوب صورت لب والا دہانہ کھولے، دلکش نیلی آنکھیں پھاڑے مجھے تکتی رہی، پھر دوسرے ہی لمحے اس کے
چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ اُبھری۔

اس نے اُڑی اُڑی رنگ کی انتہائی ٹائٹ جینز اور اس پر چست ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں
کورٹ شوز تھے۔ وہ اب کار سے اتر کر جیسے گھورنے کی حد تک میرا تفصیلی جائزہ لینے لگی۔ میں نے اپنے
لمبے چوڑے وجود پر لفافہ ٹائپ براؤن جینز اور اوپر ہاف دھاری دار شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال میرے
ہمیشہ ہی سولجر کٹ کے رہتے تھے۔ میں پورے قد کے ساتھ سامنے چیڑ کے درخت کی طرح کھڑا تھا اور
وہ پیری کے پیڑ کی طرح اپنے پورے نشیب و فراز کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ازحد دلچسپی
اور ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ ہلکورے لے رہی تھی۔

''ہائے، میرا نام کاشانہ ہے۔'' اس نے مترنم آواز میں کہا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے
بھی ہولے سے مسکرا کر مصافحے کے انداز میں اس کا نرم و گداز ہاتھ تھاما اور ایک بار پھر اپنا نام بتایا۔

''کاشانہ'' کے نام پر بے اختیار میری نگاہوں کے سامنے کوٹھی کا نام ''کاشانہ پیلس'' رقصاں ہو گیا اور
ایک بار پھر ایک اندازے کے تحت میں اُلجھن میں مبتلا ہو گیا کہ یہ کوٹھی اس کے نام سے منسوب تھی۔ ہو
سکتا تھا، یہ رب نواز کی دختر نیک اختر ہی ہو۔ اگرچہ تھوڑی دیر پہلے اس نے عجیب انداز میں اپنے باپ کا
نام لیا تھا۔

''آپ کو کس سلسلے میں رب نواز سے ملنا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک کاروباری سلسلے میں ان سے بات کرنا تھی۔ موبائل پر غالباً.....'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا
چھوڑا تو وہ شرارت بھری مسکراہٹ سے بولی۔

''سوری! وہ میری ہی شرارت تھی۔ رانگ نمبر نہیں تھا۔''

''اچھا..... پھر تو آپ نے میرے منیجر مشتاق بے چارے کو اچھی خاصی جھاڑ پلوا دی مجھ سے۔
میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بار بار رانگ نمبر مل رہا تھا۔''

''آپ اندر تشریف لائیں..... پلیز!'' وہ اچانک بولی۔ اس کے ''پلیز'' کہنے میں بے تابانہ اشتیاق
جھلکتا تھا۔

''میں اپنی جیپ اندر لے آؤں؟'' میں نے اپنی جیپ کی طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ پھر اس
کے بعد دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اندر داخل ہو گئیں۔ اندر ایک جانب ڈبل کیبن پک اپ بھی کھڑی تھی۔

ہم وہیں لان میں بچھی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

''آپ کیا لیں گے؟'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کی چین کے کسی بٹن کو پش کیا تو
اندر کوٹھی کے کسی گوشے میں کوئل کی آواز اُبھری۔ یہ ریموٹ کنٹرول بیل تھی، کسی ملازم کو متوجہ کرنے کے
لئے۔ نتیجے میں ایک سانولی سی، پکی عمر کی عورت نمودار ہوئی۔

''کافی پلا دیں۔'' میں نے بلا تکلف کہا۔

''کافی لے آؤ۔'' کاشانہ نے اس سے کہا۔ ملازمہ خاموشی سے لوٹ گئی۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جی.....؟'' وہ بھرپور معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

''رانگ نمبر والی بات پر میں ابھی تک الجھا ہوا ہوں۔ جب میرا منیجر نمبر ملا رہا تھا تو رب نواز صاحب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk


سے سفید جھوٹ بولا تھا۔ درحقیقت وہ تینوں ٹرک کہیں نہیں پھنسے ہیں۔ وہ سارے گودام میں ہی کھڑے ہیں۔ کسی پارٹی نے منہ مانگے داموں ان کا سودا کیا تھا، وہ وہیں سپلائی کرنے والا تھا۔ بلکہ آج دوپہر تک وہیں پہنچا دیئے جائیں گے۔"

مجھے اس کی بات سن کر رب نواز کے جھوٹ، فریب پر بری طرح طیش آیا۔

"لیکن..... ان پر ہمارا حق پہلے بنتا ہے۔ میں اس کی پے منٹ کر چکا ہوں۔ اگلی پارٹی سے میرا سودا منسوخ ہو جائے گا اور ہمیں لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا۔" میں نے کاشانہ سے کہا۔

"آپ کیوں فکر مند ہوتے ہیں؟ میں جو بیٹھی ہوں، رب نواز کے سینے پر مونگ دلنے کے لئے۔ ابھی دیکھو تماشا۔" اس نے یہ کہہ کر اپنے سیل فون پر کسی کے نمبر پنچ کئے اور پھر جیسے ہی دوسری جانب سے کسی کی آواز اُبھری، کاشانہ نے فوراً اپنا دوسرا موبائل نکال کر اپنے سوتیلے باپ کا ایک ریکارڈ شدہ جملہ منتخب کیا اور پہلے والے موبائل کے بالکل قریب کرتے ہوئے ایک بٹن پش کر دیا۔

"گگل خان! گودام نمبر تین اے میں جو ٹرک کھڑے ہیں، وہ مری ٹال والوں کو اسی وقت روانہ کر دو۔ ہاں، ہاں..... وہیں حیدر گل والے ٹال میں۔" اس کے بعد کاشانہ نے دونوں موبائل آف کر دیئے۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"بھلا یہ جملہ تم نے کب اور کیسے فیڈ کر لیا تھا؟" میں نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

اس کے لبوں پر اسرار بھری شاطرانہ مسکراہٹ اُبھری اور پھر الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔ "یہ وہی ٹال ہے نا، جہاں حیدر گل ہوتا تھا؟"

"ہاں..... وہ میرے ماموں تھے۔ مگر اب اس دنیا میں نہیں رہے۔"

"اوہ..... ویری سیڈ!" وہ متاسفانہ لہجے میں بولی۔ پھر بتانے لگی کہ یہ جملہ اس نے اس وقت اپنے موبائل پر ریکارڈ کیا تھا جب وہ میرے ماموں حیدر گل کے ساتھ لاکھ ہڑپ کرنے کے بعد ان کی طرف دیمک زدہ لکڑی کا ٹرک روانہ کرنے کے لئے اپنے گودام کیپر گگل خان کو حکم دے رہا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک گہری ہنکاری خارج کر کے مجھ سے بولی۔

"تو گویا آپ حیدر گل کے بھانجے ہیں۔ میں سمجھتی تھی آپ وہاں کام کرتے ہیں۔ خیر، اب آپ کے مطلوبہ ٹرک آپ کے ٹال تک پہنچ جائیں گے۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" میں نے کہا۔ "ویسے کیا آپ بھی ..... اپنے چچا..... میرا مطلب ہے رب نواز کے دفتر"

"ہاں، میں بھی دفتر میں بیٹھتی ہوں۔ بلکہ وہ میرے باپ کا ہی کاروبار ہے، جس پر رب نواز نے قبضہ جما رکھا ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر زہریلے لہجے میں بولی۔

میں نے پھر بھی اس سے ذرا شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ "کاشانہ صاحبہ! ویسے میرا دل تو نہیں مان رہا اس طرح کی حرکت کرنے کو لیکن....."

"نادر صاحب! آپ کس دنیا میں رہتے ہو؟ اس سادگی کی وجہ سے تو آپ کے ماموں مرحوم نے رب نواز سے دھوکا کھایا تھا۔" وہ بولی۔ "زہر کو زہر ہی کاٹتا ہے۔ آپ کا کام ہو گیا۔ یہ آپ کا حق ہے۔ چاہے جس طریقے سے ہو۔"

"میں ایک بار پھر آپ کی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف کرتے ہوئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔" میں نے تہہ دل سے اس ذہین و فطین پری وش کا شکریہ ادا کیا۔




بول رہے تھے اور جب وہ میری طرف موبائل بڑھاتا تو آپ کی آواز آتی تھی۔ کیا شرارت میں آ... پپا بھی شامل تھے؟"

"پپا؟..... کس کے پپا؟..... کون سے پپا؟" وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔ اس کی ا... کرنے کا انداز بھی نرالا تھا۔

"کیا رب نواز صاحب آپ کے پپا نہیں ہیں؟"

"وہ میری مما کے شوہر ہیں، میرے پپا نہیں۔" اس نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

"اوہ..... میں سمجھ گیا۔ غالباً وہ آپ کے اسٹیپ فادر یعنی سوتیلے باپ ہیں۔"

"چھوڑیں اس بات کو۔ آپ شرارت والی بات پوچھ رہے تھے؟" اس نے یاد دلایا۔

"جی۔" میں نے ہولے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"درحقیقت میں رب نواز کو تنگ کرنے اور دق کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے د... اکثر ان کے موبائل کی "سم" چرا لیتی ہوں اور اپنے موبائل میں لگا کر ان کے کسٹمرز کو تنگ کرتی ہو...

"لیکن..... میرے منیجر کو رب نواز کی بھی آواز سنائی دی تھی۔ مگر جب اس نے میرے موبائل بڑھایا تو ایک دم آپ کی آواز ابھری۔ یہ کیا معاملہ تھا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ابھی بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنی لچکیلی کمر کو قیامت خیز خم دیا اور قیمت موبائل سیٹ نکال کر ایک بٹن پش کیا۔ موبائل سے رب نواز کی ریکارڈ شدہ آوازوں کے نشر ہو رہے تھے۔ مثلاً..... ہاں، میں رب نواز بات کر رہا ہوں..... "آئی ایم سوری! ... کر دو..... جہاں یہ کہہ رہے ہیں وہاں مال پہنچا دو، وغیرہ۔

اس نے بٹن آف کر دیا۔ میں ہنس پڑا۔ "آپ تو اس طرح خاصی تنگ کرتی ہوں گی رب... میں نے جیسے اسے شہ دیتے ہوئے کہا۔

دراصل ان دونوں کے سوتیلے پن والی حقیقت میرے لئے سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ بالخصوص کے ان چند (TYPICAL) انداز کے جملوں نے میرے ذہن رسا کو دور تک سوچنے کی راہ سجھائی

میں اب کاشانہ کی شخصیت میں اس حوالے سے اس غیر معمولی دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا اس فریبی اور دھوکے باز ٹھیکے دار رب نواز کے گھر کی میرے لئے ایک ایسی بھیدی ثابت ہو سکتی تھ... کی لنکا ڈھا سکتا تھا۔

"چلیں، یہ تو مذاق ہوا۔ کیا آپ بتائیں گی کہ رب نواز کہاں ہو گا اس وقت؟" بالآخر میں... موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"وہ نہ دفتر میں ہیں نہ گھر پر۔ اپنے کسی دوست سے ملنے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہی ہوں..." جواباً بولی، پھر آخر میں مستفسر ہوئی۔ "آپ کو کس سلسلے میں ملنا تھا ان سے؟"

اس کی بات پر میں نے پہلے ایک گہری سانس لی۔ میں نے اسے اس کے سوتیلے باپ کے... سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ مگر پہلے مال کی دوسری کھیپ وقت مقررہ پر نہ پہنچانے کی شکا... ہوئے ساری بات بتا دی۔

"ایک نمبر کا فراڈیا اور چیٹر ہے یہ رب نواز..... اس نے بہت سے لوگوں کے ساتھ دھو... کی ہے۔ خیر....." وہ رک کر بولی۔ "رب نواز جھوٹ بولتا ہے، اس کے کوئی ٹرک حویلیاں... پر نہیں پھنسے ہیں۔ جس وقت آپ نے ان کے دفتر فون کیا تھا، میں بھی وہاں موجود تھی۔ اس

اس دوران ملازمہ ایک ٹرے میں کافی لے آئی تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے کافی پینے لگے۔
کاشانہ نے میرا مسئلہ چٹکی بجاتے ہی حل کر ڈالا تھا۔ میں نے اسی وقت اپنے منیجر مشتاق سے
پر رابطہ کر کے اسے چند ضروری ہدایات دے ڈالیں۔

کاشانہ ایک جینئس لڑکی ثابت ہوئی۔ بلکہ خطرناک حد تک جینئس۔ اس کی غیر معمولی ذہانت
لئے جتنی حیران کن تھی، اتنی ہی عجیب و غریب بھی۔ شکر تھا کہ وہ اپنی خطرناک ذہانت کو مثبت اندا
استعمال کر رہی تھی۔

کافی پینے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ کاشانہ یک ٹک اور بڑے غور سے میرے چہرے کو
رہی تھی۔ اس کا یہ انداز بڑا بے باکانہ تھا جبکہ مجھے اس سے بار بار نظریں چرانا پڑ رہی تھیں۔

''آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں گے؟ میرا مطلب ہے، آپ رہتے کہاں ہیں؟'' معاً اس
سے پوچھا۔ میں نے کافی کا آخری گھونٹ لینے کے بعد کپ میز پر رکھا اور مختصراً اپنے بارے میں بتا

''گویا ہماری طرح آپ کی بھی فیملی مختصر ہے۔'' وہ بولی تو میں نے اس سے رخصت چاہی۔
ہو گیا تھا۔ رب نواز سے ملنے کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ البتہ دوبارہ بہت جلد ملاقات کا متمنی ضرور تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں اب چلوں گا۔ آپ سے دوبارہ ملاقات اب دفتر میں ہو گی۔''

وہ بھی کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''کون سے دفتر میں؟''

''ظاہر ہے، آپ ہی کے دفتر میں ہو گی۔ ساٹھ لاکھ والا معاملہ بھی تو حل کرنا ہے مجھے۔ اس سل
رب نواز سے دو تین روز میں ملنے والا ہوں۔ ویسے.........'' میں اچانک کچھ کہتے کہتے رکا، پھر
کر بولا۔ ''اس گمبھیر معاملے کے سلسلے میں بھی شاید مجھے آپ کے مشورے کے مطابق ہی کوئی قد
چاہئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

میری بات پر وہ دلنشین نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کے پاس اس مع
تھوڑی بہت دستاویزی تفصیل تو ہو گی جو آپ کے ماموں حیدر گل اور رب نواز کے درمیان طے پا

''جی ہاں......... بالکل ہے۔'' میں نے برجستہ کہا۔

''میرا خیال ہے میں کبھی آپ کے دفتر کا چکر لگاؤں۔ اور پھر وہیں ایک نشست میں کوئی ا
طے کر لیں گے۔''

میں اس کی فراخ دلانہ پیشکش پر مسرور ہو گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ رب نواز جیسے دھوکے
فریبی انسان سے نمٹنے کے لئے اتفاقاً ہی کاشانہ کی صورت میں ایک فوری اور سودمند شارٹ کٹ
اور میں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے انتہائی خلوص سے کہا۔

''کاشانہ صاحبہ! میں آپ کا پہلے ہی نہایت شکر گزار ہوں۔ تاہم مجھے بے حد خوشی ہو گی
میرے غریب خانے پر تشریف لائیں تاکہ میں بھی آپ کو وہ تفصیلات دکھا کر مطمئن کر سکوں کہ آ
مسئلہ بھی جائز لگے۔''

''میں سب جانتی ہوں اور میں نے آپ کے ماموں حیدر گل سے بھی ان دنوں رابطہ کیا
بولی۔ ''میں نے انہیں بھی یہی مشورہ.........''

وہ اچانک رکی۔ شاید اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مضطربانہ رمق اُبھری او
کا۔ وہ بولی۔ ''چلیں ٹھیک ہے، میں وہیں آ کر آپ سے تفصیلی گفتگو کر لوں گی۔ اس وقت اگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



آ گیا تو آپ کو یہاں پا کر بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ پھر شاید میں بھی اسے ڈاج نہ دے سکوں۔''
میں اس کی بات کا اشارہ سمجھ گیا اور واپس لوٹ آیا۔

❄ ❄ ❄

میں اپنے ٹال پہنچا تو منیجر مشتاق کی باچھیں خوشی کے مارے کانوں کی لوؤں تک کھچی ہوئی تھیں۔

''آپ.........آپ نے تو کمال کر دیا سر جی! اِدھر آپ گئے، اُدھر مال آ گیا۔ میں نے تو چیرنے کے لئے بھی بھیج دیا، جی کڑا کے۔'' مجھے دیکھتے ہی وہ اپنے مخصوص تکیہ کلام کے ساتھ خوشی سے بولا۔

''جی کڑا کے، کیوں؟ خوشی سے کیوں نہیں؟'' میں بھی ذرا موڈ میں آ گیا۔

''او جی، خوشی سے ہی۔ یہ تو ایسے ہی تکیہ کلام ہے۔'' وہ جھینپی ہوئی مسکراہٹ سے بولا۔ وہ بغیر قدغن کے اپنا تکیہ کلام فٹ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

''ویسے سر جی! کیا رب نواز اتنا ہی تھڑ دِلا ثابت ہوا تھا کہ آپ کو دیکھتے ہی اس پر ایسی دہشت سوار ہو گئی کہ فوراً مال بھیج دیا۔'' وہ حیرت سے بولا۔

میں اپنے آفس روم میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے تحیر آمیز استفسار پر میرے ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ یہ اس کے رانگ نمبر کا کمال تھا یا پھر حُسنِ اتفاق۔ مگر وہ ذرا احمق سا شخص تھا اس لئے ابھی میں اس سے رب نواز کی سوتیلی بیٹی کاشانہ کے سلسلے میں ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ فوراً خام مال چیروا کر رضوی صاحب کو روانہ کر دے۔ نیز آئندہ وہ کبھی بھی رب نواز جیسے دھوکے باز شخص سے کوئی کاروباری ڈیل نہ کرے، وغیرہ۔

مجھے رب نواز کے اس جھوٹ پر شدید غصہ آ رہا تھا کہ اس کے ٹرک ہزارہ سے آتے ہوئے حویلیاں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ جبکہ بہ قول کاشانہ کے یہ اس نے میرے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ مجھ سے کئے گئے شاہ بلوط کی لکڑی کے طے شدہ سودے کا مال وہ کسی اور پارٹی کو دینا چاہتا تھا۔

اب میں سنجیدگی کے ساتھ اپنی ساٹھ لاکھ کی خطیر رقم رب نواز کے حلق سے نکلوانا چاہتا تھا جو خاصا مشکل کام تھا مگر ناممکن نہیں۔ اور پھر کاشانہ کے اچانک درمیان میں آنے سے مجھے ایک راہ سجھائی دی تھی۔ کاشانہ سے مل کر میں نے اس کے بارے میں اندازہ قائم کیا تھا کہ وہی اس گمبھیر معاملے میں میری مدد کر سکتی تھی۔ کیونکہ رب نواز اور کاشانہ کے درمیان نفرت کی جو فطری خلیج حائل تھی، مجھے اس سے فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ وہ میرے لئے دھوکے باز رب نواز کے گھر کا بھیدی ثابت ہو رہی تھی۔ اور میں اس کے ذریعے رب نواز کی لنکا ڈھا دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ میرا مقصد ناجائز تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ کاشانہ بھی اپنے سوتیلے باپ کی دھوکا دہی والی قبیح فطرت سے آگاہ تھی اور میرے مسئلے کو جائز سمجھتی تھی۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ بہ قول اس کے وہ اپنے سوتیلے باپ کے سینے پر مونگ دل رہی تھی اور اسے زچ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتی تھی۔ اس میں ممکن تھا اس کا بھی کوئی اپنا ذاتی مفاد شامل ہو جو یقیناً گھریلو نوعیت کے جھگڑوں کا ہی نتیجہ تھا۔

بہرطور میرا فوری طور پر ایک مسئلہ تو حل ہو چکا تھا۔ میں اب نگینہ کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔

''ہیلو نگینہ!.........کیا صورت حال ہے؟''

''سب کچھ ویسا ہی ہے.........میں پیکنگ کر رہی ہوں۔'' اس کی پژمردہ آواز اُبھری۔

''نگینہ! امریکہ میں تمہارا کوئی جاننے والا نہیں؟.........میرا مطلب کوئی دور پرے کا عزیز، رشتے دار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



دوئم

وغیرہ؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ایسا کوئی قریبی رشتے دار تو نہیں۔ مگر پپا کے ایک دور کے رشتے کی خالہ زاد بہن وہاں ورجینیا (واشنگٹن) میں رہتی ہیں۔''

''تم نے رابطہ کیا ہے ان سے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں.....وہی ہمیں ریسیو کرنے آئیں گی۔''

''میں تمہیں سی آف کرنے آؤں ایئرپورٹ پر؟'' میں نے ہولے سے پوچھا۔

''نہیں نادر! بس مجھے روانہ ہونے دو..... میں شدید ذہنی پریشانی کا شکار ہوں۔ ویسے انکل نے حیات ہوں گے میرے ساتھ۔'' وہ ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بولی۔ اس کی بات پر میرے دل کی حالت خراب ہونے لگی اور بالآخر رابطہ منقطع کر دیا۔

اچانک میری نگاہ شیشے کے دروازے سے پار، جہاں سے ٹال کے وسیع احاطے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا، پڑی تو میں ذرا چونکا۔ وہ ایک سنگل ڈور ویگن تھی، جو تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی اور یکدم بریک لگا کر اسے روکا گیا تھا۔ پھر میں نے ایک لمبے تڑنگے شخص کو دروازہ کھول کر گویا چھلانگ لگا کر برآمد ہوتے دیکھا اور اس کے ہمراہ تین مزید افراد بھی تھے۔ چاروں اپنی وضع قطع سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ جبکہ لمبا تڑنگا شخص کچھ زیادہ کرخت چہرہ تھا۔ ان لوگوں نے ٹائٹ جینز اور ہاف سلیو چست ٹی شرٹیں پہن رکھی تھیں۔ لمبے تڑنگے شخص کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی بھی تھی۔ دور سے ہی میں نے اس کے کرخت چہرے سے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ ہتھ چھوڑ اور مغرور طبیعت کا مالک تھا۔ اس وقت ان کے بشرے سے جارحانہ عزائم کا اندازہ ہوتا تھا۔

ان کے جارحانہ تیوروں کو محسوس کر کے میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہو گئی۔ وہ میرے دفتر کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ میں نے خود کو اس طرح ہی آرام دہ برجمان رہنے دیا۔ دروازہ کھلا اور سب سے پہلے وہ لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے بعد باقی بھی اندر آ گئے۔

''تمہارا نام نادر علی خان ہے.....؟'' لمبے تڑنگے نے مجھے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر جھلائے لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں.....آپ کی تعریف؟'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''میرا نام گگل خان ہے اور مجھے ٹھیکے دار رب نواز نے بھیجا ہے۔'' اس نے بتایا تو میں پل کے سمجھ گیا کہ معاملہ کیا تھا؟

''جی .....میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ تشریف رکھیں۔'' میں نے بدستور بے نیازی مگر اخلاقاً کہا۔

''آج صبح جو ٹرک آئے، ان کا مال ہمیں واپس چاہئے۔'' گگل خان میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے خرانٹ لہجے میں بولا۔

''لیکن کیوں؟.....وہ مال تو میرا ہے۔ رب نواز نے خود بھیجا تھا۔ میں اس کی پے منٹ.....''

''بکواس بند کرو۔ ہمارے ساتھ دھوکا کیا تھا تم نے۔''

گگل خان نے غرا کر مجھے گھورتے ہوئے کہا اور یکدم ہی میرے اندر کا جنگجو نادر علی خان



جو بعد میں گولی کی طرح میرے ہاتھ سے نکل کر گگل خان کی ناک پر لگا۔ اس کے حلق سے کریہہ خارج ہوئی اور بھل بھل خون بہنے لگا۔ اس کے باقی گرگے ایک لمحے کو پھیلی ہوئی آنکھوں سے میری یہ اور غیر متوقع حرکت کو دیکھتے رہ گئے۔

پھر ان میں سے ایک نے زخمی گگل خان کو سہارا دیا جو تکلیف کی شدت سے بری طرح کراہ رہا تھا باقی دو گماشتے جارحانہ تیوروں کے ساتھ میری طرف لپکے۔ میں ریوالونگ چیئر سے پشت ٹکائے ان کی سمت تھوڑا سا گھوما اور سب سے پہلے اپنی طرف بڑھنے والے گماشتے کے پیٹ میں لات کر دی۔ وہ چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ دوسرا وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر اُچھلا۔ میں نے دوبارہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے اسے گھمایا، وہ اچھل کر میری بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر کی لمبی چوڑی گاہ سے ٹکرایا۔ میں نے تیسری بار بیٹھے بیٹھے ہی ریوالونگ چیئر گھمائی اور اپنے دائیں ہاتھ کی کہنی اس پہلو پر رسید کر دی۔ ضرب کا زوردار ہونا ضروری تھا۔ ورنہ وہ سنبھلتے ہی اتنے قریب سے بہ آسانی کے سے میرے چہرے کی تواضع کر سکتا تھا۔ میری کہنی کی ضرب نے اسے ذرا دیر کے لئے بے بس دیا تو پہلا والا لات گزیدہ بدمعاش مجھ پر جھپٹا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی سے کرسی چھوڑی اور وہ کرسی پڑا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، ٹال کے مزدور شیشے کے پار سے اس دھینگا مشتی کی جھلک دیکھ کر ہاں، ڈنڈے لئے اندر گھستے چلے آئے۔ میں ایک کونے میں بڑے آرام سے جا کھڑا ہوا تھا۔ پھر اس پہلے کہ مزدور ان کا مار مار کر بھرکس نکال دیتے، میں نے بآواز بلند ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ان کہا۔

''ابھی رک جاؤ۔ اگر ان کا دماغ پھر بھی ٹھکانے نہیں لگے تو ان کا مار مار کر قیمہ کر دینا۔''

وہ چاروں قہر و غضب کی تصویر بنے ہانپ رہے تھے اور مجھے غضب ناک نظروں سے گھورے جا رہے ۔ میں نے مزدوروں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ان چاروں کو میرے آفس سے باہر دھکیل دیا۔ وہ ں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے اپنی جیپ میں جا بیٹھے اور منہ کی کھا کر واپس لوٹ گئے۔

میں نے گگل خان اور اس کے تینوں ساتھیوں کو مزہ چکھا دیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ بے غیرت ۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کی بجائے محاذ بنا کر اپنی ذلت کا بدلہ لینے دوبارہ ضرور آتے۔ میں زرخرید کتوں کو لاتوں کے ذریعے خوش آمدید کہا کرتا تھا۔

میں نے منیجر مشتاق کو بلا کر ٹال کی چوکیداری کے انتظامات سخت کرنے کی ہدایات دیں۔ اگرچہ اس پہلے ہی ٹال میں آگ لگنے کے واقعے کے بعد سے دو چوکیداروں کے علاوہ میں نے دو عدد لائسنس گن بردار بھی متعین کر رکھے تھے۔ کام معمول کے مطابق چل رہا تھا جو شام تک جاری رہا۔ رضوی ب کو مال روانہ کر دیا گیا تھا۔ اب میں اسلام آباد ایئرپورٹ کی طرف نکلنا چاہتا تھا۔

میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ نگینہ کی فلائٹ رات گیارہ بجے ی۔ میرے پاس وہاں تک پہنچنے کے لئے دو گھنٹے تھے۔ خاصی دیر کی ذہنی کشمکش کے بعد میں نے نگینہ کو سی آف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

نگینہ کو سی آف کرنے کے بعد لامحالہ گرین لاج پہنچتے پہنچتے کافی دیر ہو جاتی۔ ماں دیر سے آنے کا دریافت کر سکتی تھی۔ میں ماں سے مصلحتاً بھی اب جھوٹ بولنے کا روادار نہ رہا تھا۔ اس لئے میں نے کا جواب بھی سوچ لیا تھا۔ چنانچہ میں ابھی نکلنے ہی لگا تھا کہ میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ یہ کاشانہ

کی کال تھی۔

''فینٹاسٹک نادر صاحب!......... واہ، آپ تو بڑے زبردست فائٹر ہیں۔'' میرے موبائل کا لگاتے ہی اس کی پٹاخے دار آواز ابھری۔

''ایسا کیا کر دیا میں نے؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے موبائل کان سے لگائے لگائے جیپ کی قدم بڑھا دیئے۔ میں تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ارے واہ......... جیسے آپ کو معلوم ہی نہیں۔'' اس کی کھنکتی ہوئی پُر شوخ آواز میری سماعت ٹکرائی۔ ''آپ نے رب نواز کے خاص چیلے گگل خان کی ناک توڑ کر رکھ دی ہے اور اس کے ساتھیوں کو پیٹا، یہ کیا کم کارنامہ ہے اس کا غرور توڑنے کے لئے؟''

''ہاں......... وہ میرے آفس میں آ کر بدمعاشی دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔'' میں نے بتا تو اچھا ہوا، ان چاروں کی جنگ مجھ اکیلے تک محدود رہی۔ بہ صورت دیگر میرے مزدور اگر ذرا دیر جاتے تو ان چاروں کا بھرکس نکال دیتے۔''

''ہاں ......... میں اس وقت دفتر میں ہی تھی جب وہ چاروں رب نواز کو اپنی ذلت بھری کہ رہے تھے اور اس وقت رب نواز بری طرح جھلا کر گگل خان سے کہہ رہا تھا کہ اسے چوڑیاں چاہئیں۔ یہ پہلا موقع ہے نادر صاحب! کہ رب نواز کے خاص الخاص چیلے گگل خان کا کسی نے یوں بگاڑا ہے۔''

اس کی بات پر میں نے کہا۔ ''اگر انہوں نے دوبارہ میرے سامنے آنے کی جرأت کی تو میں پورا جغرافیہ بھی بگاڑنے کی طاقت رکھتا ہوں۔''

''ایکسیلنٹ .........!'' وہ چہکنے لگی۔ ''آپ مردانہ وجاہت کے حامل ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے ہیں۔ اب تو آپ کے ساتھ دوستی کرنے میں بڑا مزہ آئے گا۔ کرو گے نا مجھ سے دوستی؟'' اس میں بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

اس کی بات پر میں ذرا گڑبڑا گیا۔ لیکن میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب مجھے رب نواز حلق سے ساٹھ لاکھ روپے کی رقم نکلوانی تھی، لہٰذا اسے بناتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے، آپ کی ابتداء تو اسی روز سے ملنے والے رانگ نمبر سے ہو چکی ہے۔''

''اوہ......... ویری نائس!......... تو پھر ڈن؟'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''ڈن!'' میں نے بھی جواباً کہا۔

''میں آپ کے پاس کل آ رہی ہوں......... او کے، بائی!'' اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا نے موبائل آف کر کے جیب میں رکھا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

❄ ❄ ❄

میں جیپ کو خاصی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑا رہا تھا۔ میں اب اس تذبذب میں مبتلا تھا کہ ماں تاخیر سے گھر آنے کی اطلاع کروں یا نہیں۔ اگر اطلاع کرتا تو لامحالہ وہ مجھ سے وجہ پوچھ سکتی تھیں بہرطور میں نے سردست یہی سوچا کہ خود سے اطلاع نہ دوں۔ اگر انہوں نے خود مجھ سے رابطہ بتا دوں گا۔

سوا گھنٹے کی تیز رفتار، نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد میں اسلام آباد کی حدود میں داخل ہو یہاں سے میں نے لال مسجد کی طرف جیپ موڑ لی۔ فیصل مسجد کے مقابلے میں یہاں سے کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



شارٹ کٹ پڑتا تھا۔ مزید پندرہ بیس منٹ بعد میں ایئرپورٹ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

میں جیپ کو پارک کرنے کے بعد نیچے اُتر آیا۔ اسلام آباد کا موسم معتدل تھا۔ ایئرپورٹ جگمگاتی روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ میں گیٹ کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ اچانک ایک سیاہ رنگ کی کار میرے بالکل قریب راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

میں ٹھٹک کر رک گیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں کار کو پہچان چکا تھا۔ یہ انکل اعظم خان کی کار تھی ڈرائیونگ سیٹ پر وہ خود موجود تھے۔ جبکہ ان کے برابر ان کا باڈی گارڈ وزیر خان بیٹھا تھا۔ لیکن جب عقبی سیٹ کا دروازہ کھلا تو میں ایک خاتون کو گرم کشمیری شال اوڑھے نکلتے دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہ میری ماں تھیں۔ ان کا چہرہ غصے اور طیش کے مارے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

''تم نگینہ کو سی آف کرنے آئے تھے نا؟'' ماں نے مجھے زندگی میں پہلی بار اس قدر نفرت آمیز نظروں سے گھورا تھا۔ اس دوران انکل اعظم خان بھی نیچے اتر آئے تھے اور وزیر خان بھی۔

''ہاں، ماں.........!'' میں نے اپنے اندر کی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ پھر گہری متانت سے کہا۔ ''مگر شاہ میر کو نہیں......... صرف نگینہ کو۔''

''میں تمہاری ماں ہوں۔ تم مجھے اب زیادہ دیر نہیں بہلا سکتے۔'' ماں نے ہونٹ چبائے۔

''میں نے پہلے کب آپ کو بہلایا ہے ماں!'' میں نے دکھ سے کہا تو اچانک انکل اعظم خان نے مداخلت کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

''شبینہ! مجھے بات کرنے دو۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بڑے رسان سے بولے۔ ''نادر بیٹا! تم خود کو آخر کیوں دو پاٹوں کے بیچ پیس رہے ہو؟......... تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ کیونکہ میری دور اندیش نظریں دیکھ رہی ہیں، اگر تمہارے اور ماں کے بیچ یہی حالات رہے تو مجھے ڈر ہے کہ تم نہ ادھر کے رہو گے نہ ادھر کے۔''

''انکل! میرا کیا قصور ہے؟ میں نے دشمنوں کے سلسلے میں ماں کا کب ساتھ نہیں دیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''شاہ میر آج مُردوں سے بدتر ہو چکا ہے۔ نظر حیات بھی رات والے حملے کے بعد مرتے مرتے بچا ہے۔ اور میں کیا کروں؟ رہی نگینہ کی بات تو اس کا کیا قصور ہے؟''

''اس کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ دشمن کی بیٹی ہے؟'' ماں نے قہرناک لہجے میں کہا۔

''یہ کوئی قصور نہیں ہوا ماں!'' میں نے کہا۔ ''یہ اس کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اس نے مجھ سے ناتا توڑا ہے اور نہ ہی اب تک پولیس میں کوئی رپورٹ درج کروائی ہے۔ اور وہ بے چاری کیا کرے؟''

''ہونہہ......... بے چاری.........''

ماں نے حقارت سے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اس کا رخ گیٹ کی طرف تھا۔ ہم سب ذرا چونکے۔ ایمبولینس ہمارے قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس کے عقب میں ایک پراڈو کار بھی تھی۔ وہ بھی رک چکی تھی۔

ایمبولینس کا سائرن بند کر دیا گیا تھا۔ پھر میں نے ایمبولینس کا عقبی سلائیڈنگ ڈور کھلتے دیکھا۔ اس سے نگینہ برآمد ہوئی۔ اسے دیکھ کر میں چونکا تھا۔ یقیناً ایمبولینس میں زندہ لاش کی صورت شاہ میر اسٹریچر پر پڑا ہوگا۔ جبکہ پراڈو کار کے بھی دروازے وا ہوئے تھے اور میں نے نظر حیات کو اترتے دیکھا۔ اس کے ہمراہ دو آدمی بھی تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



دوئم

فلائٹ روانگی میں ابھی دو، سوا دو گھنٹے باقی تھے۔ نظر حیات بھی نگینہ کو سی آف کرنے آیا تھا۔ مگر ہ شاید نظر پڑتے ہی یہ لوگ نیچے اتر پڑے تھے۔

ماحول یکا یک ہی بدل گیا تھا۔ ایئر پورٹ کی رونقیں مجھے ماند ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔

آج سے پچیس سال پہلے والی لرزہ خیز کہانی کے متضاد کرداروں کا ایک جگہ اکٹھے ہونا، ایک نئی ہولناک داستان کو جنم دے سکتا تھا۔ ماں کی غضب ناک نگاہیں نگینہ کے چہرے سے ہٹ کر نظر حیا جم گئی تھیں اور نظر حیات نگینہ سمیت دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا ہماری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جہاں مجھے غیظ و غضب اور نفرت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

نگینہ اور نظر حیات، دونوں شانہ بشانہ چلتے ہوئے ہم ماں بیٹے سے چند قدم دور آ کر رک گئے۔ کو نظر حیات کے ساتھ دیکھ کر میرے اندر نفرت کی لہر چلنے لگی تھی۔ دونوں کا ساتھ نظر آنا ماں کے دل پہلے سے پیدا شدہ نگینہ کے خلاف غلط فہمی کو مزید تقویت دینے کا سبب بن سکتا تھا۔

نگینہ نے دھیرے سے ماں کو سلام کیا مگر ماں نے نہایت متکبرانہ نفرت کے ساتھ اسے نظر انداز کر دیا ظر حیات کو گھورنے لگی۔ جبکہ نظر حیات نے ایک اچٹتی سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد ماں کو رتے ہوئے کہا۔

''شبینہ! تمہاری اس وقت یہاں آمد کو میں کیا سمجھوں؟''

''مجھے اس دھرتی پر ہر جگہ تم صرف اپنی موت ہی سمجھو نظر حیات! مطلب کیا پوچھتے ہو؟'' ماں نے یلے لہجے میں نظر حیات کو جواباً گھورتے ہوئے کہا۔

''اوہ..... بہت آگ ہے تمہارے سینے میں۔'' نظر حیات نے استہزائیہ لہجے میں ماں سے کہا۔ یکن شبینہ بیگم! اس آگ میں آخر ایک دن تم خود جل کر خاکستر ہو جاؤ گی۔''

میں نے دیکھا، ماں کے چہرے پر بڑی اسرار بھری مسکراہٹ اُبھری۔ ایسی مسکراہٹ جس میں نفرت چنگاریاں اور جوشِ غیظ بھی تھا تو اپنے بدترین دشمن کو زیر دست کرنے کی بھرپور خود اعتمادی بھی۔ میں ستہ خاموش رہا۔ شاید میں ایسے مواقع پر ماں کے دشمن کے ساتھ جوابی گفتگو میں تسکین حاصل کرتا تھا۔

''نظر حیات! جن کے سینوں میں پورا آتش فشاں دہک رہا ہو، انہیں یہ آگ کیا خاکستر کرے گی؟'' ا کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی۔ ''شاہ میر کا حشر تو تم دیکھ ہی رہے ہو نظر حیات! عنقریب تم اسے اپنا ندھا بھی دو گے۔ اس کے بعد تمہاری باری آئے گی۔''

ٹھیک اس وقت نگینہ نے ماں سے روہانسے لہجے میں تڑپ کر کہا۔ ''آنٹی! پلیز..... میرے پپا گی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ہمیں جانے دیں۔''

نگینہ کے ملتجی لہجے میں تڑپا دینے والی لاچاری تھی جس نے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ مگر میں ماں کے نے کچھ بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اب ماں نے نگینہ کی طرف سنسناتی نظروں سے دیکھا اور پھر جانے یوں اچانک میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور میں جیسے یہ خاموش راہ پاتے ہی بہ زبانِ خاموشی ماں ے نگینہ کے لئے سرتا پا التجا بن گیا۔

''ہم دشمنی کرتے ہیں تو اس کا وقار بھی قائم رکھتے ہیں۔ تم جا سکتی ہو۔ لیکن اس سے پہلے.....'' لینہ مستفسرانہ انداز میں ماں کا چہرہ تکنے لگی۔ میں بھی ایک طرف کھڑا تھا۔ فوری طور پر میں سمجھ نہ سکا تھا ماں نگینہ سے کون سا سوال کرنا چاہتی ہے۔ میرا خیال تھا، ماں نگینہ سے ہی سوال پوچھے گی۔ لیکن ماں نے اس کی بجائے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''نادر! اس سے پوچھو کہ اس روز سبزہ زار پر غفورے کے بدلے میں جو ڈیلنگ ہو رہی تھی، اس کے باپ شاہ میر کو کس طرح ہوا تھا؟''

میں چونک گیا اور جیسے یہ سوال نگینہ کو منتقل کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ بھی سن رہی تھی، ماں بولی۔ ''میں نے اس روز اتفاقاً نادر سے فون پر رابطہ کیا تھا۔ مجھے اس کے لہجے سے پریشانی محسوس ہو پھر میرے اصرار پر اس نے مجھے ساری بات بتا دی تھی۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ پپا نے ٹیلی سیٹ ریکارڈنگ پر کر رکھا تھا۔ یوں انہیں اصل بات کا علم ہوا۔ کاش، وہ یہ گفتگو ٹیپ نہ کرتے اور آپ لوگوں کا اور پپا کا تصادم ہوتا۔''

یہ بتاتے ہوئے نگینہ کی آنکھوں میں مزید نمی اتر آئی۔ میرا خیال تھا کہ نگینہ کی صاف گوئی سے ضرور متاثر ہوگی۔ مگر اس کے برعکس وہ، نگینہ کے غمناک چہرے کو گھور کر استہزائیہ لہجے میں بولی۔

''خوب!........ اپنے جھوٹے آنسوؤں اور جذباتی گفتگو سے تم نادر کو تو بے وقوف بنا سکتی ہو مجھے نہیں۔ بس........ بات صاف ہو گئی۔ وہ گفتگو ٹیپ شدہ نہیں تھی بلکہ تم نے اپنے باپ کو آگاہ کیا چلو، اس سے یہ بات تو ظاہر ہوئی کہ مجھے یرغمال بنانے والوں کا تعلق تمہارے باپ کے زرخرید کتوں نہ تھا۔ تم جا سکتی ہو۔'' ماں کے سرد اور کاٹ دار لہجے نے نگینہ کے کرب میں مزید اضافہ کر دیا۔ خود ماں کی اس غلط فہمی پر اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔

نگینہ نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا مگر ماں نے انتہائی سرد لہجے میں اسے جانے کو کہہ دیا۔ ایک بھیگی ہوئی شکوہ کناں نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ اور پھر اپنے ساتھ کھڑے نظر حیات سے مخاطب کر دھیرے سے بولی۔

''انکل! آیئے پلیز۔ فلائٹ کا وقت ہونے والا ہے۔''

نظر حیات نے ماں اور مجھ پر ایک آخری برماتی ہوئی معاندانہ نگاہِ خار ڈالی اور نگینہ کے ساتھ ماں خاموش کھڑی رہیں۔ میں نے ذرا ہمت کر کے ماں سے کہا۔

''ماں! نگینہ جھوٹ نہیں کہہ رہی ہے۔''

ماں نے میری طرف سرد نگاہوں سے دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر کار کی طرف بڑھ گئی۔ انکل اعظم میرے قریب آئے اور ہولے سے میرا شانہ تھپتھپا کر ازراہِ تشفی بولے۔

''حوصلہ رکھو نادر میاں!........ ایک دن انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

یہ کہہ کر وہ بھی اپنی کار کی طرف بڑھ گئے۔ کار روانہ ہو گئی۔ میں تنہائی میں کھڑا رہ گیا۔ میرا پیش میں جیسے سناٹا چھا گیا تھا۔ ایسا سناٹا جو میری روح کے اندر اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

ہلکی ہلکی خنک ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ میرے اندر اُداس اور سرد شام اُتری ہوئی تھی۔ کتنی دیر میں اس طرح وہاں کھڑا رہا۔ میں اس وقت چونکا جب ایک تیز رفتار کار نے شاید کسی سے بچنے کے لئے بریک لگائے اور ان کی چرچراہٹ سے وہاں کی فضا گونج سی گئی۔ بے اختیار ناک نظریں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ اسی آسمان پر کچھ دیر بعد نگینہ کو لے جانے والا طیارہ ہونے والا تھا۔

میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی جو آنسو بن کر میری آنکھوں میں جھلملانے لگی۔ میں اس ناک آنکھوں کے ساتھ اُداس سا کھڑا چشمِ تصور سے طیارے کو جیسے اپنے وجود کا ساتھ چھوڑتی ہوئی روح کو پرواز کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کیا خبر جہاز کی کھڑکی کے قریب بیٹھی نگینہ کی مجبور نگاہیں بھی


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں سے تکے جا رہی ہوں۔ پھر بے اختیار میرا دایاں ہاتھ الوداعی انداز میں اٹھا اور میرے دل عمیق گہرائیوں سے نگینہ کے لئے دعائیہ کلمات اُبھرے۔

''نگینہ!........ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ تم خیریت سے اور بہت جلد واپس لوٹو گی۔'' اس کے بعد اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ میرے سینے میں اُداسی کی لہر چھائی ہوئی تھی۔ بہت بوجھل ہو رہا تھا میں وقت۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی میں نے اسے اسٹارٹ کیا اور آگے بڑھ گیا۔

میرا رخ مری (نتھیا گلی) کی جانب تھا۔

میں اس وقت بری طرح اعصاب گزیدگی کا شکار ہو رہا تھا۔ ماں کے سرد اور بے رحم رویے کی برف کو کی میں جس قدر سعی کر رہا تھا وہ اتنی ہی زیادہ دبیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس پر نگینہ کی ان گوں حالات میں امریکہ روانگی نے میرے اعصاب کو مزید توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ نگینہ کا خود سے، اپنے سے ہزاروں میل دور دیارِ غیر میں جانا اور وہ بھی اپنے باپ کے علاج کے سلسلے میں بہت پریشان کن تشویش زدہ صورتِ حال تھی میرے لئے۔ میں سوچ سوچ کر ہی پریشان ہو رہا تھا کہ آخر نگینہ تن تنہا دیس میں کیا کر سکے گی؟ میرے پوچھنے پر وہ مجھے بتا چکی تھی کہ وہاں ورجینیا (واشنگٹن) میں اس باپ کی کوئی خالہ زاد بہن رہتی تھی۔

معاملہ دشمنی اور ماں کی غلط فہمی کا نہ ہوتا تو میں کبھی اس طرح نگینہ کو تنہا امریکہ نہ جانے دیتا بلکہ میں اس کے ساتھ جاتا۔

نگینہ نے ماں کے سوال کے جواب میں جو بتایا تھا، مجھے اس پر پورا یقین تھا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ نکہ شاہ میر اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ میرے اور نگینہ کے بیچ بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ بعید نہ تھا کہ اس نے فون ریکارڈنگ پر کر رکھا ہو۔ مگر ماں کو اس کی سچائی پر یقین نہیں تھا۔ وہ وہی سمجھ رہی تھیں، جو اب تک بہ دستور سمجھتی آ رہی تھیں۔ یعنی باپ بیٹی کا گٹھ جوڑ........ بہر طور یہ بات تو ہو گئی تھی کہ ماں کو اغواء کرنے والوں کا تعلق بہرحال شاہ میر اور نظر حیات والوں سے نہیں تھا۔ پھر بات ذہن میں آتی تھی کہ وہ چھپکلی مارکہ لیڈر کا ٹولا یقیناً غفورے سے ہی تعلق رکھتا تھا جس نے اپنی کی قربانی دے کر غفورے کو فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔

جیپ تاریک اور گھنے جنگل کے بیچ بل کھاتی چمکتی سڑک پر دوڑے جا رہی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ رنگ پر جمے ہوئے تھے اور نظریں اسکرین کے پار ٹکی ہوئی تھیں۔

نگینہ کی جدائی کا تصور ہی میرے لئے سوہانِ جان تھا۔

اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے ڈیش بورڈ پر رکھا موبائل اٹھایا۔ ''ہیلو!''

''ہیلو نادر!........ میں........ نگینہ........'' دوسری جانب سے نگینہ کی آواز اُبھری۔

''نگینہ!........ نگینہ!........ مم........ میں........'' وفورِ جذبات کے باعث مجھ سے جملہ پورا نہ ہو سکا۔

''نادر! تمہیں دل مضبوط کرنا ہوگا۔ یہ جدائی برداشت کرنا ہوگی۔ جیسے........ جیسے میں کر رہی ہوں۔'' نہ کی آواز میں درد تھا۔

''نگینہ!........ میں نے تمہارے لئے صدقِ دل سے دعا مانگی ہے۔ تم خیریت کے ساتھ اور بہت لوٹو گی۔'' میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

''ہاں نادر!........ بس دعا کرتے رہو۔ مجھے اس وقت دعا ہی کی ضرورت ہے۔'' وہ جیسے ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''اچھا نادر!........ خدا حافظ۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



"سنو!......... سنو!" میں جلدی سے بولا۔ "تم نے اپنی آنٹی کو امریکہ آمد کے بارے میں خبر دی ہے؟"

"ہاں........." نگینہ نے کہا۔ "وہی ایئر پورٹ پر مجھے ریسیو کرنے آئیں گی۔"

"نگینہ! تم حوصلہ رکھنا۔ تم بہت ہمت والی لڑکی ہو۔ کاش، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا۔ تم جتنا وہاں رہو گی، میرا سارا دھیان تمہاری طرف ہی لگا رہے گا۔ کم از کم مجھے اپنی آنٹی کا تو پتہ دے دو" میں نے آخر میں کہا تو وہ جواباً بولی۔

"ہاں........ میں امریکہ پہنچتے ہی آنٹی رخسانہ کا پتہ SMS کر دوں گی تمہیں۔ اچھا....... خدا... بورڈنگ شروع ہو چکی ہے۔ پپا کو اٹینڈنٹ لے جا چکا ہے۔ میں بھی طیارے کی طرف بڑھ رہی... میرے لئے دعا کرنا۔ ایک مرتبہ پھر خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" میں نے موبائل کو دوبارہ ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

جیپ خاصی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ اچانک ایک تاریک اور تنگ موڑ کاٹتے ہوئے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ میری اچانک ہی بیک ویو مرر پر نظریں پڑی تھیں۔ عقب میں آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹ نظر آ گئی تھی۔ میں اسے تعاقب تو نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ عقب میں سڑک ویران... ضروری نہ تھا کہ میرا ہی تعاقب ہو رہا ہو۔ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ تاہم، جانے کیوں میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔

میں نے اپنے اس شبہے کو دور کرنے کی غرض سے اپنی جیپ کی رفتار دانستہ دھیمی کر دی۔ اب گاہے گاہے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں عقب سے آتی گاڑی کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی رفتار کے ساتھ بدستور دوڑی آ رہی تھی اور لمحہ بہ لمحہ اس کا فاصلہ میری جیپ سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے اپنے سائے تک سے بھی محتاط رہنا پڑتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی گاڑی میرے قریب سے گزرنے لگی تو میں نے ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے دوسرے فرد کو بھانپنے والی نظروں سے دیکھا اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ ایک پرانے ماڈل کی ڈبل کیبن پراڈو جیپ... کے اندر صرف دو ہی افراد موجود تھے۔ جیپ آگے نکل گئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے بھی اپنی پوٹھوہار کی رفتار بڑھا دی۔

میرے اندر زبردست ہلچل ہو رہی تھی۔ مجھے وہ دونوں چہرے شناسا معلوم ہوئے تھے۔ لیکن فوری طور پر یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے دونوں کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔ لیکن چونکہ میرے ذہن میں شناسائی کا سگنل بدستور جل بجھ رہا تھا اس لئے فوراً ہی مجھے لالہ زار کی وہ شب ہنگامہ یاد آ گئی جب غفورے کے بدلے ماں کی واپسی کا معاہدہ طے پا رہا تھا۔ یہ دونوں چہرے اس چھپکلی مارکہ بدمعاش کھڑتالی ٹولے میں شامل تھے جو اپنے لیڈر کے میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوتے ہی غفورے سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اب ذہن کا سگنل پوری طرح روشن ہو گیا تھا اور ساتھ ہی میری رگوں میں خون کی گردش بھی منتشر ہونے لگی۔ چنانچہ میں ان کے تعاقب میں لگ گیا۔ یہ لوگ بھی شاید میری طرح اسلام آباد سے نکل رہے تھے۔ میں نے تعاقب کو شک و شبہے سے بچانے کی خاطر پراڈو سے اپنی پوٹھوہار کا درمیانی خاصا بڑھا رکھا تھا۔

میں نے اب ان کے تعاقب کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ یہ لوگ کس کے آدمی



اگرچہ یہ لوگ غفورے کے ہی ساتھی تھے مگر کھڑتالی گروپ کے ان دونوں بدمعاشوں کی پشت پناہی آخر کون کر رہا تھا؟ اور کچھ بعید نہیں تھا کہ غفورا انہی میں شامل ہو۔

کافی دور جا کر پراڈو جیپ پنڈی روڈ سے لاہور جانے والی سڑک پر گامزن ہو گئی۔ اب میرا ماتھا ٹھنکا۔ میری جیپ میں بہت کم فیول رہ گیا تھا۔ اگر یہ لوگ واقعی لاہور جانے کا قصد کئے ہوئے تھے تو میں ان کا اس قدر طویل تعاقب نہیں کر پاتا۔ چنانچہ میں نے بالآخر ان سے بھڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی جیپ کی رفتار بتدریج بڑھا دی۔ سڑک دور تک تاریک اور سنسان تھی۔

اب ان کا چونک جانا لازمی امر تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ انہوں نے میری پالیسی اپنائی اور اپنے تعاقب کی تصدیق کی خاطر اپنی جیپ کی رفتار ذرا گھٹا دی۔ میں جانتا تھا کہ اب چونکہ ان دونوں کی توجہ میری طرف ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے لالہ زار والی اس ہنگامہ خیز رات کے حوالے سے پہچان لیتے۔ اور وہی ہوا۔

جیسے ہی میری پوٹھوہار ان کی پراڈو کو کراس کرنے لگی میں نے ان دونوں کو گردنیں گھما کر اپنی طرف دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پایا۔ اور پھر جیسے انہوں نے بھی مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے یک لخت ہی اپنی جیپ کی رفتار تیز کر دی۔

اب کھلی اور تاریکی میں چمکتی ہوئی سڑک پر دونوں جیپیں غراتی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اپنی جیپ روک کر میرا دوبدو مقابلہ کریں گے۔ مگر یہ دونوں ہی تھڑدلے ثابت ہوئے تھے۔ یا پھر شاید لالہ زار کی اس رات میں انہوں نے اپنے چھپکلی مارکہ لیڈر کی میرے ہاتھوں عبرت ناک موت نے دہشت بٹھا رکھی تھی۔ شیر کے لئے بزدل دشمن خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

یہ دونوں مجھے پہچان کر اب نکل جانا چاہتے تھے اور میں جانتا تھا کہ وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔ کیونکہ میری گاڑی کا فیول بتانے والی سوئی "E" کے قریب تھی۔ میں انہیں نکلنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایکسیلیٹر سے میں نے بھی اپنا پاؤں نہیں ہٹایا تھا۔

دونوں جیپیں ریس لگانے کے انداز میں اندھا دھند دوڑ رہی تھیں۔ میرے اعصاب بری طرح تنے ہوئے تھے اور چہرہ جوشِ جنوں کی غمازی کر رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں ایسی خطرناک ڈرائیونگ کسی خوفناک حادثے کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ مگر میں بھی ہاتھ آئے شکار کو "چھاپنے" کا عزم کر چکا تھا۔

اسٹیئرنگ پر میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ دفعتہً پراڈو نے میری جیپ کو سائیڈ ماری۔ میری جیپ کو جھٹکا لگا، اس کا توازن ذرا بگڑا مگر میری مہارت نے اسے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ میں نے فوراً ہی اس پر قابو پا لیا۔ مگر اس لمحاتی کوشش میں پراڈو آگے نکل گئی۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے ایک قدرے تنگ موڑ دکھائی دے گیا۔ میں نے دوبارہ اسپیڈ بڑھا دی۔ موڑ نزدیک آتا جا رہا تھا۔ چنانچہ دونوں گاڑیوں کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی۔

موڑ پینتالیس ڈگری سے زیادہ کا تھا جسے کاٹنے کے لئے گاڑی کے اسپیڈومیٹر کی سوئی کو نوے اور سو کے درمیان سے نیچے چالیس کے قریب لانا ضروری تھا۔

موڑ قریب آتا جا رہا تھا۔ دونوں جیپوں کی رفتار بھی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک لمحہ ... رفتار، فاصلے اور وقت کی پیمائش کرتے ہوئے اپنی جیپ کی رفتار کو فوراً ہی گھٹا دیا اور پراڈو کو پہلے کاٹنے کا موقع دیا۔ پھر جیسے ہی وہ موڑ پر گھومی، میں نے اپنی جیپ کا ایکسیلیٹر پوری قوت سے دبا دیا۔ ہلکی پھلکی جیپ غرا کر آگے بڑھی اور موڑ کاٹتی ہوئی پراڈو سے ٹکرائی۔ نتیجتاً پراڈو، کچے میں اتر گئی اور

الٹتے الٹتے بچی۔ اس کا انجن بند ہو گیا۔ میرے لئے اتنا وقت کافی تھا۔ میں بجلی کی سی تیزی کے سا اترا تو اچانک میں نے غفورے کے دوسرے ساتھی کے ہاتھ میں پستول کی جھلک دیکھی۔ وہ درواز کر نیچے اتر آیا۔ میں نے کھڑکی کی آڑ لیتے ہوئے سب سے پہلے نہایت پھرتی کے ساتھ ڈرائیور کی طاقت ور گھونسا جڑ دیا۔

اس کے منہ سے ''اوغ'' کی ہلکی سی آواز خارج ہوئی اور پھر وہ گردن ایک طرف ڈال کر بے ہو گیا۔ عین اسی وقت اس کے ساتھی نے مجھ پر پستول سے فائر کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا مگر میں یکدم ہٹ کر جیپ کے بونٹ کی آڑ میں ہو گیا۔ میگارد ہر وقت میرے ساتھ ہوتا تھا۔ میں نے فوراً ہی نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ غفورے کے ساتھی نے ابھی میرے ہاتھ میں پستول کی جھلک نہیں دیکھ مگر وہ مجھ سے بہر حال محتاط تھا اور شاید مجھے نہتا سمجھ کر جما ہوا تھا ورنہ وہ کب کا لالہ زار والی رات کی بھاگ چکا ہوتا۔

میں نے جھکے جھکے بونٹ کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا اور ساتھ ہی ذرا سر اُبھار کر د میں نے دشمن کو غائب پایا۔ ایکا ایکی میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک خدشہ اُبھرا اور ہی میں اسپرنگ کی طرح اچھل کر بونٹ پر چڑھ گیا۔ ٹھیک اسی وقت پراڈو کے نیچے گولی چلنے کی اُبھری۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ دشمن نے نیچے جھک کر میرے پیروں پر گولی چلانے کی کوشش تھی۔ ناکامی کی صورت اور بونٹ پر میرے اچھل کر چڑھنے کی دھمک نے اسے جیسے ہی غیر ارادی طو سیدھا کھڑے ہونے پر مجبور کیا تو میں نے اس پر اپنے میگارد سے گولی چلانے کی بجائے اس کے چ پر اپنے بوٹ کی ایک زوردار ضرب رسید کر دی۔ وہ بھیانک انداز کی کراہ آمیز چیخ کے ساتھ کئی قدم میں لڑکھڑا کر جھاڑیوں میں جا گرا۔ پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ میں بھلا اب کہاں موقع دینے والا تھا۔

میں ایک ایتھلیٹ تو تھا ہی۔ چنانچہ میں نے وہیں سے ایک لانگ جمپ لگائی اور فضا میں اُڑ سیدھا دشمن پر جا پڑا۔ میری دونوں ٹانگیں اس کے سینے پر جم کر پڑتیں تو یقیناً اس کے سینے کے پسلیاں ٹوٹ کر اس کے پھیپھڑوں میں پیوست ہو جاتیں مگر اس نے اپنے بچاؤ کی صرف اس قد کوشش کی کہ اپنے وجود کو سکیڑ لیا۔ میں اس پر گرا۔ وہ کراہ آمیز انداز میں چیخا۔ میں نے ہانپتے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اسی وقت میری سماعتوں سے جیپ کے اسٹارٹ کی مخصوص آواز اُبھری۔

ایک لمحے کے لئے میری توجہ بٹ گئی۔ میں نے گردن موڑ کر غیر ارادی طور پر عقب میں دیکھا۔ والا دشمن ہوش میں آتے ہی جیپ اسٹارٹ کر کے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ توجہ ہٹتے ہی میں دوسرے زیردست دشمن کو مجھ پر وار کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے جما کر اپنے ایک ہاتھ کا گھونسا میں جبڑے پر رسید کر دیا۔ ضرب کی شدت نے میرے دماغ کو جھنجنا دیا۔ پہلے والے دشمن کی جیپ اسٹا کرنے کی کوشش جاری تھی۔ مجھے زیردست دشمن کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ مجھے گھونسا رسید کر کے گو نے میرے وجود کی آتشِ جنوں بھڑکا دی تھی۔ میں نے ایک ہی زوردار پنچ مار کر اسے لمبا کر ڈالا۔ اسی وقت مجھے ایک تیز اور ہسٹریائی انداز کی نسوانی چیخ سنائی دی۔

یہ آواز جیپ کے اندر سے اُبھری تھی۔ میرے پاس حیرت میں پڑ کر وقت ضائع کرنے کا کوئی نہ تھا۔ میں غراتا ہوا جیپ کی طرف بڑھا۔ اس اثناء میں جیپ اسٹارٹ ہوتے ہی ایک جھٹکے سے آ


Courtesy www.pdfbooksfree.pk


بڑھ چکی تھی۔ جیپ کے اندر سے نسوانی چیخیں ابھی تک بلند ہو رہی تھیں جس نے میرے اُلجھن آمیز تجسس کو مزید بڑھا دیا تھا۔ میں نے جیب میں ٹھونسا ہوا میگارد نکال کر جیپ کے ٹائر کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ تاریکی کے باوجود میرا نشانہ حیرت انگیز طور پر کامیاب ثابت ہوا۔ سماعت شکن دھماکے سے جیپ کا ٹائر برسٹ ہوا اور وہ ایک طرف جھک گئی۔

میں تیزی سے آگے بڑھا۔ جیپ رک چکی تھی۔ اس کے اندر سے دشمن دروازہ کھول کر آناً فاناً قریب کی تاریک جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ میں نے دو تین مزید فائر جھونک مارے لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں دوڑ کر پراڈو کے پاس پہنچا اور کھڑکی سے اندر جھانکا۔ پراڈو جیپ کے اندر مدھم روشنی میں ایک جوان العمر عورت کو دیکھ کر میں بری طرح چونکا تھا۔

وہ رسن بستہ حالت میں جیپ کے فرش پر پشت کے بل پڑی ہوئی تھی۔ مگر میرے چونکنے کی وجہ اس کی مجھ سے شناسائی تھی۔ یہ غزالہ تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر چونک اُٹھی تھی۔ دفعتہً مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں فوراً پلٹا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ کسی نے اچانک ہی عقب سے میری کھوپڑی پر کسی ٹھوس شے سے وار کیا تھا۔ مجھے اپنا ذہن تاریکی میں ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

❋ ❋ ❋

یہ دس بائی بارہ کا کمرہ تھا جس کے محدود ماحول میں ہوش آنے کے بعد میری آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں ٹیوب لائٹ روشن تھی جبکہ کمرہ ہم دونوں کے علاوہ ہر شے سے عاری تھا۔ یعنی میرے علاوہ سپاٹ کمرے کے ننگے فرش پر غزالہ بھی موجود تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر مقتول جواد احمد کی بیوی غزالہ کو غفورے کے ساتھیوں نے کیوں اغواء کیا تھا۔ یہ لوگ یقیناً اسے اسلام آباد سے اغواء کر کے کہیں لے جا رہے تھے۔ مگر غزالہ پنڈی میں رہتی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس رات والے عجیب و غریب واقعے اور اپنے بدنصیب شوہر جواد احمد کے قتل کے بعد اسلام آباد میں کہیں مقیم ہو اور یہ لوگ بُو گیر کتوں کی طرح اس کی بُو سونگھتے ہوئے وہاں تک جا پہنچے ہوں۔ مگر کیوں؟.........غزالہ کی غفورے کے ٹولے کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟ اب مجھے یہ غزالہ ہی بتا سکتی تھی۔

اس رات جب غزالہ پراسرار طور پر مجھے مدد کی غرض سے بصد اصرار اپنی رہائش گاہ میں لے گئی تھی، آج شاید اس پراسرار ڈرامے کا پردہ گرنے والا تھا۔ بہرطور شکر تھا کہ مجھے رسن بستہ نہیں کیا گیا تھا جبکہ غزالہ بھی اب جکڑ بندیوں سے آزاد میری طرح ننگے فرش پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ اسے بھی اب ہوش آنے لگا تھا۔

مجھے اپنے سر کے پچھلے حصے میں ٹیس سی اُٹھتی محسوس ہوئی۔ میں نے ہاتھ رکھ کر چوٹ کو سہلایا تو وہاں ایک گومڑ کا ابھار محسوس ہوا۔ مجھے وہاں خون کی چپچپاہٹ بھی محسوس ہوئی تھی۔

میں نے اس معمولی چوٹ کو خیرباد کہا اور غزالہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ''مِلک روز'' رنگ کے مہین سلیپنگ گاؤن میں ملبوس تھی اور اس کے پُرشباب جسمانی خطوط توبہ شکن انداز میں اپنی قیامت خیز جھلک دکھا رہے تھے۔

''یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے؟'' میں نے سرسری نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد پوری طرح ہوش میں آتی ہوئی غزالہ سے پوچھا۔ وہ خود دہشت زدہ نظر آ رہی تھی۔ یکدم فرش پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ

خاصی ہراساں نظر آ رہی تھی مگر میں نے فوراً ہی محسوس کیا کہ میری موجودگی پر وہ متحیر ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے مطمئن بھی نظر آنے لگی تھی۔

''تت.....تم.....تمہاری ان لوگوں کے ساتھ کیسے مڈبھیڑ ہوگئی؟'' وہ اپنے بے ترتیب سلیپنگ گاؤن کو درست کئے بغیر مجھ سے بولی۔

''پہلے میرے سوال کا جواب دو۔'' میں نے سرد مہری سے کہا تو وہ جواباً بولی۔

''یہ لوگ مجھے اسلام آباد سے اغواء کر کے لے جا رہے تھے۔ اوہ گاڈ!.....کک.....کیسے انہیں پتہ تو نہیں چل گیا کہ اس رات تم بھی وہاں میری پنڈی والی رہائش گاہ میں موجود تھے، جب میرے شوہر کو شوکی نے قتل کر ڈالا تھا اور بعد میں وہ میرے ہاتھوں مارا گیا تھا؟'' یہ کہتے ہوئے وہ مزید ہراساں نظر آنے لگی۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کا ہراس میری جان مصیبت میں پڑنے کی وجہ سے تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کون سی ہولناک رات کا حوالہ دے رہی تھی۔ مجھے اس پراسرار اور ہولناک رات کا منظر اچھی طرح یاد تھا جب میں اپنے ٹال سے نکل رہا تھا تو غزالہ اچانک اپنی کار میں پنڈی سے مری میرے پاس ٹال پر پہنچی تھی اور مجھے کچھ بتائے بغیر اپنی مدد کی خاطر اپنے ساتھ اپنی پنڈی والی رہائش گاہ تک لے جانا چاہتی تھی۔ وہاں پہنچ کر ایک مسلح نقاب پوش سے مڈبھیڑ ہوئی تو مجھے یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ یہ سارا چکر غزالہ نے مجھے پھنسانے کے لئے چلایا تھا۔ مگر پھر جب میں نے اس کے شوہر کی خواب گاہ میں معذور جواد احمد کے سینے میں خنجر اُترا ہوا دیکھا تو دہل کر رہ گیا تھا۔ غزالہ نے بھی اپنے شوہر جواد احمد کو بیڈ پر مُردہ حالت میں پایا تو ہسٹریائی انداز میں چلّائی تھی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ مجھے پھنسانے کے لئے ڈرامہ کر رہی تھی۔ مگر جب اس نے میرے اس نقاب پوش کے ساتھ مارا ماری کے دوران ہاتھ سے چھوٹ کر گر جانے والے پستول سے نقاب پوش پر فائر کر کے اسے ہلاک کر ڈالا، تب مجھے احساس ہوا کہ معاملہ میری سوچ سے بھی بڑھ کر پُراسرار اور گمبھیر تھا۔ مگر پھر غزالہ نے مجھے کچھ بتائے بغیر واپس جانے پر اصرار کیا تھا۔ یوں میں بھی اس گھن چکر پر ایک عدد لعنت بھیج کر لوٹ آیا تھا۔ آج شاید اس پراسرار واقعے کے بارے میں پردہ اٹھنے والا تھا۔

غزالہ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی شوکی کا نام لیا تھا، جس نے غزالہ کے معذور شوہر جواد احمد کا قتل کیا تھا اور بعد میں خود بھی غزالہ کے پستول کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ چنانچہ جب غزالہ نے مجھ سے ہراساں لہجے میں کہا کہ کہیں ان لوگوں کو اس بات کا علم تو نہیں ہوگیا کہ اس رات میں بھی وہیں تھا تو میں ساری بات سمجھ گیا کہ یہ لوگ شوکی کے ہی ساتھی تھے اور غزالہ کو اس جرم میں اغواء کر کے لے جا رہے تھے کہ اتفاق سے راستے میں مجھ سے بھی مڈبھیڑ ہوئی۔

میں نے اس کی آگہی کے لئے یہ بتایا کہ یہ لوگ میرے ایک دشمن جو درحقیقت ہمارا شکار تھا، غفورے کے ساتھی تھے تو غزالہ نے میری مختصر صراحت سننے کے بعد ایک گہری ہمکاری لے کر اپنا تفصیلی حال سناتے ہوئے ایک چونکا دینے والا انکشاف بھی کیا۔

وہ نقاب پوش، شوکت عرف شوکی درحقیقت غفورے اور اشفاق شاہین کا ہی ساتھی تھا۔ نیز شکورانا کا شخص غفورے کا سگا بھائی تھا اور شکورا وہی چھپکلی مارکہ بدمعاش تھا جس نے میری ماں کو اغواء کیا تھا جسے بعد میں، میں نے لالہ زار میں ماں اور غفورے کے تبادلے کی ڈیلنگ کے دوران واصل جہنم کر ڈالا تھا۔

میں اس انکشاف کے علاوہ اشفاق شاہین کے ذکر پر بھی بری طرح چونکا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ اس دوران جب میں نے انکل اعظم خان سے یونہی غفورے کے متعلق پوچھا تھا تو انہوں نے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ غفورا درحقیقت پروڈیوسر اشفاق شاہین کا ہی گرگا اور خاص گماشتہ تھا۔ جبکہ خود پروڈیوسر اشفاق شاہین انڈر ورلڈ فلم مافیا کا ایک ''ڈان'' تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے ہی ایک معروف فلمی اداکارہ ''سپنا'' کو غفورے کے ہاتھوں قتل کروایا تھا۔

''کیا سوچنے لگے؟'' مجھے سوچتا پا کر اچانک غزالہ نے پوچھا تو میں نے کہا۔

''کچھ نہیں.....تم اپنی بات ختم کرو اور مجھے بتاؤ کہ وہ رات والا آخر معاملہ کیا تھا؟ نیز تمہارے شوہر جواد احمد کو کیوں قتل کیا گیا تھا؟''

میری بات پر غزالہ نے دوبارہ اپنی داستان کا سلسلہ جوڑا۔ ان غیر یقینی حالات میں ہم دونوں کا پہلے ہی ان باتوں سے آگاہ ہونا اشد ضروری تھا۔ کیونکہ غفورے اور غزالہ کے ڈانڈے مجھ سے آن ملے تھے۔

''اشفاق شاہین ایک بہت سنگ دل اور سفاک انسان ہے.....اس نے میری بہن سپنا کا قتل کروایا تھا۔''

''کیا.....اداکارہ سپنا تمہاری بہن تھی؟'' میں بری طرح چونکا۔

''ہاں.....'' وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں اپنی بہن کے قاتل سے نمٹنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے مجھے اشفاق شاہین کے ہاتھوں کھلونا بھی بننا پڑا مگر میں اپنی عزت گنوانے کے باوجود اس رذیل انسان سے اپنی بے گناہ بہن ''سپنا'' کے خون کا انتقام نہ لے پائی اور الٹا اسے اپنا دشمن بنا لیا۔ میں اس سے دور ہوگئی۔ اس سے دور ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ درحقیقت ایک شیطان تھا۔ مخرب الاخلاق فلم بنانے والی ایک بین الاقوامی فلم کمپنی سے اس کے خفیہ تعلقات تھے۔ وہ مجھے اس میں کام کر کے دولت مند بنانے کا لالچ دینے لگا۔ میں نے انکار کیا تو مجھ پر دباؤ ڈالنے لگا۔ میں اس سے دور ہوگئی۔ پھر اس رات، جب میں تم سے مدد لینے راتوں رات پنڈی سے مری آئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس رات اشفاق شاہین نے اپنے ایک ساتھی شوکی کو مجھے گن پوائنٹ پر لینے کے لئے بھیجا تھا۔ میں نے کسی طرح شوکی کو بے وقوف بنا کر اسے ایک کمرے میں محبوس کر دیا۔ پریشانی کے عالم میں مجھے یہی طریقہ سوجھا تھا۔ اور جب میں تمہیں لے کر واپس اپنے گھر پہنچی تو وہ بدبخت شوکی جانے کس طرح آزاد ہو کر میرے شوہر کو قتل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بعد میں، میں نے بھی تمہاری آنکھوں کے سامنے مغلوب الغضب ہو کر اسے قتل کر ڈالا۔ میں سمجھ گئی تھی، یہ پلاننگ ہی ساری اس خبیث اور ابلیس صفت شخص اشفاق شاہین کی تھی۔ یعنی میرے شوہر کو قتل کر کے مجھے تنہا کرنا۔ کیونکہ وہ یہی سمجھتا تھا کہ میں اپنے شوہر کی وجہ سے اس گھناؤنے منصوبے کی تکمیل سے انکاری ہوں۔ اس کے بعد میں اپنی پنڈی والی رہائش گاہ کو فروخت کر کے اسلام آباد میں ایک کرائے کا اپارٹمنٹ لے کر رہنے لگی۔ مگر اشفاق شاہین نے میرا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔'' وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔

میرے سینے میں بری طرح ہلچل ہونے لگی۔ غفورا کس قدر خطرناک لوگوں کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا، مجھے اس کا ہرگز اندازہ نہ تھا۔ اس کریہہ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ جس کا تذکرہ کرنا بھی شاید معیوب بات ہو۔ لیکن ''فحاشی'' اور ''معیوب'' کا نام دے کر بھلا کب تک بعض کڑوی حقیقتوں سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ مخرب الاخلاق فلموں کی ترسیل و فروخت ایک طویل عرصے سے جاری ہے جو نئی نسل کے اخلاق و کردار کو تیزی سے برباد کر رہی ہے۔ اس قسم کی فلموں کو ''تھری ایکس'' کی مخصوص اصطلاح کا نام دیا گیا تھا۔ یہ تو خیر ایک پرانا مسئلہ تھا ہی اور اس گندی وبا پر قابو نہ پانے کی وجہ سے آج نوبت یہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



تک آ پہنچی ہے جو شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اب انڈر ورلڈ فلم مافیا نے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی خاطر اپنے وطن عزیز میں بھی ایسی بلیو فلمیں خفیہ طور پر بنانا شروع کر دی تھیں، جن کے باقاعدہ کاروباری مراسم امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کی معروف بلیو فلم کمپنی سے استوار ہو چکے تھے اور انہی کے تعاون سے ان کی ڈسٹری بیوشن پورے ملک میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہو رہی تھی۔ باہر کا گند باہر والے جانیں مگر ہمیں اپنے ملک سے تو کم از کم اس برائی کو ختم کرنا چاہئے۔ یہاں یہ مذموم اور شرم ناک کاروبار شروع ہو چکا تھا۔ اب مجھے غزالہ بتا رہی تھی کہ یہاں اس کا چیف اشفاق شاہین تھا اور غفورا اس کا دست راست تھا۔

''کیا سوچنے لگے نادر؟''

معاً مجھے دوبارہ سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر غزالہ نے الفاظ کو ٹہوکا دیا تو میں چونک کر خیالات کے بھنور سے اُبھر کر پھر ایک گہری ہنکاری لے کر بولا۔

''اس کا مطلب ہے، ہم دونوں ہی اس وقت بہت خطرناک قسم کے کرمنل اور انڈر ورلڈ کے ایک بہت بڑے گینگسٹر کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔''

''ہاں نادر!..... مجھے بھی سب سے زیادہ یہی پریشانی ہو رہی ہے۔'' میری پُرتشویش بڑبڑاہٹ سن کر وہ بھی متوحش لہجے میں بولی۔

''خیر، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''میں ذرا کمرے کا جائزہ لے لوں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا۔

یہ کمرہ ہم دونوں کے علاوہ ہر شے سے عاری تھا۔ حتیٰ کہ اس کی چہار دیواری میں کوئی کھڑکی تک نہ تھی سوائے چھوٹے سے چوکور روشندان کے، جو کمرے کی جنوبی سمت کی دیوار پر حاصی بلندی پر تھا اور اس کے چوکھٹے پر موٹی موٹی آہنی سلاخیں نصب تھیں۔ میں کچھ سوچ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

حسب توقع اس میں ایک ذرا سی بھی جھری تک نہ تھی۔ روشندان سے مقدور بھر نظر آنے والے تاریک آسمان سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی رات اپنے پچھلے پہر پر ہی تھی۔ میں نے غزالہ کی جانب پلٹ کر اس سے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہم اس وقت اس خبیث اور ابلیس صفت شخص اشفاق شاہین ہی کی قید میں ہیں؟''

''مجھے سو فیصد یقین ہے۔'' وہ مستحکم لہجے میں جواباً بولی۔ ''کیونکہ جو لوگ ہمیں یہاں لائے ہیں، میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ لوگ اشفاق شاہین کے ہی گماشتے ہیں۔''

مجھے اب اس بات پر ایک نئی تشویش نے آن گھیرا تھا۔ اگر یہ لوگ اشفاق شاہین جیسے خطرناک انڈر ورلڈ گینگسٹر کے آدمی تھے تو یقیناً غفورا سمیت چھپکلی مارکہ زرد رو بدمعاش لیڈر بھی اشفاق شاہین کا ہی خاص آدمی ہوگا جس نے میری ماں کو یرغمال بنایا تھا اور اس کی رہائی کے بدلے لالہ زار میں غفورے کی رہائی کی ڈیلنگ کے دوران وہ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا۔ اس کے نتیجے میں غفورا فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ گویا اب اشفاق شاہین کی توپوں کا رخ میری جانب ہو سکتا تھا۔

میں نے غزالہ کو اس چھپکلی مارکہ بدمعاش کے حلیے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تو وہ مزید ہراساں ہو گئی اور خوف زدہ نگاہوں سے میری جانب تکتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولی۔ ''کک..... کیا تم نے شش..... شکورے کو قتل کر ڈالا؟''

''اس کا میرے ہاتھوں یہی انجام ہونا تھا۔ اس نے میری ماں کو اغواء کرنے کا ناقابل معافی جرم کیا



تھا۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ میری ماں کو اغواء کرنے کے بعد فون پر مجھ سے اس قدر لچر اور خبیثانہ گفتگو کیوں کر رہا تھا؟ اس لئے کہ وہ اشفاق شاہین جیسے مکروہ شخص کا ساتھی تھا۔'' میں دانت پیس کر بولا تو غزالہ کی حالت مزید تشویش ناک ہو گئی۔ وہ اب بہت زیادہ خوف زدہ اور ہراساں نظر آنے لگی تھی۔ پھر کپکپاتے لہجے میں بولی۔

''تت..... تم نہیں جانتے نادر! کہ تم نے نادانستگی میں کیسے خطرناک لوگوں سے ٹکر لے لی ہے۔ شکورا اور غفورا دونوں سگے بھائی ہیں اور اشفاق شاہین کے مقرب الخاص بھی۔ اوہ خدایا!..... مجھے امید نہ تھی کہ یہ معاملہ اس قدر سنگین صورت اختیار کر لے گا۔''

اس بات پر مجھے بھی اگرچہ ایک جھٹکا لگا تھا تاہم میں نے اس کے ہراساں چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے استہزائیہ مسکراہٹ سے کہا۔

''حیرت ہے..... تم اپنی بہن سپنا کا اشفاق شاہین جیسے ایک بڑے انڈر ورلڈ گینگسٹر سے انتقام لینا چاہتی تھیں اور اب اس سے خوف بھی محسوس کر رہی ہو؟''

میرے طنز پر وہ برا منائے بغیر بولی۔

''میں علی الاعلان اس سے ٹکرانے کی بے وقوفی ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ میں پہلے اس کے قریب آنا چاہتی تھی مگر قریب آنے کے بعد ہی مجھے اس حقیقت کا احساس بھی ہو گیا کہ اسے ہلاک کرنا اتنا آسان نہ تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ شاید میں اتنی بہادر نہ تھی۔ تاہم یہی بات میرے الٹا گلے پڑ گئی۔ میں نے اپنی عزت تو اس کے ہاتھوں گنوا دی تھی مگر جان گنوانے کا مجھ میں حوصلہ نہ ہو پایا تھا۔ تاہم میں موقع کی منتظر ضرور تھی۔ لیکن جب الٹی آنتیں گلے پڑنے کے مصداق اس مردود نے مجھ پر فحش فلم بندی کا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تو میں آہستہ آہستہ اس سے دور ہونے لگی۔ مگر جلد ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے اپنے شیطانی چنگل میں جکڑنے والا تھا۔ میں نے اس سے جان چھڑانے کے لئے بہانہ کر دیا تھا کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ بس یہی میرے شوہر جواد احمد کی موت کا سبب بنی۔ یوں اس رات اشفاق شاہین نے شوکت عرف شوکی کو میرے شوہر کے قتل اور مجھے لانے کے لئے بھیجا تھا۔ اب اشفاق شاہین مجھ سے اس بارے میں کڑی باز پرس کرے گا۔ مگر تم یہ بات ہرگز اس سے مت کرنا کہ تم بھی اس رات.....''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے سوچا کہ کمرے کی اکلوتی ٹیوب لائٹ بجھا دوں۔ مگر میں ایسا نہ کر پایا۔ دروازہ دھڑاکے سے کھلا اور تین افراد ہاتھوں میں گنیں سیدھی کئے اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک شخص کو پہچان کر میری کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ وہ غفورا تھا جو مجھے شعلہ بار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اُس کا ڈنبے کی طرح پلا ہوا وجود غیظ و غضب کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اس کی کھولتی اُبلتی کیفیات سے میں واقف تھا۔ کیونکہ بہ قول غزالہ کے میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے والا وہ چھپکلی مارکہ بدمعاش شکورا اس کا سگا بھائی تھا۔

''دل تو میرا یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت تجھے گولیوں سے بھون ڈالوں..... لیکن.....''

مجھے غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے وہ دانت کچکچا کر بولا اور دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ یہ میری سرشت تھی کہ ایسے نازک مواقع پر میں جوش کو خیر باد کہہ کر ہوش سے کام لیتا تھا۔ لہٰذا بولا۔

''مجھے کہیں معلوم تھا کہ وہ تمہارا بھائی تھا۔ لیکن اس نے بھی میری ماں کو اغواء کرنے کا گھناؤنا اور ناقابل معافی جرم کیا تھا۔''

''یرغمال تو تم نے مجھے بھی بنا رکھا تھا، بلا کسی سبب کے......... کیوں؟'' وہ بدستور غضب ناک لہجے میں بولا۔ میں نے بھی بلا تامل کہا۔

''ہم تمہیں پولیس سے تحفظ دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ ایس پی ظہیر قریشی اور ڈپٹی رانا مشتاق تمہاری تلاش میں چھاپے مار رہے تھے۔ تمہارا پولیس کے ہاتھ آ جانا، ہمارے دشمنوں کے مفاد میں تھا۔

''جھوٹ مت بولو نادر علی خان!'' وہ زخمی درندے کی طرح غرایا۔ ''حقیقت یہ تھی کہ تمہارا وہ نام نہاد انکل اعظم اور تمہاری ناگن صفت ماں مجھے قتل کر ڈالنا چاہتے تھے تاکہ ملک سردار خان کے قتل کا کیس ہمیشہ کے لئے داخل دفتر ہو جائے۔ میری نمک حلالی کا یہ صلہ ملا ہے؟''

''اس میں تمہاری جلد بازی کا دخل تھا۔'' میں نے لہجے کو پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند کرو.........اب اپنی بھیانک موت کے لئے تیار ہو جاؤ نادر علی خان!'' وہ غضب ناک لہجے میں غرایا۔ اس کے خطرناک تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے اسی وقت گولیوں سے بھون دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرے وجود میں سنسنی پھیل گئی۔ اس کے باقی دونوں مسلح ساتھی میری جانب اپنی گنوں کا رخ کئے نہایت مستعد کھڑے تھے جبکہ غزالہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ میری عقابی نظریں بظاہر غفورے کے طیش آور چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن ساتھ ہی ٹرائیگر پر اس کی انگلی کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ اب کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

''نہیں......... ٹھہرو......... پلیز ٹھہرو۔'' اچانک غزالہ میرے عقب سے چلاّئی اور پھر میری ڈھال بن کر غفورے سے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے چیف صاحب سے ملواؤ۔ ان سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔''

اس کی بات پر غفورے کے گینڈے جیسے بدصورت چہرے پر اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''لگتا ہے، نیا یار پال لیا ہے۔ چلو.........ہم تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔'' دوسرے ہی لمحے وہ درشت لہجے میں بولا۔

میں نے بے اختیار طویل سانس لی۔ وہ ہمیں شاید اپنے چیف اشفاق شاہین کے پاس لے جانے کے لئے آیا تھا۔ ہم دونوں نے ان کی رائفلوں کے اشارے پر حرکت کی اور کمرے سے باہر آ گئے۔ ایک روشن راہداری سے چلتے ہوئے نشست گاہ کی طرز کے کمرے میں آ گئے۔ اس دوران میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تھا۔ یہ کسی شاہانہ طرز کی کوٹھی کا اندرونی حصہ تھا۔

میری نظر سامنے پڑی، ایک لگژری طرز کے فیملی صوفے پر وہ بھاری بھرکم شخص اپنا دایاں بازو صوفے کی پشت گاہ پر پھیلائے بڑے شاہانہ کروفر کے ساتھ بیٹھا تھا۔

پینتالیس، پچاس کے درمیان میں اس کی عمر کا اندازہ ہوتا تھا۔ جسم بھاری بھرکم ضرور تھا مگر تنومند تھا۔ سر کے بال بہت لمبے، گھنے تھے۔ چہرہ کلین شیو تھا۔ قلمیں لانبی لانبی تھیں۔ اس کی آنکھیں چندی چندی تھیں جن میں خباثت بھری چمک تھی۔ اس نے عام سی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ یہ شاید اس کا شب خوابی کا لباس تھا۔ تاہم مجھے حیرت تھی کہ رات کے اس آخری پہر میں اسے ہماری ''پیشی'' کرانے کی اتنی جلدی کیا پڑ گئی تھی۔

اس نے غزالہ پر تو ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی جبکہ میرے چہرے پر اس کی تیز سرسراتی ہوئی نظریں جم کر رہ گئی تھیں۔

''بیٹھو!'' اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔

ہم دونوں اس کے سامنے کے صوفے پر براجمان ہو گئے۔ میری نظریں ابھی تک اس کے چہرے



جائزہ لے رہی تھیں۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت کسی ولن ہی جیسی نظر آتی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے.........؟'' اس نے بدستور اپنی تیز بھانپتی ہوئی نظریں میرے وجود پر مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''نادر علی خان۔''

''غزالہ سے تمہاری کب سے دوستی ہے؟'' اس نے اگلا سوال پوچھا۔ لہجہ خشک تھا۔

''میری اس سے دوستی نہیں ہے۔''

''تم اسے جانتے بھی نہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''ہوں.........'' اس نے ایک گمبھیر سی اسرار بھری ہمکاری خارج کی۔ ''یہ سچ کہہ رہا ہے غزالہ؟'' اس نے اس بار غزالہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ جبکہ ادھر میں بھی اس کے بارے میں یقینی اندازہ لگا چکا تھا کہ یہی اشفاق شاہین تھا۔ انڈر ورلڈ فلم مافیا کا ڈان اور ایک خطرناک گینگسٹر۔

جواباً غزالہ نے مرتعش سی آواز میں اس سے کہا۔ ''ہاں......... یہ صحیح کہہ رہا ہے۔''

اس کے بعد اشفاق شاہین نے غفورے کے ساتھ کھڑے اپنے دو ساتھیوں سے کہا۔ ''اسے یہاں سے لے جاؤ۔''

اشارہ غزالہ ہی کی طرف تھا۔ مگر اچانک غفورے نے مداخلت کرتے ہوئے اشفاق شاہین سے دبے دبانہ کہا۔ ''یہ جھوٹ بول رہی ہے، چیف!''

میں اور غزالہ سناٹے میں آ گئے۔ اشفاق شاہین خاموشی سے غفورے کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ اپنے چیف کی خاموشی مگر مستفسرانہ نظروں کا مطلب بھانپتے ہی مزید بولا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے نادر کی ڈھال بن کر اس کی مجھ سے جان بخشی کی سفارش کی تھی۔''

غفورے کی اس بات پر اشفاق شاہین نے تیز اور سنسناتی نظروں سے غزالہ کو گھورا۔

''مجھ سے جھوٹ بولنے کا انجام جانتی ہو؟''

''میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' جواباً غزالہ نے ہراساں ہونے کے باوجود قدرے سکون سے جواب دیا وہ شاید خود کو کسی حد تک سنبھال چکی تھی۔ ''غفورے نے ایک دم ہی اس پر اپنی گن تان لی تھی۔ اسے ہلاک کرنے کے درپے ہو گیا تھا۔ یہ خون ریزی میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔'' غزالہ نے جواب دیا۔

''لے جاؤ اسے۔'' اشفاق شاہین نے کھرکھراتے لہجے میں کہا۔

دونوں ساتھی، چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آئے اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اب کمرے میں ہم تین افراد رہ گئے تھے۔

''تم بیٹھو!'' اشفاق نے غفورے سے کہا۔ وہ خاموشی سے ایک طرف صوفے پر براجمان ہو گیا۔

''تم نے ہمارے ایک اہم آدمی، شکورے کا قتل کیا ہے۔ اس کی سزا تم خود تجویز کرو گے۔'' معاً اشفاق نے میری طرف گھور کر سرسراتے لہجے میں کہا تو میں نے بھی اسے وہی جواب دے ڈالا جو ذرا دیر پہلے میں غفورے کو دے چکا تھا۔ مگر اشفاق شاہین میرے اس جواب سے متفق نہ ہوا۔ اس کی عجیب شخصیت تھی، بیک وقت وہ سرد مزاج اور سفاک انسان بھی محسوس ہوتا تھا اور متحمل بھی۔ اس نے غفورے کو مخاطب کر کے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''یہ تمہارا مجرم ہے۔ اس نے تمہارے بھائی کو ہلاک کیا ہے۔ اس کی سزا بھی تم خود بخود تجویز کر لو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



چاہو تو چھوڑ بھی سکتے ہو اسے۔'' وہ یہ کہہ کر اٹھا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ اب میں اور غفورا وہاں رہ گئے۔

''میں ایک شرط پر تمہاری جان بخشی کر سکتا ہوں۔'' اشفاق شاہین کے جانے کے بعد غفورے نے مجھ سے کہا۔

''کون سی شرط؟'' میں نے پوچھا۔

''تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔''

''میں کب تمہارے پیچھے ہوں؟'' میں نے بھی حالات سنبھلتے ہی مفاہمانہ رویہ اختیار کیا۔ کیونکہ حقیقت تھی کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی دشمنی نہ تھی۔

''تم، تمہاری ماں اور اعظم خان مجھے ہر قیمت پر قتل کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''درحقیقت ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ہاتھے نہ چڑھو اور بس۔''

''میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔'' وہ پہلی بار ہموار لہجے میں بولا۔ ''تم چیف کو نہیں جانتے۔ یہ ان کی تم پر ایک بہت بڑی مہربانی ہے۔ انہوں نے تمہارے سلسلے میں کوئی کڑا فیصلہ نہ کیا بلکہ یہ معاملہ میرے سپرد کر دیا۔''

''ہاں......... تمہارے چیف ایک سمجھ دار انسان ہیں۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ سب محض غلط فہمی کے سبب ہوا۔'' میں نے چالاکی سے کہا۔ ''اور تم اب جان گئے ہو کہ ہماری براہِ راست تم سے یا تمہارے چیف سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔''

''تو پھر ڈن!'' وہ گفتگو کو سمیٹتے ہوئے بولا۔

''ڈن!'' میں نے دانستہ اپنے ہونٹوں پر ہلکی سی دوستانہ مسکراہٹ سموتے ہوئے کہا۔

''تم جا سکتے ہو۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا مگر جانے سے پہلے اس سے بولا۔ ''پولیس کے علاوہ تمہیں نظر حیات وغیرہ سے بھی محتاط رہنا ہوگا۔ تمہیں تو نظر حیات اور ہمارے درمیان دشمنی کا علم ہوگا ہی۔ اس لئے وہ تمہیں ہر صورت میں گرفتار کروانا چاہتے ہیں تاکہ ہمارے خلاف تمہیں وعدہ معاف گواہ کا جھانسا دے کر......

''میں اتنا احمق نہیں ہوں۔'' وہ میری بات کاٹ کر تلخ مسکراہٹ سے بولا۔ ''بس، اب تم جاؤ۔ میرے حصے کا کام مجھ تک رہنے دو۔ باہر تمہاری جیپ موجود ہے۔''

میں اس کا شکریہ ادا کر کے اس کی رہنمائی میں کوٹھی سے باہر آ گیا۔ یہ بڑی عالیشان اور وسیع کوٹھی تھی۔

خنک سی فضا میں گل بوٹوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ میں کن انکھیوں سے گرد و پیش کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ یہ مجھے گلبرگ کا پوش علاقہ ہی محسوس ہوتا تھا۔ دائیں بائیں وسیع لان تھا جہاں ذرا فاصلے پر چھوٹے کھمبوں میں برقی گلوب روشن تھے۔

وسیع چکنے احاطے میں دو مزید بھاری بھرکم چمچماتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میری جیپ الگ تھلگ نظر آ گئی۔ میں خاموشی سے اپنی جیپ میں سوار ہو گیا۔ اگنیشن سوئچ میں چابی لگی ہوئی تھی۔ گیٹ پر ایک گن بردار محافظ نے مجھے جیپ میں سوار ہو کر اسے اسٹارٹ کرتے دیکھ کر ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ جیپ کو پختہ روش پر دھیمے دھیمے چلاتا ہوا باہر آ گیا۔ عقب میں گیٹ بند ہو گیا۔



میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ لاہور کا پوش علاقہ، گلبرگ ہی تھا۔ میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ ہر سُو سناٹے اور گہری تاریکی کا راج تھا۔ میں مین شاہراہ پر آ گیا تھا۔

اب تک میرا جن خطرناک لوگوں اور خونی گروہوں سے سامنا ہوا تھا، یہ لوگ ان سے قطعی طور پر مختلف اور عجیب ہی نکلے تھے۔ یا پھر میری سوچ سے بڑھ کر شاطر اور دور اندیش تھے۔ غزالہ نے انڈر ورلڈ فلم مافیا کے گینگسٹر اشفاق شاہین کا میری نظروں کے سامنے جو نقشہ کھینچا تھا، یہ ان سے مختلف ہی محسوس ہوئے تھے۔ اپنے ساتھی کی میرے ہاتھوں ہلاکت کا پتہ چل جانے کے باوجود اشفاق شاہین نے ہی نہیں بلکہ غفورے نے بھی مجھے چھوڑ دیا تھا۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ٹھنڈی پالیسی اور گہری سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ خواہ مخواہ کسی سے پنگے بازی نہیں کرتے تھے۔ شکورے کی میرے ہاتھوں ہلاکت کی درست نوعیت کو سمجھتے ہوئے ان لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا تھا اور یہ بھی کہ اس میں کسی قسم کی ذاتی یا پرانی دشمنی کا دخل نہ تھا۔ تو پھر کیوں کر معاملے کو طول دیا جائے؟ تاہم میرا دل یہی کہتا تھا کہ ایسے خاموش لوگ، ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ہوتے ہیں جو اپنے اندر بڑے بڑے طوفان چھپائے ہوئے ہوتے ہیں اور لومڑی کی سی چالاکی اور اونٹ کا کینہ رکھتے ہیں۔

بہر طور......... مجھے غزالہ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا افسوس ضرور تھا۔ وہ بہر حال مظلوم عورت تھی اور اشفاق شاہین ایک سفاک اور خبیث انسان۔ میں غزالہ کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کا معاملہ تھا اور وہی اسے بہتر طور پر ہینڈل کر سکتی تھی۔

مین شاہراہ پر آ کر میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ اچانک میرے پاؤں غیر اختیاری طور پر بریک پیڈل پر پڑے۔ رات کے سناٹے میں جیپ کے ٹائر سماعت شکن آواز سے چرچرائے اور جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ غزالہ کا غمگین اور مظلوم چہرہ میری نظروں کے سامنے رقصاں ہو گیا۔ بقول غزالہ کے، اشفاق شاہین جو گھناؤنا کاروبار کرتا تھا، وہ غزالہ کو بھی اس کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا۔ یہ درست تھا کہ وہ کوئی باکردار عورت نہ تھی، کبیر سے اس کے رنگین و سنگین تعلقات کا تو میں خود عینی گواہ تھا۔ مگر کسی کی عریاں فلم بنا کر اسے کمائی کا ذریعہ بنانا......... پہلے اس کی بہن سپنا کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا، پھر اس کے معذور شوہر کو ہلاک کر ڈالا۔ اب وہی سفاک اور ابلیس صفت لوگ اسے اپنے کالے دھندے کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے۔

غزالہ کے لئے پہلی بار اپنے اندر ترحم آمیز نرم جذبات پروان چڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب غفورے نے مجھ پر بڑے جارحانہ انداز میں اپنی گن تان لی تھی تو یہ غزالہ ہی تھی جو اپنے خوف و ہراس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اچانک میری ڈھال بن گئی اور غفورے کو مجھ پر گولی چلانے سے منع کرنے کی عاجزانہ التجا بھی کی تھی۔ اگرچہ غفورے کا مجھے قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر بہر حال اپنے تئیں میری جان بچانے کے لئے غزالہ کا یہ ایک قابل قدر عمل تھا۔ پھر میرا ضمیر کیسے گوارا کرتا کہ اسے میں ان خبیث اور ننگ انسانیت لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔ تب پھر ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے اب تک اپنے دشمنوں سے نبرد آزما رہنے والے نادر خان میں ایک دوسرا روپ بھی انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگا......... یہ روپ حقوقِ انسانیت کی علمبرداری کے لئے تھا۔ اپنے وطن کو، اپنی دھرتی کو اشفاق شاہین جیسے شیطان سے پاک کرنے کا عزم۔ اب تک میں نے اپنی ذاتی غرض کے لئے ہی تو سب کچھ کیا تھا۔ مگر کوئی کام ضمیر کی طمانیت کے لئے بھی تو کرنا چاہئے تھا۔

یہ سب سوچتے ہی میں نے غزالہ کو ان شیطانوں کے ٹولے سے رہا کرانے کا حتمی ارادہ باندھا اور جیپ کو ویران اور سنسان سڑک پر تیزی سے یوٹرن دیا۔ چند ثانیے بعد ہی میں، خدائی فوجدار کی طرح اشفاق شاہین کی کوٹھی کی طرف تیزی سے اپنی جیپ دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ میں گلبرگ سے زیادہ دور نہ گیا تھا۔ وہاں سے بہ مشکل چند کلومیٹر تک کا ہی تو فاصلہ طے کیا تھا۔

تاہم گلبرگ کے علاقے میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک بلاک پہلے ہی اپنی جیپ کسی تاریک گوشے میں کھڑی کر دی اور خود نیچے اتر آیا۔ میں نے براؤن جینز اور ہاف آستین کی سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس پر لیدر کی سیاہ جیکٹ تھی۔ میگارد میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا تھا۔

میں قدرے تیز تیز قدموں سے اشفاق شاہین کی کوٹھی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ میرے دونوں طرف کوٹھیوں اور بنگلوں میں ویرانی مسلط تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی بھی ان کے وسیع احاطوں سے پھوٹتی نظر آ رہی تھی۔ تقریباً ہر پُرشکوہ کوٹھی کے آہنی گیٹ پر لگے ستونوں پر سفید گلوب روشن تھے۔ اشفاق شاہین کی کوٹھی میرے دائیں ہاتھ کی قطار میں تین کوٹھیوں کے بعد آتی تھی۔

میں دبے پاؤں چل رہا تھا۔ مگر پھر جانے کیسے کوٹھی کے اندر احاطے میں چھوڑے ہوئے کسی اعلیٰ نسل کے کتے نے میری باہر موجودگی کو محسوس کرتے ہی زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ میں ذرا ٹھٹکا اور پھر تیز تیز قدموں سے آگے نکل گیا۔ پھر اپنی مطلوبہ کوٹھی کے سامنے سے گزرنے لگا۔ کوٹھی میں ویرانی مسلط تھی۔ یہاں زیادہ تر کوٹھیاں ایک منزلہ ہی تھیں۔ میں اپنی مطلوبہ کوٹھی سے آگے نکلتا چلا گیا۔ یہ کارنر واقع تھی۔ دائیں جانب ایک چوڑا گلی نما راستہ تھا جو غالباً آگے جا کر مین شاہراہ سے لگتا تھا۔ یوں میں مطلوبہ کوٹھی کی جنوبی دیوار کے ساتھ ہی اس راستے پر مڑ گیا اور ذرا ٹھہر کر گرد و پیش پر نظر ڈالنے کے بعد دیوار کی بلندی کا جائزہ لینے لگا۔ دیوار نو فٹ سے زیادہ بلند نہ تھی۔ مگر اس کے سرے پر تقریباً چھ چھ فٹ کے فاصلے پر آہنی بریکٹوں پر تین رویہ خاردار آہنی باڑ منسلک تھی۔ ان میں برقی رو موجود ہو سکتی تھی۔ میں آگے بڑھا اور اس طرح کوٹھی کی جنوبی دیوار کے ساتھ عقبی دیوار کی طرف آ گیا۔ اس حصے کے سامنے ایک چوڑا راستہ اور پھر وسیع میدان تھا۔ میں وہاں کھڑا ہو کر عقبی حصے کا ذرا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ یہاں بھی وہی صورتِ حال تھی۔ یعنی دیوار کے اوپری سرے پر آئرن بریکٹوں سے خاردار آہنی تاروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ گویا نقب لگانے کی راہیں مسدود ہی دکھائی دے رہی تھیں۔

اچانک میری نگاہ اپنی بائیں جانب ایک دبلے پتلے پول پر پڑی۔ یہ ٹیلی فون کا کھمبا تھا اور مذکورہ کوٹھی کی عقبی دیوار کے کسی قدر قریب بھی۔ میرے ذہن میں قریب ترین کھمبے کو استعمال کرنے کا خیال اُبھرا۔ کھمبے کے سرے پر ڈی پی باکس نصب تھا اور یہ دیوار سے کافی اونچا تھا۔ ابھی میں نے اس کھمبے کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک کہیں قریب سے تیز سیٹی کی آواز اُبھری اور ساتھ ہی کسی نے بلند آواز میں چلّا کر کہا۔

"ہوشیار.....خبردار.....جاگتے رہنا۔"

یہ آواز کسی گشتی چوکیدار کی تھی۔ جو ہر طرف پھیلے سناٹے کو دور تک چیرتی چلی گئی۔ میں سمجھا شاید اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی ہے۔ میں نے بے اختیار آواز کی سمت دیکھا۔ یہ میرے دائیں جانب سے اُبھری تھی۔ پھر مجھے ایک ہیولا نظر آیا جس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لاٹھی تھی۔ میں فوراً دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ دائیں جانب سے آتا ہوا شبینہ چوکیدار جب اندر کی ایک گلی میں مڑ گیا تو میں نے سکون کی سانس لی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



پھر جب اس کی آواز دور چلی گئی تو میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور دوبارہ کھمبے کی طرف بڑھا۔ اس کھمبے پر چڑھنا بھی آسان نہ تھا۔ یہ بالکل گول تھا۔

میں اس سے لپٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں پیروں کی مدد سے دھیرے دھیرے اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ بہت مشکل اور مشقت طلب کام تھا۔ ابھی میں نصف کھمبے تک ہی چڑھ پایا تھا کہ بری طرح ہانپنے لگا۔ رکنا بھی کارِ محال تھا۔ تقاضا یہی تھا کہ کارِ مسلسل جاری رکھا جائے ورنہ کھمبا میرے ہاتھوں پیروں سے پھسل جاتا اور میں نیچے آ رہتا۔ میں نے ہمت مجتمع کی، پھر کوشش شروع کر دی اور بالآخر سرے تک جا پہنچا۔ سرے پر اتنا ضرور تھا کہ دو عدد آہنی راڈ منسلک تھے تاکہ ان پر بہ آسانی ٹک کر ڈی پی باکس میں کام کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ میرا "کام" دوسرا تھا۔ میں نے اندر کوٹھی میں جھانکا۔ یہ کوٹھی کی اصل عمارت کے عقبی احاطے کی دیوار تھی۔ درمیان میں خلا تھا۔ اندر تاریکی تھی۔ کسی گمنام گوشے سے روشنی کا جگنو پھیلا ہوا تھا۔ اب میں مخمصے کا شکار تھا۔ ٹیسٹر تو تھا نہیں کہ تاروں میں برقی رو کی موجودگی کو چیک کر سکتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں آہنی پول پر تھا۔ آہنی باڑ پر اگر کم واٹ کی برقی رو دوڑ رہی تھی تو وہ میرے آہنی پول پر ہونے کی وجہ سے مجھے ڈبل شاک پہنچا سکتی تھی۔ اور خود میں "ٹیسٹر" بننے کا رسک بہرحال نہیں لے سکتا تھا۔

اچانک مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے فون کے کھمبے پر نصب آہنی راڈ کو ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ ڈھیلی تھی۔ اس کے "نٹ" آدھے باہر نکلے ہوئے تھے جبکہ بولٹ غائب تھے۔ میں نے انگلیوں کی مدد سے ڈھیلے پڑے ہوئے نٹ کھول کر نیچے پارسل کیے اور آہنی راڈ نکال لی۔ اس کے بعد میں نے اس طرح کمال مہارت سے آہنی راڈ کو دو رویہ آہنی باڑ پر اچھالا کہ وہ دونوں سے ٹکرائے اور اندر گرنے کی بجائے باہر ہی گر پڑے۔

ایسا ہی ہوا۔ راڈ دونوں سے ٹکرائی اور نیچے گر گئی مگر کوئی چنگاری نہ چھوٹی۔ تسلی ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے ہاتھ بڑھا کر ایک فولادی بریکٹ کو پکڑا اور پھر اچھل کر دیوار کی منڈیر پر آ گیا۔ اب میرا زیادہ دیر بلندی پر ٹکے رہنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ میں کسی کی نظروں میں بھی آ سکتا تھا۔ میں نے خود کو خاردار باڑ میں اُلجھنے سے بچایا۔ اندر کی طرف نیچے جھانکا۔ اس جانب دیوار پر بلندی میں واٹر ٹینک تھا۔ یہاں سے مسلسل اوور فلو ہونے کے باعث کوٹھی کے اس عقبی حصے میں خاصی سیلن تھی اور کائی زدہ جھاڑیاں سی نیچے اُگی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں احتیاط سے نیچے کود گیا۔ نیچے سیلن زدہ کائی میں جمع شدہ پانی میں چھپاکے سے گرا اور پھر وہیں جم کر سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔

خیر خیریت ہی رہی۔ میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ اب اندر داخل ہونے کا مسئلہ تھا مگر مجھے امید تھی کہ اس مسئلے کے حل کے لئے کوئی دروازہ کھلا مل ہی جائے گا۔ میں نے جیسے ہی مدھم روشنی میں آگے قدم بڑھائے، اچانک مجھے ہلکی سی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ یہ عقب سے آئی تھی۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ عقب میں مڑ کر دیکھا تو سکتے میں آ گیا۔ ایک قد آور، اعلیٰ نسل کا السیشن کتا مجھے اس دخل در معقولات پر خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں ایسے پالتو کتوں کی سرشت سے واقف تھا۔ یہ بھونکتے کم تھے اور شکار پر جھپٹ کر اسے بری طرح بھنبھوڑ دینے کے عادی ضرور تھے۔ اس کے ادھ کھلے بھیانک جبڑوں سے دو نوکیلے شکاری دانت خونخوار سی جھلک دکھا رہے تھے۔

پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک خونخوار غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جست لگا دی۔ دو بدو حیوانی مقابلے کا اس سے پہلے تجربہ ہو چکا تھا۔ ماموں حیدر گل کے ساتھ ایک بار شکار پر میں گیا تھا اور واسطہ ایک

بھورے خونخوار بھیڑیے سے پڑا تھا۔ ماموں حیدر گل آگے نکل چکے تھے۔ میں پیچھے رہ گیا تھا۔ بھ
نے اچانک عقب سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ بندوق میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی۔ پھر مجھے خونخ
جسیم بھیڑیے سے دوبدو بزور بازو مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ ''مکش پور'' کی مہم کے دوران بھی میں ایک آ
سے گزر چکا تھا۔ اس کے علاوہ شاہ میر کی کوٹھی پر بھی ایسے حالات سے واسطہ پڑ چکا تھا۔

چنانچہ جیسے ہی اس خونخوار السیشن کتے نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جست لگائی ''ڈسک'' پھینکنے کے ماہرانہ ایتھلیٹ انداز میں ایک ٹانگ پر گھوما اور میری دوسری ٹانگ کتے کی تھو پڑی۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی۔ کتے کے حلق سے ''کوں'' کی آواز ابھری اور اس کا قد آور وجو زدہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ ہلکی سی ''دھپ'' کے ساتھ وہ کائی زدہ جھاڑیوں میں گرا اور چند ثانیے ہڑبڑ کے انداز میں ہلنے جلنے کے بعد دوبارہ سنبھلا۔ مگر مجھے اب فوراً اس کا تیا پانچا کرنا تھا۔ لہٰذا جیسے سنبھل کر دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرنے لگا، میں نے جھپٹ کر اپنے دائیں ہاتھ کا ''لاک'' اس کی گردن پر فٹ کرتے ہی زوردار جھٹکا دیا۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر ٹھنڈا پڑ گیا۔

میں نے کتے کی لاش کو جھاڑیوں میں پھینک دیا اور پھر سامنے کے رخ پر آگے بڑھنے کا ارادہ کر کے عقب میں بڑھا۔ دائیں جانب ایک گلی تھی، یہاں کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ میں آواز پیدا کیے آگے بڑھنے لگا۔ پھر بیرونی دروازے والے حصے کی دیوار سے ذرا اُبھر کر اطراف کا جائزہ لیا۔ خاموشی اور ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں نے کوٹھی کے بیرونی محرابی دروازے کی طرف قدم بڑھائے مگر اسے بند پایا۔ پھر مجھے منزل کی بالکونی نظر آئی جس کے نیچے ایک ہائی روف کھڑی تھی۔ مگر یہ بالکونی گیٹ کے رخ پر تھ وہاں مجھے کسی چوکیدار کے ہونے کا شبہ تھا۔ میں سب سے پہلے دبے پاؤں آگے بڑھ کر وہاں کسی کی موجودگی کی تسلی کرنے کے بعد بہ آہستگی و احتیاط ہائی روف کی چھت پر چڑھ گیا۔ پھر فینسی ٹائپ کی جانب ہاتھ بڑھا کر جھول گیا اور پھر اپنے نچلے دھڑ کو جمناسٹک کے انداز میں سکیڑ کر اوپر چڑھ گیا۔

بالکونی کے سامنے مجھے ساگوان کی خوب صورت محرابی چوکھٹ نظر آئی جس پر کوئی دروازہ نہ تھا۔ نے دبے پاؤں جھک کر آگے بڑھنا شروع کیا اور ہال میں آ گیا۔ ہال خالی تھا۔ یہ مجھے ٹی وی لاؤ محسوس ہوا۔ یہاں زیرو پاور کے دو سبز بلب روشن تھے۔ اب کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر میرا دل پسلیوں کی بجائے میرے حلق میں دھڑک رہا تھا۔

میں کسی کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ تاہم مجھے اپنی مہم جوئی پر بھروسہ تھا۔ میں اسی احتیاط کے ساتھ پیش کا جائزہ لیتا ہوا زینے کو دیکھتے ہی اس جانب بڑھا اور پھر دھیرے دھیرے زینے طے کرتا ہوا آیا۔ یہاں سے مجھے اس حد تک محلِ وقوع کی شناسائی ہوئی کہ جس کمرے میں مجھے اور غزالہ کو مقید تھا، وہ بائیں جانب کی مختصر راہداری کے آخری سرے پر تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب بھی اسے وہیں رکھا ہوگا۔

میں دبے پاؤں مذکورہ راہداری میں آ گیا۔ یہاں دیوار گیر فینسی لیمپ کے اندر کم واٹ کا بلب روشن تھا۔ جلد ہی میں مطلوبہ کمرے کے دروازے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے باہر سے کنڈا لگا تھا۔ قفل لگانے کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ ظاہر تھی۔ لہٰذا میں نے سانس روک کر کنڈے کو دھیرے گھما کر کھولا اور پھر دور سے ہی لمحے دروازے کو اندر کی جانب آہستگی سے دھکیلا۔ سامنے نگاہ پڑ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



سامنے حیران و پریشان غزالہ کھڑی تھی۔ وہ کھڑ پٹر کی آواز پر شاید اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''تت.........تم.........!'' اس کی لکنت زدہ آواز میں تحیر تھا۔

''شش.........!'' میں نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ''آ جاؤ.........جلدی۔''

میرے کہنے کی دیر تھی، وہ بلا توقف حرکت میں آ گئی۔ کمرے سے باہر آتے ہی میں نے آہستگی کے ساتھ دروازہ بند کر کے کنڈا لگا دیا۔

''نن.........نادر!.........تم یہاں کیسے؟'' وہ میرے ساتھ ساتھ دبے پاؤں مختصر راہداری میں چلتے ہوئے مجھ سے بولی۔

''یہاں سے نکلنے کی کرو.........پھر باتیں کر لیں گے۔'' میرے لہجے میں ہدایت تھی۔

اب ہمارا بیرونی گیٹ سے نکلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ سر دست میں نے باہر تک واپسی کے لئے وہی زینہ اور بالکونی والا راستہ اپنایا۔ بالکونی کی ریلنگ سے میں نے پہلے غزالہ کو سنبھالا دیتے ہوئے نیچے کھڑی ہائی روف وین کی چھت پر اتارا اور اس کے بعد خود بھی اتر گیا۔ پھر ہم ہائی روف کی پھسلواں چھت سے پھسل کر نیچے اتر گئے۔

غزالہ اب بھی متوحش ہی نظر آ رہی تھی۔ تاہم آزادی کی امید نے اسے کسی قدر حوصلہ ضرور بخش دیا تھا۔ میں نے یہاں لمحے بھر کو کھڑے ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ غزالہ کو اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بیرونی گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ایسا لگتا تھا کہ اشفاق شاہین کے گرگوں کی تعداد یہاں کچھ کم ہی تھی۔ جتنے بھی تھے، وہ سب نرم اور آرام دہ بستروں پر خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ ممکن ہے اس کے بیوی بچے بھی یہیں ہوں۔

گیٹ کے قریب مجھے ایک مختصر سا بنکر نما گارڈ کیبن نظر آیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر تاریکی تھی۔ غالباً محافظ چوکیدار بھی اندر مست الست پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ گیٹ کے قریب پہنچے تو میں نے اندر سے اسے مقفل پایا۔ اب گیٹ کے آہنی دروازے پر ہی طبع آزمائی کر کے اوپر سے باہر چھلانگیں لگانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تاہم اچانک میرے ذہن میں ایک سہل راہ اُبھری۔

اگر میں گارڈ کیبن کے اندر داخل ہو کر چوکیدار پر قابو پانے کی کوشش کرتا تو یقیناً اس کے پاس سے چابی برآمد ہو سکتی تھی۔ بصورتِ دیگر آہنی گیٹ کو چڑھ کر پار کرنا بھی پُرخطر اور محال تھا۔

چنانچہ یہ سوچ کر میں نے غزالہ کو پہلے قریب ہی دو رویہ بڑے بڑے گملوں کے چھتنار سے پودوں کی آڑ میں کھڑے ہونے کا کہا اور خود دبے پاؤں کیبن کی طرف بڑھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا کہ آیا اندر کتنے افراد تھے؟ ایک سے زائد محافظ ہوتے تو میری اب تک کی یہ ساری مہم اکارت چلی جاتی۔

میرے پاس موبائل میں لگی ٹارچ تھی۔ چنانچہ میں نے کیبن کی چوکھٹ پر پہنچ کر اپنی جیب سے موبائل نکالا اور اس کے سر پر لگے بلب کو دھڑکتے دل کے ساتھ روشن کر دیا۔ روشنی ہوتے ہی میں نے اچانک ایک قد آور اور بھاری بھرکم شخص کو خود پر دو نالی بندوق تانے کھڑے گھورتے پایا۔ موبائل میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ اندر تاریکی اور باہر مدھم روشنی کے باعث وہ مجھے تو دیکھ سکتا تھا اور جانے کب سے میری حرکات و سکنات کو دیکھ رہا تھا۔ جبکہ میں اندر دیکھنے سے قاصر تھا۔

''دونوں ہاتھ اوپر کر لو۔ ورنہ کارتوس فائر کر کے تمہارا جسم چھلنی کر دوں گا۔''

وہ خوف ناک لہجے میں غرا کر مجھ سے بولا۔ اس کی بڑی بڑی گھنی مونچھوں میں غضب کا تناؤ محسوس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



ہو رہا تھا۔ ایک موٹا سا کالا مسہ اس کے دائیں گال پر آنکھ کے قریب، اس کی صورت کو مزید خونخوار بنا رہا تھا۔ ناچار میں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔ وہ میرے سینے پر دونالی بندوق ٹکائے دھکیلتا ہوا کیبن سے باہر نکل آیا۔ میرا ذہن اچانک خطرناک پڑتی پوزیشن پر تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایک تو یہ تھی کہ یہ اکیلا ہی اندر تھا۔ دوسرا ساتھی ہوتا تو اسے قابو کرنا مشکل ہی ہوتا۔

''کدھر ہے وہ لڑکی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے ساتھ کھڑی تھی؟'' اس نے اطراف میں متلاشی نظریں ڈالتے ہوئے درشت لہجے میں مجھ سے کہا اور مجھے واقعی حیرت ہوئی کہ آخر غزالہ اچانک کہاں غائب ہو گئی تھی۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق اسے اب تک نظر آ جانا چاہئے تھا۔ اس کی بات میں نے غیر ارادی طور پر لگے چھتنار پودوں والے گملوں کی طرف دیکھا تو مجھے وہ وہاں نظر نہ آئی۔

''پتہ نہیں۔ ابھی تو ادھر ہی تھی۔'' میں نے کہا تو اچانک مجھے اس کرخت رو چہرے والے گارڈ کے عقب سے غزالہ نمودار ہوتی نظر آئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک بڑا سا گملا تھا۔ میرے وجود میں سنسنی پھیل گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے گارڈ نے بھی میری نظروں کی سمت اور آنکھوں میں اُبھرنے والی چمک کو بھانپتے ہی غیر ارادی طور پر اپنے عقب میں گردن موڑ کر دیکھنا چاہا تھا۔ مگر تب تک غزالہ وہ بھاری گملا اٹھائے اس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔

تنومند اور خرانٹ صورت گارڈ کو خود پر زیادہ ہی زعم تھا۔ میرے سینے پر بندوق کی نال ٹکا کر سمجھا کہ مجھے وہ بے بس کر چکا تھا۔ اس لئے جیسے ہی اس نے اپنے عقب میں دیکھا تو میں بہ آسانی اس لمحاتی موقعے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ مگر پہلے منتظر تھا غزالہ کے گملے کی کارگزاری کا۔ چنانچہ میری مطمئن نظروں نے دیکھا، جیسے ہی موچھیل محافظ کو اپنے عقب میں خطرہ محسوس ہوا اور اس نے گردن کو نصف دائرے میں کسی روبوٹ کے سر کی طرح گھمایا، غزالہ نے بھی عین وقت پر اسے محتاط ہوتا دیکھتے ہی غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گملا اس کے سر پر دے مارا۔

گارڈ کے حلق سے ایک عدد خزاں رسیدہ کراہ خارج ہوئی اور ادھر میں نے اس ڈر سے کہ کہیں اس کمبخت کی انگلی لبلبی پر غیر ارادی طور پر نہ دب جائے، ایک ہاتھ سے بندوق کی نال پکڑ کر اوپر کر دی۔ گملا نیچے گر کر زوردار آواز کے ساتھ پاش پاش ہو گیا۔ محافظ ضرب کی شدت سے کھڑے کھڑے لہرا گیا تھا کمبخت سخت جان ثابت ہوا تھا۔ باقی کی کسر میں نے پوری کر دی تھی کہ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی بندوق میں نے کھینچ کر جھپٹ لی اور اسے نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھمانے کے انداز میں اس کے سر پر رسید کرنا چاہی مگر اس سے پہلے ہی وہ زمین پر جا گرا۔

میں نے لپک کر اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ میری توقع کے عین مطابق چابی اس کے پاس تھی۔ میں پھرتی سے اٹھا۔ ایک ٹھٹکی ہوئی نگاہ کوٹھی کے مرکزی دروازے پر ڈالی۔ گملا ٹوٹنے کی آواز سے کوئی نہیں جاگا تھا۔ پھر میں تیزی سے گیٹ کی جانب بڑھا اور قفل کھول دیا۔ پھر آہستگی سے دروازے کا ایک پٹ وا کر کے ہم دونوں باہر آ گئے۔

''میری جیپ وہاں کھڑی ہے، بھاگو!'' میں نے باہر تاریکی میں آتے ہی غزالہ سے کہا اور پھر دونوں دوڑ پڑے۔

جیپ کے نزدیک پہنچ کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور پھر اسے جب تک اسٹارٹ کیا تو غزالہ بھی لپک کر میرے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر براجمان ہو چکی تھی۔ اسٹارٹ ہوتے ہی میں نے گیئر بدل کر ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔



میں نے فیول بتانے والی سُوئی پر نظر ڈالی۔ فیول ختم ہونے کے قریب تھا۔ یقیناً ان لوگوں نے اس میں فیول ڈلوا دیا ہو گا۔ کیونکہ میری جیپ میں فیول تھوڑا ہی رہ گیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی پراڈو کا ٹائر برسٹ ہونے کے بعد یقیناً میری پوٹھوہار کو استعمال کیا تھا۔

بہرطور میری مہم کامیابی سے دوچار ہوئی۔ میں جیپ کو ویران شاہراہ پر دوڑائے جا رہا تھا۔ غزالہ میرے برابر کی سیٹ پر خاموش بیٹھی تھی۔ مجھے ماں کی طرف سے فکر ہو رہی تھی کہ وہ میرے ابھی تک ایئر پورٹ سے گرین لاج نہ پہنچنے پر کس قدر پریشان ہو رہی ہوں گی۔ اگرچہ انہوں نے ابھی تک موبائل پر مجھ سے رابطہ نہ کیا تھا مگر میں نے بھی سردست رابطہ نہ کیا۔ اب ویسے بھی میں گرین لاج ہی تو جا رہا تھا۔ فیول بھروانا ضروری تھا۔ ایک پمپ اسٹیشن سے میں نے یہ کمی پوری کی اور پھر موٹروے کا رخ کیا۔

غزالہ کی مسلسل اسرار بھری چپ مجھے مخمصے میں ڈال رہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ ''تمہیں آزادی ملنے پر خوشی نہیں ہوئی؟''

وہ جیسے اپنے اندر کے پُرسوچ بھنور سے ابھر کر قدرے چونکتے ہوئے بولی۔ ''آں..... ہاں..... شاید.....'' مجھے اس کے عجیب سے جواب پر حیرت ہوئی۔

''شاید..... کیا مطلب؟''

''تم نے یہ سب اچھا نہیں کیا نادر!'' وہ اسکرین پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ''تم نے بلاوجہ اشفاق شاہین جیسے شیطان سے ٹکر لے لی۔''

مجھے اس کی بات پر غصہ تو آیا مگر تحمل سے بولا۔ ''وہ خبیث تمہارا جانے کیا حشر کرتا۔ میرے ضمیر نے یہ گوارا ہی نہیں کیا کہ تمہیں ان شیطانوں کے بیچ چھوڑ جاؤں۔ میں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر تمہیں آزادی دلائی اور تم ہو کہ.....'' میں نے آخر میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میری بات پر غزالہ نے ذرا گردن موڑ کر میری جانب دیکھا مگر میں نے اپنی نگاہیں سامنے اسکرین کے پار ہی مرکوز رہنے دیں۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''مجھے غلط مت سمجھو نادر!..... میں نہیں چاہتی تھی، تم جیسا شریف انسان ان خبیث لوگوں کے ساتھ اُلجھے۔ رہی میری بات تو میں کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو فیس کر ہی لیتی۔''

''اگر مجھ سے ان لوگوں نے اُلجھنے کی کوشش کی تو میں انہیں منہ توڑ جواب دوں گا۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''ویسے تو ان خبیثوں کے کالے کرتوت سے واقف ہونے کے بعد اب میں خود بھی سنجیدگی کے ساتھ ان لوگوں کے خلاف کارروائی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میرا تو خیال تھا کہ تم بہادری کے ساتھ میرا ساتھ دو گی۔ مگر تم تو خود ہی ان کے سامنے اپنے آپ کو بے بس سمجھے ہوئے ہو۔''

میری بات پر غزالہ نے قدرے چونکنے کے انداز میں میری طرف دیکھا تھا۔ پھر بے اختیار میرے کاندھے پر اپنا نرم و گداز ہاتھ رکھتے ہوئے جوش و خوشی سے لرزتی آواز میں بولی۔

''کک..... کیا واقعی..... سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں.....'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ان خبیث لوگوں نے جانے اب تک کتنی معصوم لڑکیوں کو ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر پامال کیا ہو گا۔ ایسے لوگ ہمارے سماج میں زہر گھول رہے ہیں، ہماری آنے والی نسلوں کو بے راہ روی کے کنوئیں میں دھکیل کر انہیں مفلوج بنا رہے ہیں۔''

''نادر! کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے تمہیں با آسانی چھوڑ دیا اور تم انہیں کمزور سمجھ رہے ہو۔''

''میں دشمن کو کمزور سمجھنے کی غلطی کبھی نہیں کرتا غزالہ! اور یہی میری عادت مجھے اب تک دشمنوں پر

زبردست کیے ہوئے ہے۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا تو وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔

''اگر یہ بات ہے تو نادر! میں تمہارے ساتھ بھرپور تعاون کروں گی۔''

''ٹھیک ہے..... مگر سب سے پہلے تمہیں اپنا ٹھکانا بدلنا ہوگا۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''اس کا کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔ ''اور ہاں..... اتنا تو میں کر سکتی ہوں کہ احتیاط کے پیش نظر اپنی حفاظت کا مکمل بندوبست کر رکھوں۔''

''لیکن سردست تمہیں اپنا اسلام آباد والا اپارٹمنٹ تو کم از کم ضرور بدل لینا چاہئے۔''

''خیر..... یہ میرا دردِ سر ہے، وہ میں کر لوں گی۔ تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔''

میں خاموش رہا۔ دور مشرق کی سمت پو پھٹنے لگی تھی۔ میں نے اسے اسلام آباد اس کے اپارٹمنٹ میں چھوڑا اور پھر خود مری روانہ ہو گیا۔

گرین لاج پہنچا تو سکینہ نے بتایا کہ ماں اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔ میرے دل کو گھونسہ لگا۔ کہاں تو میرے غیاب پر ماں کو نیند تک نہ آتی تھی، جب تک میں صحیح سلامت گرین لاج نہ پہنچ جاتا۔ وہ بار بار مجھ سے اپنے موبائل پر رابطہ کر کے میری خیر خیریت معلوم کرتی رہتی تھیں۔

کیا ماں کا دل مجھ سے اس قدر ہی خراب ہو چکا تھا؟..... کیا آتش انتقام نے واقعی میری ماں کی ممتا کو خاکستر کر ڈالا تھا؟ اور بہ قول اس کے اسے اپنا دوسرا، زخمی عورت والا روپ زیادہ عزیز تھا؟

بہرطور میں اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔ ہنگامہ خیز رات کی اعصاب شکن مہم جوئی کے بعد میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ بستر پر گرتے ہی ایسی گہری نیند سویا کہ دن چڑھے ہی میری آنکھ کھلی اور وہ بھی سکینہ ہی نے مجھے آ کر جگایا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ماں میرا کھانے کی میز پر انتظار کر رہی تھیں۔

مجھے بھوک نہیں تھی تاہم میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر کھانے کی میز پر پہنچا تو ماں کو اپنا منتظر پایا۔ میں نے انہیں ہولے سے سلام کیا۔

''تم رات بھر گھر نہیں آئے..... کدھر رہ گئے تھے؟''

میں جواباً بولا۔ ''واپس لوٹتے وقت میرا غفورے کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔'' اس کے بعد میں نے انہیں ساری بات بتا دی اور یہ بھی کہ غفورے سے میرا معاہدہ بھی ہو چکا تھا۔

''غفورے کا زندہ رہنا ہمارے دشمنوں کے مفاد میں ہوگا۔ تمہیں اسے فوراً گولی مار دینی چاہئے تھی۔'' ماں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''لیکن ماں! غفورا کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک بہت بڑے انڈر ورلڈ مافیا کے چیف اشفاق شاہین کا خاص کارندہ ہے۔ پولیس اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تو پھر کیا فائدہ خون خرابے کا۔ کیونکہ اس صورت میں اشفاق شاہین کا پورا گروہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ جائے گا اور ہم اپنے اصل دشمنوں کی بجائے فضول الجھ جائیں گے۔''

ماں کو میری بات سمجھ میں آ گئی۔ لیکن اس کے باوجود بولیں۔ ''ٹھیک ہے پھر..... میں اعظم خان سے اس سلسلے میں بات کرتی ہوں۔ تم کھانا شروع کرو۔'' یہ کہہ کر وہ کھانے میں مشغول ہو گئیں۔ میں بے دلی سے کھانا زہر مار کرنے لگا۔ میں نے اب تک ماں سے رب نواز اور اس کے دھوکا دینے کی بات کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی مناسب سمجھتا تھا۔ کیونکہ میں اس مسئلے کو بالا ہی بالا حل کر دینا چاہتا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ماں نے اسی وقت انکل اعظم خان سے فون پر رابطہ کیا۔ غفورے کا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ذکر انہوں نے اشاروں میں کرتے ہوئے ان سے ملاقات چاہی۔ پھر رابطہ منقطع کر کے مجھ سے بولیں۔

''تم ذرا ٹال کا چکر لگا آؤ۔ منیجر مشتاق کا دو تین بار فون آ چکا ہے۔ تمہارا پوچھ رہا تھا۔ میں ذرا اعظم خان سے غفورے کے سلسلے میں بات چیت کر کے آتی ہوں۔''

ماں کی بات پر میں فکرمند سا ہونے لگا۔ رب نواز کے غنڈے اور اس کے ساتھیوں کو میں نے خوب مزہ چکھایا تھا اور میرا ٹال میں رہنا لازمی تھا جبکہ ادھر ماں کو تنہا اعظم خان کے ہاں جانے دینے کو بھی میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ لہٰذا بولا۔

''ماں! آپ کا یوں تنہا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ میں آپ کو انکل اعظم خان کے پاس چھوڑتا ہوا ٹال کی طرف نکل جاؤں گا۔''

ماں خاموش رہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ماں نے میری بات سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ ذرا دیر بعد ہم جیپ میں سوار ہو کر ''گرین لاج'' سے روانہ ہو گئے۔

❄❄❄

ماں کو انکل اعظم خان کے ہاں چھوڑ کر میں ٹال کی طرف نکل گیا۔ راستے میں مجھے منیجر مشتاق کی کال اپنے موبائل پر موصول ہوئی۔

''سر جی! آپ کدھر ہیں؟..... طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی، جی کڑا کے..... آئے نہیں آج آپ؟''

''میں وہیں آ رہا ہوں۔ خیریت تو ہے نا؟..... رب نواز کے غنڈے دوبارہ تو نہیں آئے؟'' میں نے آخر میں پوچھا۔

''نہیں جی۔ وہ تو نہیں آئے۔ البتہ کوئی خاتون ہیں۔ پتہ نہیں، شاید شانہ یہ شانہ قسم کا نام بتا رہی تھیں جی کڑا کے۔ اس وقت آپ ہی کے انتظار میں گھنٹے بھر سے بیٹھی ہیں۔''

خاتون کے ذکر پر میں ذرا چونکا۔ پر شانہ یہ شانہ کے الفاظ سے مجھے یاد آیا اور بولا۔ ''خاتون کا نام کاشانہ تو نہیں؟''

''جی..... جی سر جی!..... یہی نام ہے ان کا، جی کڑا کے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ اسے میری آمد کا بتاؤ۔ میں ابھی چند منٹوں میں پہنچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے موبائل بند کر دیا۔

میں نے لالہ زار چوراہے سے جیسے ہی اپنی جیپ مال روڈ کی طرف موڑی تو اچانک مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ ہلکے گرے رنگ کی کار کو میں نے لالہ زار چوراہے سے موڑ کاٹتے دیکھا اور اس کی ہموار رفتار سے مجھے فوراً شبہ ہوا تھا کہ یہ میرے تعاقب میں ہے۔ یہ شاہراہ خاصی معروف تھی لیکن باوجود اس کے میں چونکہ اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے کا عادی ہو چکا تھا اس لئے میں نے اپنے تعاقب کو بھانپ لیا تھا۔ تاہم میں نے ان پر اپنے محتاط ہونے کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور ٹال تک بدستور سفر جاری رکھا۔

ٹال یہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہاں پہنچ کر میں جیپ کو بڑے سے چوبی گیٹ سے اندر لے گیا۔ اندر مجھے سیاہ رنگ کی چمچماتی ہنڈا اکارڈ کھڑی نظر آ گئی۔ میں کاشانہ کی کار کو پہچان گیا تھا مگر اس وقت میری ساری توجہ متعاقب کار پر تھی۔ میں پھرتی سے نیچے اترا اور پھر کھڑا ہو کر کھلے گیٹ کی طرف اپنی عقابی نظریں جما دیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



چند ثانیے بعد ہی میں نے اس گرے کلر کی کار کو گیٹ کے سامنے رکتے دیکھا۔ اس میں دو افراد تھے۔ دونوں ہی گردنیں موڑے اندر دیکھ رہے تھے۔ میں نے گیٹ پر متعین اپنے دو گن بردار محافظوں میں سے ایک کو کار کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ شاید ان سے یہاں رکنے کا مقصد پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ محافظ کے کار تک پہنچنے سے پہلے ہی کار اچانک تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

میں ان کی اس مشکوک حرکت پر ٹھٹکا اور تقریباً دوڑتا ہوا گیٹ سے باہر آ گیا اور دور ہوتی اس گرے کلر کی کار کو جاتے دیکھتا رہا۔ رفتار غیر معمولی تیز تھی۔ محافظ مجھے دیکھ کر ذرا خفیف ہوا۔ میں نے پوچھا۔

''کتنے افراد تھے؟''

''جناب! دو ہی تھے۔'' وہ مؤدبانہ بولا۔ اس اثناء میں میرا منیجر مشتاق بھی اپنی طوطے جیسی ناک پھنگی پر اُلوؤں کے دیدوں جیسی گول گول عدسوں والی عینک ٹکائے وہاں آن پہنچا تھا۔

''کوئی بات کی انہوں نے؟''

''نہیں جی۔''

''کیسے لگتے تھے؟''

''مقامی تو ہرگز نہیں لگتے تھے جی، یہ تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔'' محافظ نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''کیا ہوا سر جی؟'' معاً منیجر مشتاق نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے محافظ سے کہا۔

''تم محتاط رہو۔ ہوسکتا ہے، یہ لوگ دوبارہ یہاں سے گزریں۔''

''ٹھیک ہے جناب! آپ بے فکر رہیں۔''

''سر جی! وہ شانہ..... بہ شانہ..... اوہ میرا مطلب ہے جی کڑا کے.....'' منیجر مشتاق دوبارہ لقمہ دیا اور میں اس کے ہمراہ واپس اپنے گلاس کیبن آفس کی طرف بڑھ گیا۔

اندر کاشانہ بے چینی سے میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے گداز لبوں پر دلکش مسکراہٹ اُبھری۔

''ہیلو..... کاشانہ! کیسی ہیں آپ؟ معافی چاہتا ہوں، آپ کو میرا بہت انتظار کرنا پڑا۔'' میں معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ اس نے حسب عادت فوراً مصافحے کے لئے اپنا نرم و نازک ہاتھ بڑھا طوعاً و کرہاً مجھے اس کا ہاتھ تھامنا پڑا۔ ایک طرف بوتل کے جن کی طرح کھڑا منیجر مشتاق اُلوؤں دیدے گھماتا ہوا ہولے سے بڑبڑایا۔

''جی کڑا کے.....'' شاید کاشانہ کے مجھ سے بے باکانہ انداز میں ہاتھ ملانے پر اس کی طبیعت منغصی سی ہوگئی تھی۔

''جی..... آپ نے کچھ کہا؟'' معاً کاشانہ نے اپنی گردن ذرا موڑ کر پاس کھڑے منیجر مشتاق سے پوچھا۔

''نہیں جی، شاخسانہ صاحب! میں نے بھلا کیا کہا، جی کڑا کے؟'' وہ منہ بسور کر بولا تو میں نے نظر اسے گھورا پھر کاشانہ سے مسکرا کر بولا۔

''یہ اس کا تکیہ کلام ہے۔ یوں ہی اوٹ پٹانگ بونگی مارتا رہتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے منیجر مشتاق سے ''آپ جائیں یہاں سے۔''



''چلا تو جاؤں میں، جی کڑا کے سر جی!..... مگر ایک ضروری بات کرنا تھی آپ سے۔'' منیجر مشتاق نے منہ بسور کر کہا۔ کاشانہ مسکرا کر رہ گئی۔

''کون سی بات؟'' میں نے قدرے چونک کر مشتاق سے پوچھا۔

''رب نواز کا فون آیا تھا۔ دھمکی دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، اپنے نادر میاں سے کہنا، وہ میری بیٹی کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی بزدلانہ حرکت نہ کرے، جی کڑا کے۔''

''کب آیا تھا فون؟'' میں نے دانت پیس کر پوچھا۔

''دو گھنٹے پہلے آیا تھا، جی کڑا کے۔''

''تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے کیا جواب دینا تھا سر جی! جی کڑا کے۔'' منیجر مشتاق منہ پھلا کر بولا۔ ''میں نے تو صرف یہ کہا کہ نادر صاحب آ جائیں تو یہ بات آپ ہی ان سے کہہ دیجئے گا، جی کڑا کے۔''

''ہوں..... ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' میں نے کہا۔ وہ چلا گیا۔ میں نے کاشانہ کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ اس نے جینز کے اوپر ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بوائے کٹ بالوں میں پیرے کر رکھا تھا۔ منیجر مشتاق کی بات اس نے بھی سن لی تھی اور اس کا دلکش چہرہ ایک دم ہی غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔ میں نے یونہی ازراہِ تفنن کاشانہ سے کہا۔

''سن لیا آپ نے اپنے ابا حضور کا دھمکی آمیز فرمان؟''

میری بات پر وہ بے اختیار ہنسی اور اس کا غصہ چٹکی بجاتے ہی کافور ہوگیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''میں آپ سے کہہ چکی ہوں، وہ میرا باپ بننے کے لائق نہیں ہے۔ اور نہ ہی بن سکتا ہے۔ وہ صرف میری مما کا شوہر ہے اور بس۔''

''خیر چھوڑیں، میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ رب نواز کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ رہا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا، آخر اسے یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ شاہ بلوط کی دوسری کھیپ کی واپسی آپ کی عین منت ہو سکی تھی؟''

''میں سمجھ گئی۔'' وہ یکدم کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''ضرور میرا وہ موبائل اس کے ہاتھ لگ چکا ہوگا اس کے اندر میں نے رب نواز کے چند ''کارآمد'' اور ٹیکنکل جملے ریکارڈ کر رکھے ہیں۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا موبائل دو دن پہلے کھو گیا تھا۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بتانے لگی۔ ''مجھے یاد تھا، جب میں اپنے کمرے میں تھی تو میں نے اپنے دونوں موبائل دراز میں رکھے تھے۔ بعد میں مجھے ان میں سے ایک پڑا ہوا دوسرا گم تھا۔ آج وہ جب مجھے دوبارہ وہیں پڑا ملا تو میں نے ریکارڈ شدہ جملے سننے چاہے تو پتہ چلا اس میموری Delete ہو چکی تھی۔ اب میرے شبے کی تصدیق ہوگئی کہ یہ اس کمینے گگل خان کی ہی حرکت ہو سکتی ہے۔''

''خیر چھوڑیں اس بات کو۔ آپ سنائیں، کیسے آنا ہوا'' میں نے کہا۔ پھر جیسے کچھ یاد آیا۔ ''ارے، میں بھول ہی گیا، آپ کیا پئیں گی؟''

''اچھی سی چائے پلوا دیں۔'' وہ بے تکلفی سے مسکرا کر بولی۔

میں نے انٹرکام پر منیجر مشتاق کو چائے بھجوانے کا کہا تو اس نے عادت کے مطابق یکدم لقمہ دیا۔ ''سر یہ کون خرابہ ہے؟ اس سے جان چھڑائیں۔ کچھ ٹھیک کردار کی لڑکی نہیں لگتی، جی کڑا کے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''تم خود آ کر کہہ دو۔'' میں دانت پیس کر بولا۔

''مم..... میں چائے بھجواتا ہوں، جی کڑا کے۔'' وہ یک دم سٹپٹا کر بولا اور میں نے مسکرا انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔

''نادر صاحب! وہی بات ہوئی جس کا ڈر تھا۔'' وہ گہری متانت سے بولی۔ ''اب آپ کا ساٹھ والا معاملہ کھٹائی میں پڑ سکتا ہے۔ خیر، آپ فکر نہ کریں۔ میں کچھ تحریری ثبوت اکٹھے کر رہی ہوں اور آ دکھانے کے لئے اپنے ساتھ لائی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے خوب صورت سے ہینڈ بیگ کو میز اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور پھر اس کی زپ کھولنے کے بعد اندر سے چند کاغذ نکال کر میری طر بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ سودے کی تفصیل ہے جو آپ کے مرحوم ماموں حیدر گل اور رب نواز درمیان طے پایا تھا اور دیگر خطوط بھی ہیں۔''

میں نے کاغذات کا وہ مختصر پلندا اس کے ہاتھوں سے لیا اور بہ غور جائزہ لینے لگا۔ ان میں سود تفصیل کے علاوہ ماموں حیدر گل کی طرف سے احتجاجی خطوط بھی تھے جس میں ساٹھ لاکھ کی مالیت دیمک زدہ لکڑی بھیجنے پر احتجاج کیا گیا تھا۔ نیز اس میں عدالتی سمن نامے بھی تھے جو سرکاری بیلف ذریعے رب نواز کو ارسال کئے گئے تھے مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی تھی۔

''یہ ناکافی ثبوت ہیں۔'' میں نے ان کا سرسری جائزہ لینے کے بعد انہیں ایک طرف رکھتے ہ بے دلی سے کہا۔ ''تاہم آپ کے تعاون کے لئے میں شکر گزار رہوں گا۔''

میری بات پر وہ ہولے سے مسکرا کر مجھے دیکھنے لگی۔ جانے کیوں مجھے اس کی نگاہوں کی چمک عجیب سی گہرائی محسوس ہونے لگی۔ پھر وہ اسی گہرے پن سے بھیدوں بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''نادر صاحب! اس میں شکریے کی کون سی بات ہے؟ آپ کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے اور آ آپ کا حق ملنا چاہئے۔ لیکن شاید آپ یہ سمجھیں کہ میں رب نواز کے ساتھ اپنی ذاتی مخاصمت کی وجہ ایسا کر رہی ہوں تو یہ بھی غلط ہے۔ ٹھیک ہے، میں اسے ناپسند کرتی ہوں لیکن وہ میری مما کا شوہر میری مما نے اپنی مرضی سے اس کے ساتھ شادی کی ہے۔ دیکھا جائے تو سارا قصور میری مما کا ہی مگر نادر صاحب! میں اپنے پپا کے بہت قریب تھی۔ وہ میرے پپا بھی تھے، میرے دوست بھی۔ ا وفات کے بعد میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ میرے اندر ایک خلا آباد ہو گیا تھا۔ میری مما کو چا کہ وہ اپنی ممتا کے ذریعے یہ خلا پُر کرنے کی کوشش کرتیں لیکن وہ اپنی زندگی میں مگن رہتی تھیں۔ پھر انہوں نے بیوہ ہونے کے بعد رب نواز سے شادی کی تو میرے اندر کا خلا اور وسیع ہو گیا۔ میرے احساسِ محرومی مزید گہرا ہو گیا۔ بالآخر میں اس قدر دل برداشتہ ہوئی کہ پورے ایک سال تک دنیا پر نکل گئی۔ جب میں نے دنیا دیکھی تو پتہ چلا کہ زندگی کس قدر حسین ہے۔ اور جتنی حسین، اتنی ہی بھی۔ مگر یہ سنگینی بھی خود انسان ہی اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے۔ اصل زندگی، جس میں ایک الوہی راز پنہاں ہوتا ہے، وہ محض دوسروں کے کام آنے میں ہی ہے۔ دوسروں کے کام آنا، دوسروں کے بھلائی کرنا، دل و جان کو کس قدر تسکین پہنچاتا ہے۔ بس نادر صاحب! میں اس تسکین کی بھوکی ہوں آپ کی مدد کرنے کے پیچھے درحقیقت میرا یہی جذبہ کارفرما ہے۔''

وہ اپنی رو میں جانے کہاں سے کہاں چلی گئی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی باتیں سچی تھیں۔ ایک آزمائش اور پختہ تجربے کا نچوڑ تھیں۔ وہ اس وقت واقعی ایک عجیب لڑکی کے روپ میں نظر آ رہی تھی کے بیک وقت دو روپ تھے۔ ایک جذباتی و سنجیدہ جبکہ دوسرا کھلنڈرا اور لاابالی۔



''ارے ..... یہ میں کیا اول فول بک گئی۔'' وہ اچانک منفعل سی ہو کر بولی۔ ''میں آپ کو بہت جلد وہ اہم ثبوت بھی لا دوں گی جن کی بنا پر آپ رب نواز کے خلاف.....''

''کاشانہ صاحبہ!'' میں نے اچانک اس کی بات کاٹی اور گہری متانت سے بولا۔ ''آپ کے والد..... سوری، میرا مطلب ہے رب نواز کی اس دھمکی کے بعد یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ آپ اس سلسلے میں میرے ساتھ تعاون کر رہی ہیں۔ میں اس کی دھمکی کو اوّل تو درخورِ اعتنا سمجھتا ہی نہیں ہوں لیکن اب میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرے گا کہ میں سوتیلے باپ بیٹی کے ذاتی عناد سے فائدہ اٹھا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی کوشش کروں۔ لہٰذا میں اب آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ اس معاملے سے الگ ہو جائیں۔ میں اب خود رب نواز کے حلق میں ہاتھ ڈال کر ساٹھ لاکھ کی رقم وصول کروں گا۔''

میں نے دیکھا، میری اس بات پر کاشانہ کے دلکش چہرے پر غیر مرئی سا رنگ آ کر گزر گیا۔ اس کی بڑی بڑی کجراری آنکھوں کی جھیل میں اُداس چاند کا عکس جھلملانے لگا تھا۔ اسی اثناء میں ایک ملازم چائے اور بسکٹ لے آیا۔

ہم دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔

''آپ نے میری بات کا برا تو نہیں منایا کاشانہ صاحبہ؟'' میں نے معاً اس کے خاموش اور پھیکے پڑتے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ بے تاثر مسکراہٹ سے بولی۔

''نہیں نادر صاحب! میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ گئی ہوں اس لئے اب اصرار بھی نہیں کر سکتی۔ بہرحال کبھی ضرورت پڑے تو مجھے یاد کر لیجئے گا۔ کیونکہ ایک انسان ہی دوسرے انسان کے کام آتا ہے۔ میں اب چلوں گی۔''

وہ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی احتراماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں اسے باہر اس کی کار تک چھوڑنے آیا۔ پھر جب وہ جانے لگی تو بڑی گہری نگاہوں سے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے عمیق لہجے میں بولی۔

''نادر صاحب! میں دعویٰ تو نہیں کرتی مگر میں نے ایک دنیا دیکھ رکھی ہے جس کا ماخذ یہی ملا کہ زندگی فقط انجوائے منٹ کا نام ہے۔ مجھے آپ کی آنکھوں میں اَن کہے درد کی کسک محسوس ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے اندر ایک طوفان چھپا ہوا ہے۔ آپ ایسا کریں، کبھی میرے ہاں تشریف لائیں۔ دنیا کے آزاروں سے ہٹ کر ہم تھوڑا مل بیٹھ کر اچھا وقت گزاریں گے۔ پھر دیکھئے گا، آپ خود کو حالات کے سامنے نئے سرے سے تازہ اور پُرعزم محسوس کریں گے۔ کیونکہ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے سے دل و دماغ کا بوجھ بھی تو ہلکا ہو جاتا ہے..... اچھا، اب میں چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔

اس کی باتوں میں مجھے انوکھا اور عجیب سا سحر محسوس ہوا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے مجھے ہپناٹائز کر دیا ہو۔ اس کی باتوں میں کچھ ایسا ضرور تھا، جس نے مجھے چند ثانیے کے لئے مبہوت کر کے رکھ دیا تھا۔

''سر جی! آپ تو گئے کام سے، جی کڑا کے۔''

کاشانہ کے کار ریورس کر کے لے جانے کے بعد میں وہیں کھڑا رہا تو اچانک نہ جانے کب منیجر مشتاق میرے قریب آ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ میں ذرا چونکا، پھر اس کی طرف گھوم کر ''شٹ اپ'' کہا اور اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے میرے آفس میں چلا آیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''ویسے سر جی! یہ تھی کون، جی کڑا کے؟'' میرے چیئر پر براجمان ہوتے ہی وہ بھی سامنے کی کرسی بیٹھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''یہ ٹھیکے دار رب نواز کی سوتیلی بیٹی کا شانہ تھی۔'' میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا اور منیجر مشتاق کا اس کی آنکھوں کی طرح کھلا رہ گیا۔ پھر اس کے بعد کسی مشین میں اٹکنے والی گراری دار آواز میں بولا۔

''سس.....سر جی! آپ سچ کہہ رہے ہیں، جی کڑا کے؟''

''بغیر جی کڑا کے سچ کہہ رہا ہوں، تمہیں شبہ ہے میری بات پر؟'' میں نے اسے گھورا۔

''نن.....نہیں، میں تو اس لئے پوچھ رہا تھا جی کڑا کے کہ وہ تو آپ سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے آپ دونوں میں بہت پرانی اور گہری شناسائی ہو، جی کڑا کے۔''

''ہاں.....مگر وہ اپنے سوتیلے باپ سے بالکل مختلف ہے۔''

''سر جی! کب سے آپ دونوں کے بیچ یہ سلسلہ چل رہا ہے؟'' اس نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''جج.....جی.....کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی زبان پھسل گئی، جی کڑا کے۔'' وہ میرے تیور دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔

''تم مجھے ایک بات ذرا سوچ کر بتاؤ۔''

''جی سر جی! پوچھیں۔''

''جس روز رب نواز نے دیمک زدہ لکڑی بھیجی تھی، کون یہ مال لایا تھا؟''

''یہی گگل خان لایا تھا ٹرک بھروا کر۔ اس وقت میں بھی موجود تھا۔''

''ماموں حیدر گل نے اسی وقت مال چیک کیا تھا یا بعد میں پتہ چلا تھا؟''

''او سر جی! آپ کے ماموں حیدر گل تو آنکھیں بند کر کے سب پر بھروسہ کر لیتے تھے۔ لیکن الا غیر موجودگی میں مال میں نے ہی اُتروایا تھا۔ اللہ جنت نصیب کرے مردان شاہ کو، اس نے تو اسی و چند شہتیر دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا کہ یہ دیمک زدہ ہیں لیکن.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا اور اس کا ندامت سے سرخ ہو گیا۔ میں نے سرسراتے لہجے میں اسے گھور کر کہا۔

''مشتاق! تم جھوٹ نہیں بولتے ہو اور میں سچ سننا چاہتا ہوں۔''

''جی.....جی سر جی! غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اس وقت بے چارے مردان شاہ کی بات توجہ نہیں دی تھی اور سارا مال اُتروالیا تھا۔'' وہ منفعل ہو کر بولا۔

مجھے اس پر غصہ تو آیا لیکن اب کیا فائدہ؟ منیجر مشتاق ہمارا پرانا آدمی تھا اور بہت مخلص اور دیانت بھی۔ اس میں یقیناً اس کی بد نیتی کا دخل نہ تھا۔ تاہم وہ بے پرواہی کا ضرور مرتکب ہوا تھا۔ البتہ مردان شاہ کے ذکر پر مغموم ضرور ہوا تھا لیکن میں نے اس کے قاتل کالا ناگ کو بھی جہنم واصل کر مردان شاہ کے خون کا حساب برابر کر دیا تھا۔

چونکہ مردان شاہ نے میری خاطر اپنی جان کی قربانی دی تھی اور وہ اپنے بوڑھے باپ اور ایک بہ واحد سہارا تھا۔ اس لئے میں اس کی قربانی کے بعد اس کے باپ اور بہن کو ہر مہینے اتنی معقول رقم بھیج کرتا تھا جس سے ان دونوں باپ بیٹی کی گزر اوقات اچھی طرح ہونے لگی تھی۔ یہی نہیں، میں نے مرا شاہ کی جوان بہن کی شادی کا بندوبست اور اس مد میں ہونے والے متوقع اخراجات کا ذمہ بھی اپنے لے رکھا تھا۔



یہ سارے انتظامات میں نے منیجر مشتاق کے سپرد کر رکھے تھے۔ میرے اس فعل سے ٹال کے دیگر زدوروں پر بہت اچھا اثر پڑا تھا اور وہ مجھے اپنا ہی سمجھنے لگے تھے۔

بہر طور میں نے منیجر مشتاق کو رخصت کیا اور اس گرے کار والوں کے متعلق سوچنے لگا جنہوں نے ماں تک میرا تعاقب کیا تھا۔ نہ جانے یہ کون لوگ تھے؟ اور ان کا میرے کس دشمن سے تعلق تھا؟.....

ہم گیٹ پر موجود میرے گن بردار گارڈ کے مطابق وہ مقامی ہرگز نہیں لگتے تھے۔ میں نے سوچا، کہیں تو نہ تھا کہ اپنے جوڑی دار شاہ میر کا عبرت ناک انجام دیکھنے کے بعد نظر حیات نے کسی اور علاقے لوگوں کو میرے پیچھے لگا رکھا ہو۔ ایک خیال اشفاق شاہین کی طرف بھی جا رہا تھا۔ مگر مجھے اس کی ب سے یوں فوری ردِعمل کی توقع نہ تھی۔ تو پھر یہ کون لوگ تھے؟.....اچانک میرے ذہن میں جھما کا ہوا۔ کیلاش وادی کی پُر خطر اور جاں گسل مہم کا خیال اُبھرا اور عامل عاروب کی مکروہ صورت ی نگاہوں میں گھوم گئی جسے میں نے گولی مار دی تھی مگر مجھے اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ وہ زندہ تھا یا عدم دمرسل ہو چکا تھا۔

میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا، شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں نگینہ کو ایک پل کے لئے نہیں بھولا تھا۔ میں نے امریکہ اور پاکستان کے وقت کا اندازہ کیا اور نگینہ سے موبائل پر رابطہ کرنے کی ش کرنے لگا لیکن رابطہ ممکن نہ ہو سکا۔ کبھی ٹون بگڑ رہی تھی تو کبھی نیٹ ورک کام نہیں کر رہا تھا۔ میں ان اور متفکر ہو گیا۔ ساتھ ہی مجھے یہ پچھتاوا بھی ہونے لگا تھا کہ کاش میں اس کی ورجینیا (واشنگٹن) آنٹی کی رہائش گاہ کا فون نمبر ہی لے لیتا۔ میں نے چند گھنٹوں بعد ٹرائی کرنے کا سوچ کر موبائل اپنی میں ڈالا اور پھر جیپ میں بیٹھ کر ٹال سے روانہ ہو گیا۔

ٹال سے گرین لاج کی طرف روانہ ہوتے وقت میرا دل و دماغ نگینہ کی طرف اُلجھا ہوا تھا۔ شام ری ہونے لگی تو مال روڈ سے میں نتھیا گلی کی طرف مُڑا اور بتدریج جیپ کی رفتار بڑھا دی۔

مجھے گرین لاج پہنچنے سے پہلے ماں کو انکل اعظم خان کے گھر سے لینا تھا اس لئے میرا رخ انہی کی ش گاہ کی طرف تھا۔ وہاں پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ ماں مجھ سے پہلے ہی گرین لاج جا چکی تھیں۔ مجھے ت تو ہوئی۔ اعظم خان بھی گھر پر نہ تھے۔ ان کے ملازم سے معلوم ہوا کہ وہی ماں کو ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے کار میں گرین لاج چھوڑنے گئے تھے اور پھر واپس نہیں لوٹے تھے۔

میں واپس پلٹا۔ اب میرا رخ گرین لاج کی طرف تھا۔ سڑک دور تک ویران تھی۔ میں خاصی تیز ری سے جیپ دوڑائے جا رہا تھا۔ اطراف کے پیڑوں پر کجراری شام اُترنے لگی تھی۔ فضا میں سرد ت بھی اُتر آئی تھی۔ میں نے کھڑکیوں کے شیشے چڑھا رکھے تھے۔ البتہ اندر ہیٹر جلانے کی ضرورت ں نہیں کی تھی۔

موڑ کاٹتے ہی اچانک مجھے بریک پیڈل پر پاؤں رکھنا پڑا۔ اگر میں موڑ کاٹتے ہی بر وقت بریک نہ تو میری جیپ کا سامنے سڑک پر ترچھی کھڑی اس کار سے تصادم ہونا لازمی تھا۔ جیپ کے ٹائر زوردار سے چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں نے سامنے راستہ روکے ترچھی کار پر اپنی نظریں یں۔ کار کو دیکھ کر میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہو گئی۔ یہ وہی گرے کلر کی کار تھی جس نے خاتب کیا تھا۔ مگر مجھے اس کے اندر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ایکا ایکی مجھے خطرے کی بُو محسوس ہوئی..... لمحے کو ذہن میں خیال اُبھرا کہ ایکسیلیٹر دبا کر اور کار کے عقبی حصے کو کھدیڑتا ہوا نکل جاؤں مگر میں یسا نہیں کیا اور پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے میگزین نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور دروازہ کھول کر باہر اُتر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



دوئم

آیا۔ چہار سُو دھڑکتی ہوئی اسرار بھری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دفعتہً ایک ٹھوس شے میرے پستول ہاتھ سے ٹکرائی اور میگارد میرے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر جا گرا۔ میں نے ابھی سنبھلنے کی کوشش تھی کہ معاً دو افراد دائیں بائیں کی تاریک جھاڑیوں سے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہ ہوئے پستول نظر آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ پر لگنے والا پتھر سڑک پر پڑا تھا جو یقیناً انہی دو میں سے شاخسانہ ہو سکتا تھا۔

''خبردار!.....کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔'' ان دو ایک نے کرخت آواز میں کہا۔ میں بہ غور ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ دونوں درمیانے قد کے مگر مض تنومند نظر آتے تھے۔ یہ مجھے کہیں سے بھی مقامی محسوس نہیں ہوئے۔ ان کی رنگت سرخ و سپید تھی ا دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا تھا جن میں حد درجہ خونخواری کی چمک ہلکورے لے ر انہوں نے شلو کے دار شلوار قمیضیں پہن رکھی تھیں۔

''کون ہو تم لوگ؟'' میں نے ایک سے درشت لہجے میں پوچھا۔

''سوال کرنے کا کوئی حق نہیں تمہیں۔'' دوسرے نے خونخوار لہجے میں غرا کر کہا۔ ''چلو..... بیٹھو۔''

''ٹھیک ہے..... میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔'' میں نے چالاکی سے نرم پڑتے ہو ''مگر کم از کم مجھے اتنا تو بتا دو کہ تمہاری مجھ سے آخر کیا دشمنی ہے؟ ہو سکتا ہے، تم لوگوں کو میرے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو؟''

میری بات پر پہلے والے نے دانت پیس کر انتہائی زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ہم دشمنوں کو پہچا معاملے میں کبھی غلطی نہیں کرتے ہیں۔ کاش ہمیں تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ہوتا تو آج سانس نہیں لے پاتے..... چلو اب۔'' مجھے یہ سن کر تسلی ہو گئی کہ کم از کم ان کا مجھے فوری طور کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں نے ذرا ہمت کر کے دوبارہ کہا۔ ''لیکن تم نے ابھی تک میرے جواب نہیں دیا۔''

''ہتو!..... یہ ایسے نہیں مانے گا۔'' دوسرے نے دانت پیس کر اپنے ساتھی سے کہا اور اپ سے ہتھکڑی نما حلقے دار زنجیر نکال لی۔ مجھے دونوں ہاتھ پشت پر کرنے کا درشتی سے حکم دیا جبکہ پہلے سے دس بارہ قدموں کے فاصلے پر اپنا پستول تانے چوکس کھڑا تھا جس کا نام ہتو تھا۔ یہ نام بھی صورتوں کی طرح غیر مقامی محسوس ہوا تھا۔

''ہتو! اگر یہ ذرا سی بھی چالاکی کرے تو اس کی ٹانگ پر گولی چلا دینا۔'' ہتھکڑی بہ دست پستول بردار ساتھی سے کہا۔ یہ دونوں میری سوچ سے بڑھ کر چالاک اور محتاط تھے۔ میں نے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر دیئے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ شخص ہتھ میری پشت کی جانب بڑھا اور مجھے ہتھکڑی پہنانے لگا تو میں نے پل کے پل دونوں کی پوز اندازہ کیا۔ اور پھر جیسے ہی میرے عقب والے نے مجھے ہتھکڑیاں پہنانے کے لئے میرے ہاتھو میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی پوری قوت کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپ کر اپنی ڈھال بنا لیا۔ ہتو نے گولی چلا دی۔ مجھے چونکہ ''ٹارگٹ'' کا پیشگی علم تھا اس لئے میں ہی اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا دی تھیں۔ نتیجتاً گولی ہتھکڑی والے کی ٹانگ پر پیوست ہو گئی۔ اس سے چیخ خارج ہوئی مگر میں نے اسے بدستور ڈھال بنائے رکھا۔ ہتو نامی وہ شخص مارے



دوئم

پستول مجھ پر تانے میری جانب بڑھا۔ مگر میں نے اس کے دوسرے ساتھی کی گردن کے گرد اپنے دائیں بازو کا آہنی شکنجہ کس لیا تھا۔

''رک جاؤ..... ورنہ تمہارے اس ساتھی کی گردن توڑ ڈالوں گا۔'' میں نے وحشت ناک لہجے میں غراتے ہوئے کہا اور وہ ہکا بکا سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میری گدی سے ایک سرد لہر سی آ ٹکرائی اور ساتھ ہی سرسراتے لہجے میں کسی نے عقب سے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

''نادر!..... اس کو چھوڑ دو۔ ورنہ آج میں تمہارا قصہ پاک کر کے ہی رہوں گا۔''

یہ آواز میری شناسا تھی۔ جسے سن کر میرے اندر مہیب سناٹے چیخنے لگے.....!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



یہ آواز کبیر کی تھی..... وہی کبیر، جو میرا زبردست رقیب بھی تھا اور جانی دشمن بھی۔ اس کی اچانک اور بالکل ہی غیر متوقع موجودگی پر ایک لمحے کو میں ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔

''شاید میری آواز پہچان گئے ہو؟'' عقب سے اور بالکل قریب ہی اس کی استہزائیہ آواز ابھری میں نے ہیتو نامی شخص کے اس ساتھی کی گردن چھوڑ دی، جس کی ٹانگ پر اس کے اپنے ہی ساتھی کے پستول کی گولی لگی تھی۔ چنانچہ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے دائیں پاؤں کی ایڑھی پر گھ اپنے بائیں بازو کی کہنی پوری قوت سے کبیر کے بائیں پہلو میں رسید کر ڈالی۔ اس کے لئے یقیناً اچانک ثابت ہوا تھا۔ نتیجتاً وہ اپنے حلق سے بھیانک کراہ خارج کرتے ہوئے بے اختیار دُہرا تکلیف کی شدت کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے پستول بھی چھوٹ کر گر پڑا تھا۔

میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر ہی ایک زوردار گھونسا اس کے جھکے ہوئے چہرے پر بھی دیا۔ ادھر ہیتو نے چلّا کر اپنے زخمی ساتھی کو میرے سامنے سے ہٹ جانے کا کہا۔ اس کے ہاتھ میں تک پستول دبا ہوا تھا۔ اگر اس کا زخمی ساتھی میرے آگے سے ہٹ جاتا تو ہیتو یقیناً بلا تاخیر مجھ پر دیتا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں، میں نے صورتِ حال کا تجزیہ کیا اور دوبارہ بجلی کی سی تیزی کے حرکت میں آ گیا۔

میں نے اس کے زخمی ساتھی کو نہ صرف دوبارہ دبوچ لیا بلکہ اسے اپنی ڈھال بنائے بنائے قر سڑک پر پڑے کبیر کے پستول پر گرا اور بہ سرعت پستول اچک کر لیٹے لیٹے بلاتوقف ہیتو پر گولی چ وہ کراہت انگیز چیخ کے ساتھ سڑک پر گرا۔ میں اپنے میگارد کی طرف لپکا۔ میں ہیتو کو کوئی موقع چاہتا تھا۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ میں موجود پستول سے میرا نشانہ لینا چاہتا تھا۔ مگ بدن میں گویا برقی رو دوڑ رہی تھی اور میں خود بھی برق کی مانند حرکت میں تھا۔ اس سے پہلے کہ باندھتا، میں دوڑتا ہوا عین سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کے پستول والے ہاتھ پر پاؤں کی ٹھوک دی۔ پستول سڑک پر پھسلتا ہوا کچے میں اُگی خودرو تاریک جھاڑیوں میں جا پڑا۔

اب میرے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ دائیں ہاتھ میں میرا میگارد تھا جسے میں نے فورا جیب میں اڑس لیا تھا اور کبیر والا پستول ان پر تان لیا۔ ہیتو کو میں ''خبردار'' کر چکا تھا جبکہ کبیر دوسرا ساتھی سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے انہیں ساکت ہو جانے کا حکم دیا۔

ہیتو ابھی تک سڑک پر اوندھے منہ پڑا کراہ رہا تھا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کے بائیں پیوست ہو گئی جہاں سے خون کا اخراج جاری تھا۔ جبکہ کبیر کی ناک سے بہنے والا خون اس کے مزید بھیانک بنائے دے رہا تھا جسے وہ اپنے رومال سے روکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ باوجود ان دونوں کی قہر ناک نگاہیں میری جانب مرکوز تھیں۔ میرا اور ان دونوں کا فاصلہ زیادہ طو



میں پوچھا۔

''کبیر! یہ دونوں کون ہیں؟ اور مجھے یہ یرغمال کیوں بنانا چاہتے تھے؟''

''میں نہیں جانتا.....'' کبیر نے نہایت غصیلے انداز میں جواب دیا اور اس کے پستول کی لبلبی پر میری انگلی نے یکدم جنبش کی۔ رات کے تاریک اور دم بہ خود سناٹے میں گولی کی دھماکے دار آواز اُبھری اور وہ کبیر کے پیروں کے بالکل قریب سڑک پر چنگاری چھوڑتی ہوئی اچٹ گئی۔ کبیر بے اختیار خوف زدہ ہو کر اچھل پڑا۔

''جھوٹ نہیں چلے گا کبیر!'' میں غصے سے دانت پیس کر دھاڑا۔ ''تمہیں میرے ہاتھوں کالا ناگ کا انجام تو یاد ہے نا..... مگر اب میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میرے لہجے کی خوف ناک گھن گرج نے اس پر خاطر خواہ اثر کیا اور وہ بولا۔

''ان دونوں کا تعلق کیلاشی عامل عاروب سے ہے اور یہ لوگ اس کا انتقام لینے کے لئے تمہیں یرغمال بنا کر کیلاش وادی لے جانا چاہتے تھے۔''

اس کی بات پر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''مگر وہ تو مر چکا تھا؟''

''نہیں.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''تو گویا ان لوگوں سے اپنی جاں بخشی کا معاہدہ کرتے ہوئے تم نے مجھے یرغمال بنانے کے سلسلے میں ان کی مدد کی ہے اور یہاں تک ان کی رہنمائی بھی کی۔'' میں نے زہریلے لہجے میں اس سے کہا تو وہ نہایت ڈھٹائی آمیز صاف گوئی سے بولا۔

''ظاہر ہے۔ اور میں کیا کرتا؟..... جب تم نے ان کی خانقاہ میں خون ریزی پھیلائی تھی اور کالا ناگ کو ہلاک اور عامل عاروب کو زخمی کر کے نگینہ کے ساتھ فرار ہو گئے تھے تو مجھے ان لوگوں نے پکڑ لیا تھا۔ یہ تو شکر رہا کہ مشتعل ہو کر عاروب کے پیروکاروں نے مجھے ہلاک نہیں کیا۔ کیونکہ وہ میرے ذریعے تم اور نگینہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔''

''نگینہ.....'' میں زیرلب سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔ ''نگینہ سے بھلا ان کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟'' میں نے کسی قدر اُلجھن آمیز پریشانی سے کہا۔

''اس لئے کہ عامل عاروب کے پیروکار اسے اپنے مقدس دیوتا دابولامینزی پر قربان کرنے کا پختہ عزم کر چکے ہیں۔'' اس نے بتایا اور یہ بتاتے ہوئے اس کے لہجے سے مجھے غضب کا کینہ ٹپکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''ہوں.....''

میں نے ایک گمبھیر اور پُرسوچ ہمکاری لی۔ اب میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میرے جی میں تو آئی کہ ان تینوں کو اسی وقت جہنم واصل کر ڈالوں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور کبیر سے بولا۔

''کبیر!..... میں تمہیں اس بار چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ میرے راستے میں آنے کی کوشش کی یا نگینہ کے سلسلے میں ان خبیثوں کی مدد کرنا چاہی تو یاد رکھنا، مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔'' یہ کہہ کر میں ہیتو کے زخمی ساتھی سے غضب ناک غراہٹ کے ساتھ بولا۔

''اور تم..... اپنے اس کتے عامل عاروب کو جا کر بتا دینا، اگر اس نے نگینہ کا بال بھی بیکا کرنے کی کوشش کی تو میں اسے وہیں آ کر کتے کی موت ماروں گا۔ اب تم اپنے ساتھی کو اٹھاؤ اور میرا پیغام لے کر اسی وقت کیلاش دفع ہو جاؤ۔ دوبارہ نظر آئے تو میں کوئی رعایت نہیں برتوں گا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



میرے انداز اور دوٹوک رویے پر وہ دونوں مجھے خونخوار نظروں سے گھورنے لگے تھے۔ ان کا بس چل رہا تھا کہ وہ مجھے کچا چبا جاتے۔ اپنی بات مکمل کر کے میں نے کبیر کے پستول سے گولیاں نکال کر ایک طرف تاریک جھاڑیوں میں اچھال دیں اور پستول سڑک پر پھینک کر اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

ذرا دیر بعد ہی میں گرین لاج کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔

❄❄❄

گرین لاج پہنچا تو میں نے سکینہ سے پہلے ماں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ بی بی کھانا کھا کر اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔ میرے دل کو گھونسہ لگا۔ کیونکہ اس سے پہلے کبھی ماں میرے بغیر کھانا نہیں کھایا تھا۔

''آپ کے لئے کھانا لگا دوں چھوٹے صاحب؟'' سکینہ نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں..... مجھے بھوک نہیں ہے۔''

میں نے کہا اور اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ ماں کے روز بروز بڑھتے ہوئے رویے نے مجھے خاصا اعصاب زدہ کر دیا تھا۔ میں موجودہ حالاتِ دگرگوں کی کشاکش سے اس قدر متاثر ہوا تھا جتنا ماں کی طرف سے مجھے پریشانی اور تشویش لاحق تھی۔ میرا دل و دماغ گونا گوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ نگینہ کی طرف سے الگ مجھے فکر تھی۔ وہ جانے کس حال میں ہو گی؟

اُدھر نظرِ حیات بھی دانت نکوسے ہوئے تھا۔ بد دیانت ٹھیکے دار رب نواز سے الگ میری چپقلش شروع ہو چکی تھی۔ جبکہ انڈر ورلڈ گینگسٹر اشفاق شاہین کو بھی میں نے اب غزالہ والے واقعے کے بعد اپنے پیچھے لگایا تھا اور اب کبیر اور کیلاشی عامل والا دیرینہ معاملہ اُبھر کر سامنے آ گیا تھا۔ پھر کبیر کی زبانی سنسنی خیز انکشاف کہ کیلاشی عامل عاروب اور اس کے پیروکار نہ صرف میری جان کے دشمن بن چکے تھے بلکہ انہوں نے اپنے خود ساختہ دیوتا، دابولا میزی کے آگے اب نگینہ کی قربانی دینے کا پختہ عزم کر لیا تھا۔ نگینہ کی طرف سے سردست مجھے اس حد تک تو اطمینان تھا کہ ابھی ان خبیث لوگوں کے ناپاک ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے کیونکہ وہ امریکہ جا چکی تھی۔

پریشان خیالات کا ایک جمگھٹا تھا، جس نے میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ حالات نے مجھے چوکھی جنگ میں دھکیل کر رکھ دیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پہلے کون سے معاملے میں ہاتھ ڈالوں، کسے موخر کروں؟ جبکہ میرے اردگرد دیدہ و نادیدہ دشمنوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ ہر کوئی میری گھات میں تھا اور وار کرنے کا منتظر۔ ایک جنگ تھی جس کا کوئی بظاہر اختتام دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سوچتے سوچتے میرے دماغ کی نسیں دُکھنے لگیں تو میں یکدم سارے پریشان کن خیالات ذہن سے جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند تھی جیسے میری آنکھوں کا راستہ ہی بھولے ہوئے تھی۔ میں بھی اس طرح بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور بالآخر اس طرح میں نے وہ رات گزار دی۔

صبح غسل وغیرہ کے بعد میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو ماں بھی موجود تھیں۔ ماں نے مجھے ناشتے کا پوچھا بھی نہیں بھیجا تھا۔ تاہم میں نے ماں کو ہولے سے سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر شاید شب گزشتہ تھکن اور بیداری کی جھلک میری نیم غنودہ آنکھوں سے محسوس کر کے ماں نے ہولے سے پوچھا۔

''نادر بیٹا! کیا ساری رات جاگتے ہی گزاری تھی؟''

''ہاں ماں!..... نیند نہیں آئی تھی۔'' میں نے بے خیالی میں کہہ ڈالا اور فلاسک سے اپنے ایک خالی کپ میں چائے انڈیلنے لگا۔



''کیا نگینہ یاد آ رہی تھی؟''

''ماں!..... کیا ہم کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار میرے منہ سے ایسے چبھتے ہوئے الفاظ برآمد ہوئے تھے یا پھر شاید یہ شب بیداری کا چڑچڑا پن تھا۔

''بہت تلخ ہوتے جا رہے ہو تم۔ کیا اب مجھ سے بھی بات کرنا تمہیں برا محسوس ہونے لگا ہے؟'' ماں کے لہجے میں بھی چبھن تھی۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے کہا۔

''ماں! ایک بات پوچھوں آپ سے؟''

''ہاں..... پوچھو!'' ماں نے بھی میرے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

''ماں! آپ کو یاد ہو گا کہ ایک دن آپ نے مجھے بڑے ممتا بھرے پیار سے میری پیشانی پر بوسہ دے کر پوچھا تھا کہ نگینہ مجھے اچھی لگتی ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو میں نے اس کا جواب اثبات میں دیا تھا اور آپ نے مجھ سے یہ خوش خبری نگینہ کو سنانے کے لئے بھی کہا تھا کہ آپ کو میری اور نگینہ کی شادی پر کوئی اعتراض نہ ہو گا بشرطیکہ نگینہ اپنے باپ شاہ میر کو بھی منائے؟''

''ہاں..... مجھے یاد ہے، اچھی طرح۔ اور آج بھی میں اپنی اس بات پر قائم ہوں۔'' میری بات مکمل ہوتے ہی ماں نے بغیر کسی تذبذب یا تردّد کے کہا۔

''تو پھر ماں!..... یہ سب کیا ہے؟'' میں نے کرب ناک لہجے میں ان سے پوچھا۔

''کیا..... کیا ہے؟'' ماں نے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔

''آپ کا دل ابھی تک نگینہ کی طرف سے صاف کیوں نہیں ہوا؟ اُلٹا آپ مجھ سے بھی بدظن ہونے لگی ہیں۔'' میں نے تکلیف زدہ لہجے میں کہا تو ماں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''نادر بیٹے! نگینہ کی طرف سے میرا دل کبھی صاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن تمہاری اور نگینہ کی شادی پر میں معترض نہیں ہو سکتی اس لئے کہ مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے۔ میں ان روایتی ماؤں میں سے نہیں ہوں جو اولاد کی خوشیوں کو اپنی ذاتی انا کی بھینٹ چڑھا دیتی ہیں اور پھر یہاں تو کسی انا کا سوال ہی نہیں۔ یہ تو ایک جنگ ہے..... حق اور انصاف کی جنگ..... جرم اور قصاص کی جنگ۔ ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور جان کے بدلے جان.....'' ماں نے تھوڑا توقف کیا پھر دوبارہ بولیں۔ ''رہی یہ بات کہ میں تم سے بدظن ہوں تو یہ سراسر غلط ہے۔ بھلا ماں بھی اولاد سے ناراض یا بدظن ہو سکتی ہے؟ میں نے تو تم سے صاف اور سیدھی بات کی تھی جسے میں اب بار بار دہرانا نہیں چاہتی۔ ناشتہ کرو، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ ہاں، تم آج ٹال پر نہ جانا چاہو تو کوئی بات نہیں، آرام کر لو۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

''ماں! ایک اور بات پوچھوں؟'' میں نے آخر میں کہا۔

''ہاں، پوچھو۔''

ماں نے اپنے لئے توس پر مکھن لگاتے ہوئے بظاہر سرسری لہجے میں کہا۔

''آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے بارے میں آپ کوئی سخت فیصلہ کرنا چاہتی ہیں۔''

میری بات پر ماں کے توس پر مکھن لگاتے ہوئے ہاتھ ایک لمحے کو رک گئے۔ ان کی تیکھی نظریں میری جانب اُٹھیں۔ ہونٹوں کے گوشے کچھ بولنے کو کپکپائے۔ میں سرتاپا ان کا حکم سننے کو بے چین تھا۔ انہوں نے بولنے کے لئے لب کھولے مگر دوسرے ہی لمحے سختی سے بھینچ لئے۔ ایک لمحے بعد پُرسکون انداز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں گویا ہوئیں۔

''ہاں......... مجھے یہ بھی یاد ہے مگر......... نگینہ کی امریکہ سے آمد تک میں نے اپنا یہ فیصلہ محفوظ کر دیا ہے۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں ماں! کہ وہ کڑا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے؟'' میں نے بھی پوچھ ہی لیا۔

''ابھی میں بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔''

یہ کہہ کر انہوں نے سکینہ کو آواز دی اور اسے چائے گرم کرنے کا کہا۔ پھر توس کھانے کے دوران اخبار کا مطالعہ کرنے لگیں۔ اس کے بعد پورے ناشتے کے دوران ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ ناشتے کے بعد میں اٹھا۔ تب بھی ماں کچھ نہ بولیں۔

میں نے جیپ کی چابیاں اٹھائیں اور جیپ میں بیٹھ کر ٹال کی طرف نکل گیا۔ ٹال پہنچا تو ایک سیاہ رنگ کی ہنڈا سٹی کار کو کھڑے پایا۔ میں نے جیپ احاطے میں روکی اور نیچے اُتر آیا۔ اسی وقت دفعتہً بوتل کے جن کی طرح منیجر مشتاق نازل ہو گیا۔ اس کے چمرخ منہ پر بارہ بج رہے تھے اور وہ خاصا گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔ میرے قریب پہنچتے ہی وہ بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

''سس......... سر جی! وہ......... وہ آیا ہے......... جی کڑا کے......... ٹھیکے دار رب نواز۔ اس کے ہمراہ وہی دو غنڈے بھی ہیں جو پہلے.........''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا، میں اس کی بات کو نظر انداز کرتا اپنے آفس میں داخل ہوا۔ میرے عقب میں میرے دو مسلح محافظ اور چھ سات مزدور بھی کسی متوقع بدمزگی کے پیش نظر چلے آئے تھے۔ مگر میں نے انہیں وہیں سے واپس لوٹا دیا۔

اندر ایک کرسی پر ٹھگنے قد کا بدوضع شخص سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس براجمان تھا۔ اس کے برابر والی کرسی پر گگل خان بھی بیٹھا تھا۔ جبکہ اس کے دونوں ساتھی ان کے عقب میں کھڑے تھے۔ یہ تینوں وہی بدمعاش تھے جو ایک دو روز پہلے مجھے دھمکانے آئے تھے اور منہ کی کھا کر واپس لوٹنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جبکہ بہ قول منیجر مشتاق کے سوٹڈ بوٹڈ بدوضع سا شخص ٹھیکے دار رب نواز ہی تھا۔ مگر میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے قریب بیٹھے گگل خان کو گھورتے ہوئے پُرطیش لہجے میں کہا۔

''تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی؟ گیٹ آؤٹ......... گیٹ لاسٹ۔''

اس کا چہرہ غصے سے بگڑ گیا مگر رب نواز نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں مجھ سے کہا۔

''نادر علی! آرام سے بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔ تم بیٹھو۔''

''میں کہتا ہوں تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میں کوئی بات نہیں کروں گا۔'' میں نے پھر ٹھیکے دار رب نواز کو نظر انداز کرتے ہوئے گگل خان کو مخاطب کرتے ہوئے بلند لہجے میں کہا تو ٹھیکے دار رب نواز نے بالآخر ان تینوں کو وہاں سے باہر نکل جانے کا اشارہ کیا۔

گگل خان مجھے جلتی سلگتی نظروں سے گھورتا ہوا اپنے دونوں ساتھیوں سمیت میرے آفس سے باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کے بعد میں تضحیک آمیز ہنکارا بھرتے ہوئے اپنی بھاری بھرکم چیئر پر بیٹھنے کے بعد سامنے بیٹھے ٹھیکے دار رب نواز سے دانستہ سرد لہجے میں بولا۔

''آپ کی تعریف؟''

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم میرے آدمی گگل خان کو دیکھ کر سمجھ چکے ہو گے......... خیر، بتائے دیتا ہوں۔ میرا نام رب نواز ہے۔ ٹھیکے دار رب نواز، جس کے شیشم اور شاہ بلوط کے ٹرک تم نے دھوکے سے ہتھیا لئے ہیں۔''

''میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔'' میں نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری کوشش تھی کہ میرے تاثرات سے اُلجھن کا اظہار بھی ہو۔ پتہ نہیں میں اس میں کامیاب رہا یا نہیں۔ جواباً وہ ایک زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔

''اتنے انجان نہ بنو میاں نادر!''

میں نے بھی سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''وہ چاروں ٹرک تمہارے یہ تینوں کتے لے کر خود آئے تھے جو ابھی باہر گئے ہیں۔'' میرا اشارہ گگل خان اور اس کے دو ساتھیوں کی طرف تھا۔

''وہ دھوکے سے یہاں لے آئے تھے۔'' وہ بولا۔

''تم نے بھی مجھے جھوٹ بول کر دھوکا دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ ٹرک حویلیاں کے ٹوٹے ہوئے پل کے قریب پھنس چکے ہیں۔ اور ہاں......... میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جب تمہیں ہم نے پیشگی پے منٹ کر دی تھی تو ان ٹرکوں پر ہمارا ہی حق بنتا تھا۔ پھر تمہیں آخر اتنی پریشانی کیوں ہو رہی ہے؟''

میری بات پر وہ لاجواب سا نظر آنے لگا مگر دوسرے ہی لمحے ڈھٹائی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ مگر تمہارے والے ٹرک میں کچھ دنوں بعد پہنچا دیتا۔ لیکن تم سے پہلے جس پارٹی نے مجھے پیشگی رقم دی تھی، انہیں.........''

''دیکھو رب نواز! مجھے تمہارے لہجے سے بددیانتی کی بُو آ رہی ہے۔ تم نے ہمیں مقررہ وقت پر مال دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ ہم نے بھی تو آخر دوسری پارٹی کو بروقت مال پہنچانا تھا۔''

وہ میری دوٹوک گفتگو پر جزبز ہوئے بغیر بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں اپنا قصور مانتا ہوں۔ اب ایسا کرو مجھے ان دونوں ٹرکوں کا مال واپس لوٹا دو۔ میں چند دنوں کے اندر اندر تمہیں تمہارا مال پہنچا دوں گا۔''

مجھے اس کی بات پر بری طرح طیش آ گیا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''جس طرح تم نے میرے ماموں حیدر گل کو مال پہنچایا تھا......... دیمک زدہ؟''

''ان کی بات چھوڑو۔ وہ پرانی بات ہو گئی۔''

''وہی پرانی بات اب نئی ہو گئی ہے ٹھیکے دار رب نواز!'' میں نے اسے گھورتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ ''اچھا ہوا تم آ گئے۔ ورنہ میں خود تمہارے پاس ساٹھ لاکھ کے مال کے سلسلے میں آ رہا تھا جو تم نے آج سے کچھ مہینے پہلے میرے ماموں مرحوم حیدر گل کو دیمک زدہ لکڑی کی صورت میں پہنچایا تھا۔''

میری بات نے اس کے چہرے کے تاثرات کو مزید بگاڑ دیا تھا۔

''نادر میاں! اس معاملے کو بھول.........''

''نہیں بھولوں گا ٹھیکے دار رب نواز! تمہیں ہر قیمت پر وہ ساٹھ لاکھ مجھے ادا کرنے ہوں گے۔'' میں اس کی بات کاٹ کر ٹھوس لہجے میں بولا۔

''میں تمہارے پاس اپنے دو ٹرکوں کی واپسی کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

''انہیں بھول جاؤ اور میرے ساٹھ لاکھ دینے کی بات کرو۔''

وہ میرے مسئلے کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا اور میں اس کے مسئلے کو۔ اور حق بجانب تو بہرحال میں ہی تھا۔ وہ دانت کچکچا کر بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں، تم کس کے بل بوتے پر اتنا اکڑ رہے ہو؟......... مگر کاشانہ ایک بے وقوف اور غیر سنجیدہ لڑکی ہے۔ اس کے کہنے پر چلو گے تو کسی دن منہ کی کھاؤ گے۔''

میرے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اور پھر میں اسی لہجے میں اسے برماتی ہوئی نظ
سے گھورتے ہوئے بولا۔

''رب نواز! جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔ تم نے بڑی مکاری سے میرے ماموں حیدا
ساٹھ لاکھ کا دھوکا دیا اور اب پینتیس لاکھ کے قریب مجھ سے بھی ہتھیانا چاہتے تھے۔ میں اب بہ
ساٹھ لاکھ تمہارے حلق سے برآمد کرنے والا ہوں۔''

میری چبھتی گفتگو پر وہ چند ثانیے اپنی آنکھیں سکیڑے سنسنی خیز نظروں سے میری طرف گھورتا رہا
ایک سرسراتی ہوئی ہنکاری خارج کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔

''نادر میاں! تو گویا تم میرا مال واپس نہیں کرو گے؟''

''بالکل نہیں..... بلکہ اب تم میرے ساٹھ لاکھ دینے کی بات کرو۔'' میں نے بھی سرسرا
میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تمہارا ٹال اپنے بطن میں ایندھن سموئے ہوئے ہے۔ جسے آگ پکڑنے میں ایک لمحے کی بھی
نہیں لگے گی۔'' وہ بالآخر دھمکیوں پر اُتر آیا۔ مجھے طیش تو آیا مگر میں ضبط سے کام لے کر استہزائیہ ہنسی
ساتھ بولا۔

''ہاں ..... یہ بالکل ممکن ہے۔ تم نے اچھا کیا، مجھے پہلے سے بتا دیا تاکہ اپنے ٹال میں
لگنے کے بعد میں اِدھر اُدھر بھٹک کر وقت ضائع کرنے کی بجائے تمہارے نتھیا گلی والے دفتر سمیت تم
عالی شان محل نما کوٹھی کی طرف اپنی ٹال کی آگ کا رخ موڑ سکوں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اب تم جا
ہو۔ لیکن میرے ساٹھ لاکھ روپے ذہن میں رکھنا۔'' میری بے نیازی اور دھمکی کے جواب میں دھمکی
وہ مزید بھنایا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

''میں تم سے نمٹ لوں گا۔'' وہ دانت پیس کر اُٹھتے ہوئے بولا۔

''شیور!'' میں نے قہقہہ مار کر کہا۔ ''میں منتظر ہوں۔''

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا میرے دفتر سے نکلتا چلا گیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی منیجر مشتاق
داخل ہوا اور اپنی عرق آلود پیشانی صاف کرتے ہوئے مجھ سے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''شکر ہے سر جی! یہ بلا ٹلی۔ ورنہ تو آج یہاں اکھاڑا ہی لگ گیا تھا۔''

''خاطر جمع رکھو منیجر! ..... یہ بلا ٹلی نہیں ہے۔ اب تو یہ نازل ہوتی رہے گی۔'' میں نے زہر
مسکراہٹ سے کہا۔

''اچھا سر جی!'' وہ کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں اپنے دیدے گھماتے ہوئے بولا۔

میں نے کرسی سے پشت ٹکا لی اور ان ساٹھ لاکھ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں اسے مزید تاؤ
چاہتا تھا۔ اچانک مجھے کاشانہ کا خیال آ گیا۔ اگرچہ میں نے اس سلسلے میں کسی قسم کی مدد لینے سے انکا
دیا تھا اور میں اپنی بات پر قائم بھی تھا۔ مگر اتنا تو میرا حق بنتا ہی تھا کہ میں رب نواز جیسے دھوکے باز
فریبی انسان کے سینے پر مونگ دل سکوں۔ کاشانہ گزشتہ دن ہی مجھ سے دفتر میں مل کر گئی تھی۔ بڑی عجی
وغریب گفتگو کے بعد مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی تھی..... مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس
باتیں مجھے جتنی عجیب لگتی تھیں، اتنی ہی پُرکیف بھی محسوس ہوتی تھیں جو میرے درماندہ دل کو تسکین
تھیں۔ میں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور کاشانہ کا نمبر پنچ کرنے سے پہلے منیجر مشتاق کو وہاں
جانے کا اشارہ کیا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہیلو کاشانہ! میں نادر بات کر رہا ہوں۔'' رابطہ ملتے ہی میں نے ٹیلی فون کے مائیکروفون میں کہا۔

میری آواز سنتے ہی دوسری طرف سے کاشانہ کی پُرمسرت آواز اُبھری۔

''ہیلو نادر صاحب! آپ نے مجھے فون کرنے کی زحمت گوارا کر ہی لی بالآخر۔ بہت بہت شکریہ! کیسے ہیں آپ؟''

''بالکل ٹھیک..... آپ سنائیں۔'' میں نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ آپ کب تشریف لا رہے ہیں میرے غریب خانے پر؟''

''غریب خانہ کہاں ..... آپ کا گھر تو پورا محل ہے۔ ویسے آپ اس وقت اپنے گھر پر ہی ہیں؟'' میں نے آخر میں پوچھا۔

''ہاں..... اور آپ؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں اپنے ٹال پر ہی ہوں اس وقت۔ آپ سے ملاقات کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔''

''زہے نصیب۔ مجھے یقین نہیں آ رہا، میری آنکھیں آپ کے انتظار میں فرشِ راہ ہیں۔ پھر آ رہے ہیں آپ؟'' وہ مسرت سے لبریز لہجے میں بولی۔

''یس..... ابھی نکل رہا ہوں۔''

''تشریف لے آئیں..... میں سرتاپا آپ کی منتظر ہوں۔'' اس نے بے تابی ظاہر کی اور میں نے گفتگو کا اختتام کر دیا۔

موبائل آف کر کے میں نے اپنی جیب میں رکھا اور جیپ کی چابیاں سنبھالیں۔ اپنے آفس سے جیسے ہی باہر نکلا، اچانک ایک نیلے رنگ کی آٹو میٹک گیئر والی بی ایم ڈبلیو تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ میں ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔ کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر صرف ایک ہی شخص موجود تھا۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر کار سے نیچے اُترا تو اسے پہچان کر ایکا ایکی میرے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

وہ اشفاق شاہین تھا۔ انڈر ورلڈ مافیا کا ڈان..... مجھے اسے غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر دو باتوں پر حیرت ہوئی۔ پہلی تو یہ تھی کہ وہ بالکل تنہا تھا۔ دوسری یہ کہ لاہور سے ہی آ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی رہائش گاہ لاہور گلبرگ کے علاقے میں تھی۔

اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور سیدھا میری طرف آیا۔ میں نے اپنی اندرونی مضطربانہ کیفیات پر قابو پاتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ سجا کر اس کا پُرتپاک استقبال کیا اور فوراً ہی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

''یہ تمہارا دفتر ہے؟'' مجھ سے گویا طوعاً و کرہاً ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے سامنے میرے آفس کیبن کی طرف اشارہ کر کے سرد لہجے میں کہا۔

''آں..... آؤ، خیریت تو ہے؟ ویسے مجھے خوشی ہوئی۔'' میں نے مکاری سے کہا۔ میں جانتا تھا کہ کہاں اور کب مکاری سے کام لینا چاہئے۔

میں اسے لے کر اپنے دفتر میں پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے پاس کیوں آیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ میرے چہرے کو بھانپتی ہوئی نظروں میں لئے ہوئے تھا۔

''بیٹھو..... پہلے مجھے یہ بتاؤ، تم کیا پیو گے؟'' میں نے خوش دلی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ میں نے پل کے پل اشفاق شاہین کے سلسلے میں ایک مربوط حکمت عملی ''پلین'' کر لی تھی کہ مجھے اس کے ساتھ کس طرح پیش آنا تھا اور کس طرح اس غلیظ انسان کی بیخ کنی کرنی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''تم نے کل رات میری رہائش گاہ پر نقب لگائی اور غزالہ کو لے اُڑے۔'' کرسی پر براجمان ہوتے ہ
اس نے خشک لہجے میں مجھ سے دریافت کرنا چاہا تو میں نے ذرا ڈرپوک انسان کا رول پلے کرتے ہو
اپنے لہجے میں حیرت آمیز پریشانی سمو کر اس سے کہا۔

''کیا؟..... یہ ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟..... میں تو تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے ا
رات سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے جانے کی اجازت دی تھی۔ اور ساتھ ہی غفورے کا بھی کرا
نے مجھ سے معاہدہ کر لیا کہ آئندہ ہم دونوں میں سے کوئی کسی کا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا
اور پھر بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں غزالہ کی خاطر ایسی خطرناک مہم جوئی کرتا پھروں۔''

میں نے کسی خوف زدہ انسان کے سے انداز میں ایک ہی سانس میں اپنی صفائی پیش کرتے ہو
اس سے کہا اور اپنی اداکاری کی اثر پذیری کے نتیجے میں اس کے چہرے کی سرد مہری کو اُلجھن آمیز تر
میں تبدیل ہوتے دیکھا اور مجھے بھی کچھ حوصلہ ہوا۔

''ہوں..... تم سچ کہہ رہے ہو؟'' وہ میرے چہرے کی طرف کھوجتی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا

''اس میں جھوٹ کی گنجائش ہی نہیں ہے اشفاق صاحب!'' میں نے پہلے سے بھی زیادہ اپنے جھو
لہجے کو پُر اعتماد بناتے ہوئے مکاری سے کہا۔ ''تم خود سوچو، بھلا مجھ جیسا عام کاروباری اور امن پسند آد
ایک انڈر ورلڈ فلم مافیا کے ڈان کے ساتھ ایسی بے وقوفانہ قسم کی غلطی کر سکتا ہے؟''

میرے انداز اور تبصرے پر اس کی آنکھوں میں ایک تیز چمک اُبھری۔ یہ ایک حیرانی کی چمک تھی ا
میں جو چال اشفاق شاہین جیسے خطرناک گینگسٹر کے ساتھ چلنا چاہ رہا تھا، اس کا یہ تقاضا تھا کہ میں بعض
ایسی باتوں کو اس کے سامنے کھل کر بیان کر ڈالوں کہ ایک تو مجھے اس پر ذرّہ برابر شبہ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ
وہ مجھے ''شوقین مزاج'' آوارہ نوجوان سمجھے۔

''میرے بارے میں تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' اس نے معاً اپنی آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے اسرا
بھرے لہجے میں کہا۔

''ارے چھوڑیں جی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے، آپ خفیہ قسم کی بڑی مسالے دار فلمیں بھی بناتے ہیں
میں خود ایسی فلموں کا جنون کی حد تک کریز رکھتا ہوں۔'' میں نے اوباشانہ لہجے میں ایک آنکھ معنی خیز ادا
میں میچ کر کہا تو اس کے چہرے پر ویرانی سی پھیلنے لگی۔

''تت..... تمہیں..... یہ..... یہ کیسے پتہ چلا؟''

''اور کون بتائے گا؟..... اس چھنال، غزالہ نے ہی بتایا تھا۔ مگر یقین کریں اشفاق صاحب! م
تو یہ سن کر حیران رہ گیا تھا کہ یہاں بھی ایسی زبردست اور گرما گرم فلمیں بنتی ہیں۔ میں تو اس سلسلے م
خود آپ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ پلیز..... کبھی مجھے ایسی فلمیں بناتے ہوئے نظارے تو کرائیں۔ اب
تک میں نے صرف ٹی وی اسکرین پر ہی دیکھا ہے۔ ذرا حقیقی طور پر بنتے ہوئے بھی تو دیکھوں۔ اس
لطف ہی الگ ہوگا۔''

میں بدستور اس کے لئے حیرت کا سامان مہیا کئے جا رہا تھا۔ میری اپنی بھی کوشش یہی تھی کہ اشفا
شاہین جیسے خبیث ہاتھی کو چیونٹی بن کر اس کی سونڈ میں گھس کر مارنا چاہئے تھا اور اس کے لئے ضروری
کہ میں اس کے سامنے خود کو زیادہ سے زیادہ شوقین مزاج ظاہر کروں۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اس
لحہ بہ لحہ بڑھتی ہوئی حیرت کے دوران ہی اس پر مزید رعب ڈالنے کی غرض سے کہا۔

''میں تو اب اپنے کمپیوٹر پر بھی ایسی مخصوص ویب سائٹس پر دھاکر قسم کے ٹوٹے دیکھتا رہتا ہوں



آپ کو شاید یقین نہیں آئے گا۔ اس شوق میں، میں اس قدر آگے جا چکا ہوں کہ میں نے انٹرنیٹ پر
جنوبی امریکہ کی ایسی تھری ایکس بلیو فلمیں بنانے والی کمپنیوں کے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں سے
رابطے بھی کر رکھے ہیں۔ وہ تو مجھ سے کہتے ہیں کہ اگر میں ان کی کمپنی میں کام کروں تو وہ خود اپنے خرچ
پر مجھے امریکہ بلوائیں گے اور ہزاروں ڈالر منافع بھی دیں گے۔ یہی نہیں، نیٹ ٹو فون اور ویژن کیمرہ
کے سامنے مذکورہ ڈائریکٹر اپنی کمپنیوں کی گوری چمڑی والی عورتوں اور جوان لڑکیوں سے بھی میری باتیں
کرواتے ہیں۔''

میں کہتا جا رہا تھا اور وہ حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ مجھے یوں حیرت بھری نظروں
سے تکے جا رہا تھا جیسے اس کے سامنے اس کا کوئی باپ بیٹھا ہو۔ مجھے یہ ساری معلومات غزالہ کے ذریعے
معلوم ہوئی تھیں اور آج میں اس کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

''آپ کیا پئیں گے اشفاق صاحب؟..... بلکہ ٹھہریں، میں آپ کے لئے دہی بھلے منگواتا ہوں،
گلاب جامن ڈلوا کے۔''

''نن..... نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ بس چائے منگوا لو۔'' اشفاق شاہین نے جلدی سے کہا۔

اس کا ابال اب جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے اپنی چوٹیں لگانے کا سلسلہ جاری
رکھا۔ ''واہ..... واہ اشفاق شاہین صاحب! یہ سالی انگریز عورتیں بھی کیا شے ہیں..... بالکل فری
سٹائل محبت کرتی ہیں۔ ارے میں تو بھول ہی گیا.....'' میں نے آخر میں دانستہ خود کو بے وقوف ظاہر
کرنا چاہا تھا۔ پھر بیل بجا دی۔ ذرا دیر بعد ایک ملازم اندر داخل ہوا۔ میں نے اسے چائے اور کیک
پیسٹریوں کا آرڈر دیا۔ وہ واپس چلا گیا۔

''ہاں تو اشفاق صاحب! میں کہہ رہا تھا کہ.....'' میں پھر شروع ہونے لگا تو وہ بول پڑا۔

''نادر صاحب! آپ کے ساتھ خوب جمے گی۔ اچھا، آپ یہ بتائیں آپ شادی شدہ ہیں؟''

''نہیں جی..... ابھی تو نہیں کی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ پھر خوش امید مسکراہٹ سے بولا۔ ''اشفاق
صاحب! تو پھر میں آپ کے دولت کدے پر کب حاضر ہو جاؤں؟ اور..... اور کیا آپ مجھے اپنی اس
فلم میں کام کرنے کا چانس.....'' میں نے جھینپی جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا جملہ دانستہ ادھورا چھوڑا تو
وہ ہولے سے کھنکھار کر بولا۔

''مگر تم کس طرح ایسی فلم میں کام کر سکتے ہو؟..... ہمارے پاس تو ایسی فلموں میں کام کرنے
کے لئے مخصوص پیشہ ور آدمی ہوتے ہیں جو گمنام ہوتے ہیں۔ جبکہ تم کو یقیناً بہت سے جاننے والے لوگ
جانتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کو منظر عام پر کبھی نہیں لاتے۔ بلکہ وہ گمنامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔''

''جی ہاں..... آپ کی یہ بات تو درست ہے۔'' میں نے اس کے متوقع جواب پر بڑی چالاکی
سے بات کو دوسری طرف موڑتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ ''لیکن آپ کسی اور طریقے سے ہی
سہی، بس مجھے اپنے کاروبار میں کسی طرح شریک کار بنا لیں۔ یہ بڑا رنگین اور دلچسپ کاروبار ہے۔ لیکن
سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں منافع اور دولت کمانے کے بے حساب مواقع ہیں۔ میں کسی وقت حاضر
ہو جاؤں گا آپ کے دولت خانے پر۔ یوں تو میں آپ کے ہاں ایک بار غزالہ والے حوالے سے آ تو چکا
ہوں لیکن..... پھر بھی ذرا تفصیلی پتہ اور اپنا کنٹیکٹ نمبر دے دیتے تو اچھا تھا۔

میری بات پر اس نے جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا اور بولا۔ ''اس میں
میری گلبرگ والی جگہ کا پتہ موجود ہے اور میرا فون نمبر درج ہے۔ آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کر دینا۔''

اپنی چالاکی پر میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ میں نے کارڈ اس شیطان کے ہاتھ سے فوراً لے کر اس پر ایک نظر ڈالی پھر آخر میں پوچھا۔ ''کیا آپ ایسی فلمیں وہیں اپنی رہائش گاہ میں بنواتے یا.........؟'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

یہ باتیں اب وہیں ہوں گی۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''چلیں ٹھیک ہے.........ویسے آپ مجھے اپنے اس منافع بخش کاروبار میں شامل تو کریں گے نا!

''ہاں.........اسی لئے تو بلا رہا ہوں۔ سوچنا پڑے گا کہ تمہیں کیسا کام دیا جائے۔'' وہ بولا۔

اسی دوران ملازم چائے وغیرہ لے آیا۔ ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر میں اچانک غزالہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ ''اشفاق صاحب! غزالہ کا کیا معاملہ ہے؟.........کیا وہ بھی ایسی کسی فلم کا کام کر چکی ہے یا پھر اپنا معاوضہ بڑھانا چاہتی ہے؟''

میری بات پر اس نے ایک پوری پیسٹری نگلنے اور چائے کے چند بڑے بڑے گھونٹ بھرنے کے کہا۔ ''وہ ذرا ٹیڑھی لڑکی ہے۔ حالانکہ وہ ہماری ہی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر پھر جانے کیا ہو وہ.........مگر یہ تو بتاؤ، تم اسے کیسے جانتے ہو؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''میں تو اسے ہرگز نہیں جانتا۔ یہ تو میں آپ کو وہیں بتا چکا تھا، آپ کی رہائش گاہ پر۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہوں.........'' اس نے ایک گہری ہمکاری لی اور چپ ہو گیا۔ دراصل اس موضوع پر میرے اشفاق شاہین کے درمیان گفتگو ہو چکی تھی۔ اس وقت غفورا بھی وہیں موجود تھا۔ مگر میں نے بڑی صورتی اور چالاکی کے ساتھ اپنی بات ان دونوں غنڈوں کے پہچان لئے جانے پر موڑ دی تھی جنہیں کر میں چونکا تھا۔ ان دونوں کا تعلق جہنم واصل چھپکلی مارکہ کھڑتال گروپ لیڈر سے تھا جو میرے ہاتھوں اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچا تھا۔ جو حقیقت میں غفورے کے ساتھی نکلے تھے اور یوں غزالہ کے ح... سے بات آئی گئی ہو گئی۔

''مگر اس نے تمہیں میرے اور میرے اس خفیہ کاروبار کے بارے میں جو تفصیل بتا ڈالی ہے! مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ وہ اب ہمارے لئے خطرناک ہو سکتی ہے اور ہمارے پیچھے کسی خفیہ سرکاری ا... کو لگا سکتی ہے۔'' وہ چائے کا کپ خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا اور پھر اچانک سے پوچھا۔ ''اس نے ہمارے متعلق اور بھی کچھ تمہیں بتایا تھا؟''

''نہیں تو.........بس اتنی ہی باتیں بتائی تھیں۔'' میں نے کہا اور فوراً ہی کچھ سوچتے ہوئے اس رنگ آمیزی کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ تو جی، اس حادثاتی ملاقات کے دوران میری اچھی خاصی دوستی گئی تھی اور مجھے اپنے گھر بھی آنے کی دعوت دی تھی۔ تاہم وہ آپ لوگوں سے بہت خوف زدہ بھی ہے اور آپ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے تاکہ اپنی الگ تھلگ پُرسکون زندگی بسر کر سکے۔ میں تو کہتا جناب! اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اگر اسے چھیڑنے کی کوشش کی تو وہ کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔''

یہ ساری باتیں بتاتے وقت میں نے یہ بھی ضرور کہا تھا کہ غزالہ نے مجھے یہ ساری باتیں اس وقت بتائی تھیں جب ہم دونوں کو اشفاق شاہین نے اپنی گلبرگ والی رہائش گاہ کے کمرے میں مقید کر رکھا لہٰذا! آخر میں، میں نے یہ کہنا ضروری سمجھا۔

''اشفاق صاحب! یہ بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ آخر غزالہ کو کس نے آپ کی قید سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



فرار ہونے میں مدد دی ہے؟ بلکہ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، یہ کام آپ ہی کے کسی غدار کا لگتا ہے۔''

''ہاں.........اب تم سے ملنے کے بعد میرا بھی یہی خیال ہے۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ میں دل ہی دل میں اپنی شاطرانہ چال پر خوش ہونے لگا کہ میں نے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے اسے اپنی طرف سے بھٹکانے پر کامیابی حاصل کر لی تھی۔ تاہم ابھی مجھے یہ دیکھنا تھا کہ وہ غزالہ کے سلسلے میں کون سا لائحہ عمل ترتیب دینا چاہتا ہے؟ یہی سبب تھا کہ میں اپنی بات کہنے کے بعد مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا تھا۔ مگر وہ میری بات کا تسلی بخش جواب دیئے بغیر رخصت ہونے کے لئے کھڑا ہوا تو میں نے بھی اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ وہ مجھ سے دوستانہ انداز میں مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''میں تمہاری آمد کا منتظر رہوں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔''

میں نے بھی دوستانہ گرم جوشی دکھاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر باہر احاطے میں کھڑی اس کی کار تک اسے چھوڑنے آیا۔ ذرا دیر بعد وہ واپس چلا گیا تو میں اپنی جیپ میں بیٹھ کر ''کاشانہ پیلس'' کی طرف روانہ ہو گیا۔

اشفاق شاہین جیسے بڑے گینگسٹر کو اتنی آسانی سے اُلّو بنانا میری ایک غیر متوقع اور اچانک کامیابی تھی۔ اپنی اس چومکھی جنگ میں اپنے ایک حریف کو میں پھندا ڈال چکا تھا۔ جب کہ رب نواز اور کبیر سمیت کیلاشی عامل عاروب کے کارپردازوں کا مسئلہ نمٹانا تھا۔ بالخصوص میں نگینہ کی امریکہ سے واپسی سے قبل عامل عاروب والا معاملہ نمٹانا چاہتا تھا۔ کیونکہ کبیر اور کیلاشی عامل عاروب کے دو کارپردازوں سے ٹکرانے کے بعد مجھے یہ معاملہ زیادہ سنگین محسوس ہونے لگا تھا۔ مجھے اس بات کا ذرا بھی خوف نہ تھا کہ میں عامل عاروب کو زخمی کرنے کا باعث بنا تھا اور اب اس کے پیروکار مجھ سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ بلکہ سنگین پہلو یہ تھا کہ ان کا اصل ٹارگٹ نگینہ تھی۔ وہ ہر قیمت پر اپنے خودساختہ دیوتا دابولا میزی پر نگینہ کی جان کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے اور کبیر اس سلسلے میں ان کی پوری رہنمائی کر رہا تھا۔ عامل عاروب کے جن پیروکاروں سے میرا ٹکراؤ ہوا تھا ان میں سے ایک کے پیٹ میں گولی مار چکا تھا جو پتہ نہیں اب زندہ بھی تھا یا نہیں؟ تاہم دوسرے ساتھی کا نام مجھے معلوم نہ تھا۔ اگرچہ اس کی ٹانگ میں بھی گولی لگی تھی، غالب خیال یہی تھا کہ دونوں یا کوئی ایک میرے ہاتھوں منہ کی کھانے کے بعد واپس کیلاش وادی لوٹ گیا ہو۔

''کاشانہ پیلس'' پہنچ کر میں نے اپنی جیپ جیسے ہی وسیع و عریض احاطے کے گیٹ کے سامنے روکی، مسلح محافظوں نے فوراً گیٹ کھول دیا۔ غالباً کاشانہ نے انہیں میری متوقع آمد کے بارے میں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ مگر پھر جیسے ہی میں نے اپنی جیپ اندر سبزہ زار کے احاطے میں داخل کی تو مجھے ایک جانب چند قدموں کے فاصلے پر کاشانہ چہل قدمی کرتی نظر آئی۔ تاہم میری جیپ دیکھتے ہی وہ فوراً میری جانب بڑھی۔ میں جب تک اگنیشن سوئچ آف کر کے اور دروازہ کھول کر جیپ سے نیچے اترا۔ کاشانہ بھی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ اس نے اسکن ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی جس کے پائنچے اس کی گوری گوری اور گداز بھری بھری پنڈلیوں کو جیسے دبوچے ہوئے تھے۔ نیچے سیاہ رنگ کے دیدہ زیب سینڈل تھے۔ اس بار اس نے جو ہاف آستین کی شرٹ پہن رکھی تھی، اس کے کالر مردانہ تھے۔ شرٹ پینٹ کے اندر اڑسی ہوئی تھی جس کے باعث اس کے مدور نشیب و فراز ہیجان خیز منظر پیش کر رہے تھے۔ اپنے

بوائے کٹ بالوں کو اس نے ڈائی کیا ہوا تھا۔ گداز بھرے ہوئے ہونٹوں پر پُرکشش، دعوت انگیز مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ جب وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تو بائیں گال پر خفیف سا ڈمپل اُبھرا۔ آج میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی نشیلی آنکھوں پر سایہ کی ہوئی سیاہ پلکیں غیر معمولی طور پر لمبی تھیں۔

''زہے نصیب!......... نادر صاحب! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ واقعی مجھ سے ملنے دوسری بار آئے ہیں۔'' وہ مترنم لہجے میں بولی۔

''نہیں......... آپ سے ملنے تو پہلی بار ہی آیا ہوں۔'' میں نے بھی جواباً مسکرا کر کہا۔

''وہ کس طرح؟''

''پہلی ملاقات میں آپ کے پپا......... میرا مطلب ہے رب نواز سے ہی کرنے آیا تھا مگر آپ سے ہوگئی۔ اس بار تو بالخصوص آپ سے ہی ملنے آیا ہوں۔''

میری بات پر وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دی۔

''آپ بھی بس.........'' وہ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی۔ ''چلیں، اندر تشریف لائیں۔'' وہ بے تکلفی سے میرا ہاتھ اپنے نرم و گداز ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے بولی۔

میں اس کے ہمراہ سبزہ زار کے درمیان بنی خوب صورت روش پر چلتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مجھے اندر ایک شاہانہ طرز کے کمرے میں لے آئی۔ یہ ایک کشادہ ڈرائنگ روم تھا۔ پُرتعیش بیش قیمت جدید آرائشی اشیاء سے آراستہ و پیراستہ۔ اس نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا کہا اور خود میرے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگئی۔

میں نے اردگرد یونہی نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''لگتا ہے گھر میں اس وقت آپ اکیلی ہیں۔''

''ہاں......... مما، رب نواز کے ساتھ کہیں دعوت پر گئی ہیں۔ رات بارہ بجے سے پہلے ان کی واپسی ممکن نہیں۔'' وہ بولی۔

''تو آپ اتنا طویل وقت یونہی بیٹھے گزار دیتی ہیں؟......... میرا مطلب ہے آپ بھی ذرا آؤٹنگ پر نکل جایا کریں۔ اکیلی تو آپ بور ہو جاتی ہوں گی۔''

میری بات پر وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولی تو مجھے اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ''نادر صاحب! پتہ نہیں، کیا بات ہے۔ پپا کے انتقال کے بعد میں جیسے اپنے ہی خول میں بند ہو کر رہ گئی ہوں۔ کسی چیز میں دل ہی نہیں لگتا۔''

''اوہ......... لگتا ہے، آپ اپنے پپا سے بہت قریب تھیں۔''

''ہاں......... بہت قریب۔ مما سے بھی نہیں، جتنا مجھے اپنے پپا سے محبت تھی۔ وہ میرے دوست تھے۔ میرے خیالات، میرے افکار غرضیکہ مجھ سے وہ ہر چیز شیئر کرتے تھے۔''

''اور مما سے؟''

''مما کو اپنی سوشل لائف سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''انہوں نے مجھے لائف میں بہت نظر انداز کیا۔ اب تو جیسے وہ مجھ سے دور ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔ بہت دور چلی گئی ہیں۔ ان کی طرف دیکھتی ہوں تو مجھے مزید تنہائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور پپا کی یاد بھی اتنی شدت کے ساتھ آتی ہے۔ درحقیقت نادر صاحب! پپا کی موت کا غم مجھ سے بھلائے نہیں بھولتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پپا کی موت بالکل اچانک اور غیر متوقع ہوئی تھی۔ دو سال کا عرصہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ مگر آج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk





مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پپا اچانک نمودار ہوں گے اور مجھے بالکل ایک ننھی منی بچی کی طرح اپنی گود میں بھر لیں گے۔'' وہ اپنی رو میں کہتی جا رہی تھی۔ میری نظریں اس کے غم ناک چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کی لانبی پلکیں بھیگی بھیگی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ اچانک جیسے وہ حسرت و اندوہ کے بھنور سے اُبھر کر قدرے چونکتے ہوئے بولی۔

''ارے......... یہ میں کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ میں نے تو آپ کو کچھ کھانے پینے کا ہی نہیں پوچھا۔'' پھر تھوڑے توقف کے بعد بولی۔ ''آپ لنچ کر کے ہی جائیں گے۔ میں پہلے آپ کے لئے کولڈ ڈرنک منگواتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے کسی ملازمہ کو آواز دی تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت اندر داخل ہوئی۔ کاشانہ نے اسے کولڈ ڈرنک لانے کا کہا۔ وہ چلی گئی تو میں نے ذرا کھنکھار کر کاشانہ سے کہا۔

''آپ لنچ کا بکھیڑا رہنے دیں۔ کولڈ ڈرنک ہی بہتر رہے گا۔''

''جی نہیں......... ہر وقت آپ کی مرضی نہیں چلے گی۔'' وہ جیسے یکدم اپنی کھلنڈری خو میں آتے ہوئے بولی۔ ''میں نے آپ کے لئے اسپیشلی بکرے کی ران کا تنوری چرغہ اور جنجر چکن تیار کروایا ہے اور بلوچی تنور والے سے بڑے بڑے نان......... اور سویٹ ڈش میں ٹرائفل کسٹرڈ......... مزہ آ جائے گا۔''

''واہ......... آپ تو کھانے پینے کا بڑا شوق رکھتی ہیں......... حالانکہ آپ کی عمر کی لڑکیاں تو کھانے پینے سے دور بھاگتی ہیں کہ کہیں موٹی نہ ہو جائیں۔'' میں نے ازراہ تفنن کہا تو وہ بے اختیار چلبلے انداز میں ہنس پڑی۔

''میں ایسے کسی احمقانہ کریز میں مبتلا نہیں ہوتی۔ جو کرنا ہے وہ کرنا ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ انسان کو کوئی حسرت دل میں نہیں رکھنی چاہئے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور دھیمے دھیمے مسرت انگیز لمحات جہاں اور جیسے میسر ہوں، انہیں کشید کر لینا چاہئے۔''

اس کی باتوں میں عجیب سا سحر تھا۔ میٹھی میٹھی آنچ تھی۔ میں خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ''رب نواز آیا تھا میرے پاس۔''

''وہاٹ؟......... کب؟''

''آج۔''

''کیا کہہ رہا تھا وہ؟''

''یہی کہ میں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور اب مجھے میرا مال واپس لوٹا دو۔ یہی کہہ رہا تھا۔''

''تو پھر......... آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے کہہ دیا تھا کہ اس مال پر میرا حق بنتا تھا، جس کی پے منٹ میں اسے کر چکا تھا۔ لہٰذا اب وہ میرے ساتھ لاکھ روپے دینے کی بات کرے۔''

''ویری نائس......... پھر کیا کہا اُس نے؟'' وہ پُر اشتیاق لہجے میں بولی۔

''آپ کے حوالے سے بات کر رہا تھا کہ میں یہ سب کس کے بل بوتے پر کر رہا ہوں۔''

''مائف فٹ۔'' وہ نفرت خیز لہجے میں دانت پیس کر بولی۔ ''آپ نے کہہ دینا تھا پھر کہ تم جیسے بد دیانت شخص کے ساتھ ہر طرح کا حربہ جائز ہے۔''

''میں نے اس سے ملتا جلتا جواب ہی دیا تھا اسے۔''

''نادر صاحب! آج کل اینٹی کرپشن کے ایک سرکل آفیسر بابر وڑائچ کے ساتھ جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اگر آپ اس سے ایک ملاقات کریں اور اپنا مسئلہ بیان کریں تو آپ کا کام بن سکتا ہے۔'' اس نے

مجھے صائب مشورہ دیا۔

''اچھا.....معاملہ کیا ہے؟'' میں نے دوبارہ پوچھا تو وہ تلخی سے بولی۔

''کیا معاملہ ہونا ہے، سوائے فراڈ کے۔ جس طرح انہوں نے آپ کے ماموں حیدر گل سے فراڈ کیا تھا، اسی طرح رب نواز نے کسی اسماعیل گوندل کے ساتھ بھی یہی دھوکا کیا تھا۔ تمہارے ماموں چارے تو خاموش ہو گئے تھے مگر اسماعیل گوندل رب نواز کے گلے پڑ گیا۔ کیونکہ وہ اینٹی کرپشن کے آفیسر بابر وڑائچ کا چچیرا نکلا۔ اب تو اس نے اپنی رقم کے علاوہ نقصانات کا کلیم بھی کر دیا ہے۔ رب نواز بہت پریشان ہو گیا ہے۔''

''بابر وڑائچ رہتا کہاں ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''میں آپ کو ان کا تفصیلی ایڈریس لے دوں گی۔'' وہ بولی اور اس اثناء میں ملازمہ ایک ٹرے میں کولڈ ڈرنک اٹھا لائی۔ ہم دونوں خاموشی سے کولڈ ڈرنک پینے لگے۔

کولڈ ڈرنک ختم کرنے کے بعد کاشانہ نے صوفے سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''آیئے نادر صاحب! میں آپ کو اپنا کمرہ دکھاؤں اور پپا کی البم بھی۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے لے کر ایک کشادہ اور آرام دہ کمرے میں آ گئی۔ یہاں ایک طرف بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ایک ایزی چیئر بھی تھی۔ دوسرے کونے میں ایک ٹیبل پر کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔ کاشانہ نے مجھے بیڈ پر بیٹھنے کا کہا اور پھر بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے نیلے رنگ کی البم نکالی اور میرے بالکل قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کے پُرشباب وجود سے بڑی مسحور کن خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے البم کھول کر میرے زانو پر رکھ دی۔ اس طرح اسے تھوڑا میرے چہرے کے قریب جھکنا پڑا تو اس کی سانسوں کی تپش مجھے اپنے چہرے پر صاف محسوس ہونے لگی۔

البم میں کاشانہ کی اپنے باپ کے ساتھ بچپن سے لے کر جوانی تک ساری ہی تصاویر موجود تھیں۔ ان تصاویر میں سیر گاہیں اور تفریحی مقامات بھی تھے۔ مجھے باپ بیٹی کے سوا اور کوئی نظر نہ آیا تھا۔ یعنی اس میں ماں کی کہیں ایک بھی تصویر نہیں تھی۔

''یہ البم میں اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر ہی سوتی ہوں اور ہر روز رات کو سونے سے پہلے اسے ضرور دیکھتی ہوں۔ ان سے باتیں کرتی ہوں۔'' وہ پھر اپنی رو میں بہکنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''مس کاشانہ! اس میں شک نہیں کہ بعض دکھ انسان کو ادھ موا کر کے رکھ دیتے ہیں لیکن انسان کے آگے بڑی زندگی ہے۔ اگر وہ دکھ کو اپنے گلے سے لگا لے تو نہ صرف ساری زندگی اس انسان کے اس ایک دکھ کو سینے سے لگائے گزر جاتی ہے بلکہ اس طرح مرے ہوؤں کی روح کو بھی تکلیف پہنچتی ہے۔ آپ خوش رہا کریں..... بلکہ میں تو آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ کسی اچھے لڑکے کا انتخاب کر کے اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیں۔ آپ کی زندگی کے اس دکھ کا بدل اسی خوشی میں ہے اور اس طرح آپ کے پپا کی روح کو بھی یقیناً سکون ملے گا۔'' میں نے اسے نیک نیتی سے دوستانہ مشورہ دیا تو اس نے بے اختیار ایک گہری ہنکاری بھری پھر مجھ سے البم لے کر دراز میں ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ میرے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔

''مجھے آج تک اس کا موقع ہی نہیں ملا۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ اپنے خول سے نکلیں۔ مواقع مل جائیں گے۔''

''ہاں.....شاید آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔'' وہ گومگو سے مگر گہرے لہجے میں بولی۔ اس کے بعد



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گداز اور دلکش لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ سموتے ہوئے بولی۔ ''اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو؟''

''کک.....کیا سوال؟'' میں نے ذرا گڑبڑا کر کہا۔

''یہی کہ آپ نے اب تک اپنی زندگی کا کوئی ساتھی منتخب کیا؟''

''ہاں.....'' مجھ سے جھوٹ نہ بولا گیا۔ اس نے قدرے چونک کر میری جانب دیکھا پھر ہولے سے بولی۔

''پوچھ سکتی ہوں وہ کون خوش نصیب ہے؟''

''ہاں.....وہ بھی آپ ہی کی طرح من موہنی صورت والی لڑکی ہے۔ بالکل آپ جیسی۔''

میری بات پر کاشانہ کی گھنی پلکوں والی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے۔ کشمیری سیبوں جیسے گالوں پر شفق رنگ قوسِ قزح کی جھلک اُبھری۔

''نام بتائیں گے آپ اس کا؟''

''نگینہ۔'' میں نے بتایا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا پھر بولی۔

''بہت خوب صورت نام ہے.....کیا آپ اس سے بہت محبت کرتے ہیں؟''

''ہاں.....بہت.....وہی میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ میں نے جیسے نگینہ کی خوشبو کو اپنی سانسوں کے ذریعے اندر سینے میں اتارتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی یقیناً آپ سے بہت محبت کرتی ہوں گی؟''

''ہاں.....بلکہ ہم دونوں کو ہی یہ دعویٰ ہے کہ وہ دوسرے سے زیادہ محبت کرتا ہے۔''

''ویری فنا سٹک اینڈ ویری نائس ٹرو لو اسٹوری.....''

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ پھر جیسے بہ غور میری آنکھوں، میرے چہرے کو بھانپتی ہوئی نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا۔ ''مگر نادر صاحب! محبت کرنے والوں کی آنکھوں میں تو الوہی مسرتوں کے چراغ سے جلتے بجھتے رہتے ہیں ہر سے۔ ان کے چہرے نو دمیدہ کلی کی طرح کھلنے کے لئے بے چین سے رہتے ہیں۔ ان کی باتوں سے محبت بھرے پھولوں کی خوشبوئیں سی اُمڈتی رہتی ہیں۔ مگر نادر صاحب! آپ کی آنکھیں تو کسی اور ہی غیر مرئی منظر پر مرکوز رہتی محسوس ہوتی ہیں مجھے۔ ایسا منظر جہاں اندیشوں کی آگ سلگ رہی ہو اور آپ کا چہرہ جیسے بے رحم وقت کی شورش زدگی کا شکار ہو اور.....اور آپ کا لہجہ جیسے آتش خوں رنگ کی جھلک دیتا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے اندر کی محبت کی آگ سے زیادہ کسی اور ہی جذبہ خوں رنگ کی تپش سلگ رہی ہو۔ آپ بیک وقت دو متضاد آتشیں حالات کا شکار ہوں۔ کیا میں صحیح کہہ رہی ہوں نادر صاحب؟''

میں اس کی غضب کی قیافہ شناسی پر ہکا بکا رہ گیا۔ کاشانہ کی انہی باتوں نے ہی تو مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی کشاں کشاں اس کی ''سنگت'' پر مجبور کیا تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل اٹھارہ اُنیس برس ہی تھی مگر اس کی باتوں میں برسوں کے تجربے کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ بظاہر لاابالی اور کھلنڈری طبیعت کی نظر آنے والی اس لڑکی میں ایسی گہرائی میرے لئے حیرت ہی کا باعث تھی۔ مجھے کسی گہری اور پُرسوچ خاموشی میں پا کر اس نے دھیرے سے کہا۔

''آپ کی خاموشی میرے اندازے کی درستگی کو ظاہر کر رہی ہے نادر صاحب!.....دیکھیں، دوستی ایک نہایت اعلیٰ و ارفع جذبہ ہوتا ہے۔ اس ناتے سہی، مجھ سے اپنے اندر کی کیفیت شیئر کریں۔ میں نے کہا تو آپ کو اپنا ایک اچھا اور سچا دوست سمجھ کر اپنے دکھ سے آگاہ کیا اور یقین جانیں، مجھے اپنے دل کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



بوجھ کم ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ پلیز نادر صاحب! کیا آپ مجھے اس بارے میں کھل کر نہیں بتائیں گے؟ آپ کی اور نگینہ کی محبت کن نادیدہ جکڑ بندیوں کی زد میں ہے؟..... اگر ایسا ہے تو مجھے آپ کے کام کر بے پایاں خوشی ہوگی۔"

میں نے اس کی بات پر ایک گہری سانس خارج کی اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بولا۔ "ہاں کاشانہ کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میری اور نگینہ کی محبت واقعی ایک پل صراط سے گزر رہی ہے۔ اس کا انجام کیا گا، میں نہیں جانتا۔" پھر میں نے اسے ماں اور نگینہ کے حوالے سے ساری کتھا سنا ڈالی۔

میری ساری بپتا کی صراحت کے بعد کاشانہ خاصی دیر تک پُرسوچ اور گہری خاموشی کا شکار رہی اس کے بعد بولی۔ "نادر صاحب! مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے کسی لائق جان کر اپنے بارے میں حقیقت بیان کر دی۔ مگر نادر صاحب! ایک بات میں آپ کو پورے یقین سے بتائے دیتی ہوں کہ محبت کی سچی اور بے لوث راہ پر چلنے والوں کو مشکلات کا سامنا ضرور رہتا ہے۔ لیکن یہ سب وقت گزرنے کے ساتھ عارضی ثابت ہوتی ہیں۔ اچھا یہ بتائیں، نگینہ کے امریکہ جانے کے بعد اس نے یا آپ نے فون تک رابطہ کیا؟" اس نے آخر میں پوچھا۔

"میں نے ایک بار کوشش کی تھی مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔" میں نے مختصراً کہا تو وہ دوبارہ مستفسر ہوئی۔

"وہ ورجینیا میں اپنی جس آنٹی کے ہاں مقیم ہیں، ان کا ٹیلی فون نمبر وغیرہ؟"

میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں..... نہ اسے دینے کا موقع ملا اور نہ ہی میں لے سکا۔"

"یہ تو بڑی عجیب اور پریشانی والی بات ہو جائے گی نادر صاحب! آپ کے لئے۔" کاشانہ فکرمند سے بولی۔ "اب دیکھئے نا، نگینہ کہاں اور کس حال میں ہوگی، اس کا آپ کو علم کس طرح ہوگا؟"

"اس کے پاس میری رہائش گاہ "گرین لاج" کا پی ٹی سی ایل نمبر موجود ہے۔ مجھے امید ہے تھوڑے دنوں میں وہ مجھ سے رابطہ کرے گی۔" میں نے کہا۔

"نادر صاحب! میں سمجھتی ہوں آپ کی سب سے اہم جنگ محبت کی جنگ ہے۔ رہا آپ کی امی کا مسئلہ تو وہ بھی اپنی جگہ غیر اہم نہیں۔ آپ ان دونوں کے درمیان ایک توازن قائم رکھنے کی کوشش کریں اور میرا خیال ہے جیسا آپ نے مجھے بتایا ہے، آپ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کی امی کے دل آپ کی طرف سے غلط فہمی پیدا ہونا، میں سمجھتی ہوں ایک فطری ردِعمل ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے آخر آپ کی امی کا مسئلہ کیسے حل ہو؟" کاشانہ نے پُرخیال لہجے میں کہا تو میں بولا۔

"امی والا مسئلہ میرا ہی ہے اور اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے نظر حیات کی موت۔"

"یہ قانونی جنگ کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔"

"مگر قانونی جنگ ہم ہار چکے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"تو پھر اب کیا ہو سکتا ہے، بجز اس کے کہ آپ بھی نظر حیات کا وہی حشر کریں جو آپ کی ماں شاہ میر کا کیا ہے۔"

"ہاں..... اب یہی ہو سکتا ہے۔"

"ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔"

"کون سی؟"

"یہ قول آپ کے نگینہ نے معافی تلافی کروانے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اپنے انکل نظر حیات بھی....."



"اب یہ بھی ممکن نہیں رہا۔" میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر فوراً بولا۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔" کاشانہ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولی۔ "اگر آپ کسی طرح نظر حیات کو یہ ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیں تو سارے حالات خود بہ خود ٹھیک ہو جائیں گے۔" کاشانہ کی یہ بات میرے دل کو کسی حد تک قابل قبول لگی تھی۔

"مگر کیسے؟" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"بہت آسان طریقہ ہے اس کا۔ آپ اسے واشگاف الفاظ میں یہ دھمکی دے ڈالیں کہ اگر اسے اپنی زندگی پیاری ہے تو یہ ملک چھوڑ کر خاموشی سے چلا جائے۔ اگر وہ نہیں مانتا تو آپ اسے ذہنی طور پر اتنا ہراساں کر دیں کہ وہ خود ہی یہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔"

اس کی بات پر میں ایک لمحے کو حیران رہ گیا۔ وہ جس طرح میرے اور نگینہ اور ماں کے مسئلے کو پورے خلوص دل کے ساتھ شیئر کر رہی تھی، ایسا کوئی اپنا ہی کر سکتا تھا۔ جب کہ کاشانہ میری کیا لگتی تھی؟ صرف ایک اچھی دوست..... اور اس دوستی کو بھی چند ہی دن بیتے ہوں گے۔ اگرچہ میں اس کی آنکھوں میں اپنے لئے جلتے ہوئے جگنو وغیرہ محسوس طریقے سے بھانپ چکا تھا۔ تاہم وہ بڑی صدق نیت کے ساتھ مشاورت کر رہی تھی۔

عام حالات میں ایسا نہیں ہوتا۔ کوئی لڑکی کسی کو پسند کرتی ہے تو وہ رقابت کے فطری جذبے سے مجبور و مغلوب ہو کر دوسرے کا راستہ کاٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن کاشانہ اس معاملے میں ایک باوقار اور اعلیٰ ظرف لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ مجھ پر اپنے دل کا حال ظاہر کئے بغیر میرا بھرپور ساتھ دینے کے لئے کوشاں تھی۔ میں نے پہلی بار گہری نظروں سے کاشانہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں مجھے بے لوث جذبات کی تہہ میں ایک ان کہا کرب سا جھلکتا صاف محسوس ہو رہا تھا۔ اور اس نامعلوم کرب کی پرچھائیں مجھے اس سے پہلے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس سے پہلے وہ نگینہ سے واقف نہیں تھی۔ یا یہ کہ نگینہ کا ذکر اس کے سامنے نہیں ہوا تھا۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا، وہ کچھ ٹوٹ سی گئی ہے۔ اس نے شاید مجھ سے کچھ توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ مگر میں بھلا اس کی توقعات و خواہشات کے سامنے کیوں کر سرنگوں ہو سکتا تھا۔ میں تو نگینہ کے درِحسن و الفت کا سوالی تھا۔ وہی نگینہ جو میری جان تھی، میری آرزوؤں اور تمناؤں کا محور تھی۔

"کیا سوچنے لگے نادر صاحب؟" میری طویل اور پُرسوچ خاموشی پر معاً کاشانہ نے اپنی مترنم آواز کا ٹہوکا دیا تو میں خیالات کی دنیا سے حقیقی دنیا میں واپس لوٹ کر بولا۔

"آں..... نن..... نہیں، کچھ نہیں۔ بس آپ کی اس معقول تجویز پر غور کر رہا تھا۔" میں نے اپنی اصل سوچ کو خود تک محدود رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"چلیں..... کھانا تیار ہو گیا ہوگا، پلیز.....!" وہ اٹھتے ہوئے خوش دلی سے مسکرا کر بولی تو میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

کھانا واقعی بہت پُرتکلف اور لذیذ تھا جسے کاشانہ کی قربت نے گویا دو آتشہ کر دیا تھا۔

کھانے کے بعد میں نے روانگی کا ارادہ کیا۔ وہ مجھے باہر تک چھوڑنے آئی تھی۔

"پھر کب ملاقات ہوگی؟" اس نے میرے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد پوچھا۔

"اب آپ زحمت کریں۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے گھر پر۔ میں آپ کو اپنی ماں سے ملواؤں گا۔"

"ہاں..... مجھے بھی آپ کی ممی سے ملنے کا شوق ہو رہا ہے۔" اس نے پُراشتیاق لہجے میں جواب

دیا۔ ''چلیں، پھر میں فون پر بتا دوں گی۔ اور ہاں، نگینہ کا فون آئے تو مجھے ضرور بتائیے گا۔ اب تو اچھے اور سچے دوستوں کی طرح اپنے معاملات مجھ سے شیئر کرنے لگے ہیں نا۔'' اس کا لہجہ کھلنڈرا تھا اس کی آنکھوں میں نا معلوم کرب کی پرچھائیاں صاف طور پر محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے ان آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔

''ضرور.....'' اس کے بعد میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے ریورس کرتا ہوا گیٹ سے باہر گیا۔ تب تک کاشانہ بھی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گیٹ تک آن پہنچی تھی۔ اس نے مسکرا کر اپنے ہاتھ سے مجھے الوداعی اشارہ کیا۔ میں نے بھی جواباً مسکرا کر ہاتھ لہرا دیا اور پھر جیسے ہی میں نے جیپ کو گیئر میں ڈال کر آگے بڑھایا تو اچانک میری نگاہ بائیں جانب درختوں کے جھنڈ پر پڑی۔ مجھے وہاں کوئی حرکت کرتا نظر آیا مگر پھر اچانک ہی جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ میں نے فوراً بریک لگا دیئے اور جلدی سے جیپ سے اتر کر مذکورہ سمت دوڑا اور درانہ وار جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ دوسری جانب ذیلی سڑک تھی جو کنارے کنارے کوٹھیوں اور بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں جیسے ہی واپس پلٹا تو میں اچانک کسی سے ٹکرایا۔ وہ کاشانہ تھی۔

''اوہ.....سوری!'' میں قدرے گڑبڑا گیا۔ میں اس سے ایسے ٹکراؤ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''کیا ہوا نادر صاحب!.....آپ اچانک جیپ سے کیوں اتر آئے تھے؟'' اس نے قدرے چونک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں.....بس ایسے ہی، مجھے ذرا وہم ہوا تھا کہ ذرا دیر پہلے کوئی میری گھات میں بیٹھا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اوہ.....!'' اُس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''کوئی گڑبڑ ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے بے پرواہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ اندر چلیں۔ میں روانہ ہو رہا ہوں۔ میرا دور ہو گیا ہے۔''

''اگر کوئی مسئلہ ہے تو میں اپنا گارڈ آپ کے ساتھ کر دیتی ہوں۔'' اس نے محبت آمیز انداز میں پیش کش کی۔

''ارے نہیں.....آپ خواہ مخواہ فکرمند ہو رہی ہیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔''

''اوکے، ٹیک کیئر یور سیلف!'' اس نے گویا میری بات پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے مجھے اجازت دے دی۔ میں نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔

گرین لاج کی طرف بڑھتے ہوئے میرے ذہن میں کاشانہ کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ اس کی ماں اور نگینہ والے مسئلے سمیت نظرِ حیات کے سلسلے میں مجھے جو تجویز دی تھی، میں اس پر غور کر رہا تھا۔ اس نے درست ہی کہا ہے کہ صلاح مشورے کے سلسلے میں کسی اچھے اور بے لوث دوست کی مشاورت شامل ہو تو یہ سودمند رہتا ہے۔ ورنہ تو انسان اپنی ہی جھونک میں ایک ہی لکیر پر سوچتا رہتا ہے۔ کاشانہ نے مجھے جو راہ سجھائی تھی، اس سے پہلے میرے ذہن میں یہ نہیں آ سکی تھی۔ چنانچہ اب میں اس پر غور کرنے کے لئے سنجیدگی سے غور کرنے لگا تھا۔ انہی خیالات میں غلطاں جب میں گرین لاج پہنچا تو چونک پڑا۔ مجھے گیٹ پر چار مسلح گن مین دکھائی دیئے۔ میں نے جیپ روکی اور اتر آیا۔ ان چاروں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مؤدبانہ انداز میں مجھے سلام کیا۔

''کون ہو تم لوگ؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں ایک کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''ہمیں یہاں اعظم صاحب نے تعینات کیا ہے، بیگم صاحبہ اور آپ کی حفاظت کی غرض سے۔''

میرے مخاطب نے نہایت ادب سے کہا اور میں چند ثانیے کھڑا کچھ سوچتا رہا، پھر اندر بڑھ گیا۔

سکینہ نے مجھ سے کہا۔ ''چھوٹے صاحب! کھانا لگا دوں؟''

''نہیں، میں کھا کر آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا چھوٹے صاحب! میں پھر بیگم صاحبہ کو بتا دوں گی۔ وہ آپ ہی کا انتظار کر رہی تھیں۔''

''کیا انہوں نے کھانا نہیں کھایا ابھی تک؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں چھوٹے صاحب! وہ آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ پھر اُنہیں بتا دو، کھانا کھا لیں وہ۔'' یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں رات سے بے آرام تھا اس لئے بستر پر گرتے ہی سو گیا۔

شام چھ بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو سکینہ نے مجھے ماں کا پیغام دیا کہ وہ چائے پر میرا انتظار کر رہی تھیں۔ میں ذرا دیر بعد ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ اس روز غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ ایک کونے میں آتش دان دہک رہا تھا۔ وہیں قریب ہی دو تین کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر ماں بیٹھی تھیں۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی میز پر چائے کے برتن تھے۔ میں بھی ایک کرسی پر ماں کو آداب کہتا ہوا بیٹھ گیا اور اپنے لئے چائے بنانے لگا۔ ماں نے سیاہ رنگ کی گولڈن وائر کی گرم شال اوڑھ رکھی تھی۔ چائے کا کپ ان کے ہاتھ میں تھا۔

''اچھا ہوا.....ٹال سے جلدی آ کر تم نے نیند پوری کر لی۔'' ماں نے مجھ سے کہا۔

''جی امی! بے آرامی کی وجہ سے نیند نے طبیعت بے چین کر رکھی تھی۔'' میں نے ہولے سے کہا اور چائے کا ایک گھونٹ لیا تو ماں نے میرے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''امریکہ روانگی کے بعد نگینہ نے تم سے رابطہ کیا؟''

ماں کا یہ اچانک سوال میرے لئے غیر متوقع نہ تھا۔

''نہیں.....ابھی تک تو نہیں کیا۔'' میں نے جواب دیا۔

''حیرت ہے۔'' ماں نے کہا۔ مجھے ان کے لہجے سے ہلکا سا طنز محسوس ہوا۔ ''پھر تم نے تو اس سے ضرور رابطہ کیا ہو گا۔''

''سیل فون پر کوشش کی تھی مگر نہیں ہو سکا۔'' میں نے جواباً کہا۔ آتش دان کے شعلے دھیمے پڑنے لگے تو ان سے دھواں اٹھنے لگا۔ ماں نے دست پناہ سے آتش دان کی ادھ جلی لکڑیوں کو آگ پر اکٹھا کیا تو کمرے کے ماحول میں بھڑکتے شعلوں کی چرچراہٹ اُبھری۔ حالانکہ گیس ہیٹر بھی تھا مگر ماں کو آتش دان کی آگ زیادہ پسند تھی۔

''تمہیں تو نگینہ نے بتایا ہو گا کہ امریکہ میں وہ کس کے ہاں ٹھہرے گی؟'' دست پناہ کو دوبارہ اپنی کرسی کے ساتھ ٹکا کر ماں نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ آتش دان کے بھڑکتے شعلوں کی پُرتپش روشنی میں مجھے ماں کا چہرہ بھی بھڑکتا محسوس ہوا۔ میں نے جواباً کہا۔

''ورجینیا میں اس کی کوئی آنٹی رہتی ہیں۔ نگینہ انہی کے پاس ٹھہرے گی۔''

''ان کا کوئی ٹیلی فون نمبر نہیں دیا تھا نگینہ نے تمہیں؟''

''نہیں۔''

''تو پھر اب یہ کیسے معلوم ہو کہ شاہ میر زندہ ہے یا مر چکا ہے؟'' ماں کے لہجے میں ایکا ایکی شعلوں تپش عود کر آئی۔ میں نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر خالی کپ تپائی پر رکھا اور بولا۔

''میں دوبارہ موبائل پر نگینہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہ صورت دیگر اب نگینہ خود ہی سے رابطہ.........'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''فون دیکھو۔'' ماں نے مجھ سے گمبھیر لہجے میں کہا مگر میں پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ میں سیدھا فون طرف بڑھا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور ہیلو کہا۔

''ہیلو نادر!......... میں نگینہ بول رہی ہوں۔'' دوسری جانب سے نگینہ کی مدھر آواز نے میرے مسرتوں کی بجلیاں دوڑا دیں۔

''ہاں......... ہاں نگینہ! میں......... میں نادر بات کر رہا ہوں۔ تت.........تم کیسی ہو؟ میں نے سے موبائل پر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر.........''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی موبائل پر انٹرنیشنل رومنگ نہیں کھلی ہے اس لئے اس پر رابطہ نہیں سکے گا۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ''میں اپنی آنٹی فرحت کے ہاں سے بول رہی ہوں۔ پپا کو یہا سینٹ جان ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ نیورو سرجنز نے کچھ امید تو دلائی ہے دیکھیں کیا بنتا ہے۔ تم سناؤ، کیسے ہو؟.........آنٹی کیسی ہیں؟ میرا ان سے سلام کہنا۔''

''ہاں.........وہ بھی بالکل ٹھیک ہیں۔'' میں اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر بہ مشکل قابو پا ہوئے بولا۔ ''خدا کا شکر ہے تم خیریت سے ہو۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ، کتنے روز لگیں تمہیں وہاں؟'' میں نے آخر میں پوچھا۔

''ابھی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''بس تم اپنا خیال رکھنا نادر! میری فکر نہ کرو۔''

''ہاں.........'' میں نے مختصراً کہا۔ ماں کی موجودگی کے باعث میں اس سے زیادہ کھل کر گفتگو نہ کر پا رہا تھا اور شاید نگینہ نے بھی یہ بات میرے لہجے اور میری بے تابانہ گفتگو کی بے ربطی سے محسوس کر لی تھی، بولی۔

''کیا آنٹی تمہارے آس پاس ہیں؟''

''ہاں۔'' میں نے پھر مختصراً جواب دیا اور اچانک اس سے بولا۔ ''نگینہ! تم اپنی آنٹی فرحت کا ٹیلی فون نمبر مجھے دے دو۔ میں اسی نمبر پر بات کر لیا کروں گا۔''

''میں گھر پر تو کم ہی ہوتی ہوں۔ زیادہ تر ہسپتال میں پپا کے پاس ہوتی ہوں۔ خیر، میں آنٹی کے نمبر کے ساتھ ہسپتال کا نمبر بھی دے دیتی ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر نمبر بتانے لگی۔ میں نے اپنے موبائل دونوں نمبر نوٹ کر لئے۔ اس کے بعد نگینہ نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ میں چند ثانیے گم صم کھڑا رہا۔ نگینہ کی مدھر آواز میرے دل و دماغ میں کئی لمحات تک گونجتی رہی۔ اس کے بعد اچانک پھر ماں کی یہاں موجودگی کا خیال آیا اور پھر میں ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے ریسیور رکھ کر ماں کے پاس رکھی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

ماں کی سپاٹ مگر سرایت کرتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر جیسے گڑ کر رہ گئی تھیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''کیا کہہ رہی تھی نگینہ؟'' معاً ماں نے پوچھا۔ میں نے مختصراً ان کے کام کی بات بتا دی۔ وہ چند ثانیے کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہنے کے بعد جیسے مجھے ''ہدایات'' دیتے ہوئے بولیں۔

''نگینہ سے رابطے میں رہنا۔ تاکہ ہمیں یہ معلوم ہوتا رہے کہ شاہ میر زندگی سے کتنا دور اور موت سے کس قدر قریب ہے؟''

''اچھا ماں!'' میں نے مختصراً کہا۔ آتش دان میں شعلے چیخ رہے تھے۔ پھر چند ثانیوں کی دم بہ خود خاموشی کے بعد ماں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''نادر بیٹا! ہمیں اپنے دشمن نظر حیات پر بہت جلد ایک اور فیصلہ کن وار کرنے کا سنہری موقع ملا ہے۔'' ماں کے لہجے سے جوشِ غیظ کی تپش مترشح تھی۔ ماں کی طرف سے اچانک موضوع بدلتے ہی میں ان کی گفتگو میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا اور نظر حیات کے ذکر پر ماں کی زبانی کسی سنہری موقع کا سنتے ہی ایکا ایکی میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ ماں نے مزید بتایا۔ ''وہ مردود پرسوں دوپہر میں کسی وقت پنڈی سے یہاں نتھیا گلی میں مقیم اپنے ایک ٹھیکے دار دوست کے ہاں پہنچنے والا ہے۔ وہ دونوں برفانی لومڑیوں کے شکار کی غرض سے بٹ راس اور کمال بن کے گھنے جنگلات جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''ماں! یہ تو بہت اہم خبر ملی آپ کو۔'' میں نے بے اختیار جوشِ مسرت سے کہا۔ ''لیکن ماں! یہ اہم اطلاع آپ کو کس نے دی ہے؟''

ماں نے اچانک میری بات کاٹ کر کہا۔ ''اعظم خان کے آدمی وزیر خان نے۔''

''اسے اتنی اہم خبر کیسے ملی؟''

''اتفاق سے نظر حیات کے ٹھیکے دار دوست کے ایک آدمی سے باتوں باتوں میں اسے اس بات کا علم بس اتفاقاً ہی ہوا تھا اور اس نے فوراً ہی یہ خبر اعظم خان تک پہنچا دی۔''

''نظر حیات کے ٹھیکے دار دوست کا نام؟'' میں نے کسی دھڑکتے خیال کے تحت پوچھا۔

''رب نواز۔''

''کیا.........؟'' میں اس نام پر بری طرح چونکا۔

''کیا تم اسے جانتے ہو؟'' میرے ردِعمل پر ماں نے بھی قدرے چونک کر پوچھا تو میں نے زیادہ تفصیل میں جانے کی بجائے صرف اس قدر ہی بتانا مناسب سمجھا کہ اس سے میرے بھی کاروباری روابط رہ چکے تھے، وغیرہ۔

''کیا تمہیں اس کی رہائش گاہ کا علم ہے؟'' ماں نے پوچھا تو میں نے جواباً اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''ہاں ماں!''

''تو بس ٹھیک ہے پھر۔'' ماں نے اچانک پُرجوش قطعیت سے کہا۔ ''ہمیں پرسوں صبح ہی سے ٹھیکے دار رب نواز کی رہائش گاہ کا محاصرہ کرنا ہو گا۔ اور جیسے ہی وہ دونوں روانہ ہوں، ہمیں ان کا تعاقب کر کے راستے میں ہی نظر حیات کو جہنم واصل کرنا ہو گا۔''

''میرے ذہن میں ایک اور طریقہ بھی آتا ہے ماں!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو ماں مستفسرانہ نگاہوں سے میرا چہرہ تکنے لگیں۔

''نظر حیات جیسے خطرناک دشمن کو ہلاک کرنے کے لئے ہمیں تعاقب کا رسک لئے بغیر پہلے سے جال بچھا کر گھات لگانا زیادہ بہتر ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ہم پہلے سے بٹ راس یا کمال بن کے جنگل

میں کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر گھات لگائیں تو ہمیں شکار کو پھانسنے میں زیادہ آسانی ہو گی۔"

میری بات پر ماں کچھ سوچ میں پڑ گئیں۔ اس کے بعد بولیں۔

"یہ ہمارا ایک غیر تسلی بخش عمل ہو گا۔ گھات لگانے سے پہلے یہ تسلی کرنا زیادہ ضروری ہے کہ وہ وقت اور کہاں کا رخ کرنے والا ہے۔ اس لئے بہتر طریقہ تعاقب کے سوا مجھے نظر نہیں آتا۔"

"لیکن ماں! یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ اگر یہ کام مکمل طور پر میری صوابدید پر چھوڑ دیں تو میں اور بہت جلد اس اہم کام کو نمٹا لوں گا۔"

"نہیں، شاہ میر کا اپنے ہاتھوں حشر خراب کر کے میرے سینے کی آگ کو جو تسکین حاصل ہوئی اب وہی تسکین میں خود اپنے ہاتھوں سے نظر حیات کی جان لے کر دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی جسے محسوس کر کے میں نے ہولے سے اثبات میں سر کو جنبش دی اور

"ٹھیک ہے ماں! جیسے آپ کی مرضی۔ میں تیار ہوں۔"

"میں نے اعظم خان کو اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ اپنے کچھ آدمی بھی میری مدد کو چاہتے تھے مگر میں نے صاف انکار کر کے ان سے کہہ دیا تھا کہ اپنے دشمن کو ٹھکانے لگانے کے لئے اور میرا بیٹا نادر ہی کافی ہے۔"

ماں کی اس بات پر میرا رواں رواں مسرت سے جھوم اٹھا۔

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا انکل اعظم خان سے۔ بلکہ میں تو اکیلا ہی کافی تھا۔ مگر آپ......" نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو ماں مسکراہٹ بھرے لہجے میں بولی۔

"میں جانتی ہوں نادر بیٹا! کم از کم نظر حیات کے معاملے میں تم مجھ سے بد دیانتی نہیں کر سکتے۔"

ماں کی اس بات پر اچانک میرے دل پر ایک گھونسہ لگا۔ انہوں نے یہ بات شاید اس لئے کہی تھی کہ وہ نگینہ کا باپ نہیں تھا۔ میں بدمزگی بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ ماں کی بات سے مجھے دکھ تو ہوا تھا مگر میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ماں نے بھی مزید کوئی بات نہ کی تھی۔ پھر ہم دونوں خاصی دیر بیٹھے آئندہ کی صورتِ حال پر غور کرتے رہے۔

اگلے دن صبح تک ہم ماں بیٹا ایک مضبوط اور مربوط لائحہ عمل ترتیب دے چکے تھے۔ مگر میں نے منصوبے کو مزید سرعت کے ساتھ انجام دینے کی غرض سے ماں کے علم میں لائے بغیر تھوڑی ترمیم کی۔ ذرا اپنے انداز سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے فوری طور پر ایک منصوبہ بنایا۔

ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد میں جیپ لے کر گرین لاج سے ٹال کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں جیپ کی رفتار میں نے ذرا ہلکی کرتے ہوئے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور کاشانہ سے رابطہ کیا۔

"ہیلو نادر! خیریت؟" دوسری طرف سے اس کی دل موہ لینے والی خوب صورت آواز ابھری۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی حیرت تھی۔ شاید اسے میرے اتنی جلدی دوبارہ رابطہ کرنے کی توقع نہ تھی یا پھر وہ سمجھی تھی کہ نگینہ کا فون آیا ہو گا اور اب میں اس کو مطلع کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ یہ کسی حد تک درست بھی تھا تاہم میں نے کہا۔ "ہاں! خیریت ہی ہے۔ تم سے ایک بات کرنا تھی۔ بہت ضروری۔"

"ہاں، ہاں......کہو۔ کیا نگینہ کا فون آیا تھا امریکہ سے؟" حسب توقع اس نے میری اچانک کال کا یہی مطلب لیا تھا۔ تاہم میں نے اسے نگینہ کے فون کے بارے میں مختصراً آگاہ کرنے کے بعد کہا۔

"مگر میں نے تم سے کسی اور سلسلے میں بات کرنا تھی۔ پہلے یہ بتاؤ، اس وقت تم ہو کہاں؟ میرا مطلب ہے گھر پر ہو یا کہیں باہر؟"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں گھر پر ہی ہوں۔"

"تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"آ جاؤ......یا پھر میں آ جاتی ہوں تمہارے ٹال پر۔"

"نہیں، تم ایسا کرو، مری پارک میں آ جاؤ۔"

"ٹھیک ہے......آ جاتی ہوں۔" اس نے بلا توقف آمادگی ظاہر کی۔

"پھر ابھی نکل رہی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے گویا یقین دلانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے......میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر کے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ مری پارک زیادہ دور نہ تھا۔ مال روڈ پر ہی تھا۔ پہلے یہ "باغ شہیداں" کے نام سے موسوم تھا۔ مگر یہ بہت اجاڑ اور خود رو جھاڑیوں کا منظر پیش کرتا تھا۔ لیکن یہ بہت پہلے کی بات تھی۔ اب اسے نئے سرے سے بنایا گیا تھا اور عام مقامی لوگ اسے باغِ شہیداں کی بجائے مری باغ ہی کہنے لگے تھے۔ بہرطور میں سیدھا وہاں پہنچا تو تھوڑی دیر بعد ہی کاشانہ بھی اپنی کار میں وہاں آ پہنچی۔

"خیریت تو ہے نادر! کیا بات ہے؟" کار سے اترنے کے بعد کاشانہ نے مجھ سے پوچھا۔ اس نے اپنی کار میری جیپ کے قریب ہی کھڑی کر دی تھی۔ ہم باغ میں چہل قدمی کرنے لگے۔ میں نے جواباً اسے ماں کو ملنے والی اطلاع کے بارے میں بتا دیا جسے سن کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"یہ تو بڑا ہی حیرت انگیز اور سنگین اتفاق ہے۔" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ "خیر......رب نواز ان دنوں معمول کے مطابق لومڑیوں کے شکار پر جاتا تو ہے لیکن مجھے یہ علم نہ تھا کہ اس کا پرسوں ہی جانے کا پروگرام ہے اور وہ بھی نظر حیات کے ساتھ۔ چلو، یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ دونوں سے ایک ساتھ ہی نمٹنے کا تمہیں موقع مل جائے گا......لیکن......"

اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ "لیکن کیا؟"

"میرا خیال ہے نظر حیات کو ہلاک کرنے کی بجائے تمہیں میرے ہی مشورے کے مطابق اسے خوف زدہ کرنا چاہئے۔"

"لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا۔ کیونکہ یہ ماں کا منصوبہ ہے۔ اور سب سے پہلے اسے ہی یہ بات معلوم ہوئی ہے۔ میں ان کی مدد تو کر سکتا ہوں لیکن ان کے منصوبے میں کسی قسم کی "ترمیم" کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔ مگر رب نواز کا کیا کرو گے؟" اس نے پوچھا تو میں کہنے لگا۔

"وہ بھی زد میں آ سکتا ہے۔ لیکن ہمارا اصل شکار نظر حیات ہی ہو گا۔"

"نادر! نظر حیات کی موت سے تم ماں بیٹا مشکل میں بھی پھنس سکتے ہو۔ پولیس کا شک سیدھا تم ماں بیٹے کی طرف ہی جائے گا۔ ابھی شاہ میر والا مسئلہ بھی تازہ ہے۔ بے شک اس سلسلے میں حریف کی طرف سے کوئی قانونی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی مگر اب بقول تمہارے نظر حیات کا بیٹا کبیر بھی واپس آ چکا ہے۔ لہٰذا گڑبڑ کا امکان سو فیصد ہے۔"

"کوئی ثبوت چھوڑیں گے تو پکڑے جائیں گے نا۔" میں نے کہا۔

"کچھ بھی سہی، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی معمولی سی غلطی یا بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولی۔

"لیکن اب کیا، کیا جا سکتا ہے؟ ماں کو سمجھانے بجھانے کی پوزیشن میں تو ویسے میں نہیں ہوں۔ یہ بات بھی انہوں نے جانے کیسے مجھے بتا دی ہے۔ ورنہ تو نگینہ والے معاملے کے بعد سے ماں نے تو اشار کنایوں میں مجھے شاہ میر اور نظر حیات والے معاملے سے ہی الگ کر دینے کی دھمکی دے ڈالی تھی۔ اگر میں نے کوئی ذرا سی بھی آنا کانی کی یا بحث کرنے کی کوشش کی تو ماں کے دل میں میرے خلاف غلط مزید تقویت حاصل کر لے گی۔ لہٰذا اب میرے لئے بھی ماں کے دل سے اپنے خلاف غلط فہمی دور کر ایک سنہری موقع ہے جسے میں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا۔ بلکہ ماں نے تو یہ بات مجھے بتاتے ہو اور مجھے اس مہم میں شامل کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں یہ بھی کہا تھا کہ "نادر بیٹے! مجھے یقین ہے کہ از کم نظر حیات والے معاملے میں مجھ سے بددیانتی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ نگینہ کا باپ نہیں ہے۔"

"ہوں......... تمہاری بات درست ہے۔ بہرحال مجھے بتاؤ، میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد کر ہوں؟" اس نے استفساریہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تم فقط اتنا کرنا کہ نظر حیات کی آمد پر مجھے بروقت اطلاع کر دینا اور ان دونوں شیطانوں پروگرام پر ذرا نظر رکھنے کی کوشش کرنا تاکہ یہ بات کنفرم ہو جائے کہ ان لوگوں کا شکار پر جانے کا پرو پرسوں کا پکا ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے......... اتنا تو میں کر ہی سکتی ہوں۔" کاشانہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

ہم دونوں ذرا دیر باغ میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے چہل قدمی کرتے رہے۔ میرے اور نگینہ وا معاملے کے سلسلے میں اس کی دلچسپی اور درپردہ مشاورت و گفتگو نے مجھے اس کی ہمراہی میں رہنے پر کر دیا تھا۔ ہم نے کافی پی، اس کے بعد ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر لوٹنے لگے۔ کاشانہ دوسرے سے کار نکال لے گئی۔ اور میں جیپ کی طرف پلٹنے لگا تو اچانک مجھے محض چند قدموں کے فاصلے پر ک تیز قدموں سے ایک طرف جاتا دکھائی دیا۔

اسے دیکھ کر میرے ذہن میں کل سہ پہر کا واقعہ تازہ ہو گیا جب میں لنچ کرنے کے بعد کاشا رہائش گاہ سے نکل رہا تھا اور مجھے کوئی شخص تیزی کے ساتھ سامنے کی گھنی جھاڑیوں میں گھستا نظر آیا اب اس وقت کبیر کو یوں اچانک جاتا دیکھ کر یونہی میرا خیال اس طرف چلا گیا تھا اور مجھے لگا کہ اس اس سے کچھ نہ کچھ تعلق تھا۔ کیا خبر یہ وہی ہو۔ تیز تیز چلنے کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ تھوڑ پہلے وہ یہاں موجود تھا اور میری اور کاشانہ کی حرکات و سکنات کو نظروں میں لئے ہوئے تھا۔ اتنا تو یقین تھا کہ وہ میری اور کاشانہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکا ہو گا۔ تاہم اس مقام پر موجودگی خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی۔ دل میں تو آئی کہ اسے آواز دوں۔ مگر پھر یہ سوچ سکتا ہے وہ میرا وہم ہو اور کبیر اپنے ہی کسی کام سے یہاں آیا ہو۔ وہ گیٹ سے نکل کر باہر غائب تھا۔ میرا ذہن الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ بہرطور میں نے اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ٹا طرف روانہ ہو گیا۔ ٹال پہنچا تو سارے مزدور ایک جگہ اکٹھے مجمع کی صورت کھڑے تھے۔ منیجر مشتا ان کے درمیان موجود تھا۔ اس کے چہرے سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں جیسے ہی جیپ سے ا ہانپتا کانپتا میری جانب بڑھا۔

"دسن......... سر جی! وہ غضب ہو گیا، جی کڑا کے!" میرے قریب آ کر اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا ہوا؟......... جلدی بتاؤ" میں نے اپنے دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہو


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیز لہجے میں پوچھا۔

"سر جی! ہمارا لاکھوں کا مال چوری ہو گیا۔" اس نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

"کس طرح؟......... کون سا مال؟" میں جیسے ایک جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے بولا۔

"سر جی! ہم نے آج صبح ہی صبح تڑکے "دیدہ زیب فرنیچر مارٹ" والوں کو شیشم اور شاہ بلوط کے جو تین ٹرک روانہ کئے تھے، وہ راستے میں ہی اُڑا لئے گئے۔"

"کیا؟......... تت......... تمہیں کیسے پتہ چلا؟ ......... پھر تو چوری نہ ہوئی، ڈکیتی کی واردات ہوئی۔" میرے جیسے اوسان خطا ہو گئے۔ کیونکہ ان ٹرکوں میں پورے نوے لاکھ مالیت کے شہتیر لدے ہوئے تھے اور آج صبح چھ بجے وہ ٹال سے لاہور کے لئے روانہ کئے گئے تھے۔

"سر جی! اندر آئیں۔ ایک ڈرائیور ہانپتا کانپتا یہاں پہنچا تھا۔ وہ خاصا زخمی ہے۔ میں نے اسے آپ کے آفس میں........." منیجر نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ میں گولی کی طرح اپنے آفس کی طرف لپکا۔ وہ ڈرائیور لمبی سی سیٹی پر دراز کراہ رہا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور ایک بازو میں کھپچیاں باندھ کر گلے سے جھولتی بینڈیج کی پٹی سے سپورٹ دے رکھی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا لال خان! یہ سب کیسے اور کب ہوا؟" میں نے اس سے پوچھا۔ وہ اکثر ہمارا مال لاتا، لے جاتا رہتا تھا۔

"صاحب جی! ہم جیسے ہی روانہ ہوئے تو بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر دس بارہ مسلح نقاب پوشوں نے ہمارے تینوں ٹرک روک لئے اور ہمیں گن پوائنٹ پر نیچے اتار دیا......... ہم نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو ہمیں بری طرح زخمی کر دیا گیا۔ میں خود بڑی مشکلوں سے جان بچا کر کسی سے لفٹ لے کر یہاں تک پہنچا اور سب سے پہلے ایک قریبی کلینک میں مرہم پٹی کروائی تاکہ خون بہنا بند ہو۔ اور پھر یہاں آ گیا۔"

میں نے بغور اس کی بات سنی اور پھر قریب کھڑے منیجر مشتاق سے کہا۔ "تم اسے لے کر سیدھا تھانے چلے جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں، یہ کس کی حرکت ہے۔"

یہ کہہ کر میں جیپ میں سوار ہو کر آندھی طوفان کی طرح روانہ ہو گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ حرکت ٹھیکے دار رب نواز اور اس کے غنڈے گگل خان کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ میرا رخ رب نواز کے آفس کی طرف تھا۔ میں آندھی طوفان کی طرح جیپ اڑاتا ہوا نواز ووڈ مرچنٹ کے دفتر پہنچا تو وہاں چوکیدار اور ایک چپڑاسی کے سوا کوئی نہیں ملا۔ میں نے چپڑاسی سے پہلے گگل خان کے بارے میں دریافت کیا۔ پھر چالاکی کے ساتھ اس کے گوداموں کا جائزہ لیا مگر مجھے اپنے مال کی ذرا بھی جھلک نہ دکھائی دی۔

وہاں سے میں جیپ میں سوار ہوا اور سیدھا ڈرائیور لال خان کے بتائے ہوئے پتے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اچانک مجھے کاشانہ کا خیال آیا۔ وہ ٹھیکے دار رب نواز کے گھر کی بھیدی تھی۔ رب نواز نے میری پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا اور میں اسے اچھی طرح سبق سکھانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے جیپ کی رفتار دھیمی کر کے موبائل پر کاشانہ سے رابطہ کر کے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ میری بات سن کر ایک لمحہ کو تو وہ جیسے سن ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر مضطرب لہجے میں بولی۔

"نادر! تم جوش میں آ کر ابھی کوئی ایسا ویسا قدم مت اٹھانا۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔ ویسے تمہاری طرح مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ یہ حرکت رب نواز اور گگل خان ہی کی ہو سکتی ہے۔" اتنا کہہ کر چند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



دوئم

ٹانیے تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ''تم مجھے تھوڑا سا وقت دو، میں کچھ کرتی ہوں۔ پھر تمہیں کال کر
دوں گی کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ تم میری کال کا انتظار کرنا۔''

اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں سیدھا ڈرائیور لعل خان کے بتائے ہوئے اس
پہنچا جہاں یہ واردات ہوئی تھی۔ وہاں چہار اطراف ویرانے کے سوا کچھ نہ تھا۔

البتہ ایک جگہ مجھے سڑک کے دائیں جانب ذرا دور اونچا سا ''ٹبہ'' نظر آیا جس پر سے دھواں
تھا۔ قریب ہی دھواں اُگلتی چمنی بھی نظر آئی۔ یہ اینٹوں کا بھٹا تھا۔ میں جیپ لے کر فوراً کچے میں
اور سیدھا اینٹوں کے بھٹے پر پہنچا۔ وہاں سے میں نے مزدوروں سے معلوم کیا کہ انہوں نے تین
ٹرکوں کو کہیں نیچے کی طرف جاتے دیکھا تھا؟

''ہاں صاحب! ابھی دو ڈھائی گھنٹے پہلے ہی کی بات ہے۔'' ایک مدقوق سے مزدور نے پُرجوش
میں بتایا۔ ''وہاں سامنے سڑک پر تین ٹرک تھوڑی دیر تک تو رکے رہے، پھر سڑک کی دوسری طرف
کچے علاقے میں اتر گئے تھے۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے جیپ میں سوار ہو کر واپس سڑک کی طرف پلٹا اور
کے بتائے ہوئے مقام پر مجھے ایک خاصا چوڑا مگر کچا اور بل کھاتا راستہ ترائی میں جاتا نظر آیا۔
راستے پر ہو لیا۔ میرے دائیں بائیں چیڑ، صنوبر اور دوسری اقسام کے درخت ایستادہ تھے۔ ذرا نیچے
کے بعد میں رک گیا اور جیپ سے اتر کر کچے میں رکوع کے بل جھک کر کچھ دیکھنے لگا۔ میری
سننے لگیں۔ یہاں ٹرک کے چوڑے ٹائروں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ میں فوراً دوبا
میں سوار ہوا اور آگے روانہ ہو گیا۔

میں نیچے ترائی میں اتر گیا تھا۔ یہ کچا راستہ شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتا جا رہا تھا
جنگلوں کے درمیان سے بل کھاتا ہوا دور تک جاتا نظر آ رہا تھا۔ راستہ کچا اور بھربھری مٹی والا ہو
باعث ٹرک کے ٹائروں کے نشانات بہت واضح نظر آ رہے تھے۔ نصف گھنٹے بعد برف پوش پہا
وادی بہت قریب محسوس ہونے لگی۔ ایک مقام پر مجھے آبادی کے آثار نظر آئے۔ میں نے جیپ
مزید بڑھا دی۔

کاشانہ نے ابھی تک وعدے کے مطابق مجھ سے دوبارہ سیل فون پر رابطہ نہیں کیا تھا۔ جب
کی ڈھلوانی چھتوں والے گھروں کے جا بجا بکھرے ہوئے سلسلے قریب آنے لگے تو میں نے ایک
نما چائے خانے کے قریب جیپ لے جا کر روک دی اور وہاں موجود چند گاہکوں کو چھوڑ کر ہوٹل
سے تین ٹرکوں کے بارے میں دریافت کیا تو ایک نوعمر بیرے نے بتایا کہ تین ٹرک یہاں سے
تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آگے روانہ ہو گیا۔

خاصی دور جا کر کچا راستہ قوس کی صورت میں بائیں جانب گھوم رہا تھا۔ میں نے جیسے ہی
جانب موڑی تو اچانک مجھے اس راستے سے لمبا اور کچا راستہ بائیں جانب جاتا دکھائی دیا۔ میں
کی خاطر جیپ روک کر نیچے اتر گیا اور جھک کر ٹائروں کے نشانات دیکھنے لگا تو یہ نشانات مجھے
پر آگے جانے کی بجائے مذکورہ بائیں جانب دوسرے راستے پر گھومتے دکھائی دیئے۔ یہ راستہ
مگر ٹرک یہاں سے جا سکتا تھا۔ البتہ سامنے سے آنے والی کسی دوسری گاڑی کو راستہ نہیں دے
بہرطور میں اس راستے پر ہو لیا۔ قریباً کوئی پندرہ سولہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد
جانب سرسبز میدان نظر آیا۔ اگرچہ یہاں بھی صنوبر، چیڑ کے درخت ایستادہ تھے مگر ان کی تعداد



دوئم

یک ہی مجھے اپنی داہنی طرف ذرا دور ایک طرف بڑی سی ڈھلوانی چھت والی مستطیل چوبی عمارت نظر
آئی اور سب سے اہم بات جس نے بے اختیار میری رگوں میں خون کی گردش تیز کر دی تھی، وہ یہ تھی کہ
ٹرک کے ٹائروں کے نشانات اسی سمت مڑ رہے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر جیپ وہیں جھاڑیوں کے جھنڈ
میں روک دی اور نیچے اتر آیا۔ میرا میگارد حسب معمول میرے پاس موجود تھا مگر فاضل راؤنڈ میرے پاس
نہیں تھے۔ سردست میرے لئے یہی کافی تھا۔

میں جیپ سے اتر کر درختوں اور اوک اور سلورفر کی جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا مذکورہ عمارت کی طرف
بڑھنے لگا۔ ذرا قریب پہنچا تو یکلخت میری کنپٹیوں پر خون اچھال مارنے لگا۔ عمارت کے باہر سرمائی دھوپ
میں چار پانچ افراد کرسیوں پر بیٹھے چائے پیتے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان میں لمبے چوڑے وجود
والا جسیم، گگل خان بھی تھا۔ میری عقابی نظریں اوک کی گھنی جھاڑیوں کے عقب میں عمارت کا جائزہ لینے
لگیں مگر میرے دل و دماغ میں یکایک ہونے والی ہلچل کی اصل وجہ عمارت کے سامنے کھڑے وہ تین
ٹرک (چھ ٹائروں والے) تھے جن میں سے مسروقہ مال اتارا جا رہا تھا۔ مجھے یہ عمارت گودام ٹائپ
نظر آ رہی تھی جس میں مجھے تین بڑے بڑے دیو ہیکل گیٹ نظر آ رہے تھے۔ پندرہ سولہ مزدور میرے
چوری شدہ ٹرکوں سے بڑے شہتیر اٹھا کر اندر گودام میں لے جا رہے تھے۔

اس دیدہ دلیری پر میرا پورا وجود قہر و غضب کے مارے جلنے لگا۔ اب تو مجھے پورا یقین ہو چلا تھا کہ
مردود گگل خان نے اپنے گرو رب نواز کے ہی ایما پر اپنے چاروں ساتھیوں کی مدد سے میرے تین ٹرک
چوری کر کے یہاں تک پہنچائے تھے۔

گودام کی پیشانی پر سیاہ رنگ کے بڑے بڑے حروف سے ''نواز ووڈ مرچنڈائز'' لکھا ہوا تھا۔ میں
نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فوراً ہی اپنی جیب سے زوم لینس کیمرے والا موبائل سیٹ نکالا اور تقریباً
نصف گھنٹے تک وہیں جھاڑیوں میں دبکا ان کی مووی بناتا رہا۔ میں نے وہاں موجود گگل خان سمیت اس
کے پانچوں قریبی ساتھیوں اور مزدوروں کے چہروں کو اور اپنے ٹرکوں، ان کی نمبر پلیٹس کے علاوہ گودام کی
پیشانی پر لگے ''نواز ووڈ مرچنڈائز'' کے حروف کو بھی اچھی طرح فوکس کرنے کے بعد مووی کو محفوظ کر ڈالا۔
میرا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اس دوران میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ کاشانہ کی کسی وقت بھی کال آ سکتی ہے اور مجھے پہلے ہی سے
احتیاطاً اپنے موبائل کی ٹون آف کر کے وائبریٹنگ الرٹ پر سیٹ کر دینی چاہئے تھی۔ مگر اس کا وقت نکل
چکا تھا اور میرا فون گنگنا رہا تھا۔ گودام سے میرا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ میرے موبائل کی رنگ
ٹون اس خاموش ماحول میں بم دھماکے کی طرح گونجی۔ گگل خان اور اس کے پانچوں ساتھی اس آواز پر
یوں اچھلے جیسے انہیں بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ میں نے موبائل آف کر دیا اور اپنی جیب سے میگارد نکال کر
ہاتھ میں پکڑ لیا اور تیزی کے ساتھ جھاڑیوں میں دائیں جانب رینگتا چلا گیا۔

ادھر گگل خان نے بھی فوراً پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور اپنے پانچوں ساتھیوں سمیت دوڑتا
ہوا اس سمت بڑھا جہاں ذرا دیر پہلے میں چھپا بیٹھا تھا۔ ان پر اس وقت خون سوار تھا۔ یہ لوگ کیونکہ رنگے
ہاتھوں پکڑے گئے تھے، اس لئے ممکن تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔ میں دشمنوں کو گھیرنے کی
خاطر مزید گھنی جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ وہ لوگ بھی جھاڑیوں میں گھسنے لگے۔ گگل خان نے تو اب
اپنا خونخوار اور پھٹی پھٹی وحشیانہ آواز میں دھاڑنا بھی شروع کر دیا تھا۔

''کون ہے؟..... باہر نکل آؤ..... ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔''

دوئم

مگر میں ایک جگہ گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ گگل خان کے پانچوں ساتھی اس کی ہدایت پر دو اطراف میں پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر میں سب سے پہلے گگل خان پر قابو پانا چاہتا تھا۔ اور پھر جیسے ہی وہ ذرا قریب آیا، میں چیتے کی طرح اس پر جھپٹا۔ سب سے پہلے میں نے اپنی لات اس کے پستول والے ہاتھ پر رسید کر ڈالی۔ پستول اس کے ہاتھ سے طوطے کی طرح اُڑ گیا۔

پھر جب تک وہ سنبھلتا، میں نے اس پر اپنا میگارد تان لیا اور غرا کر بولا۔ ''خبردار! کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ.....'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میری کمر پر کسی نے زوردار لات رسید کر دی۔ یہ اچانک اور پشت پر حملہ تھا۔ میں مار کھا گیا اور جھاڑیوں میں گرا۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گرتے ہی میں نے سنبھلنے کی کوشش کی تو گگل خان اور اس کے دو ساتھی مجھ پر بیک وقت پل پڑے اور مجھے قابو کر لیا۔ گگل خان نے اپنا اور میرا پستول تلاش کر کے اپنے قبضے میں کر لیا اور میری طرف کینہ توز نظروں سے گھورنے لگا..... اُس کے بدہیئت ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''لے چلو اسے۔'' اس نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ تب تک اس کے باقی تین ساتھی بھی وہاں آن دھمکے تھے۔ مجھے جھاڑیوں سے نکال کر باہر گودام کے سامنے والی کھلی جگہ پر لایا گیا۔ باقی مزدور بھی اپنا کام چھوڑ کر ہماری طرف ہی متوجہ تھے۔

''تم لوگ اپنا کام کرو، جلدی۔'' گگل خان نے مزدوروں کو جھڑکا۔ یہ بھی انہی کے زرخرید کتے لگتے تھے۔ وہ فوراً اپنے کام میں جت گئے۔ گگل خان نے اپنے تین آدمیوں کو وہیں مزدوروں سے مال اتروانے پر کھڑا رہنے کی ہدایت کی اور پھر باقی دو ساتھیوں کو لئے گودام کے اندر نسبتاً کشادہ ہال کمرے میں لے آیا۔

یہاں دو تین کھری چارپائیاں اور لکڑی کی تین بینچوں کے علاوہ چند کرسیاں بھی دھری ہوئی تھیں۔

''گگل خان! تم نے میرے ٹرک چوری کرنے کی جرأت کیسے کی؟'' میں نے مفتوح ہونے کے باوجود سامنے کھڑے گگل خان سے گرج دار آواز میں کہا۔ مگر وہ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں سے تحکمانہ انداز میں بولا۔

''اس کی تلاشی لو ..... اور جو بھی شے برآمد ہو اسے اپنے قبضے میں کر لو۔'' اس کی بات پر میں پریشان ہو گیا۔ تلاشی لینے کی صورت میں میری جیب سے مووی کیمرے والا موبائل برآمد ہو سکتا تھا اور گگل خان جیسا گھاگ انسان کھٹک سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر جارحانہ مزاحمت کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ گگل خان کے ہاتھ میں اس کا اپنا پسول تھا۔ جبکہ میرا میگارد اس کی جیب میں منتقل ہو چکا تھا۔ باقی وہاں موجود اس کے دو آدمی نہتے تھے اور وہی دونوں میری تلاشی لینے کو آگے بڑھے۔

''اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' گگل خان نے اچانک ہی مجھے درشتی سے حکم دیا اور میں اسے جلتی سلگتی نظروں سے گھورتا ہوا دوسری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اس خطرناک سچویشن کا اندازہ لگایا اور پھر جیسے ہی وہ دونوں میری تلاشی لینے کے لئے بڑھے، میں کسی طوفانی بگولے کی مانند حرکت میں آیا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ایک کے پیٹ میں لات رسید کرتے ہی، دوسرے کو دھوبی پٹڑے کے انداز میں قریب ہی کھڑے گگل خان کی طرف دھکیل دیا کہ وہ مجھ پر فوری طور پر گولی بھی نہ چلا سکے..... وہی ہوا۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ اُلجھ کر رہ گیا۔ پھر جب تک دونوں سنبھلتے، میں نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ گگل خان پر جست لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا گودام کے پکے فرش پر آ رہا۔ اس کا سر سیمنٹ کے پختہ بلاک سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے زخمی بیل جیسی ڈکراہٹ ابھری۔ میں نے آناً فاناً اس کے پستول پر قبضہ جمایا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے دونوں ساتھی مجھ پر بیک وقت پل پڑے۔ مگر اب میں ان کے قابو میں آنے والا کہاں تھا۔ جیسے ہی ایک نے مجھے عقب سے دبوچنا چاہا اور دوسرے نے میرے پستول والی کلائی کو تھاما، میں نے بائیں بازو کی کہنی سب سے پہلے خود

کو پشت سے دبوچنے والے دشمن کے پیٹ میں رسید کی۔ وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' کی بھیانک کراہ
چیخ خارج کر کے پیچھے لڑھک گیا۔ پستول پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنے والے کو میں نے سوئپ کے
میں ٹانگ جڑ دی جو اس کی گردن پر لگی۔ وہ بھی پرے لڑھک گیا۔ جبکہ پستول ذرا پرے سرک گیا۔
اٹھ کر اسے اٹھانے کے لئے لپکا تو نیچے پڑے گگل خان نے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں منہ کے بل فرش
آ رہا مگر فوراً ہی اپنا چہرہ یا پیشانی فرش کی ٹکر سے بچانے کی غرض سے میں نے دونوں ہاتھ فرش پر
دیئے اور یک بیک فرش سے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹانگ گگل خان کے منہ پر جڑ دی۔ وہ ایک
پھر بھیانک ڈکراہٹ کے ساتھ دور جا گرا۔ میں نے لپک کر اس کا پستول اٹھا لیا اور سیدھا کھڑا ہو کر
پر تان لیا۔ مگر اس اثناء میں گگل خان بھی غیر متوقع پھرتی کے ساتھ کام لیتے ہوئے جیب سے
پستول نکال کر مجھ پر تان چکا تھا۔ یہ میرا ہی چھینا ہوا میگارد تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اس کے پاس میرا اور میرے پاس اس کا پستول تھا اور ہم دونوں
وقت ایک دوسرے پر پستول تانے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھا جانے
نظروں سے ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے۔ اس کے دونوں ساتھی بھی اس کے دائیں بائیں
کھڑے ہانپ رہے تھے۔

''میری نظریں تمہارے پستول کے ٹرائیگر پر جمی انگلی کی ذرا سی جنبش پر ہیں گگل خان!'' میں
گھورتے ہوئے بولا۔ مگر اس بدبخت نے فوراً ایک جانب جست بھر کے گولی چلا دی۔ مگر میں بھی
نہیں تھا میرے حواس پوری طرح چوکنے بلکہ بھڑکے ہوئے تھے لہٰذا جیسے ہی گگل خان نے جست
مجھ پر گولی چلائی، میں پہلے ہی بائیں جانب چھلانگ لگا چکا تھا۔ نتیجتاً اس کا نشانہ تو خطا چلا گیا مگر مجھے
کرنے کے بعد میں اور بر وقت موقع ملا گولی ٹھیک گگل خان کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول
کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کا ہاتھ چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی اور
زخمی ہاتھ پکڑے بری طرح کراہنے لگا۔ اس کے دوسرے ساتھی کو پستول کی جانب حرکت کرنے کی
نہ ہو سکی اور میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنا میگارد اٹھا لیا اس اثناء میں اس کے دیگر تین ساتھی
اندر داخل ہو گئے تھے۔

''کوئی حرکت نہیں کرے گا..... ورنہ سب کو بھون ڈالوں گا۔'' میں نے دونوں پستول ان پر
ہوئے وحشیانہ غراہٹ سے کہا۔ پھر ان سب کو ایک کونے میں گگل خان سمیت اکٹھا کر کے کھڑا کر
خود تیزی سے باہر نکلا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے گودام کے الگ تھلگ ہال کمرے سے باہر آ
مزدوروں نے جو مجھے اس حالت میں دیکھا تو وہ شہتیر ڈھوتے ہوئے یوں رک گئے جیسے چابی
کھلونے چابی ختم ہونے پر رک جاتے ہیں۔ میں نے ان سے چلا کر کہا۔

''یہ چوری کا مال ہے۔ تم لوگوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ جتنا سامان اتارا ہے اسے فوراً واپس
جلدی۔''

وہ لوگ ڈر گئے۔ لہٰذا فوراً انہوں نے میری ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اس وقت
کھڑے موبائل پر کاشانہ سے رابطہ کر کے اسے ساری حقیقت بیان کر ڈالی۔ پھر اعظم خان اور ما
رابطہ کر کے ساری صورت حائل سے آگاہ کیا اور یہاں کا اتہ پتہ بھی سمجھا دیا۔

سب سے پہلے انکل اعظم خان نے متعلقہ تھانے فون کر کے فوری طور پر میری مدد کے لئے پو
نفری روانہ کروا دی جنہوں نے آتے ہی گگل خان اور اس کے پانچوں ساتھیوں کو گرفتار کر لیا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک گھنٹے کے اندر اندر اعظم خان اور ماں بھی وہاں کار میں آن پہنچے۔ ان کے ہمراہ بھی پولیس کی اچھی خاصی نفری تھی۔ اس پولیس کا تعلق میرے مری ٹال والے تھانے سے تھا جہاں متاثرہ ڈرائیور لال خان نے منیجر مشتاق کے ساتھ میری ہدایت پر تھانے جا کر تینوں ٹرک چھینے جانے کی رپورٹ درج کروائی۔

مزید اگلے ڈیڑھ گھنٹوں کے اندر اندر ساری ضابطے کی کارروائی نمٹا دی گئی اور ٹھیکے دار رب نواز کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے۔ ماں نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے اپنے گلے سے لگا کر میری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ ماں کی آنکھوں اور چہرے پر اپنے لئے بے پناہ فخر و انبساط کے تاثرات دیکھ کر میرا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔

''مگر بیٹا! ہمیں ایک نقصان ضرور ہو گیا۔'' ماں نے اچانک گہری اور الجھن آمیز سنجیدگی سے کہا۔ ہم اس وقت گرین لاج میں ہی تھے۔ میں ماں کی اس پُرتشویش بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ یعنی اس واقعے اور ٹھیکے دار رب نواز کے وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد نظر حیات اور ان کا ''بٹ راس'' اور ''کمال بن'' جا کر برفانی لومڑیوں کا شکار کرنے کا پروگرام ملتوی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے بڑے رسان سے کہا۔

''ماں! آپ اس کا غم نہ کریں۔ میری نظریں اصل شکار پر مرکوز ہیں۔ نظر حیات کب تک بچے گا۔ یہ درست ہے کہ اب شاید اس کا لومڑیوں کے شکار پر جانے کا پروگرام ملتوی ہو جائے۔ لیکن.....''

''لیکن..... یہ بھی تو ہو سکتا ہے، وہ خود اکیلا ہی نکل جائے۔'' ماں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''میری معلومات کے مطابق سال میں ایک بار لومڑیوں کے سالانہ شکار پر نظر حیات کا جانا محض شوق یا مشغلہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کا کاروبار بھی ہے۔ برفانی لومڑیوں کی کھالوں کی بہت مانگ ہے اور نظر حیات اپنی ٹیم کے ساتھ ہر سال باقاعدگی سے جاتا ہے اور ڈھیروں لومڑیوں کا شکار کرتا ہے پتہ نہیں اس بار وہ ٹھیکے دار رب نواز کو کیوں اپنی مہم میں شامل کرنا چاہ رہا تھا۔ خیر، تم بھی نظر رکھو اور ہم بھی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ پرسوں کے پروگرام کو آج والے واقعے کی وجہ سے منسوخ نہ سمجھو۔''

''ٹھیک ہے ماں! میں سمجھ گیا۔'' میں نے پُرخیال لہجے میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ پھر موضوع کا روئے سخن نظر حیات سے ہٹا کر رب نواز کی طرف موڑتے ہوئے ماں سے بولا۔ ''ماں! آج والے واقعے کا ہمیں اب دہرا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں بس وکیل کوئی اچھا کرنا ہو گا۔'' یہ بتاتے ہوئے میں نے ماں کو اس ساٹھ لاکھ کے حوالے سے بھی ساری کہانی سنا ڈالی کہ اب یہ بہترین موقع تھا، اس پرانے کیس کو کھولنے کا۔ ماں نے اس سلسلے میں فوراً ہی انکل اعظم خان سے مل کر یہ کیس لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ابھی میں اور ماں گفتگو کر ہی رہے تھے کہ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ کال کاشانہ کی تھی۔

''واؤ..... فنٹاسٹک، نادر علی خان! تم واقعی نہ صرف ایک جینئس انسان ہو بلکہ دلیر اور بہادر بھی۔'' دوسری طرف سے کاشانہ کی چہکتی ہوئی آواز اُبھری۔

''ہاں کاشانہ!..... تم یہ بتاؤ، رب نواز پر کیا بیت رہی ہے اس وقت؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ماں کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''اس کا خیال ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے اور میں نے گھر کا بھیدی بن کر اس کی لنکا ڈھائی ہے۔''

''اچھا..... تو تم نے کیا جواب دیا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



"میں نے یہی کہا کہ کاش! یہ کام واقعی میری وجہ سے ہوا ہوتا۔"

"اوہ......... پھر تو وہ بری طرح سے تپ گیا ہوگا؟" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"کوئی ایسا ویسا........." اس کی خوشی سے معمور آواز اُبھری۔ "اس نے تو مما کو بھی میرے خلاف آگ بگولا کر ڈالا تھا۔ دونوں ہی پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ رب نواز سے تو مجھے کمینگی کی توقع تھی ہی، مگر نادر! مما بھی اس کے ساتھ مل چکی ہیں۔ مما نے مجھ پر بہت غصہ کیا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے کاٹ کر رکھ دیں۔" اس کی تھوڑی دیر پہلے چہکتی ہوئی آواز بھرانے لگی۔ اس میں دکھ کی رتیں بھرنے لگی تھی۔

"نادر!......... مما نے مجھے بہت لتاڑا۔ مجھے تو وہ میری مما محسوس ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ ایسا کیوں کیا مما نے میرے ساتھ؟......... میں رب نواز کی بیٹی نہیں، مگر مما کی تو سگی اولاد تھی۔ ان کی کوکھ سے جنم لیا تھا میں نے......... پھر......... پھر مما اس قدر مجھ پر غصہ کیوں ہوئیں؟ اور تو اور بعد میں سوری بھی نہیں کیا مجھ سے کہ میرا غم تو ہلکا ہو جاتا۔ ایسے میں نادر صاحب! مم......... مجھے اپنے پپا بہت یاد آئے......... بہت یاد آئے۔" یہ کہتے کہتے وہ بے چاری باقاعدہ رو پڑی۔ مجھے خود بھی دکھ ہوا۔ میں اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔

"کاشانہ! خود کو سنبھالو......... تم تو خود مجھے حوصلہ دیتی ہو، اب خود ہمت ہار رہی ہو۔ شاباش! ٹیک اِٹ ایزی۔ بہت باحوصلہ لڑکی ہو تم۔"

میرے سمجھانے بجھانے پر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھالا تاہم جب وہ بولی تو گہرے دکھ سے اس کا لہجہ اب بھی کپکپا رہا تھا۔

"نادر صاحب! جب قریبی رشتے کے لوگ ایسا رویہ اختیار کریں تو دکھ تو ہوتا ہی ہے۔ خیر......... میں خوش ہوں، رب نواز اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔"

"اچھا......... تم ایک بات بتاؤ کاشانہ!" میں نے آخر میں اچانک کسی خیال کے تحت کہا۔ "تمہیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے نا رب نواز سے یا پھر اپنی مما سے؟"

لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد کاشانہ بولی۔ "نہیں......... وہ بھلا میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ آپ کو نہیں معلوم، پپا میرے تحفظ کے لئے کیا کچھ کر کے گئے ہیں۔"

"اوکے، اوکے......... اچھا، بعد میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ اوکے، خدا حافظ!"

"خدا حافظ!"

"یہ کاشانہ کون ہے؟......... کیا رب نواز کی بیٹی ہے؟" ماں نے پوچھا تو میں نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

"ہاں ماں! مگر سوتیلی۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن اس نے کبھی رب نواز کو اپنا باپ تسلیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ اب تو اسے اپنی ماں سے بھی نفرت ہونے لگی ہے۔"

"کیا کاشانہ تمہاری اچھی خاصی دوست بن چکی ہے؟"

"ہاں......... بس اتفاقاً ہی دوستی ہو گئی تھی اس سے۔" میں نے کہا۔

"دوستی اتفاقاً ہو ہی جاتی ہے۔" ماں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "کبھی یہاں لے کر آؤ اسے۔ میں بھی تو دیکھوں اپنے بیٹے کی چوائس۔" ماں نے آخر میں میرے قریب آ کر میرے گال پر پیار لیتے ہوئے کہا۔ ماں کو خوش اور شوخ ہوتا دیکھ کر میں بھی کھل کر مسکرایا اور بے اختیار محبت سے لبریز



ہو کر میں نے ماں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ماں کی محبت بھری ممتا میرے رگ و پے میں جوش اور مسرت کی بجلیاں دوڑا رہی تھی۔ مجھے یک گونہ سکون اور قرار پہنچا رہی تھی۔ ماں نے بہت دکھ جھیلے تھے، بہت عذاب سہے تھے، بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ چاہے ہم دونوں ماں بیٹے کے درمیان نگینہ والے معاملے کی وجہ سے لاکھ بدمزگی ہوتی رہی ہو مگر ہم ماں بیٹے کی محبت میں کمی نہیں آئی تھی۔ ماں کے وجود سے مجھے بڑی روحانی خوشبو اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ ماں نے بھی اپنے دونوں بازوؤں کی سختی کو میرے پہاڑ جیسے وجود میں بڑھاتے ہوئے مرتعش آواز میں کہا۔

"نادر! میرے بچے! میں نے بہت تھوڑی خوشیاں دیکھی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے، تمہارے بہادر باپ قادر خان نے میرے ساتھ طوفانی محبت کی۔ ہم دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔ بہت نازاں و فرحاں۔ مگر ہماری اس محبت کی شادی کو صرف چھ سات ماہ ہی گزرے تھے اور تم اس دنیا میں آنکھ کھولنے والے تھے مگر تقدیر کی ستم ظریفی نے ہماری خوشیوں پر ایسا شب خون مارا کہ میں بیوہ ہو گئی اور اس پر بھی یہ ستم کہ مجھے شاہ میر اور نظر حیات جیسے زہریلے سانپوں نے میرے ہی شوہر کے قتل کے جھوٹے الزام میں جیل پہنچا دیا اور وہاں میں نے اپنی نوخیز جوانی کے تیئس سال گزار دیئے اور تمہیں بھی میں نے جیل کے سیلن زدہ ماحول اور ننگی اینٹوں والے فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جنم دیا۔ پھر میں نے تمہاری آس پر دشمنوں سے بھیانک انتقام لینے کی تپش میں جینا سیکھا۔ تم ہی میری پہلی اور آخری آس تھے۔ پھر جب میں نے تمہیں کڑیل جوان کے روپ میں دیکھا تو مجھے تمہاری صورت میں تمہارے بہادر باپ کی جھلک نظر آنے لگی۔ میرے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دینا میرے بچے!......... کبھی نہیں......... ورنہ......... ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔"

ماں میرے کاندھے پر سر رکھے بے اختیار رو دیں۔ آج پہلی بار میں نے ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور میرا دل بری طرح پسیج رہا تھا۔ ماں کے آنسو میرے سینے سے بھڑکتی ہوئی آتش انتقام پر تیل چھڑکنے کا باعث بن رہے تھے۔ میں نے ماں کو آہستگی سے علیحدہ کیا اور ان کے آنسو سے لبریز مگر پُرتپش اور غم زدہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جوش اور عزم سے معمور آواز میں بولا۔

"ماں! میں تیرا مان گھٹنے نہیں دوں گا۔ میں تیری خوشیوں کو غم میں بدلنے والوں سے بھرپور انتقام لوں گا۔ وہ وقت اب دور نہیں رہا ہے۔ بس تُو اپنے خون پر بھروسہ رکھ۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں دشمنوں کی نیندیں حرام کر کے رکھ دوں گا۔"

ماں نے اپنے آنسو پونچھے اور ہولے سے مسکرا کر بولیں۔ "تو پھر کاشانہ کو مجھ سے کب ملا رہے ہو؟"

"اسے بلانے کی دیر ہے، وہ کسی وقت بھی آ جائے گی۔" میں نے ہلکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ تاہم مجھے ماں کا کاشانہ کو گھر بلانے کا اصرار عجیب ہی محسوس ہو رہا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ نگینہ کی غیر موجودگی سے ماں خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ شاید آج ماں کا رویہ میرے ساتھ اسی امر کا ہی رہین منت تھا۔

❋ ❋ ❋

اگلے دن کا سورج اہم خبر کے ساتھ طلوع ہوا۔ ٹھیکے دار رب نواز کی ضمانت قبل از گرفتاری کی کوششیں ناکام ہوئی تھیں اور وہ گرفتاری سے بچنے کے لئے روپوش ہو گیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا کیس کمزور پڑنے لگا۔

ادھر نظر حیات کی طرف سے تازہ خبر انکل اعظم خان نے یہ دی تھی کہ اس کا کل کا شکار پر جا
پروگرام منسوخ تو نہیں ہوا تھا البتہ رب نواز کے مسئلے کی وجہ سے موخر ہو گیا تھا۔ تاہم میں بھی اپنی طر
سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نظر رکھنے سے مراد میری یہ نہ تھی کہ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پڑوی
رہتا تھا اور میں یہاں مری میں لیکن میں نے اس کا دوسرا طریقہ نکالا تھا۔ میں نے مختلف ناموں سے
چار موبائل کنکشن کی ''سم'' خرید رکھی تھیں اور میں اصل موبائل سم نمبر کی بجائے جعلی اور اجنبی نمبروں
نظر حیات کے گھر اور دفتر پر فون کرتا رہتا تھا۔ کبھی پی سی او سے جا کر رانگ نمبر کے بہانے، کبھی کسی
دوست کے بہانے۔ اس طرح مجھے پتہ لگتا رہتا تھا کہ وہ ابھی تک پنڈی میں ہی تھا۔ اس کے علاوہ
احتیاط کے پیش نظر میں نے اپنے ٹال کا ایک قابل اعتماد اور ہوشیار آدمی بھی نظر حیات کے پیچھے لگا
کہ تمہیں کبھی اچانک اس کا شکار پر جانے کا پروگرام بن جائے تو وہ مجھے فوراً اطلاع کر دے۔

میں اگلے دن ٹال پر پہنچا تو غزالہ کا فون آیا۔

''نادر! یہ تم کون سی خرافات میں پڑنے والے ہو؟'' اس نے جیسے چھوٹتے ہی کہا۔

''کیا ہوا غزالہ؟..... ایسا کیا کر دیا میں نے؟'' میں نے قدرے چونک کر اس سے کہا تو وہ بد
مضطربانہ سی متوحش آواز میں بولی۔

''وہ شیطان، اشفاق شاہین تم سے ملنے ٹال پر آیا تھا اور تم نے..... اوہ گاڈ! اب آگے بھی تم
بتانے کی گنجائش باقی ہے؟''

اس کی بات پر میں نے بے اختیار گہری سانس خارج کی مگر دوسرے ہی لمحے قدرے چونک کر
''مگر تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟''

''اس شیطان کے دو ایک چیلوں کو میں نے بھی اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ انہی کی زبانی مجھے علم
تھا۔'' وہ جواباً بولی۔

''میں اس طرح اسے زیادہ آسانی سے نابود کر سکوں گا۔ میں اس کے خلاف ثبوت اکٹھے کر
رنگے ہاتھوں اسے گرفتار.....''

''تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے نادر علی!'' غزالہ اچانک میری بات کاٹ کر بولی۔ ''مجھے بھی
خوش فہمی لے ڈوبی۔ اپنی بہن سپنا کے قتل کے بعد میں نے بھی تمہاری طرح یہی چال چلنے کی کوشش کی
مگر الٹا اس کے شیطانی جال میں پھنستے پھنستے بچی تھی۔ اب تو شاید وہ مجھ سے بالکل ہی مایوس ہو
خاموش بیٹھ رہا ہے۔ لیکن نادر!..... تم.....''

''تمہاری بات اور تھی۔'' میں اس کا اشارہ سمجھ کر قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''تم عورت تھیں
مرد ہوں۔ مجھ سے بھلا وہ شیطان کیا زبردستی کر سکتا ہے؟ میں اس کے درمیان میں رہ کر اس کی
کروں گا۔ تم بس خاموشی سے ایک طرف بیٹھی تماشا دیکھتی جاؤ۔''

''پلیز نادر! باز آ جاؤ..... تم اشفاق شاہین کو نہیں جانتے۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔'' غزالہ
اپنی بات پر اصرار جاری رکھا۔ تھوڑے توقف کے بعد میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم
خیریت سے ہو نا؟..... تم بتا رہی تھیں ابھی کہ اشفاق شاہین تم سے مایوس ہو کر بیٹھ رہا ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے کہا۔

''تمہیں کیسے علم ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''اشفاق شاہین کا ایک آلہ کار میرا قریبی دوست اور رازدار بن چکا ہے..... اس نے بتایا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اشفاق شاہین اور اس کے مقرب خاص غفورے کے درمیان میرے سلسلے میں ایک اہم میٹنگ ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ڈیلنگ کرنا چاہتے ہیں اس معاملے میں۔'' میں نے بتایا۔

''کیسی ڈیلنگ؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ غفورا مجھ سے ملنا چاہتا ہے تاکہ مجھ سے معاہدہ کر سکے کہ میں ان کے بارے میں منہ نہیں کھولوں گی۔'' اس نے بتایا۔ اس کے لہجے میں مسرت آمیز طمانیت تھی۔ مگر میں اس کی بات سن کر کھٹک گیا اور دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''تو پھر تم سے غفورے نے رابطہ کیا؟''

''نہیں..... وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''غزالہ! میری بات ذرا توجہ سے سنو۔ تمہاری جان خطرے میں ہے۔'' میں نے اچانک سرسراتے لہجے میں کہا اور دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

''ہیلو..... غزالہ! تم سن رہی ہو؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ہاں، ہاں..... سن رہی ہوں۔ تمہاری بات نے مجھے گنگ کر کے رکھ دیا تھا۔'' وہ بولی۔ اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ ''مم..... مگر تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟''

''اس لئے کہ تم میرے سامنے اشفاق شاہین کی اصلیت کے بارے میں منہ کھول چکی ہو اور یہ بات اسے میرے ذریعے سے ہی معلوم ہو چکی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا.....''

''مگر تمہاری بات اور ہے۔ وہ تو اب تمہیں بھی اپنا ساتھی سمجھنے لگے ہیں۔ اس اہم نشست میں اشفاق شاہین اور غفورے کے درمیان تمہارے سلسلے میں بھی گفتگو ہوئی تھی۔ انہیں تم سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''غزالہ! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم ان کی رازداں ہو۔ تمہیں بہرحال ان سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یا پھر تم ایسا کرو کہ یہ شہر چھوڑ کر چلی جاؤ۔'' میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا تو وہ گہرے لہجے میں بولی۔

''نادر! میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ اشفاق شاہین کا ایک اہم آلہ کار میرا رازدار بن چکا ہے جو غفورے کا بھی قریبی ساتھی ہے۔ اگر میرے سلسلے میں کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ مجھے ضرور بتاتا۔''

''اچھا..... یہ بتاؤ، تم اسلام آباد میں کہاں مقیم ہو؟'' میں نے آخر میں کسی خیال کے تحت پوچھا تو اس نے مجھے اپنی رہائش گاہ کا پتہ بتا دیا۔ یہ مکان اس نے کرائے پر لے رکھا تھا۔

''میں اور طارق بہت جلد یہ شہر ہی نہیں بلکہ یہ ملک بھی چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ طارق مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہے۔ بہت اچھا انسان ہے۔''

''کیا یہ وہی طارق ہے جو تمہارا رازدار اور اشفاق وغیرہ کا ساتھی ہے؟''

''ہاں۔''

''اچھا ٹھیک ہے..... مگر بہرحال تم محتاط رہنا۔''

''ہاں..... تم بے فکر رہو۔ طارق پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ وہ آج کل اشفاق شاہین اور غفورے کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا ہے تاکہ میرے سلسلے میں ذرا سی بھی کوئی خطرناک بات محسوس کرے تو مجھے فوراً خطرے سے آگاہ کرے۔'' اس نے پورے یقین اور فخر سے بتایا۔ اس کے بعد میں نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگا۔

میرا مسروقہ مال برآمد ہو چکا تھا اور اب رب نواز بری طرح قانون کی نظروں میں آ چکا تھا۔ کیونکہ

میں نے نہ صرف پورا مال برآمد کرا لیا تھا بلکہ مجرموں کو بھی گرفتار کروا لیا تھا۔ ان میں گگل خان اور اس کے پانچ ساتھی اہم تھے۔ باقی مزدوروں کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا تھا۔ کیس بہت مضبوط اور آسان تھا اس لئے جلد فیصلے کی توقع تھی۔ ٹھیکے دار رب نواز کو میں نے بری طرح گرفت میں لے رکھا تھا۔

اچانک میرے آفس کے ٹیلی فون سیٹ پر گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف ماں کی آواز پر میں ذرا چونک پڑا۔

''نادر بیٹا! تم مصروف تو نہیں ہو؟'' ماں نے پوچھا۔

''نہیں ماں! کچھ ایسا خاص مصروف نہیں ہوں۔ کیوں، خیریت؟''

''ہاں، خیریت ہی ہے۔ تم ذرا آ جاؤ۔''

''آ جاتا ہوں.........ویسے کیا بات ہے؟''

''بس آ جاؤ۔ تمہارے لئے ایک زبردست سرپرائز ہے۔'' ماں نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے ذرا حیرت سی ہوئی کہ ماں آخر مجھے کون سا سرپرائز دینا چاہتی ہیں؟ تاہم میں نے ریسیور رکھا اور منیجر مشتاق کو چند ہدایات دینے کے بعد اپنی جیپ میں سوار ہو کر سیدھا گرین لاج پہنچا تو وسیع احاطے میں مجھے ایک شناسا لمبی سی چمچماتی کار کھڑی نظر آئی جسے دیکھ کر ہی خود بخود میری آنکھوں کی روشنی میں اضافہ ہو گیا۔

یہ کاشانہ کی کار تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ماں مجھے کون سا ''سرپرائز'' دینا چاہتی تھیں۔ مجھے کاشانہ کے اچانک گرین لاج آنے پر حیرت ہی ہوئی ورنہ وہ مجھ سے ٹیلی فونک رابطہ کرتی تھی یا پھر ٹال پر ہی آ جاتی تھی۔ میں اسی الجھن میں اندر داخل ہوا تو ڈرائنگ روم میں مجھے ایک سے زیادہ خواتین کی آپس میں گفتگو کی آوازیں آتی سنائی دیں۔ میری ماں کی بھی آواز ان میں شامل تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو ذرا چونک پڑا۔ کاشانہ کے ساتھ ہی صوفے پر میں نے ایک فربہی مائل اور گوری چٹی عورت کو بیش قیمت ساڑھی، میک اپ اور زیورات سے لدے پھندے دیکھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب کی لگتی تھی۔ مجھے اس کی صورت میں کاشانہ کی شباہت صاف محسوس ہوئی۔ میں سمجھ گیا، وہ اس کی ماں تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور تفکر کے تاثرات نمایاں تھے۔ اخلاقاً خاتون کو سلام کیا اور کاشانہ سے بھی ہیلو ہائے ہوئی۔ پھر میں ماں کے قریب ہی صوفے پر براجمان ہو گیا۔ کاشانہ مجھے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''بیٹا! یہ مسز رب نواز ہیں.........کاشانہ کی امی۔ تم سے بات کرنے آئی تھیں۔'' ماں نے مجھے مخاطب ہو کر کہا۔ میں کسی حد تک مسز رب نواز کی آمد کا مدعا بغیر سنے سمجھنے لگا۔

''جی.........فرمائیے؟'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا تو وہ فوراً مجھ سے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

''میں اپنے شوہر کی طرف سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ آپ پلیز انہیں معاف کر دیں۔''

''مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟ یہ معاملہ تو اب عدالت میں جا چکا ہے۔'' میں نے بدستور خشک لہجے میں کہا۔ اس دوران میں نے کاشانہ کو دانستہ نظر انداز کر رکھا تھا۔

''نادر صاحب! کیس ختم بھی تو ہو سکتا ہے۔'' وہ جلدی سے امید بھرے لہجے میں بولی تو ماں نے مجھ سے گویا اس کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بیٹا! یہ صلح کرنا چاہتی ہیں اور ہمارا نقصان بھی پورا کرنا چاہتی ہیں۔''

میں فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا اور سمجھ گیا کہ یہاں اس وقت درحقیقت یہ خاتون اپنے شوہر رب نواز کے ایما پر آئی ہو گی۔ اور مزید یہ کہ رب نواز متوقع طویل قید سے بچنے کے لئے مجھ سے معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچا کہ یہ ایک سنہری موقع تھا۔ تاہم میں نے محتاط انداز میں مسز رب نواز سے کہا۔

''رب نواز نے میرے ماموں مرحوم کے ساتھ ساٹھ لاکھ کا دھوکا کیا تھا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا اور مجھے بھی دھوکا دینے کی کوشش کی۔''

''نادر صاحب! ہم آپ کے ساٹھ لاکھ روپے دینے کو تیار ہیں۔'' وہ یکدم بولی۔

میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''وہ تو یوں بھی ہمیں ملنے ہی والے ہیں۔ کم از کم رب نواز کو اس کی دھوکے بازی کی سزا تو ملنی ہی چاہئے۔'' آخر میں دانستہ میں نے اپنا لہجہ تلخ بنا لیا۔

''بہن! تم ہی اپنے بیٹے کو سمجھاؤ، ہمیں معاف کر دے۔'' مسز رب نواز نے ماں سے ملتجیانہ کہا اور ساتھ ہی اس نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی کاشانہ کو بھی ہولے سے ٹہوکا دیا۔

میں نے پہلی بار بغور مسز رب نواز کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا کے پیچھے چھپی نفرت کی پرچھائیاں صاف محسوس ہوتی تھیں۔ چہرے پر بھی عجز و انکساری کی ملمع کاری نظر آتی تھی۔ وہ سراپا تازہ بدلی ہوئی کینچلی والی ایسی ناگن نظر آتی تھی، جس کا زہر نکالا جا چکا ہو۔

ماں نے مجھ سے مخاطب ہونے کی بجائے مسز رب نواز سے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''بہن! آپ کے شوہر نے بھی ہمارے ساتھ کچھ کم برا نہیں کیا۔ اس نے چوری بھی کی اور سینہ زوری بھی کرنی چاہی۔ مگر.........'' ماں ذرا رکیں، پھر کاشانہ کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور معنی خیز لہجے میں اسے مخاطب کر کے بولیں۔ ''کاشانہ بیٹی! تمہارا کیا خیال ہے، اگر ہم صلح کر لیتے ہیں تو کیا آئندہ پھر کبھی رب نواز ہم سے دھوکا کرنے کی کوشش کرے گا؟''

مسز رب نواز کے ساتھ ماں کا نرم رویہ اور پھر آخر میں کاشانہ سے استفسار کرنا میرے لئے حیرت کا باعث تھا۔ تاہم میں سردست خاموش ہی رہا۔ البتہ کاشانہ نے ماں کے سوال پر جواباً کہا۔

''آنٹی! میرے خیال میں تو رب نواز کو دوبارہ ایسا سوچنے کی بھی جرأت نہیں کرنی چاہئے۔ مگر اس کا آسان حل یہی ہے کہ آپ لوگ آئندہ کے لئے اس کے ساتھ ہر قسم کے کاروباری روابط ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیں۔ پھر دھوکے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

کاشانہ کے اس محتاط جواب پر میں نے دیکھا، ماں کے لبوں پر ہلکی سی مگر اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ تب وہ مجھ سے مخاطب ہو کر گویا دونوں ماں بیٹی کی سفارش کرتے ہوئے بولیں۔

''نادر بیٹے! میرا خیال ہے، اتنا سبق کافی ہے۔ جب یہ ہمارا نقصان پورا کر ہی رہے ہیں تو ہمیں بھی صلح کر لینی چاہئے۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ کاشانہ تمہاری اچھی دوست بھی ہے۔''

ماں نے کاشانہ کا حوالہ جانے کیوں دیا تھا؟ تاہم میں چند ثانیے کی خاموشی کے بعد ماں سے بولا۔

''ٹھیک ہے ماں! جیسے آپ کی مرضی۔ مگر صلح نامے سے پہلے ان کو ہماری ساٹھ لاکھ کی رقم، علاوہ اخراجات کے ہمیں ادا کرنا ہو گی۔ میں کیس ختم کروا دوں گا۔''

''ہمیں منظور ہے۔'' مسز رب نواز نے جلدی سے خوش ہو کر کہا اور ماں سے گلے ملنے کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ماں نے بھی اسے گلے مل کر مسکراتے ہوئے صلح کی مبارک باد دی۔

''چلیں، اب ہم دونوں بہنیں بن گئیں۔ تم اپنا نام تو بتاؤ۔'' ماں نے خوش ہو کر پوچھا۔

''میرا نام .........شاہینہ ہے۔'' مسز رب نواز نے جبراً مسکرا کر کہا۔

''اور میرا شبینہ۔'' ماں نے کہا۔ ''کتنے ملتے جلتے نام ہیں ہمارے۔ چلیں، آپ دونوں کھانا کھا کر جانا۔'' ماں نے کہا۔

''نہیں۔ ابھی میرے سر پر پریشانی سوار ہے، پھر کبھی سہی۔'' مسز رب نواز نے اپنے لہجے میں رسانیت سموتے ہوئے ماں سے کہا۔ جبکہ مجھے ماں کا اس عورت سے گھلنا ملنا قطعاً اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر میری اور کاشانہ کی نگاہیں چار ہوئیں۔ میری طرح اس کے چہرے پر بھی عجیب سی سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔ تاہم اس کی آنکھوں میں مجھے ان کہے الفاظ کی ہلکی سی تپش کا احساس ہوا تھا۔

تاہم چائے وغیرہ کے دوران صلح نامے اور رقم وغیرہ کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی اور اسی دوران ماں، کاشانہ سے بھی گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔

سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے پا گئے۔ بیگم رب نواز نے بلینک چیک ہمارے حوالے کیا تو ماں نے اسے صرف ساٹھ لاکھ کا چیک لکھ دینے کا کہا اور باقی کا ہرجانہ وغیرہ اسے معاف کر دیا۔

دونوں ماں بیٹی رخصت ہو گئیں تو میں نے ماں سے کہا۔ ''ماں! آپ کو ہرجانے کی رقم بھی واپس لے لینی چاہئے تھی۔''

ماں نے مسکرا کر کہا۔ ''بیٹا! بس کافی ہے۔ ہمیں ہماری رقم مل گئی۔ اور پھر کاشانہ بھی تو ہماری اچھی دوست ہے۔ وہ کیا سوچے گی؟''

ماں کی بات پر میں جھلا سا گیا۔ تاہم بولا کچھ نہیں۔ ذرا دیر گزری کہ سکینہ نے آ کر بتایا کہ کوئی سلیمان نامی شخص مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں ذرا چونک سا گیا۔ سلیمان میرا وہی قابل اعتماد آدمی تھا جسے میں نے نظر حیات پر کڑی نگرانی کے لئے مامور کیا تھا۔

''بھیج دو اسے اندر۔'' میں نے سکینہ سے کہا اور وہ لوٹ گئی۔

ماں مستفسرانہ نگاہوں سے میری جانب تکنے لگیں تو میں نے انہیں بتا دیا کہ سلیمان کون ہے۔

''میرا خیال ہے، کوئی اہم اطلاع لے کر ہی آیا ہوگا۔'' ماں نے کہا۔ ''تم اس سے بات کرو، میں کمرے میں چلتی ہوں۔ مجھے پھر بتا دینا۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

ذرا دیر بعد ایک میرا ہم عمر نوجوان شخص اندر داخل ہوا۔ یہ سلیمان تھا۔ میں نے اس کے احساسِ ذمہ داری، محنت اور اچھی کارکردگی کے باعث مزدوروں کا مانیٹر بنایا ہوا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی بڑے ادب سے مجھے سلام کیا، میں نے اسے بیٹھنے کا کہا۔ پھر صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے بولا۔

''کیا خبریں ہیں؟''

''سر! یہ خبر زیادہ ضروری نہ ہوتی تو میں یہاں آ کر آپ کو زحمت نہیں دیتا۔ مگر بات ہی ایسی تھی کہ مجھے اس وقت آنا پڑا۔'' وہ بولا۔ اس کے لہجے میں جوش کی آمیزش تھی۔

''بتاؤ، کیا خبر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سر! نظر حیات کل صبح اپنی شکاری مہم پر اپنے نو آدمیوں کی ٹیم کے ساتھ نکلنے والا ہے۔'' اس نے بتایا اور میرا دل جیسے کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''اس کے ہمراہ ایک دوست بھی ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' میں نے فوراً چونک کر پوچھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کوئی سیاسی شخصیت ہے۔ قومی اسمبلی کا ممبر......... چوہدری ذیشان علی کھدیڑا۔ وہ اسلام آباد میں رہتا ہے۔ آج رات کو وہ اپنے چار آدمیوں کے ہمراہ نظر حیات کے گھر پنڈی آئے گا اور پھر وہیں سے اگلے روز صبح تڑکے یہ مختصر قافلہ بٹ راس اور کمال بن کی جانب روانہ ہو جائے گا۔'' سلیمان نے تفصیل بتائی۔ میں ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ اس سے پہلے اس کا پروگرام رب نواز کے ساتھ جانے کا تھا مگر اس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد، اب ظاہر ہے وہ نہیں جا سکتا تھا۔ مگر چوہدری ذیشان جیسی با اثر شخصیت کا نظر حیات کے ساتھ جانا مجھے الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے......... تم جاؤ۔ اور اب مجھ سے موبائل پر ہی رابطہ کرنا۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے سلیمان سے کہا۔ ''جب تک نظر حیات پنڈی سے روانہ نہیں ہوتا تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔ اور وہ جیسے ہی روانہ ہوں، تمہیں ان کے تعاقب میں نکلنا ہوگا۔'' وہ میری ہدایت پا کر روانہ ہو گیا۔

میں ذرا دیر وہیں بیٹھا کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس کے بعد ماں کے پاس آ کر انہیں ساری بات بتا دی۔ میرا خیال تھا نظر حیات کی شکاری مہم میں شامل ایک با اثر سیاسی شخصیت کا سن کر ایک لمحے کو ماں بھی میری طرح اُلجھن آمیز تذبذب کا شکار ہو جائے گی۔ مگر اس نے اس بات کو خاطر میں لائے بغیر پُرجوش مسرت سے کہا۔

''نادر بیٹا! تقدیر ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ نظر حیات کی اس شکاری مہم سے ہمیں فائدہ اٹھا کر اس کی زندگی کی مہم کو ہر قیمت پر آخری بنانا ہوگا۔''

''ماں! ہمیں اس بار ذرا محتاط ہو کر اپنے دشمن نظر حیات پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ کیونکہ اب اس کے ہمراہ کوئی عام شخصیت نہیں ہے۔''

''تم ایک ایم این اے سے گھبرا گئے؟'' ماں نے کہا۔

''بات گھبرانے کی نہیں ماں!'' میں نے گہری متانت سے کہا۔ ''میں احتیاط کی بات کر رہا ہوں۔ کیونکہ ایک ایم این اے، عوامی نمائندہ ہوتا ہے۔ اگر وہ بھی نظر حیات کے ساتھ براہِ راست ہماری زد میں آ گیا تو ہمارے لئے شاید یہ اچھا نہ ہوگا۔ ہمیں دشمن کے خلاف ایسا قدم اٹھانا ہوگا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔'' ماں نے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

''ماں! اب آپ کا جانا بہتر نہ ہوگا۔ اس مہم کو اب میں خود تنہا ہی سر کروں گا۔'' میں نے جوش سے مستحکم لہجے میں کہا تو ماں نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں ماں!......... آپ کا ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔ میری بات مانیے اور اپنے بیٹے کے زورِ بازو پر بھروسہ کریں۔ میں ضرور کامیاب لوٹوں گا۔''

میرے سمجھانے پر ماں نے ایک گہری سانس لے کر خاموشی اختیار کر لی اور پھر میری پیشانی پر بوسہ دیا۔

***

رات تقریباً دس بجے مجھے سلیمان نے موبائل پر رابطہ کر کے اطلاع دی کہ شکاری مہم کی ایک ٹیم اسلام آباد سے پنڈی پہنچ چکی ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی میں صبح تڑکے روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

صبح چھ بجے سلیمان نے مجھے اس کی خبر دی کہ نظر حیات اور چوہدری ذیشان دو تیز رفتار انٹرکولرز میں روانہ ہو چکے ہیں۔ ان کا رخ بٹ راس کی طرف تھا۔

چنانچہ میں بھی جیپ میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ سلیمان کا کام ختم ہو چکا تھا۔ ماں کو میں شروع ہی

سے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ ماں کے عزائم نظر حیات سے باقاعدہ دھواں دھار جنگ کے تھے اور یہ میں نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی نظر حیات کو میں ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں والا منصوبہ تھا کہ میں نظر حیات پر عرصہ حیات اس قدر تنگ کر ڈالوں کہ وہ یہ ملک ہی چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اسے اس قدر ذہنی و جسمانی طور پر ٹارچر کروں کہ وہ ساری زندگی اپنے پچیس سال پہلے والے شرمناک جرم کی یاد کو سینے سے لگائے پچھتاوے کی اذیت ناک زندگی گزارے۔ اس کی زندگی کو موت سے بھی بدتر کر کے رکھ دوں کہ اسے اپنی نجات صرف موت کی صورت میں نظر آئے اور ساری زندگی سسک سسک کر گزارتا رہے۔

اس کا مجھے اب ایک موقع تو مل رہا تھا۔ اگرچہ اس میں غیر معمولی خطرات بھی تھے مگر اب نے مجھے ایسے خطرات کا کھلاڑی بنا دیا تھا۔ نظر حیات جن ویران برف زاروں کا رخ کر رہا تھا وہاں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہترین مواقع میسر تھے اس لئے میں نے اس سے وہیں ارادہ کر رکھا تھا۔ اگر وہ وہاں میرے ہاتھوں جہنم واصل بھی ہو جاتا تو کسی کو کیا پتہ چلنا تھا؟ یہی سبب کہ میں نے اس کا تعاقب آخری مقام تک کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق یہ لوگ نتھیا گلی سے گزر کر ایبٹ آباد جانے والے راستے کا انتخاب کرتے۔ یہاں سے بٹ راس اور کمال بن کا راستہ قدرے قریب اور محفوظ تھا۔

میں نے اس مین شاہراہ پر پہنچ کر اپنی جیپ ایک جانب ذرا الگ تھلگ روک دی اور انتظار کرنے لگا۔ سلیمان کی بتائی ہوئی اطلاع کے مطابق ان کا مختصر قافلہ کسی وقت بھی اس مقام سے گزرنے والا تھا۔ چنانچہ میں یہیں کھڑا انتظار کرنے لگا۔

قریباً کوئی بیس پچیس منٹ بعد مجھے کشمیر پوائنٹ سے آنے والی سڑک پر دو گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ ان میں ایک نیلے رنگ کی مٹسوبشی پجارو تھی اور دوسری سرخ رنگ کی ڈبل کیبن انٹر کولر ٹربو تھی۔

میں فوراً محتاط ہو گیا۔ سلیمان کی دی ہوئی معلومات کے مطابق یہی میری مطلوبہ گاڑیاں تھیں۔ دوسری جانب منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ دونوں گاڑیاں زناٹے کے ساتھ قریب سے نکلتی چلی گئیں۔ میں سفید فور وہیل ڈرائیو پوٹھوہار جیپ کی طرف دوڑا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اسے اسٹارٹ کر کے دونوں گاڑیوں کے تعاقب میں دوڑا دیا۔

تعاقب کے درمیانی فاصلے کا میں نے خصوصی طور پر خیال رکھا تھا۔ مجھے ان کی منزل معلوم تھی اس لئے زیادہ قریب ہو کر تعاقب کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔

میں خود کو ایک طویل سفر کے لئے ذہنی و جسمانی طور پر تیار کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے احتیاط کے طور پر اضافی فیول کے دو تین کین ساتھ رکھ لئے تھے۔

سفر جاری تھا......... نتھیا گلی سے نکل کر ایبٹ آباد والے راستے پر گامزن ہونے کے لگ بھگ ایک گھنٹے بعد گاڑیاں مانسہرہ کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئیں۔ مری سے ایبٹ آباد چونسٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ بل کھاتے ہوئے پُر خطر راستے کی وجہ سے اسے طے کرنے میں دو یا دو سے زائد گھنٹے لگ سکتے تھے۔ لیکن ماہرانہ انداز کی تیز رفتار اور نان اسٹاپ ڈرائیونگ اسے ایک سے ڈیڑھ گھنٹے تک محدود کر سکتی تھی۔ اگلے چند گھنٹوں کے اندر شاہراہ ریشم سے گزرتے ہوئے ہم بٹ راس کے جنگلوں کے درمیان محو سفر تھے۔ یہاں سرسبز کھیتوں میں رواں شفاف ندیاں جلترنگ سا شور مچا رہی تھیں۔ درختوں میں چھپے رنگین پرندوں کی قوس قزح پھیلاتی خوش رنگ اُڑانیں دل و دماغ میں بڑا لطیف احساس جگا


Courtesy www.pdfbooksfree.pk


تھیں۔ دور سرسبز ڈھلانوں والی پہاڑیوں پر قبضہ جمائے ہوئے بادل گرج رہے تھے۔ لکڑی کی خوب صورت عمارتیں، شوگران اور سری پائے جیسے بلند مقامات کی جھلکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

یہاں سے دریا پر بنے پل کو عبور کیا تو ایک اونچی پہاڑی پر بنے سید اسماعیل شہیدؒ کے مزار پر نظر پڑتی تھی۔ دور سے یوں لگتا تھا جیسے سبز پتوں میں کوئی سفید پھول کھلا ہو۔ اس اونچی پہاڑی سے بالاکوٹ کا بہترین نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ سید اسماعیلؒ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت اس سرزمین کی پہچان تھی جس کی مختصر تاریخ یہ تھی کہ دلی سے آنے والے دین اسلام کے شیر دل سپاہی نے سکھوں کی طاقت کو ختم کیا تھا اور اسی مقام پر آخری فیصلہ کن جنگ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اس مزار سے نیچے گھاٹی کی طرف دریائے کنہار بپھرتا، شور مچاتا بہہ رہا تھا۔

یہاں ہوٹلوں کی بھی بہتات تھی۔ راستے میں اگرچہ ذرا دیر رک کر چائے وغیرہ کا دور چلا تھا مگر مستقل ٹھکانہ نہیں کیا گیا تھا۔ میں بڑے ڈرامائی انداز میں ان کا تعاقب کر رہا تھا۔

بٹ راس کا جنگل پیچھے رہ گیا تھا حالانکہ مجھے پورا یقین تھا کہ یہاں ان کا چند روز قیام ہو سکتا تھا۔ مگر لگتا تھا جیسے ان کا ارادہ بدل گیا تھا۔

اس وقت ہم سطح سمندر سے 7500 فٹ کی بلندی پر تھے اور بڑی کاٹ دار سردی پڑنے لگی تھی۔ ہمارا سفر اب دریائے کنہار کے ساتھ ساتھ تھا۔

اچانک میں نے اس ہائی ایس وین کو اپنی جیپ سے تیزی کے ساتھ کراس کرتے ہوئے دیکھا جسے میں قریباً ایبٹ آباد سے ہی اپنے پیچھے آتے دیکھ رہا تھا۔ اور میرا خیال یہی تھا کہ یہ سیر و تفریح کی غرض سے نکلے ہوئے سیاحوں کی کوئی گاڑی ہے۔ تاہم اس بار اسے کراس ہوتے دیکھ کر میں نے غیر ارادی طور پر اندر موجود افراد کا بہ غور جائزہ لینا ضروری سمجھا تو ایک بات دل کو کھٹکنے لگی۔ اس میں سوار تقریباً نو دس افراد میں نہ کوئی بوڑھا دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی بچہ یا عورت۔ سبھی ہٹے کٹے اور جوان افراد براجمان تھے۔ پھر میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی فرینڈ شپ ٹولا ہو اور پرہینڈ ڈونیشن کے ذریعے سیر و تفریح کی غرض سے مشترکہ طور پر نکلا ہو۔

سردست میرے ذہن میں کسی کے بارے میں شبہ کرنے کا کوئی محل نہ تھا۔ رب نواز والا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ اشفاق شاہین کو میں ''رام'' کر چکا تھا جبکہ کبیر اور ان دونوں کیلاشی باشندوں کو میں ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔ لہٰذا میں مطمئن ہو کر اپنے سفر پر گامزن رہا۔ ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے، یہاں دریائے کنہار کے ساتھ مکئی، چاول، آلو، مٹر اور گندم کی کاشت کی جاتی ہے۔

یہاں برف باری کا موسم تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ان لوگوں نے ابھی تک کسی ہوٹل وغیرہ میں کیوں نہیں بکنگ کروائی۔ جبکہ ان کا رخ کمال بن سے بھی آگے برف زار ویرانوں کی طرف تھا۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے ان کا ارادہ ''کیمپنگ'' کا ہو۔ مگر پھر فوراً میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ یہ لوگ جن تفریحی مقامات پر پہنچ کر رکے تھے، وہ ''پھاگل'' اور ''کھنیاں'' کے درمیان واقع تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ کاغان کے بازار میں واقع بہترین اور آرام دہ ہوٹلوں میں بھی رہ سکتے تھے مگر ان کے شکار کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ ویران برف زاروں کے قریب برفیلے مقامات پر ہی قیام پذیر ہو سکتے تھے۔ برفانی لومڑیوں کا شکار اس موسم میں بہترین سمجھا جاتا تھا اور اس کے شکاریوں کو بھی سخت جان ہونا پڑتا تھا۔

بہرطور جب میں نے انہیں یہاں قیام پذیر بہ الفاظ دیگر خیمہ زن ہوتے دیکھا تو میں یہاں سے آگے ''کھنیاں'' کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں خوب صورت اور آرام دہ سرائے تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



دوئم

میں نے ایک سرائے کے سامنے جیپ روک دی۔ سرائے کی عمارت بڑی خوب صورت تھی۔ اس کا نام سرائے تھا مگر یہ کسی ہوٹل سے کم نہ تھی۔

میں جیپ کے محدود اور بند گرم ماحول سے باہر نکلا تو سردی سے ٹھٹھرا کر رہ گیا۔ تاہم اس سردی میں ایک خوشگواریت کا احساس بھی تھا۔ میں اندر پہنچا اور سرائے کے مالک سے معاملات طے کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہاں بیڈ وغیرہ نہ تھے، بڑی بڑی چارپائیاں تھیں۔ میں نے بیرے سے چارپائی پر پہلے سے بچھے رضائی بستر کو اٹھوانے کا کہہ دیا اور اپنا گرم کمبل اور تلائی وغیرہ بچھا دی۔

سرائے کے عقب میں ایک بڑا سا چوبی شیڈ تھا۔ گاڑیاں وہیں کھڑی ہوتی تھیں۔ دوسرا سرائے کے ساتھ ہی بنی ہوئی تھیں اس لئے یہ مشترکہ شیڈ تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ دوسری سرائے اس سرائے کے مالک کے دوسرے بھائی کی تھی اور یہ ان کی مشترکہ ملکیت تھی۔ میں نے کھانا وہیں کمرے میں ہی منگوا کر کھایا۔ سرائے میں زیادہ لوگ نہ تھے۔ اس کی وجہ سیزن کا شاید آف ہونا تھا۔ ہائیکنگ اور برف باری کے چند شائقین سیاح جو دیگر شہروں اور ممالک سے آئے تھے، وہی نظر آ رہے تھے۔

بہرحال یہاں کا ماحول اچھا، صاف ستھرا اور آرام دہ تھا۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات کہ گنجلک آبادی سے ہٹ کر تھا۔ نظر حیات اور چوہدری ذیشان وغیرہ دوسری سرائے میں فروکش تھے۔ گویا اب میں ''کھیاں'' میں مقیم تھا اور نظر حیات وغیرہ ''پھاگل'' کے قریب۔ اب یہ مجھے معلوم تھا کہ وہ برفانی لومڑیوں کے شکار کے لئے کون سی اور کس طرف کی برف زار وادیوں کا رخ کرنے والے تھے۔

میں نے چوبی کھڑکی کھول کر باہر کا منظر دیکھا۔ لکڑی کی کھڑکی کے چوکھٹے سے دور برف سے سجائے سر بہ فلک پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ سردی میں کاٹ سے زیادہ اب خوشگوار احساس ہونے لگا تھا۔ ایسا شاید تھوڑی دیر بعد ہونے والی برف باری کی وجہ سے تھا۔ تاہم یہ احساس بہرحال اپنی جگہ ہمہ وقت تھا۔

اچانک میری نگاہ اس اُڑی اُڑی رنگت والی ہائی ایس وین پر پڑی جس کے اندر میں نے قریباً افراد بیٹھے دیکھے تھے مگر میں صحیح طرح ان کی صورتیں نہ دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی وین تھی، جسے میں نے آباد سے نکلتے دیکھا اور میرے ساتھ ساتھ ہی انہوں نے کبھی آگے اور کبھی پیچھے سفر کیا تھا۔ اب آسانی انہیں وین سے اترتے ہوئے ان کا ایک ایک چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مگر ان میں کوئی بھی چہرہ جانا پہچانا نہیں لگا تھا۔ یہ لوگ بھی شاید اس سرائے میں فروکش ہونے کے لئے ٹھہرے تھے۔ پھر میں نے کھڑکی بند کر دی اور اپنے مختصر سے سامان کا جائزہ لینے لگا۔

سفر کی تکان اتارنے کی غرض سے تھوڑی دیر بعد میں بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اچانک ہلکا شور سنائی دیا۔ توجہ دینے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک سے زائد افراد کی باتوں اور آوازوں کا شور تھا۔ یونہی پڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد پاس کے کمروں میں کھٹر پٹر کی آوازیں ہونے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ ہائی وین کے مسافر اپنے کمروں میں ''سیٹنگ'' کر رہے ہیں۔

میں ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر ذہن کو ''ریلیکس'' کرنے کی غرض سے اس طرح چارپائی پر نیم الذہنی کی حالت میں پڑا رہا۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ نظر حیات وغیرہ کم از کم آج تو برف زار وادیوں کا رخ نہیں کریں گے۔ کیونکہ سفر کی تھکان سے وہ آرام ہی کر رہے ہوں گے۔ ویسے بھی میں نے ان کو دیکھ رکھا تھا۔ میں نے وہ شام کمرے میں ہی گزار دی۔ کمرے میں آتش دان تھا۔ میں نے بیرے



دوئم

کو اسے سلگا لیا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد یونہی کمرے سے نکلا۔ مختصر سی راہداری ویران تھی۔ چھت میں دو بیمار برقان زدہ روشنی والے پیلے بلب نصب تھے۔ میں یونہی زینوں کی طرف بڑھا اور نیچے اتر کر سرائے سے باہر آ گیا۔ باہر ہر سُو سناٹا اور خاموشی کا راج تھا۔ خون کو برف کر دینے والی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ تب مجھے بھی احساس ہونے لگا کہ اس موسم میں برفانی لومڑیوں کا شکار کرنا کس قدر جان جوکھم والا کام تھا۔ میں سرائے کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی کے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر عقب میں دیکھا تو سرائے کے بیرونی دروازے سے مجھے دو افراد نمودار ہوتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے فر کے لانگ کوٹ اور سروں پر ٹوپیاں چڑھا رکھی تھیں۔ میں انہیں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ ان دونوں کا تعلق ہائی ایس کے مسافروں سے تھا جو میرے کمرے کے اریب قریب میں رہائش پذیر تھے۔ مجھے باہر تنہا کھڑے دیکھ کر دونوں نے مجھ پر ایک بظاہر اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر اس کے بعد سرائے کے عقبی گوشے کی طرف بڑھ گئے جہاں بڑے سے چوبی شیڈ کے نیچے گاڑیاں وغیرہ کھڑی تھیں۔

پھر ذرا ہی دیر بعد میں نے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور دوسرے ہی لمحے میں نے سرائے کی چوبی مستطیل عمارت کے عقب سے وہی اُڑی اُڑی رنگت کی ہائی ایس وین کو نمودار ہوتے دیکھا اور ذرا ٹھٹکا۔ کیونکہ اس میں وہی دونوں افراد براجمان تھے۔ ان میں ایک ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے ہوئے تھا جبکہ دوسرا اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وین تیزی سے غراتی ہوئی ایک طرف نکل گئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ لوگ اس وقت کہاں نکلے تھے؟ میں چند ثانیے کھڑا سرخ بتیوں کو دیکھتا رہا اور پھر واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ رات کے نو بجنے والے تھے۔ سردیوں میں یوں بھی جلدی بھوک لگ جاتی ہے۔ مجھے بھی بھوک لگ گئی۔ میں نے بیرے سے کمرے میں ہی کھانا منگوا کر کھایا۔

کھانے سے فارغ ہوا تو اچانک مجھے باہر گاڑی کی گھرگھراہٹ سنائی دی۔ میں نے کھڑکی کے قریب آ کر ذرا جھری بناتے ہوئے نیچے دیکھا تو مجھے وہی ہائی ایس وین نظر آئی۔ وہ دونوں نیچے اتر رہے تھے۔ پھر میں نے انہیں سرائے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اسی وقت مجھے مثانے پر پڑنے والے دباؤ کا احساس ہوا تو میں سیدھا ٹوائلٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ٹوائلٹ کی ایک طرف کی دیواریں بھی لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ خاصی سیلن چپکی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے ٹوائلٹ کی بائیں طرف کی دیوار میں ایک کپڑے کی دھجیاں پھنسی ہوئی نظر آئیں۔ مگر اس دیوار کی دوسری طرف سے مجھے باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے جانے کیا سوچ کر کپڑے کی دھجیاں آہستگی کے ساتھ کھینچیں تو مجھے ایک بڑا سا سوراخ نظر آیا۔ اس سوراخ سے دوسرے کمرے میں جھانکنا معیوب ہی تھا مگر میں نے اس کے ساتھ اپنی ایک آنکھ چپکا دی اور دوسرے ہی لمحے میرے سارے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

وہ کل سات افراد تھے اور کہیں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ مگر ان کی ''تیاریوں'' میں مال و اسباب کی بجائے جنگی اسباب تھا۔ کوئی اپنے پستول کے چیمبر میں گولیاں ڈال رہا تھا اور کسی کو میں نے بیلٹ کی بیلٹ میں پستول اڑستے ہوئے دیکھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ لوگ کسی سے جنگ کرنے جا رہے تھے۔ مگر کس سے؟ ..... یہ میں نہیں جانتا تھا۔ مگر یہ سب دیکھ کر میرے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔

میں بدستور دھڑکتے دل کے ساتھ سوراخ سے اپنی ایک آنکھ چپکائے یہ سب دیکھے جا رہا تھا۔ ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



دوئم

سب کے چہروں پر جوش کی تمتماہٹ تھی۔

''آج چوہدری ذیشان کی آخری رات ہونی چاہئے......... ہر صورت۔'' ایک نسبتاً کیم شحیم اور چوڑے شخص نے اپنے پستول میں بلٹ کلپ ٹھونکتے ہوئے خوفناک لہجے میں ہولے سے بڑبڑا کر کہا۔

''تم فکر ہی نہ کرو استاد! ہم بھلا ایسا سنہری موقع ہاتھ سے جانے دیں گے؟'' اس کے ایک ساتھی نے اپنی پتلون کی بیلٹ میں پستول اڑسنے کے بعد اوپر لیدر کی سیاہ جیکٹ پہنتے ہوئے کہا۔

جب ساری تیاریاں مکمل ہو چکیں تو یہ لوگ ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ میں نے جلدی سے کپڑے کی دھجیاں دوبارہ سوراخ میں بھر دیں اور ٹوائلٹ سے نکل آیا۔

میرے سینے میں زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یہ لوگ چوہدری ذیشان کو نہ جانے کس کے کہنے پر اور کون سی دیرینہ دشمنی کے باعث ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟ مجھے چوہدری ذیشان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر میرے لئے اُلجھن کی بات یہ تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ ان بدمعاشوں کے ارادوں نے میری مہم کو مشکل بنا ڈالا تھا۔ اگر میں اس پرائے چھڈے میں اپنی ٹانگ اڑاتا بھی تو میرا نظر حیات کے سامنے خود کو ظاہر کرنے کے برابر تھا۔ دفعتاً مجھے باہر انجن کی ہلکی گھرگھراہٹ کی آواز سنائی دی اور میں یکدم خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ میں لپک کر کھڑکی کی طرف آیا اور ایک پٹ ذرا کھولا تو سرد اور برفیلی ہوا کا ایک کاٹ دار جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ میں نے نیچے تاریکی میں اس سرخ رنگ کی ہائی ایس ویگن کی ہیڈ لائٹس دیکھیں جو تیزی سے آگے بڑھ کر ایک طرف کو موڑ کاٹ رہی تھی۔ میں نے تیزی کے ساتھ کھڑکی بند کی۔ اپنی براؤن لیدر کی جیکٹ چڑھائی۔ جیپ کی چابیاں اٹھائیں اور میگارو کی موجودگی کی تسلی کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آیا۔ ذرا دیر بعد ہی باہر آ کر اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔

باہر دن بھر ہونے والی بارش کے بعد برف باری شروع ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی برف باری میں انہیں آخر اپنے ''شکار'' کو ٹھکانے لگانے کی کیا پڑی تھی؟ آخر کو میں بھی انہی کی طرح اپنے شکار کے تعاقب میں یہاں آیا تھا۔ لیکن میں تنہا ہوتے ہوئے بھی کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ نظر حیات اور چوہدری ذیشان کی یہ مہم ایک آدھ روز پر مشتمل نہ تھی۔ بہر حال میں نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ میں نے دانستہ جیپ کی ہیڈ لائٹس گل کر رکھی تھیں۔ البتہ مجھے اسکرین کے پار سامنے دور جاتی ہوئی اس ہائی ایس ویگن کی عقبی سرخ بتیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ آسمان روشن تھا۔ طباق چاند کی مدھ بھری رات میں روئی کے گالوں کی طرح گرتی برف بڑا دلکش اور پراسرار منظر پیش کر رہی تھی۔

میری اس اچانک اور انجانی مہم میں کئی طرح کے خطرات تھے۔ ایک تو یہ کہ میں چوہدری ذیشان کے دشمنوں کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ دوران لڑائی چوہدری ذیشان کے آدمی مجھے بھی ان کا ساتھی ہی سمجھتے۔ مگر میں پہلے ہی سے ذہن میں ایک مربوط حکمت عملی تیار کر چکا تھا۔ یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

نظر حیات اور چوہدری ذیشان نے جس مقام پر کیمپنگ کرائی تھی وہ ''کھنیاں'' اور ''چھانگل'' کے درمیان کا ایک ویران برف زار علاقہ تھا جہاں جنگل دور تک جاتا دکھائی دیتا تھا۔

چونکہ مجھے معلوم تھا کہ نظر حیات وغیرہ نے کس مقام پر ''کیمپنگ'' کر رکھی تھی اس لئے میں



اب میں با آسانی اس سرخ رنگ کی ہائی ایس ویگن کا راستہ کاٹ سکتا تھا۔ اگرچہ مجھے اس کے لئے اضافی چکر کاٹنا پڑ رہا تھا مگر میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ ہائی ایکس ویگن کے مقابلے میں جیپ کی رفتار زیادہ ہی تھی۔ میں نے اپنی جیپ کا ہیٹر آن کر رکھا تھا۔ میں نے جیکٹ کے کالر کھڑے کر کے ہاتھوں پر گرم اونی دستانے چڑھا لئے تھے۔ تیز رفتاری کے باعث مجھے اب بہت سنبھل کر ڈرائیونگ کرنی پڑ رہی تھی۔ راستہ برف سے اٹا پڑا تھا۔ میری جیپ فور وہیل ڈرائیو تھی۔ برف باری میں ابھی اتنی کچھ خاص شدت تو نہ تھی تاہم پھر بھی سلائیڈنگ کا خطرہ تھا۔ مگر راستہ کچا اور ناہموار ہونے کے باعث یہ خطرہ قدرے کم ہو گیا تھا۔

جب میں نے محسوس کیا کہ میں ہائی ایس وین سے راستہ تبدیل کر چکا ہوں تو میں نے اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔ اب راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ ''کھنیاں'' کا علاقہ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میں اس وقت جس مقام سے گزر رہا تھا، یہاں مجھے نظر حیات اور چوہدری ذیشان کے ''کیمپس'' کے آثار ملنے چاہئے تھے۔ مگر یہاں چہار اطراف ویرانی کے سوا کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ میری پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ میں نے ذرا آگے جا کر جیپ روک دی۔ انجن البتہ آف نہ کیا تھا۔ ن تھا سخت ٹھنڈ کی وجہ سے دوبارہ اسٹارٹ کرنے میں مشکل پیش آتی۔

میں برف کے ویرانے میں جیپ کے اندر ہی بیٹھا اپنے چہار اطراف گردن موڑے جائزہ لے رہا تھا۔ جہاں تک میری نظریں کام کر سکتی تھیں، میں دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد برف باری رک گئی اور ایک طرف بادل چھٹے تو چاند کی روشنی ہر سُو پھیل گئی۔ یہ نہایت خوب صورت منظر تھا جس میں عجیب پراسراریت تھی۔ میں نے جیپ کا دروازہ کھولا اور باہر اتر آیا۔ میرے پاس برف سے ڈھکے ہوئے چند ٹنڈ منڈ درخت تھے۔ میں ذرا آگے بڑھا تو ایک مقام پر مجھے کسی پڑاؤ کے آثار محسوس ہوئے۔ میں نے فوراً ئے کے بل جھک کر آس پاس کی زمین کا جائزہ لیا تو ایک جگہ برف میں مجھے ٹائروں کے نشانات آگے جاتے ہوئے نظر آئے۔ گرتی ہوئی برف کی وجہ سے یہ نشانات دور تک واضح تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دیر نہ لگی کہ نظر حیات اور چوہدری ذیشان کا یہ مختصر سا شکاری قافلہ چند گھنٹوں پہلے ہی یہاں سے آگے کوچ کر چکا تھا۔ میں تیزی سے واپس پلٹا اور دوبارہ اپنی جیپ میں سوار ہوا۔ پھر گیئر بدل کر اسے آگے بڑھا دیا۔ میں نے اسٹیئرنگ موڑ کر جیپ کا رخ ٹائروں کے نشانات کی طرف کر دیا تھا۔ دفعتاً غیر ارادی طور پر میری نگاہ کھڑکی پر لگے بیک ویو مرر پر پڑی۔ میں چونک پڑا۔ دور عقب میں مجھے روشنی نظر آئی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ سرخ ہائی ایس ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے تیزی سے سوچا، ممکن تھا انہیں میری جیپ کی عقبی سرخ بتیاں بھی نظر آ چکی ہوں۔ اور پھر ایک جھماکے سے میرے ذہن میں یہ خیال اُبھرا کہ سرخ ہائی ایس والے مجھے ہی اپنا ''شکار'' سمجھ کر میرے تعاقب میں آ سکتے تھے۔ مجھے فوراً ہیڈ لائٹس گل کرنا پڑیں۔ میں اب مدھم پراسرار چاندنی میں ہی آگے بڑھتا رہا۔

دور سامنے برف پوش پہاڑیوں کے سر بہ فلک ہیولے پراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی برف ڈھلانوں پر سبزہ زار جنگل سیاہ دھبوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ میں نے ممکنہ حد تک جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ ساتھ ہی گاہے گاہے میں بیک ویو مرر میں بھی دیکھے جا رہا تھا۔ دور عقب میں روشنی ہنوز نظر آ رہی تھی۔ ایک بات سوچ کر میں بے اختیار ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔ جیپ کی بتیاں گل کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ برف پر بننے والے میری جیپ کے ٹائروں کے نشانات ان کی رہنمائی کر سکتے تھے۔ مجھے بھی بتیاں گل کرنے کے بعد جیپ دوڑانے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ خدشہ تھا کہ جیپ کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



اندھے گڑھے میں پھنس سکتی تھی۔ ناچار میں نے دوبارہ ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔ اب میں نے جیپ کی رفتار مزید بڑھا دی۔ تھوڑی دیر گزر گئی۔ عقب میں مجھے وہ روشنی نظر نہ آئی۔ یا تو میں اسے پیچھے چھوڑ آیا تھا یا پھر وہ کسی خرابی کے باعث رک چکی تھی۔ میں نے بہرطور اطمینان کی سانس لی۔ اب ڈھلوانی جنگل کے خاصے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی میں درخت اور ان کی شاخیں سے ڈھکی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں ٹائروں کے نشانات کی رہنمائی میں ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ دائیں مجھے برف سے ڈھکی ہوئی ڈھلوانی چھتوں والے دو تین کاٹیج بھی نظر آئے تھے۔

ٹائروں کے نشان ایک کاٹیج کے قریب سے ہو کر آگے بڑھ گئے تھے۔ شاید نظر حیات وغیرہ کے لئے یہاں رکے تھے اور پھر آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر چند کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد اچانک سامنے ذرا بائیں جانب مدھم روشنی نظر آئی۔ پھر میں اس وقت چونکا جب ٹائروں کے نشان بتدریج کی شکل میں بل کھاتے ہوئے اس روشنی کی سمت جا رہے تھے۔ میں نے فوراً جیپ کی بتیاں کچھ گل کر دیں اور ذرا قریب پہنچا تو روشنی کا ''مخرج'' ایک چوبی کاٹیج کو دیکھ کر فوراً جیپ ذرا دور ہی دی۔ پھر اگنیشن سوئچ آف کر کے میں دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

باہر بڑی کاٹ دار سردی تھی۔ میرے موبائل میں ٹارچ تھی۔ مگر میں نے اسے روشن کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور کاٹیج کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھنے لگا۔ یہ کاٹیج کا عقبی حصہ تھا جبکہ میں نے ذرا رخ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے اُبھر کر دیکھا تو مجھے نظر حیات کی نیلے رنگ والی مٹسوبشی پجارو چوہدری ذیشان کی سرخ رنگ والی ڈبل کیبن انٹر کولر ٹربو کھڑی نظر آ گئیں۔

میرا دل تیزی سے سینے میں دھڑکنے لگا۔ میں اپنی منزل کے بالکل قریب تھا۔ مگر صورتِ حال اور بڑے عجیب انداز میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مجھے دوسرا کام بھی انجام دینا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف شکار کو چھاپنا تھا اور دوسری طرف کے شکار کو بچانے کی کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔ اس پر مستزاد دونوں اکٹھے اور ایک ہی مقام پر موجود تھے۔

میں کاٹیج کے ذرا قریب آ کر ایک درخت کی آڑ سے بہ غور اس کے اطراف و اکناف کا جائزہ لگا۔ آس پاس کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔ یہ کاٹیج دو منزلہ تھا۔ روشنی کاٹیج کی اوپری منزل کے کسی کے دریچے سے آ رہی تھی۔ یہاں شاید بجلی کا انتظام نہ تھا یا پھر یہ روشنی کسی گیس کے ہنڈولے کی تھی۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور کاٹیج کی طرف لپکا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر ٹھٹکا۔ دروازے پر ایک بڑا سا تالا نظر آ رہا تھا جو اس بات کی گواہی تھا کہ اندر کوئی موجود نہیں میں اُلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچنے لگا کہ ان کی دونوں گاڑیاں ادھر ہی موجود تھیں تو یہ لوگ کہاں ہیں۔ پھر ایک اور خیال بھی آیا کہ ممکن ہے یہ لوگ پیدل ہی شکار کی تلاش میں کہیں قریب ہی ہوں۔ برفانی لومڑیاں بالخصوص اس موسم میں رات کو اپنے ٹھکانوں سے نکلتی تھیں۔ یہ موسم ان کی کا ہوتا تھا۔

اچانک کہیں قریب سے گولی چلنے کے دھماکے کی آواز اُبھری۔ میں بری طرح ٹھٹکا۔ ذرا رکا۔ دوسری اور پھر تیسری گولی بھی چلی۔ اس کے بعد پھر وہی گہری اور پراسرار خاموشی چھا گئی تھی گولی کے بعد دیگرے آوازیں میری داہنی جانب جنگل سے اُبھری تھیں۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔ حیات وغیرہ قریب ہی شکار کھیل رہے تھے۔ مذکورہ سمت کی جانب سے میں نے دیکھا تو وہاں جنگل میں متحرک روشنی نظر آئی اور ساتھ ہی چند انسانی ہیولے بھی دکھائی دیئے جن کا رخ کاٹیج



ہی تھا۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور جنوبی سمت والی دیوار کی آڑ میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے مذکورہ سمت سے چند لوگ آتے دکھائی دیئے۔ ان کی تعداد پانچ چھ کے قریب تھی۔ دو کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں جبکہ باقی تین افراد اپنے کاندھوں پر برف جیسی سفید رنگت کے بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔

جب وہ قریب آئے تو میں نے آنکھیں سکیڑ کر انہیں دیکھا۔ جن دو افراد کے ہاتھوں میں ٹارچیں اور کاندھوں پر رائفلیں جھولتی نظر آ رہی تھیں ان میں سے ایک ذرا دراز قامت اور بھاری بھرکم شخص تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی ذرا دبتی ہوئی جسامت کا مگر تنومند شخص تھا۔ انہوں نے گرم لباس زیب تن کر رکھا تھا اور ٹوپ والے موٹے گرم جیکٹر پہن رکھے تھے۔ وہ لوگ آپس میں اونچی آوازوں سے باتیں کرتے ہوئے کاٹیج کے قریب پہنچے تو مجھے یہ دیکھ کر ایک جھٹکا لگا کہ ان میں نظر حیات موجود نہ تھا۔ جبکہ یہ پانچواں اور رعب دار شخصیت والا آدمی بھی میرے لئے اجنبی تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہی ایم این اے چوہدری ذیشان ہوگا جو نظر حیات کی شکاری مہم کا ساتھی تھا۔ یہ ممکن تھا کہ نظر حیات ابھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگل کے اندر ہنوز شکار میں مصروف ہو۔ بہرطور میں نے یہ معاملہ فوری طور پر نمٹانے کا سوچا اور دیوار کی آڑ سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔ وہ پانچوں ایک اجنبی کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹکے تھے۔

''کون ہو تم؟'' بھاری جسامت اور رعب دار شخصیت کے ساتھ کھڑا وہ ٹھگنے قد کا شخص میرے چہرے پر ٹارچ کی روشنی پھینکتے ہوئے ذرا تیز آواز میں بولا۔

''مجھے چوہدری ذیشان صاحب سے بات کرنی تھی۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں چوہدری ذیشان ہوں۔ بولو..... کیا بات ہے؟'' اس با رعب شخص نے گمبھیر لہجے میں مجھ سے کہا تو میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

''چوہدری صاحب! وقت کم ہے۔ میرے تھوڑے سے کہنے کو بہت جاننے گا۔ میں کھیاں کی ایک سرائے سے آپ کو تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچا ہوں، یہ بتانے کے لئے کہ میں نے.....'' اس کے بعد میں نے اسے مختصر الفاظ میں ساری بات بتا دی۔

''یہ مجھے انہی کا ساتھی معلوم ہوتا ہے چوہدری صاحب! اسے پکڑ لیجئے۔'' اس کے گینڈے جیسی جسامت والے ساتھی نے مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے چوہدری ذیشان سے کہا۔ میں نے اس پر ایک کڑی نگاہ ڈالی اور پھر یکسر نظر انداز کر دیا۔ میں نے جو کہنا تھا، وہ کہہ چکا تھا۔ تاہم چوہدری ذیشان کو میں نے گہری سوچ میں مستغرق پایا۔ اس کی پُرسوچ نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے آخر میں اس سے پھر کہا۔

''چوہدری صاحب! میں نے انسانیت کے ناتے اپنا فرض پورا کر دیا..... میں اب چلوں گا۔'' یہ کہہ کر میں واپس جانے کے لئے مڑا تو عقب سے اس گینڈے جیسی جسامت والے شخص کو میں نے بڑبڑاتے سنا۔

''او چوہدری صاحب! لہنوں پھڑ لوو..... یہ انہی کا بندہ لگتا ہے۔''

''اوئے تُو چپ کر..... اسے جانے دے۔'' میں نے چوہدری ذیشان کی آواز سنی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی جیپ میں آ کر سوار ہو گیا۔

چوہدری ذیشان سمجھ دار واقع ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا، ایک اجنبی شخص اتنی دور سے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں اسے جس خطرے سے آگاہ کرنے آیا تھا، وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی عقل مندی کا ایک اہم اشارہ مجھے یہ ملا تھا کہ اس نے نہ میرا نام پوچھا تھا اور نہ ہی میرے بارے میں کوئی تفصیل جاننے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



ضرورت سمجھی تھی۔

بہر طور میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی جیپ کے قریب پہنچا اور پھر اس کا دروازہ کھول کر آگے بڑھ گیا۔ میرا رخ جنگل کی سمت تھا جدھر سے میں نے چوہدری ذیشان وغیرہ کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ میں خاصی تیز رفتاری کے ساتھ جیپ کو دوڑائے جا رہا تھا۔ مطلوبہ مقام پر پہنچنے کے بعد میں نے جیپ کی رفتار دھیمی کر لی۔ کیونکہ کسی بھی وقت میرا اپنے دیرینہ دشمن نظر حیات سے ''ٹاکرا'' ہونے والا تھا۔ میری متلاشی نظریں ونڈ اسکرین کے پار تیزی سے اطراف میں گردش کر رہی تھیں۔ دفعتہً مجھے جنگل کے شمال کی طرف گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی درندے کی چنگھاڑ بھی اُبھری۔ میرا پاؤں غیر ارادی طور پر بریک پر پڑ گیا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ درندے کے چنگھاڑ مارنے کی گرجتی ہوئی آوایں اب بار بار سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے آواز پر غور کیا۔ یہ مجھے جنگلی ریچھ کی آواز لگی۔

میں نے جیپ جنگل کی مطلوبہ سمت کی طرف موڑ دی۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے سامنے ٹارچوں کی روشنی میں تین افراد دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی رائفلیں تھیں۔ قریب ہی ایک بھاری بھر کم سفید دودھیا ہیولا دکھائی دیا۔ یہ ایک برفانی ریچھ تھا جو کسی بڑے سے برفانی تودے کی طرح ایستادہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پر بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ اس کے قریب زمین پر مجھے ایک خون میں لت پت انسانی وجود بھی پڑا دکھائی دیا۔ باقی تینوں افراد اپنی رائفلوں سے اس پر اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ریچھ نے ایک دل دہلا دینے والی چنگھاڑ ماری اور پھر چاروں پیروں پر ہو کر ان کی طرف لپکا۔ وہ تینوں بدحواس ہو کر الٹے قدموں دوڑے۔ مگر اس خوف ناک صورت حال میں ایک شخص کا پاؤں رپٹ گیا۔ وہ برفیلی زمین پر گر پڑا۔ ریچھ اس کے سر پر آن پہنچا۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرنا چاہی مگر ریچھ نے اسے اپنے بھاری بھر کم اور بڑے بڑے نوکیلے پنجوں میں دبوچ کر چشم زدن میں بھنبھوڑ ڈالا۔ اس بدنصیب شخص کے حلق سے برآمد ہونے والی آخری چیخ بڑی کربناک اور دلدوز تھی۔ باقی دو مختلف سمتوں کی طرف دوڑے۔ ایک کی شاید میری جیپ پر نظر پڑ گئی۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شکاریوں کا یہ گروپ نظر حیات کے ٹولے سے ہی تعلق رکھتا ہوگا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر میں نے فوراً اپنی جیپ کا دروازہ اس کے لئے وا کر دیا۔ اس نے قریب پہنچتے ہی جیپ کے اندر جست لگائی۔ اپنی رائفل وہ پہلے ہی پھینک چکا تھا۔ میں نے اس کے سوار ہوتے ہی فوراً جیپ آگے بڑھا دی۔ خونخوار قوی الجثہ ریچھ اپنے دوسرے شکار کے تعاقب میں بدستور دوڑا جا رہا تھا۔

''جیپ چلاؤ......... جلدی کرو......... ورنہ یہ درندہ ہمیں پھاڑ کھائے گا۔'' وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ خوف زدہ لہجے میں مجھ سے بولا۔ میں نے ایک نظر اس کے دہشت زدہ چہرے پر ڈالی، جیپ آگے بڑھا دی۔ مگر تھوڑی دور جنگل میں نکل آنے کے بعد میں نے جیپ ایک جھٹکے سے روک دی۔ پھر اس کی طرف سرد نظروں سے تکتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ شکاری ہو کر ایک ریچھ سے مقابلہ نہ کر سکے؟''

اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ اب کافی سنبھل چکا تھا۔ جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ہاں ہم شکاری تو ضرور ہیں مگر اتنے بڑے درندوں کو شکار کرنے کا ہمیں خاص تجربہ نہیں۔ ہم تو یہاں برفانی لومڑیوں کا شکار کرنے آئے تھے۔''

''بس......... صرف تین چار افراد؟'' میں نے دانستہ اسے کریدنے کی خاطر کہا۔



''نہیں......... میرے ساتھ اور بھی ساتھی ہیں۔'' اس نے جواباً کہا تو میں نے یونہی اِدھر اُدھر تاریک جنگل میں اپنی نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو تمہارا اور کوئی ساتھی نظر نہیں آ رہا؟''

''وہ آگے نکل چکے ہیں۔ ہم یہاں اس درندے کے چنگل میں پھنس گئے تھے......... مگر تم کون ہو؟ اور یہاں جنگل میں کیا کر رہے تھے؟'' اس نے آخر میں بہ غور میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا تو میں نے مسکرا کر کہا۔

''میں بھی برفانی لومڑیوں کے ایک شکاری ٹولے کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ مگر میں شکاری نہیں ہوں۔ انہیں یہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔ وہ اندر جنگل میں شاید تمہارے ساتھیوں کی طرح دور نکل گئے ہیں۔ میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔''

میری بات سن کر وہ الجھن آمیز حیرت سے بولا۔ ''یہاں تو میں نے کسی اور شکاری ٹولے کو نہیں دیکھا۔ تم کون سے شکاری ٹولے کی بات کر رہے ہو؟'' اس بار اس کے لہجے میں شک کی آمیزش تھی۔

''ہم ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ اور چوہدری ذیشان صاحب سے بھی ملاقات کی تھی۔ وہ کاٹیج میں پہنچ چکے تھے۔'' میں نے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا سہارا لیا۔ وہ قدرے مطمئن ہو کر سر ہلانے لگا۔

''مگر وہ تو بتا رہے تھے کہ ان کے ساتھ ان کا کوئی دوست بھی تھا۔ کہیں وہ چھوٹے قد والے گینڈے جیسے شخص کی بات تو نہیں کر رہے تھے جو ان کے ساتھ ہر وقت سائے کی طرح چپکا رہتا ہے؟'' میں نے چالاکی سے نظر حیات کے بارے میں اُگلوانے کی خاطر ایسا کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔

''نہیں......... وہ تو چوہدری صاحب کا مشیر ہے۔ بلکہ مشیر بھی کیا ہے، ان کا لاڈلا سالا ہے۔ دوست تو ان کا نظر حیات ہے۔''

''اچھا......... مگر وہ تو ان کے ہمراہ دکھائی نہیں دیا۔'' میں نے یونہی بظاہر رواروی میں مگر دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''وہ نہیں آ سکا تھا۔ اسے اچانک شدید فلو نے آ لیا تھا۔ وہ وہیں بھاگل کے ''باباسیاں'' والی سرائے میں رہ گیا ہے۔'' اس نے بتایا اور میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میرا ''شکار'' کہاں تھا، مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ اب میں نے اس سے جان چھڑانے کی خاطر خاموشی سے جیپ اسٹارٹ کی، یوٹرن لے کر واپس کاٹیج کی طرف موڑ دی۔

میں اب اپنے دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ سرخ ہائی ایس والے ابھی وہاں نہ پہنچے ہوں یا پھر چوہدری ذیشان نے میری اطلاع کے بعد فوری طور پر ان سے نمٹنے کے لئے کوئی قدم اٹھا لیا ہو۔

میں اب اسے کاٹیج تک چھوڑ کر بھاگل کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ کاٹیج زیادہ دور نہ تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد جیسے ہی میں کاٹیج کے ذرا قریب پہنچا تو اچانک گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے اچانک بریک لگا دیئے۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میرا دل یکبارگی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ گو فائرنگ کی آواز کاٹیج کی سمت سے آ رہی تھی۔ دشمنوں سے چوہدری ذیشان کا ٹاکرا ہو چکا تھا۔ میری بروقت اطلاع سے ممکن تھا کہ اب چوہدری ذیشان کے مسلح محافظوں کو اپنے دشمن کے خلاف پہلے ہی گھات لگانے کا موقع مل چکا ہو۔ اور ظاہر ہے جسے پہلے گھات مل جائے، اس کے حریف کو مات ملنا لازمی ہے۔

''ی......... یہ......... فائرنگ کیسی ہے؟'' میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھے چوہدری ذیشان کے آدمی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



نے مرتعش آواز میں کہا تو میں بولا۔

''کہیں چوہدری صاحب کے کسی دشمن نے ہلّہ تو نہیں بول دیا؟''

''ایسا ہی لگتا ہے۔'' وہ دانت پیس کر بولا اور پھر اپنی شکاری رائفل ایک جانب پھینکنے کے بعد اپنی جیب سے پستول نکال لیا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ پھر تیزی کے ساتھ کاٹیج کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ وہ چوہدری ذیشان کا کوئی پکا نمک خوار لگتا تھا۔ میں اب شش و پنج کا شکار ہو گیا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ میں نے اپنا جو فرض ادا کرنا تھا، کر چکا تھا۔ اب چوہدری ذیشان جانے اور اس کے نامعلوم دشمن۔

فائرنگ کی آواز مسلسل تاریک جنگل میں گونج رہی تھی۔ میں دانستہ ذرا کاٹیج کی حدود سے دور ہو کر جیپ دوڑانے لگا۔ اچانک میں نے کاٹیج کی سمت سے آنے والے راستے پر ایک گاڑی کا ہیولا دیکھا۔ وہ تیزی سے دوڑی جا رہی تھی۔ میں نے فوراً اپنی جیپ کی رفتار دھیمی کر لی اور ونڈ اسکرین کے پار بغور اس دوڑتی ہوئی گاڑی کو دیکھنے لگا۔ اور پھر بری طرح ٹھٹکا۔ وہ سرخ رنگ کی ڈبل کیبن انٹرکولر ٹربو تھی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے تعاقب میں بھی ایک اور گاڑی کو اندھا دھند دوڑتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہائی ایس ویگن تھی جس میں چوہدری ذیشان کے دشمنوں کا سات افراد پر مشتمل ٹولا براجمان تھا۔ مگر نہ جانے ان میں سے کتنے باقی بچے تھے؟ یہ ابھی میں نہیں جان پایا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ زبردست ''ماری'' کے بعد یقیناً چوہدری ذیشان نے راہِ فرار اختیار کی تھی۔ دونوں گاڑیاں اندھا دھند دوڑی جا رہی تھیں۔ میں اپنے دوسرے راستے پر آ گیا۔ میں نے بھی جانے کیا سوچ کر اپنی جیپ آگے بڑھا دی۔ یہ راستہ ان دونوں آگے پیچھے دوڑتی گاڑیوں کے بالکل متوازی تھا۔ مگر وہ دونوں گاڑیاں میری جیپ سے کافی آگے جا چکی تھیں۔

صورت حال گمبھیر تھی۔ میں بھی اپنی جیپ فل اسپیڈ سے دوڑائے جا رہا تھا۔ میں نے ہائی ایس ویگن سے گولیاں چلتے ہوئے دیکھیں جو تاریک جنگل میں جگنوؤں کی طرح آگے دوڑتی ہوئی چوہدری ذیشان کی انٹرکولر کی طرف لپک رہی تھیں۔ پھر اچانک ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور نظروں نے چوہدری ذیشان کی انٹرکولر کو ایک جانب جھکتے دیکھا جس کے بعد بتدریج اس کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ اور بالآخر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ اس کے تعاقب میں دوڑتی ہوئی اس کے خون آشام دشمنوں کی ہائی ایس چشم زدن میں انٹرکولر کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ میں نے بھی اپنی جیپ کا اسٹیئرنگ موڑا اور ان کی سمت چل دیا۔ میں نے قریب پہنچتے پہنچتے دیکھا کہ انٹرکولر سے ایک شخص نکل کر تیزی کے ساتھ دوڑا۔ ٹھیک اسی وقت میں ہائی ایس سے تین مسلح افراد کو بھی اترتے دیکھا۔ ایک نے اپنی رائفل کا رخ اس دوڑتے ہوئے شخص کی طرف کر کے برسٹ چلا دیا۔ گولیوں کی مہیب تڑتڑاہٹ اُبھری۔ وہ شخص چیخ مار کر گرا۔ تینوں جیسے ہی اس کے سر پر پہنچے تو اچانک میری طرف انہوں نے دیکھا۔ میری جیپ آندھی طوفان کی طرح ان کی طرف وحشی درندے کی طرح بڑھ رہی تھی۔ وہ تینوں بوکھلا گئے اور دائیں بائیں دوڑے۔ مگر میری جیپ نے زوردار ٹکر ماری۔ دونوں اچھل کر دور جا پڑے۔ میں نے فوراً جیپ کو بریک لگائے اور اپنا میگارد ہاتھ میں لیتا ہوا تیزی کے ساتھ نیچے اترا تو تیسرے شخص نے زخمی آدمی کو اپنی گن سے نشانہ بنانا چاہا تو میں نے اپنی جیپ کے بونٹ کی آڑ لے کر دونوں ہاتھوں سے میگارد تھام کر اس کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا۔ اس کے گن والے ہاتھ پر لگی تھی۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر گر پڑی۔ میں نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے دوبارہ اس کا نشانہ لیا۔ دوسری بار میرے میگارد نے لرزہ خیز دھماکا



سے آتشیں قہقہہ بلند کیا اور وہ شخص کریہہ چیخ کے ساتھ گرا۔ میں تیزی سے زمین پر پڑے زخمی شخص کی طرف بڑھا تو بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ وہ چوہدری ذیشان تھا۔ اس کی بائیں ٹانگ پنڈلی کی طرف سے لہولہان ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک موت کی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ اسے اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔ میں نے فوراً اسے سنبھالتے ہوئے ہانپتی آواز میں کہا

''چوہدری صاحب!.....آپ ٹھیک تو ہیں نا؟.....اُٹھئے، جلدی کریں۔''

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اپنی جیپ کی طرف بڑھا تو اچانک میں نے ذرا دور ایک شخص کو گن سنبھالتے ہوئے لڑکھڑا کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ یہ ان دونوں میں سے ایک شخص تھا جنہیں میں نے اپنی جیپ سے اس وقت ٹکر ماری تھی جب وہ دونوں اپنے تیسرے مسلح ساتھی کے ساتھ چوہدری ذیشان کو گولیوں سے چھلنی کرنے کے درپے تھے۔ مجھے فوری طور پر گولی چلانے کا موقع تو نہ مل سکا تاہم میں نے خطرہ بھانپتے ہی زخمی چوہدری ذیشان کو ایک طرف دھکا دے کر گرایا اور خود کو دوسری طرف اچھال دیا۔ ٹھیک اسی وقت دشمن کی رائفل گرجی۔ تڑتڑاتی ہوئی گولیوں کی بوچھاڑ ٹھیک اس سمت پر پڑی جہاں چند ثانیے پہلے ہی میں اور چوہدری ذیشان موجود تھے۔ میں نے محفوظ گوشہ سنبھالتے ہی اپنے میگارد سے اس کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا۔ میرے میگارد کی مہیب نال نے تیسرا آتشیں قہقہہ اُگلا۔ حریف بھی ایک کائیاں تھا۔ ہمیں تیزی سے جگہ چھوڑتے اور اپنا نشانہ خطا جاتے دیکھتے ہی اس نے بھی بہ سرعت جگہ تبدیل کرنے کی غرض سے ''بلینک پوائنٹ'' کی سمت چھلانگ لگا کر پیراٹروپنگ کے انداز میں خود کو میری چلائی ہوئی گولی کی آتشیں زد سے بچایا تھا۔ مگر میں بھی اسے سنبھلنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لئے اوپر تلے گولیاں برساتا چلا گیا۔ وہ بھی شاید کوئی چھلاوا صفت انسان تھا کہ پھرتی کے ساتھ قلابازیاں کھاتا چلا جا رہا تھا۔ اور مجھے اس وقت اس کی چالاکی اور اپنی بے وقوفی کا اندازہ ہوا جب میرے میگارد سے ''ٹرچ'' کی خالی آواز اُبھری۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ تاہم میں نے اس نازک صورت حال میں اپنے حواس کو مختل نہ ہونے دیا اور تیزی کے ساتھ اس کے زمین پر بے سدھ پڑے ساتھی کے قریب گری ہوئی رائفل کی سمت لپکا مگر مدمقابل نے سنبھلتے ہی مجھ پر گن تان لی اور دور ہی سے چلّا کر بولا۔

''خبردار!.....اپنی جگہ سے بالکل حرکت مت کرنا.....ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔''

میں جہاں کا تہاں رہ گیا۔ یکایک ماحول پر اعصاب شکن خاموشی طاری ہو گئی۔ زمین پر زخمی پڑے چوہدری ذیشان کا چہرہ بھی ست کر رہ گیا تھا جبکہ میرے اعصاب پوری طرح تنے ہوئے تھے اور دل گویا سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا۔ میری نظریں اس گن بردار شخص پر جمی ہوئی تھیں جو اب کینہ توز نظروں سے مجھے گھورتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر میرے قریب پہنچ کر وہ رکا اور مجھ پر رائفل تانے آنکھیں سکیڑے بہ غور مجھے خوفناک نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر میرے دائیں جانب زمین پر زخمی پڑے کراہتے ہوئے چوہدری ذیشان سے سفاکانہ لہجے میں بولا۔

''چوہدری! تیرا آخری وقت تو آن پہنچا ہے۔ پہلے ذرا میں تیرے اس خدائی فوجدار سے بات کر لوں۔'' یہ کہہ کر وہ مجھ سے خوف ناک لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے غرا کر بولا۔

''ہاں.....اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے، تم کون ہو؟''

''میں ایک شکاری ہوں۔ اور یہاں برفانی لومڑیوں کا شکار کر رہا تھا کہ میں نے تم لوگوں کو ایک نہتے آدمی پر فائرنگ کرتے دیکھا۔'' اتنا کہہ کر میں دانستہ رکا اور اس کی گھورتی ہوئی نظروں سے اپنی نگاہ یکدم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



کچھ ایسے چونکتے ہوئے انداز میں اس کے عقب کی جانب ڈالی گویا میں نے اس کے پیچھے کسی کو اچانک دیکھ لیا ہو۔ یہ ایک پرانا حربہ تھا جسے میں نے ذرا بدل کر بالکل فطری اور غیر ارادی اداکاری سے آزمایا تھا، کامیاب رہا۔ حسب توقع وہ پیچھے دیکھنے کے لئے ذرا مڑا ہی تھا کہ میں نے ''اب نہیں تو کبھی نہیں'' کے مصداق بجلی کی پھرتی کے ساتھ اچھل کر فلائنگ کک کے انداز میں اپنی دونوں ٹانگیں اس کے سینے پر دے دیں۔ وہ اچھل کر کئی قدم پیچھے لڑکھڑاتے ہی زمین پر گرا تو لامحالہ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر دور پڑی۔ وہ بازی ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر فوراً ہی تڑپ کر سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا مگر میں اب اسے کہاں موقع دینے والا تھا۔ میں نے دائیں ٹانگ کو حرکت دی اور لانگ بوٹ کی ٹو اس کی ٹھوڑی پر پڑی۔ وہ ایک بار پھر خاک چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے لپک کر گن اٹھائی اور اس پر تان لی اور غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''بس!.....اب تمہارا کھیل ختم اور ہمارا شروع۔ دونوں ہوا تھ بلند کر لو۔''

وہ مجھے قہر ناک نظروں سے گھورنے لگا۔ چوہدری ذیشان بہ مشکل اپنی زخمی ٹانگ پکڑے کراہتے ہوئے بولا۔ ''نوجوان! اپنی گن مجھے دو اور تم میری گاڑی سے رسی اٹھا لاؤ۔''

میں ذرا تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ تاہم میں نے ایسا ہی کیا۔ مگر چوہدری ذیشان کو گن تھمانے سے پہلے میں نے مقابل کو درشت حکم دیا۔ ''تم نے سنا نہیں؟.....اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر کے دوسری طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔''

اس کے پاس میرے حکم کی تعمیل کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے دانت پیستے ہوئے میرے حکم کی تعمیل کی تو میں نے چوہدری ذیشان کو رائفل تھماتے ہوئے کہا۔

''چوہدری صاحب! ذرا محتاط رہیں.....آپ زخمی ہیں۔ یہ ذرا حرکت کرے تو بے دریغ اسے گو مار دیں۔''

''آئی نو بیٹا!.....آئی نو!'' چوہدری ذیشان ہانپتی ہوئی آواز سے بولا اور مجھ سے رائفل لے اپنے دشمن کی طرف اس کا رخ کر دیا۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا انٹرکولر کے قریب پہنچا تو اچانک عقب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی..... میں تیزی سے پلٹا اور ششدر سا رہ گیا۔ میں نے مقابل کو تیزی کے ساتھ زگ زیگ انداز میں ایک طرف تاریکی میں دوڑتے دیکھا اور چوہدری ذیشان اس پر گولیاں داغے جا رہا تھا۔ اس کے دشمن نے اندھا جواء کھیلا تھا۔ کیونکہ اسے شاید بہ خوبی اس بات کا اندازہ تھا کہ چوہدری ذیشان زخمی ہونے کی صورت میں اس کا بروقت اور ٹھیک نشانہ نہیں لے سکتا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے مدمقابل نے یہ اندھا جواء بڑی کامیابی سے کھیلا اور چشم زدن میں تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اندھیرے جنگل میں غائب ہو گیا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ چوہدری ذیشان کے دشمن معمولی حیثیت کے نہیں تھے۔ وہ لڑائی بھڑائی میں خاصی مہارت اور مشاقی رکھتے تھے۔ بہرطور بھاگا ہوا دشمن ہمارے لئے اب کسی وقت بھی خطرناک بن سکتا تھا۔ تعاقب میں دوڑنا عقل مندی نہ تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا چوہدری ذیشان کے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر شدید جھنجلاہٹ طاری تھی۔ میں نے اس سے قدرے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''چوہدری صاحب ہمیں اب بلا تاخیر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ آیئے!'' یہ کہہ کر میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اس کی زخمی ٹانگ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ کاٹ دار اور سرد ہواؤں کے باعث جریان خون کم کم ہی ہو رہا تھا۔ وہ میرے سہارے جیپ تک آیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر



دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھانے کے بعد ایک محتاط نگاہ گرد و پیش تاریک جنگل پر ڈالنے کے بعد تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

''نوجوان! تمہاری بہادری سے زیادہ مجھے تمہارے اس سرفروشانہ اور انسانی جذبے نے بے حد متاثر کیا ہے۔'' چوہدری ذیشان اپنے زخم کی پرواہ کئے بغیر چند ثانیوں تک مجھے تکتے رہنے کے بعد گہرے لہجے میں بولا۔

''چوہدری صاحب! آپ نے شاید میری اطلاع کو جھوٹ سمجھا تھا۔ ورنہ آپ اس حال کو نہیں پہنچتے۔'' میں نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں.....ایسی بات نہیں تھی۔'' وہ مرتعش سی آواز میں بولا۔ ''میں نے فوراً اپنے ساتھیوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ ہم نے جم کر دشمنوں کا مقابلہ کیا مگر بدقسمتی سے ایک تو دشمنوں کے مقابلے میں ہماری تعداد کم تھی اور پھر ہمارے پاس خاطر خواہ اسلحہ نہ تھا۔ میرا سالا بھی مارا گیا اور میرے ساتھی بھی۔ میں بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔'' سانس لینے کے لئے اس نے تھوڑے توقف کے بعد میری طرف احسان مندانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نوجوان! سچ پوچھو تو مجھے بھی اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ مگر تم نے عین وقت پر میری جان بچا کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔''

''میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا چوہدری صاحب!'' میں ہولے سے بولا۔ پھر گفتگو بدل کر دوبارہ کہا۔ ''آپ کو موبائل کے ذریعے علاقائی انتظامیہ کی ہیلپ تو ضرور لینی چاہئے تھی۔''

''بدقسمتی سے رابطہ نہ ہو پایا تھا اور پھر دشمن سر پر پہنچ گئے تھے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ اس پر نیم غشی سی طاری ہونے لگی تھی اور اس کا سر سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف لٹک گیا۔ میں نے ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے رکھے دوسرے ہاتھ سے اس کی نبض چیک کی، وہ چل رہی تھی۔ اس پر یقیناً نقاہت کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔

میں پریشان ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اسے کہاں اور کون سے ہسپتال میں لے جاؤں۔ پہلا دیہات پھاٹک ہی نظر آتا تھا۔ اگر نظر حیات اس کے ساتھ منتھی نہ ہوتا تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ درحقیقت میں چوہدری ذیشان کے ساتھ اپنے دشمن کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ نظر حیات جیسے کمینے، مکار دشمن سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ وہ الٹا چوہدری ذیشان کے دشمنوں کو خفیہ طور پر میرے پیچھے لگا دیتا

اب میں بیک وقت کئی پیچیدگیوں کا شکار ہو سکتا تھا۔ یہ پولیس کیس تھا اور ضابطے کی روایتی کارروائی میں بلاوجہ میں بھی جکڑا جا سکتا تھا۔ ناچار میں نے سب سے پہلے پھاٹک پہنچ کر متعلقہ تھانے کا رخ کیا۔ تھانے کے نیند سے اٹھائے ہوئے عملے نے میرا بیزاری سے استقبال کیا۔ مگر جب انہیں ایم این اے چوہدری ذیشان کا نام معلوم ہوا تو سب الرٹ ہو گئے۔ فوراً ایک سنتری کو تھانے دار صاحب کے کوارٹر روانہ کیا گیا۔ وہ سادہ وردی میں ہی چوہدری ذیشان کا نام سن کر بھاگا چلا آیا۔ موبائل تیار کی گئی اور فوراً چوہدری ذیشان کو قریبی ہسپتال لے جایا گیا جہاں اسے فوری طور پر ابتدائی طبی امداد دے کر ہوش میں لایا گیا۔ اس کی ٹانگ کے زخموں کے معائنے اور علاج کے بعد اسے تسلی دی کہ سردست ایسی خطرے والی کوئی بات نہیں۔ پانچ گولیاں لگی تھیں۔ تین تو پنڈلی کا گوشت پھاڑتی ہوئی پار ہو چکی تھیں، ایک ران کے گوشت میں پیوست تھی۔ اسے نکال دیا گیا تھا۔ جبکہ پانچویں گولی نے پنڈلی کی ہڈی کو تھوڑا بہت نقصان پہنچایا تھا۔ اب انہیں کسی بڑے ہسپتال لے جانا ضروری تھا تاکہ کوئی کنسلٹنٹ آرتھو پیڈک سرجن ان کی ٹانگ کی ہڈی کی پراپر سرجری کر سکے۔

ہوش میں آنے کے بعد چوہدری ذیشان نے میری اندرونی پریشان کن کیفیات بھانپ لی تھیں اس سلسلے میں اس نے مجھے پہلے ہی مسکراتے ہوئے اس بات کی تسلی دے دی تھی کہ وہ مجھے منظر عام لانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ وہ اثر و رسوخ والا شخص تھا۔ اس کے لئے یہ کام کیا مشکل تھا۔ چنانچہ دونوں کی آپس کی مختصر بریفنگ کے بعد میں نے پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ میں نے انہیں زخمی حالت میں جنگل میں پڑے پایا اور یہاں اٹھا لایا، وغیرہ۔ پھر چوہدری ذیشان اپنے دشمنوں کے خلاف بیان ایف آئی آر وغیرہ کٹوانے لگا تو مجھے اس نے وہاں سے ''کھسکا'' دیا۔ یوں چوہدری ذیشان نے خوبصورتی سے مجھے معاملے سے الگ کر دیا تھا۔ بقول اس کے کہ اب اس کے لئے یہی کافی تھا کہ زندہ بچ گیا تھا۔ اب وہ اپنے دشمنوں کو (جنہیں وہ اچھی طرح جانتا بھی تھا) ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ رخصت ہوتے وقت چوہدری ذیشان نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا تھا جس میں اس کا سیل فون نمبر بھی موجود تھا۔ میں وہاں سے واپس روانہ ہوا اور ''سرائے سیاں'' جا پہنچا۔

''سرائے سیاں'' آبادی سے ذرا ہٹ کے تھی مگر تھی خوب صورت۔ یہ ایک چوبی عمارت پر مشتمل تھی اس وقت وہاں ویرانی کا راج تھا۔ میرا شکار ادھر ہی کسی کمرے میں پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اسے اگلے چوہدری ذیشان کے سلسلے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ میرے لئے فی الوقت یہ اچھا موقع تھا۔

میں نے دانستہ اپنی جیپ ذرا دور درختوں کے جھنڈ میں روکی اور سرائے کی طرف بڑھ گیا۔ قریب کر میں بھی اندر احاطے میں داخل ہوا۔ سامنے بڑا سا محرابی دروازہ تھا جو اس کا داخلی دروازہ تھا اور بند تھا میں نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ چار والے تھے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے میں ابھی دو ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ یہ سرائے تھی، اس لئے یہاں کسی مسافر کی کسی بھی وقت آمد کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ میں نے دوسری بار ذرا زور سے دستک دے ڈالی اندر کسی کے ہولے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے چند ثانیوں بعد ایک بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا۔

''بابا! میں مسافر ہوں..... کمرہ چاہئے۔'' میں نے کہا۔

''اندر آ جاؤ۔'' اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔

یہ ایک ہال نما کمرہ تھا۔ ایک کونے میں بڑا سا آتش دان سلگ رہا تھا۔ وہاں ایک خالی چارپائی اس کے قریب ہی میز کرسی دھری تھی میز پر ایک بڑا سا رجسٹر اور قلم رکھا ہوا تھا۔ ہال میں سات، آٹھ قریب لائن میں چارپائیاں دھری تھیں۔ اوپر رضائیاں اوڑھے کچھ لوگ سوئے ہوئے تھے۔ کمرے کی گرم تھی۔ سامنے کی دیوار پر سیاہ بڑے بڑے جلی حروف سے ''کمرہ، برآمدہ اور چارپائی'' پر سونے الگ الگ ریٹ درج تھے۔

وہ بوڑھا شخص مجھے لئے میز کے قریب آ گیا اور کرسی پر بیٹھ کر رجسٹر اور قلم سنبھالتے ہوئے مجھ بولا۔ ''ہاں بھائی! کیا چاہئے؟..... کمرہ یا چارپائی؟''

''کمرہ۔'' میں نے کہا۔

''کمرے کے دو سو روپے ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''نام بتاؤ۔''

''اختر حسین۔''


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوئم

''شناختی کارڈ؟''

''شناختی کارڈ تو میرے پاس نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''کتنے دن رہنا ہے؟''

''بس، آج ہی کی رات۔''

''نکالو دو سو روپے۔''

میں نے دو سو روپے جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ خانہ پری کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ہال کے دوسرے دروازے سے ایک پتلی نیم تاریک راہداری میں لے آیا۔ یہاں صرف دائیں جانب قطار اندر قطار صرف آٹھ نو کے قریب کمرے نظر آئے تھے۔ وہ مجھے لے کر سب سے آخری سرے میں واقع ایک کمرے کے سامنے پہنچا اور پھر اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر تالا کھولا اور پھر واپس جانے لگا تو میں نے اسے روک کر کہا۔

''بابا! میرا ایک دوست بھی یہاں آنے والا تھا۔ دراصل ہم برفانی لومڑیوں کے شکار کی غرض سے یہاں اکٹھے ہونا چاہتے تھے۔ اس کا نام نظر حیات ہے۔ وہ کون سے کمرے میں ہے؟''

میری بات پر وہ کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''نام تو مجھے یاد آتا ہے مگر..... کمرہ نمبر.....؟'' وہ کچھ سوچتا رہا پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا، بولا۔ ''ہاں..... یہ سامنے والے سے دو کمرے چھوڑ کر۔ مگر اب تم صبح ہی مل لینا۔ اس وقت دروازہ زور سے تمہیں کھٹکھٹانا پڑے گا۔ دوسرے مسافروں کی نیند خراب ہو گی۔''

''ٹھیک ہے..... میں خود بھی اس کی نیند نہیں خراب کرنا چاہتا۔ تسلی ہو گئی میری کہ وہ ادھر آ چکا ہے۔'' میں نے گویا اس کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ بوڑھا مجھ سے مطمئن ہونے کے بعد واپس لوٹ گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا۔ کمرے کا سرسری جائزہ لیا۔

صرف ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر گرم بستر بھی موجود تھا جو صاف ستھرا تھا۔ ایک اٹیچڈ باتھ بھی تھا۔ ایک کھڑکی تھی جو باہر کھلتی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اپنے میگارد کے چیمبر میں گولیاں بھر لیں، اس کے بعد کمرے سے باہر آ گیا۔ راہداری پر دور تک نگاہ ڈالی، کوئی نہ تھا۔

میں نے بوڑھے کے بتائے ہوئے نظر حیات والے کمرے کو ذہن نشین کر لیا تھا۔ یقیناً دوسرے کمرے میں اس کے چند خدمت گار ٹائپ کے ساتھی بھی موجود ہو سکتے تھے۔ تاہم میں دبے پاؤں نظر حیات والے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ دروازہ ظاہر ہے، اندر سے بند ہی تھا۔ میں سوچنے لگا۔ اچانک مجھے اندر کمرے سے ہلکی سی گنگناتی آواز سنائی دی۔ یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ یہ موبائل کی بیل تھی۔ میں دم سادھے کھڑا رہا۔ تاہم میں نے اپنا ایک کان دروازے سے چپکا دیا۔ بیل مسلسل بج رہی تھی۔ اچانک جب بیل آنا بند ہو گئی تو میں فوراً سمجھ گیا کہ اندر موجود نظر حیات نے جاگ کر کال سننے کے لئے اپنا موبائل آن کر دیا تھا۔

''ہیلو..... چوہدری صاحب! آپ..... کیا ہوا؟..... اوہ نو، کک..... کب؟.....

کک..... کیسے ہوا یہ سب؟..... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟..... مم..... میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔''

یہ نظر حیات کی بوکھلائی ہوئی آواز تھی اور لکنت زدہ آواز سے میں سمجھ گیا تھا کہ چوہدری ذیشان نے ہی اس سے رابطہ کیا ہو گا اور موجودہ صورت حال کی سنگینی سے باخبر کیا ہو گا۔

پھر اچانک مجھے اندر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ وہ یقیناً پہلے اپنے دوسرے کمرے میں موجود ساتھیوں کو جگانے کے ارادے سے باہر

نکل رہا تھا۔ میں نے بہ سرعت اپنی جیکٹ کی جیب سے اپنا میگارڈ نکال لیا اور پھر جیسے ہی اندر سے باہر کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ تھوڑا وا ہوا، میں نے دروازے کو زوردار دھکا دیا۔ نظر حیات دروازے سے ٹکرا کر چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور بوکھلائے ہوئے نظر حیات کی پیشانی سے اپنے میگارڈ کی بھیانک نال لگا دی۔ پھر اسے خوفناک نظروں سے گھورتا ہوا ہولناک لہجے میں غرا کر بولا۔

"کتے! آج تیری زندگی کا آخری دن ہے۔"

مجھے اس دور دراز برفیلے علاقے کی ایک دور افتادہ سرائے میں بالکل غیر متوقع اپنے سامنے پا کر اس کی آنکھیں مارے دہشت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے مگر یقینی موت کے خوف تلے اس کے منہ سے الفاظ نہیں برآمد ہو پا رہے تھے۔

میں نے اسے بستر پر دھکا دیا اور اپنی ایک ٹانگ چارپائی پر ٹکا کر اس پر جھک گیا۔

"اب بولو نظر حیات!......... کیا کہتے ہو؟......... صرف ایک گولی......... مگر نہیں، مجھے گولی ضائع کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے کہ میں اپنے باپ کے قاتل اور اپنی کو ساری عمر جرمِ بے گناہی بھوگنے والے دشمن کا با آسانی گلا دبوچ سکوں۔"

میرے لہجے سے میری دیرینہ آتشِ انتقام کی تپش کو محسوس کرتے ہی نظر حیات پر یقینی موت کے خوف سے لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کی بری طرح گھگھی بندھ چکی تھی۔ وہ ابھی تک ہکا بکا سی کیفیات کا شکار مارے وحشت کے پھٹی پھٹی آنکھوں میں ابھی تک غیر یقینی کے تاثرات بھی مترشح ہو رہے تھے۔

"نظر حیات! میں چاہتا تو کسی بھی وقت تمہارے کھوکھلے محل کی کاغذی دیواروں کو پھلانگ کر تم تک پہنچ سکتا تھا۔ مگر میں نے ایسا اب تک جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔" میں نے دانت پیس کر اور اس پھیلی ہوئی آنکھوں میں زہر کی طرح سرایت کرتی نظروں سے گھور کر دوبارہ کہا۔ "اس لئے کہ تمہارے دل و دماغ سے یہ خوش فہمی نکل سکے کہ تم میرے انتقام سے دنیا کے کسی گوشے میں بھی محفوظ نہیں رہ سکتے چاہے وہ پاتال کی گہرائیاں ہی کیوں نہ ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے میگارڈ کی نال اس کی پیشانی سے ہٹا دی اور اسے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی تو وہ گھٹی گھٹی لرزتی آواز میں بولا۔

"مم......... مجھے معاف کر دو......... نن......... نادر!"

"معافی.........!" میں نے بھویں اچکا کر سفاک لہجے میں کہا۔ "معافی کس چڑیا کا نام ہے؟ اور بھی تمہارے سلسلے میں معافی؟......... نہیں، نہیں......... نظر حیات! نہیں......... اب تمہیں میرے ہاتھوں یقینی موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" میں کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر لرزیدہ آواز میں میری منت سماجت کرتے ہوئے بولا۔ "نن......... نادر! مم......... میں اعصابی مریض ہوں۔ یقین کرو......... جب سے میں نے شاہ میر کی حالت زار دیکھی ہے تب سے اب تک ایک لمحے کو بھی سکون کی نیند سے نہیں سو سکا ہوں۔ تم ماں بیٹے کی دہشت اس دن سے ہی میرے اعصاب پر سوار ہو چکی ہے۔ مم......... میں........."

"بند کرو اپنی بکواس......... کتے!" میں نے ابلتی آنکھوں کے ساتھ غرا کر کہا۔ "تو کیا سمجھتا ہے میں تجھے اتنی آسان موت مار دوں گا؟......... ہرگز نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے ڈرامائی انداز میں اس کی گردن ایک جھٹکے سے چھوڑ دی۔ اس کے بعد اپنے میگارڈ کے چیمبر سے ساری گولیاں نکال دیں۔ پھر


Courtesy www.pdfbooksfree.pk


گولیاں اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال کر صرف ایک گولی نظر حیات کی خوف سے پھیلی ہوئی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں مسکرا کر بولا۔

"چلو پھر......... تمہاری قسمت کو آزماتے ہیں نظر حیات! میں ایک گولی چیمبر میں ڈال کر چکری کو گھماؤں گا۔ پھر تمہاری پیشانی پر نال رکھ کر ٹرائیگر دباؤں گا......... ایسا میں تین مرتبہ کروں گا۔ اب یہ تمہاری قسمت ہو گی کہ تینوں مرتبہ پستول خالی ہی چلتا رہے یا پھر کسی ایک بار میں گولی چل جائے۔"

یہ کہہ کر میں نے وہ ایک گولی چیمبر کے اندر ڈالی اور گول چکری کو گھمایا۔ پھر موٹا سا تکیہ اٹھا کر اپنے میگارڈ کی نال کے آگے کیا، پھر اس کے سینے پر رکھ دیا تا کہ گولی چلنے کی صورت میں زیادہ آواز برآمد نہ ہونے پائے۔

یہ محاورتاً نہیں، حقیقتاً زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ مگر صرف دشمن کے لئے۔

"نن......... نہیں......... ایسا مت کرو۔" نظر حیات نے چلانے کی کوشش میں اپنے حلق سے یہ کہتے ہوئے آواز بلند کرنا چاہی تو میں نے دوبارہ اس کی گردن دبوچ لی۔

"خبردار!......... اب چیخنے کی کوشش مت کرنا......... ورنہ تین بار نہیں، اس وقت تک ٹرائیگر دباتا چلا جاؤں گا جب تک فائر نہیں ہو جاتا۔" میں نے اسے غرا کر خوفناک دھمکی دی۔

اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں التجا کرتے ہوئے بولا۔

"د......... دیکھو......... تت......... تم تین بار کی بجائے......... صرف ایک بار ٹرائیگر دبا کر مجھے چھوڑ دو........." مگر پھر دوسرے ہی لمحے "اندھی موت" کے تصور سے لرز کر دوبارہ کپکپاتی آواز میں بولا۔ "نن......... نہیں۔ ایک بار بھی ٹرائیگر مت دبانا......... ورنہ......... ورنہ گولی چل جائے گی۔"

موت کے خوف نے اسے بری طرح اعصاب زدہ بنا ڈالا تھا۔

"چچ......... چچ......... اتنا خوف؟" میں جیسے اس کی کیفیاتِ قریب المرگ سے حظ اٹھاتے ہوئے سفاکانہ مسکراہٹ سے بولا۔ "تم تو میرے سامنے بہت اکڑتے تھے۔ اب تمہاری حالت کسی چوہے سے بھی بدتر ہو رہی ہے۔"

دشمن کو موت سے پہلے موت کے جاں گسل خوف تلے مبتلا کر کے مجھے زیادہ تسکین محسوس ہو رہی تھی۔

"بس، اب کھیل شروع ہوا چاہتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے سینے پر پستول کی نال کو تکیے سے لگا کر ٹرائیگر دبا دیا......... کمرے کے ہولناک ماحول میں "ٹرچ" کی خالی آواز اُبھری۔

میں نے دیکھا، خون کو برف بنا دینے والی کاٹ دار سردی کے باوجود نظر حیات کی پیشانی پر ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئیں اور اس کی سانس یوں تیز تیز چلنے لگی جیسے وہ کئی میلوں تک دوڑتا ہوا آ رہا ہو۔ وہ لرزیدہ آواز میں دوبارہ مجھ سے بولا۔

"خ......... خدا کے لئے......... اب......... اب دوبارہ ٹرائیگر مت دبانا......... ہو......... ہو سکتا ہے کہ اب کی بار گولی......... سامنے آ گئی ہو۔"

"ہاں! یہ تو عین ممکن ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا کر اطمینان سے کہا۔ "مگر ابھی تو صرف ایک باری آئی ہے۔ دو مرتبہ ٹرائیگر دبانا باقی رہتا ہے۔"

"نن......... نن......... نہیں۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ مگر میں نے ٹرائیگر دبا دیا۔ اس بار بھی خالی "ٹرچ" کی آواز اُبھری۔ یقینی موت کے خوف سے کپکپاتے ہوئے نظر حیات کی پھیلی آنکھوں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



زندگی کا دیا پھر روشن ہوا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ زور زور سے ہانپنے لگا۔ پیشانی تو کیا اس بار اس کا وجود ہی پسینے سے شرابور ہونے لگا تھا۔

''اوہ..... میرے دشمن کی قسمت تو اچھی ہے..... خیر، اب تیسری اور آخری بار ٹرائیگر دبا رہا ہے۔'' میں نے سنگدلانہ لہجے میں سرسراتی مسکراہٹ سے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

اس کی موت کے خوف سے بری طرح مٹھی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے اور میری ماں کو دھونس دھمکی دینے والا دھاڑتا، چنگھاڑتا نظر حیات اس وقت بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔ میں نے اس کے مختل پڑتے حواس غیر ہوتی حالت سے مزید محظوظ ہونے کی غرض سے آخری ''سیشن'' کو ذرا طول دیا۔

''کیوں نظر حیات!..... آج معلوم ہو رہا ہے نا، موت کا خوف کیا ہوتا ہے؟ اور زندگی کیا رکھتی ہے۔ مگر تُو نے اور شاہ میر نے تو بڑی گھناؤنی سازش کے ساتھ میرے باپ کو زہر دے کر مار ڈالا اور میری ماں کو تم نے کھلونا بنانے کی کوشش کی تھی اور..... اور پھر تُو نے میری ماں پر دوہرا ظلم کیا ڈالا کہ اس بے چاری کو بھری جوانی میں بیوہ کرنے کے بعد اسے اسی کے شوہر کے قتل کے جھوٹے میں عمر قید بھگتانے کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی دھکیل دیا۔'' میرا لہجہ آتش انتقام سے پُرغیظ جا رہا تھا۔

''کاش..... اس بار گولی چل جائے اور تیرا ناپاک دھڑکتا ہوا وجود موت کی اتھاہ تاریکیوں میں ہو جائے..... کاش!..... میں دبا رہا ہوں ٹرائیگر..... آخری بار!''

''نن..... نن.....'' مارے خوف کے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ ''مم..... مم..... میرا کچھ لے لو نادر!..... مم..... میں ساری عمر تم ماں بیٹے کے پاؤں چاٹتا رہوں گا۔ م..... دیکھو..... دیکھو، اب کی بار ٹرائیگر مت دبانا..... کیا خبر..... کیا خبر.....'' وہ بری طرح لرزنے لگا۔

''میں دبا رہا ہوں ٹرائیگر.....!'' میں نے سلگتی آنکھوں سے اسے گھور کر کہا۔ وہ تڑپنے لگا۔ مگر میں بھی اپنے پورے وجود کی طاقت کے ساتھ اسے دبوچے ہوئے تھا۔ اور پھر تیسری بار بھی میں نے ان ''نا..... نا..... نا.....'' کے دوران ٹرائیگر دبا دیا۔ کمرے کے دم بہ خود ماحول میں تیسری بار ''ٹرچ'' کی آواز اُبھری اور نظر حیات کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھنے لگیں۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کے موت کے خوف سے زرد پڑتے ہوئے چہرے پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی اور پاگلوں کی طرح خوش ہو کر بولا۔

''مم..... مم..... میں بچ گیا..... بچ گیا..... میں..... نن..... نادر! گگ..... اس بار بھی نہیں چلی۔''

''ہاں..... تُو بچ گیا کتے! مگر میں دوبارہ تیرے پاس آؤں گا۔ اور اگلی بار تیرے ساتھ اس سے بھی زیادہ گھناؤنا موت کا کھیل کھیلوں گا۔'' میں نے لہو رنگ لہجے میں اس سے کہا۔ اس کے بعد میں نے پستول اس کے سینے سے ہٹا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ یقینی موت کے خوف سے اس کا بستر غلیظ ہو چکا تھا تب میں نے اس کے جسم کو تشنجی جھٹکے لگتے ہوئے دیکھا۔ اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں کمرے سے نکلا اور ہال سے گزر کر سرائے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے اس بوڑھے کو آتش دان کے قریب رکھی چارپائی پر خراٹے لیتے دیکھا۔ خاموشی کے ساتھ سرائے سے باہر آ گیا۔



پیدہ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے اپنا میگارد نکال لیا۔ پھر ے چیمبر کو دیکھا، وہ بالکل خالی تھا۔ میرے ہونٹوں پر خود بخود زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ کیونکہ نے چیمبر میں ایک گولی بھی نہیں ڈالی تھی۔ محض نظر حیات کو ایک گولی کی جھلک دکھائی تھی اور جس وقت میں چیمبر بند کرنے لگا تھا تو اس دوران میں نے اس کی خوف زدہ نظروں سے بچا کر وہ گولی اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ اس پر خوف طاری تھا جس کی وجہ سے وہ میری یہ ''چور'' حرکت نہیں دیکھ پایا تھا۔

میں نے چیمبر میں ساری گولیاں بھریں اور پھر بھرے ہوئے میگارد کو اپنی جیب میں دوبارہ رکھتے ہوئے جیپ آگے بڑھا دی..... اب میرا رخ ''کھیاں'' کی طرف تھا۔

اپنی سرائے میں آ کر میں نے چند گھنٹے نیند لی۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا کھا کر واپس رخت سفر باندھا۔ مجموعی طور پر میری یہ مہم کامیاب رہی تھی۔ میں نظر حیات کو ذہنی و دماغی طور پر ایک زبردست ٹاک سے دوچار کر چکا تھا۔ میں نے اپنے اس انوکھے انتقام کی ابتداء کر ڈالی تھی اور نظر حیات جیسے گناؤنے دشمن کو میں موت سے پہلے موت کے خوف میں جکڑ چکا تھا۔ یہی میری دیرینہ آرزو تھی کہ میں اسے قطرہ قطرہ موت کا زہر پلاتا رہوں۔

چوہدری ذیشان والا چکر میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے دشمن کون تھے اور اسے کیوں ہلاک کرنا چاہتے تھے؟ اس نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یا پھر حالات ایسے تھے کہ میں خود بھی اس معاملے سے جلد از جلد دور ہو جانا چاہ رہا تھا۔

میں نے ایک مقام پر گاڑی ری فیول کروائی اور آگے بڑھ گیا۔

ہری پائے اور بٹ راس کے گھنے جنگلات سے گزرنے کے بعد جب میں شاہراہِ ریشم پر پہنچا تو شام ڈھلنے لگی تھی۔ وہاں سے ایبٹ آباد پہنچتے پہنچتے مجھے رات نے آن لیا۔

اب یہاں سے مری یا نتھیا گلی تقریباً پچاس ساٹھ کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔ میرا نان اسٹاپ سفر جاری تھا کہ اچانک مجھے اپنی جیب میں رکھے موبائل پر وائبریٹنگ کال محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً موبائل نکال کر ڈیشبورڈ میں دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ ماں نے مجھ سے رابطہ کیا ہو گا۔ لیکن یہ کال غزالہ کی تھی۔ میں نے احتیاط کے پیش نظر موبائل کو کال ٹون سے وائبریٹنگ الرٹ پر رکھا ہوا تھا۔ بہرطور غزالہ کی اس اچانک کال پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔

''ہیلو..... غزالہ! میں نادر بول رہا ہوں۔ خیریت تو ہے؟''

''نن..... نادر! تت..... تم اس وقت کہاں ہو؟'' دوسری جانب سے اس کی ہراساں آواز سنائی دی تو میں نے قدرے چونک کر کہا۔

''کیوں، خیریت ہے؟..... میں اس وقت ایبٹ آباد سے واپس اپنی رہائش گاہ جا رہا ہوں۔''

''گگ..... کیا تم بٹ راس اور کھیاں سے آ رہے ہو؟'' اس نے یکدم پوچھا تو مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے فوراً جیپ کی رفتار ذرا دھیمی کر دی اور جب اسے اثبات میں جواب دیا تو وہ بے اختیار متوحش لہجے میں بولی۔

''اوہ مائی گاڈ!..... تت..... تو یہ تم ہی تھے؟''

''غزالہ! آخر بات کیا ہے؟ کیا ہوا ہے؟'' میں نے اُلجھن آمیز پریشانی سے کہا تو وہ بتانے لگی۔

''کیا تمہارا پھاگل اور کھیاں میں کچھ لوگوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تھا اور تم نے کچھ مسلح لوگوں کے خونی پنجے سے قومی اسمبلی کے ممبر چوہدری ذیشان کی جان بچائی تھی؟''

''ہاں.....''

''نادر! تم سے نادانستگی میں ایک بہت بھیانک غلطی ہوگئی ہے۔'' میرے مختصر اثباتی جواب پر غ نے ہولناک لہجے میں کہا تو میں بھی جھلا کر بولا۔

''آخر بات کیا ہے؟ تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟ کھل کر کیوں نہیں بتاتیں، معاملہ کیا ہے؟''

''نادر! وہ اشفاق شاہین کے آدمی تھے جو چوہدری ذیشان کو قتل کرنا چاہتے تھے۔'' غزالہ نے ایک دھماکا کیا اور مجھے حیرت اور پریشانی کا ایک زبردست جھٹکا لگا۔

''مم.....مگر تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟'' میں نے اپنے حواس پر ذرا قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے طارق نے بتایا ہے۔''

''طارق.....؟'' میں سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔

''کیا تم بھول گئے غفورے کے قریبی ساتھی شکیل کو؟ وہی جو مجھ سے سچی محبت کا دم بھرتا ہے اور اچھا دوست بھی ہے۔'' اس نے مجھے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا کہ غزالہ نے مجھے ایک ایسے نوجوان کے بار میں بتایا تھا جو اشفاق شاہین کے گینگ میں شامل تھا اور غفورے کا دم بھرتا بھی تھا۔ وہ غزالہ سے محبت دعویٰ دار تھا اور اسی کی طرح وہ ان لوگوں سے بددل ہو چکا تھا۔

''ہاں..... یاد آیا..... بتاؤ، اسے کیسے یہ سب پتہ چلا؟'' میں نے بالآخر کچھ کچھ یاد کر ہوئے کہا تو غزالہ بولی۔

''جب تمہارا ''پھاگل'' میں اشفاق شاہین کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا تھا تو ایک اعجاز عرف جاجو شخص نے تمہیں فوراً پہچان لیا تھا۔ مگر وہ تمہارے ہاتھوں شدید زخمی ہوگیا تھا۔ پھر نہ جانے کس طرح نے گرتے پڑتے کسی قریبی آبادی پہنچ کر اشفاق شاہین کو تمہارے بارے میں مطلع بھی کر دیا کہ ان بنایا کھیل کس نے بگاڑا تھا؟''

''مگر.....اس نے مجھے کیسے اور کب پہچانا؟'' میں نے اُلجھ کر پوچھا تو وہ جواباً بولی۔

''جس وقت تمہاری میرے سلسلے میں پہلی میٹنگ اشفاق شاہین اور غفورے کے درمیان اس گ والی کوٹھی لاہور میں ہوئی تھی، جاجو نے تمہیں وہاں دیکھا تھا اور پھر جب تم سے اشفاق شاہین نے ملاقات کی تھی اور تم نے بڑی چالاکی سے اسے ہموار کر کے اپنا دوست بنا لیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ کے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھر لی تھی تو اشفاق شاہین نے یہ بات غفورے کو بھی بتائی تھی۔ غفورا تمہارے ماضی سے اچھی طرح واقف ہے اور تمہیں بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ ایک انتہائی شاط ہوشیار شخص ہے۔ اس کے حلق سے یہ بات نہ اُتر سکی۔ اسے تم پر شبہ ہوگیا تھا کہ تم اس کے اور شاہین کے خلاف کسی خفیہ ٹاسک میں مصروف ہو۔ ان لوگوں کی جنگ چوہدری ذیشان سے بھی چل تھی۔ وہ ان کے کالے کرتوتوں سے اچھی طرح واقف ہے اور ان کے خلاف بڑی موثر کارروائی ہے۔ اب یہ اسے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ چوہدری ذیشان، برفانی لو کے شکار پر روانہ ہو رہا ہے تو ان لوگوں نے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا اور..... او نو..... اچانک دوسری طرف سے غزالہ بولتے ہوئے رک گئی۔ شاید اس کے ساتھ اچانک کچھ ہوا تھا۔

میں ٹھٹک سا گیا۔

''ہیلو غزالہ!.....کیا ہوا؟.....تم چپ کیوں.....'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ مجھے دوسری طرف سے غزالہ کی اضطرابی چیخ نما آواز سنائی دی۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں.....نہیں.....خدا کے لئے نہیں.....''

میرا دھک سے رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے گولی چلنے کے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً لگا دیئے۔ جیپ کے ٹائر زور سے چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ موبائل میرے کان سے ہوا تھا اور میری سانسیں جیسے سینے میں اٹک کر رہ گئی تھیں۔ دل تیزی سے جیسے سائیں سائیں کرتی پسلیوں پر دھڑک رہا تھا۔

میرے اندر زبردست پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ صاف لگتا تھا کہ غزالہ کو کسی نے بروقت ٹارگٹ بنا لیا تھا اسے گولی مار دی تھی۔ پتہ نہیں اب وہ زندہ بھی تھی یا نہیں۔ یقیناً یہ کام اشفاق شاہین کا تھا۔ دوسری نے موبائل کے گرنے کی آواز بھی آئی تھی۔ پھر کسی نے موبائل اٹھا لیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ غزالہ کام تمام کرنے والے قاتل کے ہی ہاتھ میں اس کا موبائل تھا اور اب وہ اسے آف کر دے گا۔ مگر رے ہی لمحے مجھے دوسری طرف سے ایک غراتی ہوئی شناسا آواز سنائی دی۔

''نادر!.....تم نے ہم سے ٹکر لے کر اچھا نہیں کیا۔''

اس کے ساتھ ہی دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ کیونکہ یہ آواز غفورے کی تھی۔

غفورے کی آواز اور اس کی دھمکی نے میرے پورے وجود کو عجیب کیفیت سے دوچار کر د
غیر متوقع طور پر اس کی آواز سن کر جہاں مجھے حیرت ہوئی تھی، وہیں اس کی دھمکی نے گویا میر
غیض و غضب کی بجلیاں دوڑا دی تھیں۔

موبائل پر گولی چلنے اور غزالہ کی اُبھرنے والی آخری چیخ، پھر غفورے کی دھمکی سننے کے بعد مجھ افسوس ناک حقیقت کا اندازہ لگا لینا چاہئے تھا کہ غزالہ غفورے کی بربریت کا نشانہ بن چکی تھی او شیطان صفت اشفاق شاہین کے خلاف میرے عزائم پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔

غزالہ نے مجھے موبائل پر بتا دیا تھا کہ میری اصلیت اب اشفاق شاہین کے سامنے آشکارا ہو چکی ''بھاگل'' کے برف زار ویرانوں میں موت کے ہرکاروں کے ہاتھوں میں نے چوہدری ذیشان کی بچائی تھی، نہ صرف یہ بلکہ میں نے ان ساتوں کو ناکوں چنے بھی چبوائے تھے۔ وہ درحقیقت اشفاق کے ہی ''کار پرداز'' تھے۔ دونوں کی پرانی دشمنی کا سبب وہی تھا جو میرے اور اشفاق شاہین کے مابین یعنی اس کے شیطانی گروہ کا قلع قمع کرنا۔

میرا ذہن اب تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اب مجھے اشفاق شاہین سے جنگ لڑنی پڑے گی یا کسی مکاری کی گنجائش ابھی باقی تھی......... تب پھر اچانک جیسے میرے دماغ ایک جھماکا ہوا۔

اشفاق شاہین کو دوبارہ بے وقوف بنایا جا سکتا تھا۔ میں نے جب باریک بینی سے پیش آمدہ حالا جائزہ لیا تو بے اختیار میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

یہ حقیقت تھی کہ موجودہ حالات میں بیک وقت دو دشمنوں سے نبرد آزما ہونا فی الوقت میر آسان نہ تھا۔ نظر حیات وغیرہ سے میری کھلی جنگ تھی تو اشفاق شاہین جیسے گینگسٹر کو میں اس کی میں بیٹھ کر مارنا چاہتا تھا اور وقت کا تقاضا تھا کہ میں بھیڑیوں کی صف میں گھس کر دوسری بار مکاری کام لوں۔

میں نے غیر ارادی طور پر رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور جیپ اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے بڑھا دی.........اب میرا رخ گرین لاج کی بجائے لاہور کی طرف تھا۔

❄ ❄ ❄

وہاں سے لاہور کم و بیش دو ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

میں تین ساڑھے تین گھنٹوں کی نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد لاہور پہنچا اور سیدھا اشفاق شا گلبرگ والی کوٹھی کا رخ کیا۔

آئندہ کے غیر یقینی اور خطرناک انداز میں بدلنے والے حالات کو اپنے حق میں کرنے کے ضروری تھا کہ اس سے پہلے اشفاق شاہین کے خونی ہرکارے مجھ تک پہنچتے، مجھے اپنی بات کی سچائی


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رنے کے لئے از خود اشفاق شاہین سے مل لینا چاہئے تھا۔

کوٹھی کے قریب پہنچ کر میں نے جیپ روک دی اور نیچے اتر آیا۔ گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔ یہ وہ چوکیدار تھا جسے کچھ روز قبل میں اور غزالہ رات کی تاریکی میں تختۂ مشق بنا چکے تھے۔

''اشفاق شاہین صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔

''وہ تو اس وقت یہاں نہیں ہیں۔'' چوکیدار نے بہ غور میرا جائزہ لینے کے دوران کہا۔

''کہاں جا سکتے ہیں وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ہمیں بتا کر نہیں جاتے۔''

''کیا میں اندر بیٹھ کر ان کا انتظار کر سکتا ہوں؟......... کب تک آ جائیں گے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔ چوکیدار ذرا تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔ ''میں ان کا دوست ہوں، پنڈی سے آیا ہوں۔ ملے بغیر تو میں نہیں جا سکتا۔''

''تو پھر آپ کے پاس ان کا موبائل نمبر تو ہو گا۔ آپ ان سے.........''

میں نے دانستہ اس کی بات کاٹی۔ ''مگر یہ کام میں اندر بیٹھ کر ہی کروں گا۔ تاکہ انہیں بتا سکوں کہ میں اس وقت انہی کی رہائش گاہ میں ان کا منتظر ہوں۔'' میں نے کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے کچھ سوچ کر بولا۔ ''ٹھہرو، میرا خیال ہے یہ کام مجھے ابھی کر لینا چاہئے۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنے ذہن میں اُبھرنے والے خیال کے تحت اپنی جیب سے موبائل نکالا اور اشفاق شاہین سے رابطہ کیا۔ دوسری جانب ٹون جا رہی تھی۔ میرا دل یکبارگی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔

''ہیلو.........کون؟'' معاً دوسری جانب سے اشفاق شاہین کی کھردری آواز اُبھری۔ میں نے اپنی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''جناب! میں.........نادر علی خان، اس وقت بھاگل سے سیدھا یہاں پہنچا ہوں اور آپ کی گلبرگ الی کوٹھی کے گیٹ پر کھڑا ہوں۔ آپ سے بہت ضروری بات کرنا تھی۔''

دوسری جانب ایکا ایکی پُرسوچ خاموشی چھا گئی۔ میں نے شاید اسے تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ پھر چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد اشفاق شاہین نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم اندر بیٹھو.........میں پہنچ رہا ہوں۔''

اس کے جواب پر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اس نے مجھ سے خلافِ توقع کوئی چبھتی ہوئی بات نہیں کی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ میں خود اس کے ہاں آن پہنچا تھا جو میری مکارانہ منصوبہ بندی کا پہلا مرحلہ تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے شاہین صاحب!.........لیکن آپ کا چوکیدار.........'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے مجھے موبائل چوکیدار کو دینے کا کہا۔ میں نے جھٹ سے اپنا موبائل چوکیدار کو پکڑا دیا۔

''جی سر!.........بہت بہتر۔'' چوکیدار نے موبائل اپنے کان سے لگانے کے بعد یکدم مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ اس کے بعد مجھے موبائل پکڑاتے ہوئے بولا۔ ''آیئے جناب! تشریف لائیں۔'' اب وہ مؤدب ہو گیا تھا۔ میں بغلی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ مجھے اندر ایک کمرے میں لے آیا۔ یہاں تین افراد موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ یوں اچھل پڑے جیسے انہیں بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

پھر دوسرے ہی لمحے تینوں نے بڑی پھرتی کے ساتھ پستول نکال کر مجھ پر تان لئے۔ چوکیدار ہکا بکا کھڑا ہو گیا۔ مگر میں بے پرواہانہ انداز میں چلتا ہوا صوفے پر براجمان ہو گیا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کا

منہ تکنے لگے۔

"بیٹھ جاؤ آرام سے۔ میں نے اشفاق صاحب سے ابھی تھوڑی دیر پہلے بات کی ہے، وہ آنے والے ہیں۔" میں نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم ہمارے دشمن ہو........ کھڑے ہو جاؤ۔ ہمیں تمہاری اصلیت کا پتہ چل گیا ہے۔" ایک نے بالآخر درشت لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں نے سرسراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پُراعتماد لہجے مگر ناگواری سے کہا۔

"اعجاز عرف جاجو اور غفورے کو میرے سلسلے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے باس سے بات کر لی ہے۔ یقین نہیں آتا تو اس سے پوچھ لو۔" میں نے آخر میں قریب کھڑے حیران پریشان چوکیدار کی طرف اشارہ کیا تو اس نے ان تینوں سے کہا۔

"صاحب نے مجھ سے بھی بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے اسے یہاں بٹھانے کی اجازت دی ہے۔"

وہ تینوں چند ثانیے متذبذب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک نے چوکیدار سے کہا۔ "تم جاؤ۔"

چوکیدار الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔

تینوں نے اپنے پستول جیب میں رکھ لئے اور میرے مقابل صوفے پر چوکنا انداز میں بیٹھ گئے۔ ان کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اشفاق شاہین اپنے چند کارندوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ شعلہ بار ہو رہا تھا۔ میں یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چند ثانیے کھڑا میری طرف شعلہ بار نظروں سے گھورتا رہا، اس کے بعد سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پا رکھا تھا۔

"بیٹھو........" اس نے گمبھیر لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"کیا معاملہ تھا؟........ مختصراً بتاؤ۔ مگر صرف سچ۔ ورنہ اسی وقت تمہیں گولی مار کر تمہاری لاش گم کر دی جائے گی۔" اس نے سرد اور سفاک لہجے میں میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے چہرے پر تھوڑے پریشان کن تاثرات لانا ضروری سمجھا اور بولا۔ "سر! میں اپنے ذر... نظر حیات کے تعاقب میں چھاگل کے برف زاروں میں گیا تھا۔ غفورے نے یقیناً آپ سے ذکر کیا ہوگا کہ میری اس کے ساتھ پرانی دشمنی چل رہی ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کے ہمراہ ایم این اے چوہدری ذیشان بھی تھا۔ دونوں برفانی لومڑیوں کے شکار پر گئے تھے۔ مجھے تو چوہدری ذیشان سے کوئی سروکار نہ تھا مگر جب میں اپنے شکار پر حملہ کرنے وہاں پہنچا تو وہاں اچانک ہی گمنام مسلح افراد بھی آ پڑے جس کے باعث میں بھی چوہدری ذیشان اور اس کے آدمیوں کی نظروں میں آ گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میرا شکار وہاں موجود نہ تھا لیکن چونکہ میں چوہدری ذیشان وغیرہ کی نظروں میں آ چکا تھا اس لئے مجبوراً مجھے خود کو ایک عام شکاری کی حیثیت سے متعارف کرانا پڑا اور اس کی مدد کے لئے اس کے دشمنوں کے خلاف مجبوراً مجھے بھی میدان میں اترنا پڑا۔ لیکن سر!........ میں یہ نہیں جانتا کہ وہ آپ کے آدمی ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو اور بات تھی مگر........"

"تمہیں بعد میں کیسے پتہ چلا کہ وہ میرے ہی آدمی تھے؟" اچانک اشفاق شاہین نے اپنی بھ... ہوئی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز رکھتے ہوئے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

"غزالہ نے مجھے سب سے پہلے فون کر کے مطلع کیا تھا کہ میں جن لوگوں سے نادانستگی میں بھ...


Courtesy www.pdfbooksfree.pk


ہوں، وہ درحقیقت آپ ہی کے آدمی تھے۔" میں نے جواباً کہنا شروع کیا۔ "پھر اس دوران مجھے غزالہ کے موبائل پر گولی چلنے اور اس کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ موبائل اس کے ہاتھ سے یقیناً چھوٹ کر گر گیا تھا۔ مگر پھر چند ثانیوں بعد ہی غفورے کی آواز اُبھری اور اس نے مجھے دھمکی دے کر موبائل آف کر دیا۔ میں یہ سن کر سخت پریشان ہوا۔ غفورا تو نہ جانے اپنی کون سی دشمنی مجھ سے نکال رہا ہے۔ مجھے اپنی صفائی بھی پیش کرنے کا موقع نہ دیا۔ تب میں نے یہی بہتر سمجھا کہ مجھے خود ہی آپ سے ملاقات کر لینی چاہئے اور یوں میں ادھر حاضر ہو گیا۔"

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور بھانپتی ہوئی نظروں سے اشفاق شاہین کے چہرے پر اپنی "ادھورے سچ" کی اثر پذیری محسوس کرنے لگا۔

میری وضاحت سن کر اشفاق شاہین کے چہرے پر پُرسوچ تاثرات پھیل گئے تھے۔ پھر اس نے ہولے سے کھنکار کر میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"گویا غزالہ کے ساتھ تمہارا خفیہ رابطہ رہا ہے؟........ اس کی وجہ بتاؤ گے؟ حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ ہماری دشمن بن چکی ہے۔"

میں نے دانستہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "سر جی! کیا کہوں........ شوقین مزاج ہوں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ شکر خورے کو مفت میں شکر مل گئی تھی۔"

"مگر وہ تو اس مزاج کی نہیں ہے۔" اشفاق شاہین نے بغور مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں اب کیا کہہ سکتا ہوں سر!" میں نے گول مول سا جواب دیا تو اس نے اگلا سوال کیا۔

"غزالہ کو یہ ساری باتیں کس نے بتائی تھیں کہ تمہارا نادانستگی میں ہی سہی، میرے آدمیوں سے ٹکراؤ ہو چکا ہے؟"

مجھے اس سے اس سوال کی توقع تھی لہٰذا بلا تامل بولا۔ "اس نے اپنے "سورسز" کے بارے میں مجھے نہیں بتایا تھا۔ یا پھر شاید ممکن ہے، اسے غفورے نے موقع ہی نہ دیا تھا اور اسے شوٹ کر ڈالا۔ حالانکہ غفورے کو غزالہ سے اس سلسلے میں باز پرس کرنی چاہئے تھی۔" میں نے آخر میں اسے اس کے مقرب خاص کے خلاف بھی اُکسایا۔

"ہوں........ وہ یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔ بات واضح ہو جائے گی۔" اشفاق شاہین نے ایک سرسراتی ہوئی ہنکاری لیتے ہوئے کہا تو میں نے دانستہ ذرا شکوہ کرنے کے انداز میں اس سے کہا۔

"کیا میری وضاحت کافی نہیں ہے؟........ اگر غفورے کو میرے سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تو میرا خیال ہے، میری یہ تمہید کافی ہونی چاہئے اور میں نے غفورے سے ملاقات کرنے کی بجائے اس امید پر ہی پہلے آپ سے ملاقات کر ڈالی کہ آپ اس سے زیادہ بہتر طور پر میری بات سمجھ پائیں گے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں، جب سے غفورے کا بھائی غزالہ کے ہاتھوں قتل ہوا ہے، وہ اس کا ذمہ دار مجھے ہی سمجھتا ہے۔ اور اب مجھے ٹارگٹ بنانے پر ہر وقت تُلا بیٹھا رہتا ہے۔"

"ہاں........ ٹھیک ہے۔ آ لینے دو اسے۔" اشفاق نے کہا۔ میں نے دیکھا وہ خاصا اُلجھ گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا غزالہ اب اس دنیا میں نہیں رہی........؟"

"پتہ نہیں۔" اشفاق شاہین نے گول مول سا جواب دیا۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ غالباً ابھی اس کے علم میں پوری بات نہ ہو اور غفورے کی غزالہ کے فلیٹ پر شب خون مارنے کے بعد ابھی یہاں واپسی نہ ہوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



ہو۔ مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر مردود غفورے نے غزالہ کے فلیٹ پر کس وجہ سے شب خون مارا تھا؟..... پھر لامحالہ ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ غزالہ کے اس گروہ سے باغی ہونے کے بعد ممکن ہے، یہ لوگ اسے ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں اور اب یہ غزالہ کی ایک اتفاقی بدقسمتی تھی کہ غفورا عین وقت پر.....!

اچانک دروازہ کھلا اور غفورا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ دندناتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کی حالت مارے طیش کے غضب ناک ہو رہی تھی۔ پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے دانت پیستے ہوئے مجھے چھلانگ لگا دی۔ میں نے بھی اشفاق شاہین کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر اپنے فوری دفاع کے تحت پھرتی کے ساتھ جگہ چھوڑی تو وہ کسی غیظ آلود ریچھ کی طرح میرے صوفے سے ٹکرا گیا۔ چنانچہ میں نے اس کے دماغ سے ہوا نکالنے کی غرض سے اس کی پشت پر ایک زوردار لات جما دی تو وہ صوفے سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی دانت کچکچاتے ہوئے میری طرف بڑھے تو اشفاق شاہین کی گرجدار تحکمانہ آواز اُبھری۔

''اسٹاپ.....!''

میری طرف بڑھتے ہوئے غفورے کے دونوں ساتھی چابی ختم ہونے والے کھلونے کی طرح یکدم رک گئے۔ جبکہ غفورے کا مارے طیش کے ابھی تک برا حال ہو رہا تھا۔ وہ سیدھا کھڑا ہو چکا تھا اور شعلہ بار نظروں سے میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ وہ کسی جنگلی ریچھ کی طرح پھپھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مگر اپنے باس کی ''تحکمانہ'' مداخلت پر اسے پھر دوبارہ مجھ پر جارحانہ پیش قدمی کی ہمت نہ ہو سکی۔

''بیٹھ جاؤ دونوں آرام سے۔'' اشفاق شاہین نے پاٹ دار آواز میں ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں اپنی جگہ پر براجمان ہو گیا۔ غفورا ابھی تک مجھے خوف ناک نظروں سے گھورتا اور پھنکارتا ہوا قریبی صوفے پر جا دھنسا مگر بیٹھتے ہی اس نے اشفاق شاہین سے کہا۔

''باس! میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ اسے اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ یہ سنپولیا ہے اور حرام زادی غزالہ کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف.....''

''غزالہ کا کیا بنا؟'' معاً اشفاق شاہین نے اس کی بات کاٹ دی۔

غفورے نے اپنی بات نظر انداز ہوتے دیکھ کر منہ بسورا۔ پھر بڑی بے رحمی سے بولا۔ ''اس کتیا کو میں نے گولی مار دی۔ لاش گہرے کھڈ میں پھینک دی۔ مگر یہ..... حرام.....''

''خاموش!'' اشفاق شاہین کے لہجے میں ڈپٹ تھی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''نادر علی! تم جا سکتے ہو۔''

اس کی بات پر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اور پھر دھیرے سے اشفاق شاہین کو ''شکریہ'' کہتے ہوئے میں کمرے سے نکل گیا۔

گیٹ سے باہر آ کر میں اپنی جیپ میں بیٹھا تو میرا دل اپنی اس چال پر بے حد مسرور ہو رہا تھا۔ میں ایک بار پھر اشفاق شاہین جیسے بڑے گینگسٹر کو ڈاج دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگرچہ غفورا بدستور میری طرف سے بدکا ہوا تھا۔ ایسا غزالہ کے حوالے سے ہوا تھا۔ اس پر مستزاد عین آخری لمحات میں اس نے غزالہ کو مجھ سے موبائل پر باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اسے اس بے رحم نے گولی مار کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ گویا کبیر کی بہن کے بعد اس کے ہاتھوں یہ دوسرا بے گناہ خون تھا۔ اور اب مجھ پر یہ لازم ہو گیا تھا کہ غفورے کو میں ہلاک کر ڈالوں۔ یوں بھی وہ بدبخت میرا جانی دشمن بن گیا تھا اور اب تو اسے یقین



کیا تھا کہ میں نے اور غزالہ نے ہی گٹھ جوڑ کر کے اس کے بھائی شوکی کو ہلاک کیا تھا۔ اس کا ناپاک وجود اب میری اور اشفاق شاہین کی ''دوستی'' میں دراڑ ڈال سکتا تھا۔

اس دوران ماں نے مجھ سے موبائل پر رابطہ کر کے ''صورت حال'' کے بارے میں آگاہی چاہی تھی۔ میں نے انہیں سردست یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ میں ''گرین لاج'' پہنچ کر انہیں ساری تفصیل سے آگاہ کر دوں گا۔

اب میں اس تذبذب میں مبتلا تھا کہ آیا مجھے اشفاق شاہین کے خطرناک گروہ کی بیخ کنی کے سلسلے میں چوہدری ذیشان سے روابط بڑھانے چاہئیں۔ اسی طرح میں اپنے طور پر اشفاق شاہین کے خلاف اپنی خفیہ کارروائی جاری رکھوں۔ اس کے علاوہ چوہدری ذیشان اور اشفاق شاہین کے گرگوں کے درمیان بھائی کے برف زاروں میں ہونے والی معرکہ آرائی کے بعد یہ بھی ناممکن نہیں تھا کہ چوہدری اپنی بھرپور طاقت سے اشفاق شاہین پر جوابی وار کرتا اور اس کا کام تمام ہو جاتا۔ چوہدری ذیشان اشفاق کا کھلا دشمن تھا۔ جبکہ میں اس کی بنیادوں میں بیٹھ کر اسے کھوکھلا کرنا چاہتا تھا۔

میری پنڈی واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ لاہور کی شہری حدود سے نکل کر میں جب موٹر وے پر آیا تو اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے موبائل نکالا۔ حسب عادت ڈسپلے پر کال کرنے والے کا نام دیکھا۔ مگر ڈسپلے پر نام اس کا آتا ہے جس کا نمبر پہلے سے محفوظ کیا جا چکا ہو۔ اجنبی کال کا صرف نمبر ابھرتا ہے۔ بہرطور میں نے موبائل اپنے کان سے لگا دیا اور ہیلو کہا۔

''مسٹر نادر علی!..... تمہاری جان کو شدید خطرہ ہے۔'' موبائل کے اسپیکر کے ذریعے ایک مضطربانہ مردانہ آواز میرے کانوں میں آئی۔ ''تم کسی خوش فہمی کا شکار ہرگز نہ ہونا۔ غفورا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تمہارے تعاقب میں نکل چکا ہے۔''

''تم کون ہو.....؟'' میں نے سرسراتی آواز میں اس کی بات ختم ہونے کے بعد کہا۔ میری رگوں میں خون کی بجائے گویا پھنکارتے ہوئے سانپ رینگنے لگے تھے۔

''فضول سوال ہے۔'' دوسری جانب سے جواب آیا۔

''مگر اشفاق شاہین پر تو میں نے اپنی بے گناہی ثابت کر دی تھی۔'' میں نے بات آگے بڑھائی۔

''ہاں..... اور تم سے زیادہ بعد میں غفورے نے اشفاق شاہین کے سامنے تمہیں گناہ گار ثابت کر دیا۔'' استہزائیہ انداز میں جواب ملا۔ ''اشفاق شاہین اب تمہارے سلسلے میں ذرا بھی شبہ برداشت نہیں کر سکتا۔ تم خوش نصیب تھے کہ اشفاق شاہین کے تذبذب کا فائدہ اٹھا کر وہاں سے نکل آئے۔ اب اپنی فکر کرو۔ غفورا موت کے فرشتے کی صورت تمہارے تعاقب میں نکل پڑا ہے۔''

''تم طارق شکیل تو نہیں ہو؟'' بالآخر میں نے اپنے تئیں گمنام ہمدرد کے بارے میں ایک محتاط اندازہ لگاتے ہوئے کہا تو دوسری جانب سے اچانک گہری خاموشی چھا گئی۔ جو ظاہر کرتی تھی کہ میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اچانک رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں نے دوبارہ اس نمبر پر کال بیک کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر میں نے سردست طارق شکیل کے نام پر یہ نمبر محفوظ کرتے ہوئے موبائل جیب میں رکھ لیا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ یہ وہی طارق شکیل ہی ہو سکتا تھا جو بدنصیب غزالہ کا ہمدرد اور شاید سچا عاشق ہونے کا دعوے دار تھا۔ تاہم میں اب ایکا ایکی خطرناک حد تک بدلنے والی صورت حال کے بارے میں غور کرنے لگا۔ بالآخر اس مردود غفورے نے میری چال ناکام بنا کر ہی چھوڑی تھی۔ میرے جانے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



بعد یقیناً غفورے نے کسی طرح اشفاق شاہین کو میرے خلاف اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ میرا وجود اس کے لئے خطرے سے خالی نہ تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اشفاق شاہین اس کی بات اس وجہ سے بھی ماننے پر مجبور ہو گا کہ وہ اس کا لاڈلا ساتھی تھا اور میری ذات سے بھی اشفاق شاہین کو کوئی فائدہ محسوس نہیں ہوا ہو گا۔ یوں اس نے غفورے کو بالآخر میرا پتا صاف کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔

کوئی بھی مجرم کتنا ہی عیار، چالاک اور کتنا ہی بڑا گینگسٹر نہ ہو، کہیں نہ کہیں مار ضرور کھاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہوتی ہے کہ اسے اپنی طاقت کا کچھ زیادہ ہی زعم ہوتا ہے۔ جبکہ ایسے بڑے گینگسٹر کے مقرب خاص گرگے دشمنوں پر بڑی تیز نگاہ رکھتے ہیں۔ بہرحال کچھ بھی سہی، غفورا اشفاق شاہین کی شہ پر مجھے ہلاک کرنے کی غرض سے نکل پڑا تھا اور اب کسی بھی وقت اس کا مجھ سے ''ٹاکرا'' ہو سکتا تھا جو اس بار فیصلہ کن بھی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اب ہم دونوں کے ہی دل و دماغ میں ایک دوسرے کو پچھاڑ ڈالنے کی خواہش جڑ پکڑ چکی تھی۔

ایک خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ میں سردست اس سے بھڑنے کی کوشش نہ کروں اور اپنی جیپ کی رفتار بڑھا دوں۔ یا پھر جیپ روک کر اس کا منتظر رہوں۔

مگر میں نے دانش مندی اسی میں سمجھی کہ مجھے سردست غفورے پر لعنت بھیج کر گرین لاج کی طرف نکل جانا چاہئے۔ کیونکہ اس وقت یوں بھی ''پھاگل'' والی مہم کے بعد میں خود کو اعصابی طور پر تھکا تھکا سا محسوس کر رہا تھا۔ نئے معرکے کے لئے ضروری تھا کہ میں ذرا آرام کر لیتا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرتے ہی میں نے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔

خیریت گزری اور میں بہ خیر و عافیت گرین لاج پہنچ گیا۔ ماں نہایت بے چینی کے ساتھ میری منتظر تھیں۔ میں نے ماں کو ساری بات تفصیل سے سنا ڈالی۔ نیز چوہدری ذیشان کے ''نامعلوم'' دشمنوں کے درمیان میں کود پڑنے اور بعد ازاں ان سے معرکہ آرائی کے بارے میں بتا دیا۔ مگر اشفاق شاہین سے متعلق بات گول مول کر ڈالی۔

لیکن ماں کو صرف نظر حیات کی موت سے دلچسپی تھی۔ انہیں یہ سن کر حیرت تو ہوئی تھی کہ میں نے موقع ہاتھ آ جانے کے باوجود نظر حیات کو زندہ چھوڑ دیا تھا۔ مگر جب انہوں نے میرے ''انوکھے انتقام'' کی غایت سمجھی تو ان کے چہرے پر آسودگی پھیل گئی۔

یہ درست تھا کہ کاشانہ نے مجھے اس انتقامی روش پر چلنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس نے اشاروں کنایوں میں مشورہ دیا تھا کہ میں نظر حیات کو اس قدر خوف زدہ کر ڈالوں کہ وہ ہمیشہ کے لئے ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ میں تو نظر حیات کو اس قدر خوف زدہ کر دینا چاہتا تھا کہ ملک چھوڑنے پر کیا بلکہ خود اپنی موت آپ مرنے پر مجبور ہو جاتا اور یہی میں چاہتا تھا۔

''نگینہ سے رابطہ ہوا تھا؟'' ماں نے اچانک پوچھا۔

''نہیں ماں!''

''کب کرو گے؟''

''اس نے مجھے ہسپتال کا نمبر دے رکھا ہے، جہاں شاہ میر داخل ہے..... نگینہ کا زیادہ وقت وہیں گزرتا ہے۔''

ماں خاموش ہو گئیں۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ جیب سے موبائل نکالا اور طارق شکیل سے رابطہ کیا۔



''خدا کے لئے مجھ سے رابطہ مت کرو۔ ورنہ میرا بھی غزالہ والا حشر ہو گا۔'' دوسری جانب سے طارق کی آواز اُبھری۔ اس نے بلا تمہید بولنا شروع کر دیا۔ لہجے میں انجانے خوف کا ارتعاش تھا۔ میں نے اسے جوش دلاتے ہوئے کہا۔

''تم کیسے عاشق ہو طارق.....؟'' میں نے دانستہ اسے اس کے نام سے مخاطب کیا۔ ''کیا تم نہیں چاہتے کہ غزالہ کے قاتل.....''

''غزالہ کا قاتل غفورا ہے اور میں اسے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس کے لہجے میں یکایک انتقام کی تپش در آئی۔ تاہم غزالہ کے ذکر پر اس کے جوش میں کرب کی رمق بھی تھی۔

''تو پھر تم کو مجھ سے تعاون کرنا چاہئے۔''

''تم سے تعاون کا مطلب میری موت ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''جبکہ میں اس ذلیل کتے غفورے کو دھوکے سے ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں رابطہ اس امید کے ساتھ منقطع کر رہا ہوں کہ تم دوبارہ.....''

''سنو، سنو.....'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں تو غفورے سمیت اشفاق شاہین کے پورے گروہ کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں مجھے تمہارے.....''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''تم اس درندے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر ہونٹ بھینچ لئے۔

چند ثانیے بعد میں نے موبائل پر نگینہ سے رابطہ کرنا چاہا مگر حسب توقع رابطہ نہ ہو سکا تو میں اپنے کمرے سے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ماں شاید اپنے کمرے میں تھیں۔ میں ٹیلی فون کی طرف بڑھا اور نگین کے بتائے ہوئے ورجینیا کے ہسپتال کا نمبر ملایا۔ ایک مترنم سی نسوانی آواز اُبھری۔

''میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟'' شستہ انگریزی میں پوچھا گیا۔

میں نے جواباً انگریزی میں کہا۔ ''براہِ کرم نیورو سرجری کے وارڈ اے فور نائن سے کنیکٹ کر دیں۔''

''یقیناً!'' انگریز لڑکی نے مستعد لہجے میں جواب دیا۔

پھر دوسرے ہی لمحے میوزیکل بیل سنائی دینے لگی۔ میرا دل بے طرح سے دھڑکنے لگا۔

''ہیلو.....!'' دوسری جانب سے ایک کمزور سی نسوانی آواز اُبھری۔ آواز میں عجیب سا تھکا تھکا پن غالب تھا۔ مجھے لمحے بھر کو چپ سی لگ گئی۔ آواز میں نہیں پہچان پا رہا تھا۔ مگر مجھے اس آواز میں دور کہیں شناسائی کی مہک آتی محسوس ہوئی تھی اور پھر شناسائی کی اس مہک نے میرے دل کی کہیں عمیق گہرائیوں کو گلشن گلشن کر ڈالا اور بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔

''نگینہ.....!''

دوسری جانب لمحہ بھر کے لئے عجیب سا سکوت طاری ہوا اور پھر وہی لرزتی ہوئی مانوس اجنبی آواز اُبھری۔

''ہاں..... نن..... نادر!'' اب کی بار جیسے میرے دل کا یکتارا بج اُٹھا مگر میں نے فکر آمیز حیرت سے کہا تو خود میری اپنی آواز بھی مرتعش سی ہو گئی۔

''نن..... نگینہ!..... یہ..... یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے؟''

''تم کیسے ہو نادر؟'' نگینہ نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ مگر..... نن..... نگینہ! تم شاید ٹھیک نہیں ہو..... تم بہت تھکی تھکی، کمزور سی محسوس ہو رہی ہو۔ تمہاری طبیعت.....''

''میں نے کہا نا، میں ٹھیک ہوں۔ مجھے چوبیس گھنٹے یہیں رہنا پڑتا ہے، پپا کے ساتھ۔ ڈاکٹروں نے

سختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ انہیں اکیلا نہ چھوڑا جائے۔ کسی نہ کسی عزیز کی موجودگی ضروری ہے۔ سناؤ، آنٹی کیسی ہیں؟"

مجھے اصولاً اس کے باپ کی بھی خیریت کے بارے میں استفسار کر لینا چاہئے تھا۔ جھوٹے سہی۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن نگینہ نے میری ماں کی خیریت پوچھ کر مجھے شرمندہ سا کر دیا تھا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ مگر کیا تمہیں ریسٹ کرنے کا وقت نہیں ملتا؟" میں نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

"ریسٹ ہی تو کرتی ہوں یہاں سارا دن۔" اس نے اسی تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔

"مگر نگینہ!..... مجھے تو تم خود بھی بیمار سی محسوس ہو رہی ہو۔ پلیز نگینہ! میری خاطر ہی سہی، اپنا خیال رکھا کرو۔" میری آواز خود بہ خود بھاری ہونے لگی تھی۔ "تمہارے پپا کی طبیعت کیسی ہے؟..... اب کہتے ہیں ڈاکٹرز؟"

"نیورو سرجنز نے دو بار ان کا آپریشن کیا تھا۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بتانے لگی۔ "وہ اب کومائی حالت سے نکل آئے ہیں..... مگر ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ..... وہ....."

انتہائے دکھ سے اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔ فرطِ غم نے اسے جملہ مکمل نہ کرنے دیا اور وہ سسک پڑی۔ اس کی حالت کا تصور کر کے میرا دل کٹنے لگا۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اس کی کیفیت کیا تھی اور میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ سارا کیا دھرا میرا اپنا ہے۔ میں نے ہی اس کے باپ کو اس حالت تک پہنچایا تھا۔ میں شاید اس کا مجرم تھا۔ مگر آفرین تھی اس پر کہ اس نے مجھ سے ایسا کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔

میں نے غم سے بوجھل دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "نن..... نگینہ! پلیز، خود کو سنبھالو۔ تت..... تم پھر کب لوٹ رہی ہو؟"

اس نے چند ثانیے خود کو سنبھالنے کے بعد دوبارہ بتانا شروع کیا۔ "پپا کی حالت سنبھل تو گئی ہے اور وہ ہوش میں بھی آ چکے ہیں۔ مم..... مگر وہ اب ساری عمر نہ کسی سے بات کر پائیں گے اور نہ ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوں گے۔"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ عجیب سی چپ لگ گئی تھی مجھے۔

"تمہیں پپا کی زندگی بچ جانے کی خوشی تو نہیں ہو گی نادر!..... لیکن میں سمجھتی ہوں، تمہارے اور تمہاری ماں کے جذبہ انتقام کو تسکین تو ہوئی ہو گی۔" مجھے اچانک خاموش پا کر نگینہ نے ہولے سے کہا۔ مجھے اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ سی محسوس ہوئی تھی۔ میرا اندر چھلنی ہونے لگا۔ تاہم میں نے پوچھا۔

"کب تک لوٹ رہی ہو؟"

"ایک ہفتے بعد پپا کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ اس کے دو تین روز بعد میں لوٹ آؤں گی۔" اس نے دھیرے سے بتایا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ اچانک بولی۔

"نادر! ایک بات پوچھوں؟..... برا تو نہیں مناؤ گے؟"

"پوچھو۔"

"کیا تمہاری ماں اب ایک ایسے انسان کو معاف نہیں کر سکتیں جو پہلے ہی زندہ لاش بن چکا ہو؟"

نگینہ کی بات پر میں سن ہو کر رہ گیا۔ مگر پھر جانے کیا ہوا کہ میں نے دوسرے ہی لمحے مستحکم لہجے میں کہا۔ "ہاں، ضرور..... میں ماں کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ تم ان کی اب بالکل فکر نہ کرو۔ ہاں، ماں کو اب تمہارے پپا کی دشمنی بھلانا ہو گی۔ میں..... میں اس کا تم سے وعدہ کرتا ہوں۔"

ایکا ایکی جانے کہاں سے میرے اندر اتنی ہمت آ گئی اور میں نے ماں سے بات کئے یا وعدہ لئے


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بغیر ہی نگینہ سے وعدہ کر لیا تھا۔

دوسری جانب سے نگینہ کی پژمردہ آواز ایک دم خوشی کے بے پایاں احساس سے معمور ہو گئی۔

"نن..... نادر!..... تت..... تم نے مم..... میرے پپا..... کو معاف کر دیا؟"

"نگینہ! میں نے تو اس روز ہی انہیں معاف کر دیا تھا جس روز تم نے مجھ سے پہلی بار کہا تھا۔ لیکن ماں کے سلسلے میں، پہلے کبھی میں نے تمہیں امید نہیں دلائی تھی۔ مگر اس بار میں تم سے اب یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں ماں کو بھی سمجھا دوں گا۔"

نگینہ کو خوش ہوتا محسوس کر کے میرے دل کو بھی قرار ملا تھا۔

"نگینہ! تم بس خیریت کے ساتھ واپس لوٹ آؤ۔" میں نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

"میرے دل سے تم نے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا نادر!" نگینہ نے ایک تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

"نگینہ! بس تم جلدی سے لوٹ آؤ۔ تمہارے بنا میں خود کو بالکل تنہا اور بے کار سا محسوس کرنے لگا ہوں۔" بے چین و مضطرب دل کی آواز میرے لبوں پر آ گئی تو نگینہ کے لہجے میں تھوڑی مسرت آمیز شوخی آ گئی۔

"تم اپنی ماں کو سمجھانے کا مجھ سے پہلے ہی وعدہ کر لیتے تو یہ جدائی تمہیں برداشت نہ کرنا پڑتی۔"

"پہلے حالات اور تھے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو نادر! میں بھی یہاں تم سے ہزاروں میل دور جدائی کو خوشی سے برداشت کر رہی ہوں؟"

"مجھے اندازہ ہے۔"

"نادر! اب تمہارے وعدے کے بعد میں اپنے دل میں بوجھ لے کر نہیں بلکہ خوشی کے ایک بے پایاں احساس کے ساتھ آؤں گی اور ضرور آؤں گی۔"

"یقیناً ایسا ہی ہو گا۔ مجھے تم پر اور تمہارے الفاظ دونوں پر یقین ہے۔ بس تم جلد از جلد واپس آنے کی تیاری کرو۔" میں نے کہا اور چند رسمی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

ریسیور رکھ کر میں پلٹا تو چونک پڑا۔ نگینہ سے باتیں کرنے کے دوران مجھے ماں کی عقب میں موجودگی کا بالکل ہی احساس نہ رہا تھا۔ ماں خاموش مگر میری جانب مرکوز اپنی نگاہوں میں ہزاروں طوفان لئے کھڑی تھیں۔

"نگینہ سے تم کس قسم کا وعدہ کر رہے تھے مجھے سمجھانے کا؟" ماں نے سرسراتے لہجے میں مجھ سے پوچھا تو میں بڑے رسان کے ساتھ چند قدم چلتا ہوا ماں کے قریب آیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے ماں کو تھام کر نہایت تحمل اور رسان سے بولا۔

"ماں!..... نگینہ کو معاف کر دے۔"

"میری نگینہ سے کب دشمنی ہے؟" ماں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"نگینہ کے باپ سے تو ہے۔"

"ہاں..... اور وہ کبھی ختم نہیں ہو گی۔" ماں کا لہجہ اٹل تھا۔

"لیکن ماں! شاہ میر اب زندہ لاش کی مثل بن چکا ہے۔" میں نے کہا تو ماں نے چونک کر پوچھا۔

"کیا مطلب؟..... کیا وہ مردود ابھی زندہ ہے؟"

"ہاں ماں! لیکن نگینہ نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اب عمر بھر کے لئے معذور ہو چکا ہے۔ وہ صرف ہاتھ

پاؤں ہلانے سے ہی نہیں، زبان ہلانے تک سے ہمیشہ کے لئے معذور ہو چکا ہے۔" میں نے بتایا اور غور ماں کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔

ماں چند ثانیوں کے لئے چپ سی کھڑی رہیں۔

"ماں! اپنے بیٹے کی خاطر سہی، شاہ میر کو اب معاف کر دو......... میں سمجھتا ہوں، اسے اب موت سے بھی بدتر سزا مل چکی ہے۔" میں نے آخر میں ماں سے امید بھرے لہجے میں کہا۔

میری بات سن کر ماں نے ایک عجیب سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ اس کے بعد آہستگی سے میرے دونوں ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹائے اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی قریبی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ میں ان کی جانب پلٹا، ماں کو صوفے پر بیٹھے کسی گہری سوچ میں مستغرق پا کر دوبارہ خوش امیدی سے ان کی جانب بڑھا۔ پھر قالین پر ان کے قدموں سے جا لگا اور بے اختیار اپنا سر ان کے زانوں پر رکھ دیا۔ تب نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں آبدیدہ ہو گیا۔ میں شاید اس لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا۔ مگر نہ جانے کہاں سے مجھ میں وہ طاقت آ گئی کہ میں نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر میں نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

"ماں! اب نگینہ کے سلسلے میں اپنی دشمنی کا یہ خونیں باب ہمیشہ کے لئے بند کر دے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میری آواز رندھی ہوئی تھی۔ "شاہ میر کو اب اپنے کئے کی سزا مل چکی ہے۔ وہ زندہ لاش بن چکا ہے۔" اتنا کہہ کر میں نے سر اٹھا کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا، مجھے ان کے چہرے پر بہ دستور گہری سنجیدگی نظر آئی۔

"ماں! تُو خود بتا......... کک......... کیا اب ایک زندہ لاش سے انتقام لینا بہادری ہو گی؟ ماں دیکھ، میری بات مان لے......... اپنے بیٹے......... اپنے نادر کا مان رکھ لے۔ مم......... میں نے نگینہ سے اس کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔"

ماں نے ایک خاموش مگر گہری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی پھر آہستگی کے ساتھ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس کے بعد مجھ سے کچھ کہے بغیر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں یک ٹک ماں کو جاتے دیکھنے لگا۔ میں چند ثانیے گم صم سا رہا، مگر میرے دل کو پھر بھی قرار نہ ملا اور میرے قدم از خود ماں کے کمرے کی طرف اُٹھتے چلے گئے۔

ماں کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں آہستگی سے آگے بڑھا اور دروازے پر پہنچ کر اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ میری نگاہ ماں کی پشت پر جمی ہوئی تھی۔ ان کا رخ دوسری طرف تھا اور چہرہ ان کے سامنے دیوار پر آویزاں میرے باپ قادر خان کی تصویر پر اٹھا ہوا تھا۔ تب میری سماعتوں نے ماں کی انتہائی کرب و رقت میں ڈوبی ہوئی مرتعش آواز سنی۔ ماں، میرے باپ کی تصویر سے مخاطب تھیں۔

"قادر خان!......... میرا بیٹا میرے لئے سخت آزمائش بنا ہوا ہے۔ لیکن وہ تیرا بھی خون ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے بیٹے نادر نے تیرے دونوں خونی قاتلوں کی نیندیں حرام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے اور آج شاہ میر موت سے بدتر زندہ لاش کی صورت میں اور نظر حیات اعصابی مریض بن چکا ہے۔ مگر قادر خان!......... آج ہمارا بیٹا نادر ہم سے کچھ مانگ رہا ہے......... اسے دشمن کی بیٹی سے پیار ہو چکا ہے۔ مگر دیکھ، میں اس کی گواہ ہوں کہ ہمارے نادر نے پھر بھی اپنے دشمن شاہ میر کو معاف نہیں کیا۔ میں سمجھتی ہوں، اس نے شاہ میر کی حد تک انتقام لے لیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ نگینہ کو بھی ہم سے نفرت ہو جاتی۔ لیکن قادر خان! میں سمجھتی ہوں کہ نگینہ کو بھی ہمارے نادر علی سے سچی محبت ہے


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسی مجھے تم سے ہوئی تھی۔ ہاں قادر خان!......... ہم دونوں کا معاملہ بھی تو یہی تھا کہ میں تمہارے دشمن کی بیٹی تھی، جس نے تمہاری بڑی بہن کی آبرو ریزی کر کے اسے بے گناہ قتل کر ڈالا تھا۔ اور پھر تم نے میرے باپ کو کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ لیکن باوجود اس کے میں نے تم سے کبھی نفرت نہ کی تھی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ بالکل اسی طرح نگینہ کو بھی اپنے باپ شاہ میر کے گھناؤنے جرم کا احساس ہے۔ لیکن اس نے میری طرح کبھی اپنی محبت کو نفرت میں نہیں بدلا۔ قادر خان! آج تیرا بیٹا نادر علی اور نگینہ بھی اسی دوراہے پر کھڑے ہیں......... اگر میں ان دونوں کی محبت کے بیچ دیوار بننے کی کوشش کرتی ہوں تو کیا یہ ان دونوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہو گی؟......... قادر خان! آج ہمارا بیٹا ہم سے اپنی محبت کی بھیک مانگ رہا ہے۔ تیرے انتقام کی آگ نے مجھے اگر آتش فشاں بنا رکھا ہے تو میرے سینہ سوزاں میں ایک ممتا بھرا دل بھی دھڑکتا ہے۔ مجھے......... مجھے نگینہ کے سلسلے میں اپنے بیٹے کی بات ماننا پڑے گی قادر خان!......... روزِ حشر جب تیرا میرا سامنا ہوا تو تُو میرا گریبان نہ پکڑنا۔ میں تجھے نادر علی اور نگینہ کی محبت کا واسطہ نہیں دیتی، اپنی اور تیری محبت کا واسطہ دیتی ہوں کہ وہ ہمارے بیٹے کی محبت سے مختلف تو نہ تھی۔ قادر خان! مجھے معاف کر دینا......... مجھے معاف کر دینا۔"

ماں کی آواز بھرانے لگی۔ لہجہ کپکپانے لگا۔ اس کا وجود کرب و جذب کے مارے مرتعش ہونے لگا اور ادھر میں بت بنا کھڑا تھا۔ آج مجھ پر ایک نیا اور حیرت انگیز انکشاف ہوا تھا کہ میرے باپ اور میری ماں کی محبت بھی میری اور نگینہ کی محبت سے مختلف نہ تھی۔ ماں کی دوبارہ کپکپاتی آواز اُبھری۔

"قادر خان! اگر میں نے اپنے بیٹے کی بات نہ مانی تو یہ منافقت ہو گی۔ قادر خان! یہ میری اور تیری محبت کی منافقت ہو گی۔ اور ہماری محبت کی گواہی تو آج بھی وادی کی وہ سربلند پہاڑیاں، یہ سرسبز مرغزار، یہ بہتے گنگناتے جلترنگ سے جھرنے بھی دیتے ہیں جو ہماری پیار بھری خلوتوں میں شامل رہے ہیں۔ یہ رنگ، یہ خوشبوئیں، یہ خوش نما پھول ہماری بے لوث وفا کے آج بھی گیت گاتے ہیں۔ اگر......... اگر میں نے اپنے بیٹے کی محبت پر شب خون مارا تو قادر خان! ان بہتے جھرنوں اور مہکتی خوشبوؤں کے گیت ماند پڑ جائیں گے......... اور تمہاری اور میری محبت "چور" بن کر رہ جائے گی۔ ہاں قادر خان!......... ہمیں اپنی محبت سے ایک اور محبت کا بیج بونا ہو گا۔ اپنے بیٹے نادر علی خان اور نگینہ کی محبت کا بیج......... کہ مجھے اس میں تمہاری ہی شبیہ تو نظر آتی ہے۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے اپنا سر میرے باپ کی دیوار پر آویزاں تصویر پر ٹکا دیا اور رو پڑیں۔

میرے پورے وجود میں ایک طرف انوکھے جذبات کی آبشاریں پھوٹ پڑیں تو دوسری طرف ماں کی [illegible] انگیز آہ و زاری سے گہری غم و اندوہ کی ناقابل برداشت لہر سی اٹھنے لگی اور میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر دیوار سے لگی، روتی ماں کو تھام لیا۔

"ماں!" میں مرتعش لہجے میں صرف اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ ماں میرے ساتھ لگی سسکتی رہیں۔ میں بڑی محبت سے ان کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

❋❋❋

ماں نے میری خاطر، یا پھر اپنی اور میرے باپ کی محبت کی خاطر بالآخر میری بات مان لی تھی۔ میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اُڑ کر نگینہ کے پاس امریکہ جا پہنچوں اور اسے یہ انوکھی خوش خبری سنا دوں۔ میرا دل بالکل بچوں کی طرح خوش ہو کر مچل مچل رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ نگینہ سے دوبارہ فون پر رابطہ کر کے اسے یہ خوش خبری سنا ڈالوں، لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنا ارادہ

بدل لیا کہ اب نگینہ کو یہ خوش خبری اس کی امریکہ سے واپسی پر تحفے کی صورت میں دوں گا۔
اب میری طرف توجہ نظر حیات اور اشفاق شاہین پر مرکوز تھی۔
نظر حیات کے ساتھ میں اب دوسری بار وہی موت کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا جو میں پھاگل اور کو سرائے میں اس کے ساتھ کھیل چکا تھا۔ اس بار میں نے اس کی رہائش گاہ پر شب خون مارنے کا تھا۔ دوسری طرف اشفاق شاہین بھی کھل کر میرے خلاف میدان میں اتر آیا تھا۔ اس نے غفور سفاک درندے کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ تاہم میرے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال اُبھر رہا تھا کہ ذیشان نے اس کے خلاف اب تک کیا کارروائی کی ہے؟......... اگرچہ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اشفاق شاہین کے آدمیوں کی ہے۔ میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھا۔
اگلے روز ٹال پر روزمرہ کے امور نمٹانے کے بعد میں نے چوہدری ذیشان سے موبائل پر رابطہ
"ہیلو........." دوسری جانب سے چوہدری ذیشان کی گمبھیر آواز اُبھری۔
"ہیلو چوہدری صاحب! میں نادر علی خان بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔
"ارے نادر میاں! بھئی کیسے ہو تم؟......... کہاں ہو؟" دوسری جانب سے ان کی شفیق آواز اُبھری
"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور اس وقت اپنے مری والے ٹال میں ہوں......... آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"
"ٹھیک ہی ہوں......... ڈاکٹروں نے پورے دو ماہ کے مکمل آرام کی ہدایت کی ہے۔ اب بھگت رہا ہوں۔"
"چوہدری صاحب! آپ نے ان نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف اب تک کوئی کارروائی کی؟" میں نے دانستہ ابھی اسے اشفاق شاہین کے متعلق نہیں بتایا تھا۔
"پولیس کارروائی کر رہی ہے۔ رپورٹ تو درج ہو چکی ہے۔" انہوں نے گول مول سا جواب
میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔
"آپ کو تو معلوم ہوگا کہ آپ پر یہ قاتلانہ حملہ کروانے والا کون ہو سکتا ہے؟"
"ارے نادر میاں! جہاں ہم لوگوں کے دوست بے شمار ہوتے ہیں، وہیں دشمن بھی کم نہیں ہوتے۔ کسی دل جلے نے اپنی بھڑاس نکال لی ہوگی۔" ان کے جواب دینے کے انداز سے صاف ہوتا تھا کہ وہ سب جانتے ہیں مگر بتانے سے کترا گئے تھے۔
"میاں! تم تو بالکل ہی غائب ہو گئے۔" ان کی گفتگو جاری تھی۔ "تم نے میری جان بچا کر احسان کیا ہے......... اور میں بھی کیسا بدنصیب اور مجبور ہوں کہ تمہارے احسان کا شکریہ ادا کرنے آ سکا۔ لیکن میرے بچے! تم سے ملنے کو، تمہارا شکریہ ادا کرنے کو بہت بے تاب ہوں۔ تم اپنے گھر بتا دو۔ ہم تم سے اور تمہارے والدین سے ملنے کو بے چین ہیں جنہوں نے تم جیسے بہادر اور دلیر جنم دیا۔"
"چوہدری صاحب........." میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولے۔
"ارے یار! یہ چوہدری کے تکلفات چھوڑو......... کیا تم مجھے انکل نہیں کہہ سکتے؟"
"سوری......... میرا مطلب ہے انکل! کہ آپ آنے کی زحمت نہ کریں۔ اور میں نے آپ بالکل نہیں کیا۔ یہ تو میرا انسانیت کے ناتے فرض تھا۔"
"اچھا تو پھر تم خود ہی آ جاؤ......... کہو تو گاڑی بھیج دوں؟" وہ فوراً بولے۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی نہیں انکل! شکریہ......... بالکل ضرورت نہیں۔ میں کسی وقت آ جاؤں گا۔ لیکن آپ کو اپنے نامعلوم دشمن سے ازحد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" اتنا کہہ کر میں نے آخر میں کہا۔ "انکل! ایک بات پوچھوں؟......... آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟"
"ارے بھئی پوچھو!......... بھلا تم سے کیسی ناراضگی؟" وہ فراخ دلی سے بولے۔
"انکل! تھوڑی سی جسارت کروں گا۔ مجھے لگتا ہے آپ اپنے نامعلوم دشمن کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن مجھے بتانا نہیں چاہتے۔"
دوسری جانب انہیں لمحے بھر کی پُرسوچ چپ لگ گئی۔ پھر ہلکا سا قہقہہ مار کر بولے۔
"میاں! تم بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہو......... دراصل یار! بات یہ ہے کہ میں ابھی واقعی یہ جان نہیں پایا ہوں کہ آخر یہ میرے کس دشمن کی حرکت ہے۔ جو مجرم گرفتار ہوئے ہیں وہ بھی ابھی کچھ نہیں اگلتے۔"
"انکل!......... اگر میں آپ کے دشمن کا نام بتا دوں تو؟" میں نے اچانک کہا تو دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ پھر ان کی قدرے اٹکتی ہوئی آواز اُبھری۔ "کک......... کیا......... مطلب؟"
"آپ اشفاق شاہین کو جانتے ہیں؟" میں نے جیسے دھماکا کیا تو دوسری جانب سے فوراً ہی ان کی پُرجوش آواز اُبھری۔
"تت......... تم کیسے جانتے ہو اسے؟"
"بس اتفاق سمجھ لیں۔" میں نے گول مول سا جواب دیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے مستحکم لہجے میں بولا۔ "انکل! آپ پر حملہ کرنے والے نامعلوم لوگ اشفاق شاہین کے ہی آدمی تھے۔"
"تم......... تم کیسے جانتے ہو اس خبیث شیطان کو؟......... آخر تم بتاتے کیوں نہیں؟"
"انکل! کبھی آپ سے ملاقات ہوئی تو تفصیل بتا دوں گا۔ لیکن میں آپ کو پہلے ہی محتاط کر رہا ہوں۔ آپ ایک بااختیار انسان ہیں اور اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے اگر آپ کسی کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو دیر نہیں کرنی چاہئے۔"
دوسری جانب سے ان کے گہرا سانس لینے کی آواز اُبھری۔ پھر وہ پُرسکون لہجے میں بولے۔
"مجھے یہ بات پہلے ہی سے معلوم ہے......... مگر......... مجھے یہ بھی اعتراف کرنا پڑ رہا ہے، میرا یہ طاقت ور بھی ہے اور بااثر بھی۔ اور میں اسے اپنی گرفت میں لینے کے لئے بہت عرصے سے لگا ہوا ہوں۔ مگر ٹھوس ثبوت حاصل کرنے سے ہنوز قاصر ہی ہوں۔ لیکن اب تم نے مجھے یہ بتا کر میرے شبہے کو تقویت دے دی ہے۔ میں ان گرفتار مجرموں کے منہ سے اُگلوانے کی اب پوری کوشش کروں گا۔"
"میں بھی چاہتا تھا انکل! کہ آپ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی توجہ دشمن پر مرکوز رکھیں۔" میں نے کہا۔
"یار! تم بھی تو میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟" انہوں نے آخر میں کہا۔
"میں یہی کچھ کر سکتا تھا جو میں نے آپ کو بتایا۔" میں نے کہا۔
"ہوں........." انہوں نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔ پھر عجیب سے لہجے میں بولے۔ "تم اس کے کالے دھندے سے واقف بھی ہو گے؟"
"یقیناً۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔ پھر کسی خیال کے تحت بولا۔ "ویسے مجھے حیرت ہے کہ وہ کس قدر ڈھٹائی سے اپنا گھناؤنا کاروبار کر رہا ہے......... لیکن آج تک کسی کے کانوں میں اس کی بھنک بھی نہیں پڑ سکی اور

نہ ہی اس کے خلاف کوئی موثر انداز میں قانونی کارروائی ہو سکی ہے۔"

"ہاں.........اس لئے کہ اشفاق شاہین کوئی معمولی مجرم نہیں۔ وہ زیرِ زمین دنیا کا بہت بڑا گینگسٹر ہے۔ اور با اثر بھی۔ اس نے درحقیقت انڈر ورلڈ فلم مافیا کے بطن سے جنم لیا ہے اور پھر تیزی سے اور چند مقتدر سیاسی حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ بناتا چلا گیا۔ یہی سبب ہے کہ میں اب تک اس کے خلاف کوئی فاسٹ ایکشن نہیں لے سکا ہوں۔ مگر مجھے تو اب تمہاری فکر ستانے لگی ہے.........کیا اشفاق شاہین کو معلوم ہے کہ تم اس کی اصلیت سے واقف ہو؟"

"جی ہاں۔" میں نے مختصراً اثبات میں جواب دیا۔

"اوہ.........مائی گاڈ!" دوسری جانب سے چوہدری ذیشان کی آواز اچانک ہی پُرتشویش ہوگئی۔

"تو.........تو پھر تم بھی کوئی معمولی شخصیت نہیں ہو سکتے۔ تم ایسا کرو، مجھ سے فوراً کسی وقت آکر ملو۔ بیٹا! تم میرے محسن ہو.........اور مجھے اب تم اپنی اولاد کی طرح عزیز ہو چکے ہو۔ مجھے تمہاری حفاظت کے سلسلے میں بھی کچھ کرنا پڑے گا۔"

"میری حفاظت کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔" میں نے مضبوط اور پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "یہ اشفاق شاہین جیسے شیطان میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے اسے نکیل ڈالنی آتی ہے۔"

"اچھا........." انہوں نے گہری سانس لی۔ پھر بے تابی سے بولے۔ "پھر کب آ رہے ہو؟"

"فی الحال تو کچھ نہیں کہہ سکتا.........مگر جلد آنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ پھر انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا۔ اس کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

چوہدری ذیشان جیسے با اختیار سیاسی شخصیت کو بھی میں نے اشفاق شاہین سے خائف سا ہوتا محسوس کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اشفاق شاہین کی پشت پناہی کوئی بڑی شخصیت ہی کر رہی تھی۔ جس کے سامنے چوہدری ذیشان بھی دم مارنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

غفورے نے میری راہ پر لگ کر گویا اپنی موت کو دعوت دے ڈالی تھی۔ مگر بزدل دشمن سے خطرہ تو رہتا ہی ہے۔ کیونکہ ایسے دشمن پیٹھ پیچھے وار کرتے ہیں۔ میں اب دوسرے خطوط پر غور کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے ان دونوں با اثر اور طاقت ور دشمنوں نظر حیات اور شاہ میر کے ساتھ کیا تھا۔ وہ قانون کی گرفت سے بچ گئے تھے مگر میں نے ان دونوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اب اشفاق شاہین جیسے شیطان ناسور بن کر ملک و قوم کی نئی نسل کو تیزی کے ساتھ ذہنی اور جسمانی مفلوج کر رہے تھے۔ اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ با اختیار افراد اس کے خلاف کارروائی کرنے سے عاجز تھے۔ قانون بھی اشفاق شاہین جیسے ناسور کا علاج نہ کر پایا تھا۔ مگر ایسے مجرموں کا علاج میرے پاس تھا۔ اور زہر کو زہر سے مارنا تھا۔ چونکہ میں اشفاق شاہین کے گھناؤنے کاروبار سے واقف ہو چکا تھا اس لئے اب اسے میں گمنامی کی موت مارنا چاہتا تھا جس طرح وہ اب تک دوسرے بے گناہوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کرتا آیا تھا جس میں اداکارہ سپنا، اس کی بہن غزالہ بھی شامل تھی۔

مجھے غزالہ کی موت پر بھی دکھ ہوا تھا.........اس کی موت سے متعلق اخبار میں مختصر سی خبر شائع ہوئی تھی اور بس۔

ٹھیک اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ پھر ابھی میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ ایک ہائی روف پک اپ ٹال کے گیٹ سے تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اس کے سلائیڈنگ ڈور کھلے ہوئے تھے۔ مجھے اس کے اندر موجود سات آٹھ افراد


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لباس میں ملبوس، مسلح ڈھاٹے پوش افراد صاف نظر آ گئے۔ مزدور خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر جا چھپے۔ میری رگوں میں خون آتش فشاں سے بہتے لاوے کی طرح گردش کرنے لگا۔ ہائی روف پک اپ کو اندر داخل ہوتے دیکھتے ہی میں نے اپنی جیب سے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنا میگارڈ نکال لیا۔

ہائی روف پک اپ کا رخ سیدھا میرے آفس روم کی طرف تھا۔ گیٹ پر متعین میرے گارڈز پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے بعد یقیناً ان کا نشانہ میں ہی تھا۔ چنانچہ میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور ہائی روٹ پک اپ کو اپنے آفس کے عین سامنے رکتے دیکھا۔ میں نے جیسے ہی صوفوں کی جانب جست لگائی تھی، میرے عقب میں گولیوں کا بھیانک برسٹ فضا میں بکھرتا چلا گیا۔ تواتر کے ساتھ برستی ہوئی گولیوں نے میرے آفس کے گلاس ڈور کو کرچی کرچی کر کے بکھیر دیا.........اور پھر زٹ زٹ زنازٹ" کی سنسناتی آوازوں سے گولیاں دیواروں پر میری خالی ریوالونگ چیئر پر اور ٹیبل پر بکھری اشیاء کو تیزی کے ساتھ کھدیڑتی، ادھیڑتی چلی گئیں۔ البتہ آفس کی جنوبی دیوار جدھر میں ایک بڑے سے رنگ صوفے کی آڑ لئے ہوئے تھا وہ اب تک محفوظ رہا تھا۔ لیکن یہ جگہ بھی زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس وقت میرے پورے وجود میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی اور سنسناتی گولیوں سے لہو مثل پارا کی طرح گردش کر رہا تھا۔ اپنے دفاع میں جو بھی کرنا تھا، فوری طور پر کرنے کا متقاضی تھا۔ موت کے ہرکارے مجھے ایک پل کا بھی موقع دیئے بغیر موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے بری طرح بے چین تھے۔

اچانک دھواں دھار فائرنگ بند ہو گئی۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ میں نے ذرا سا سر اُبھارا سب سے پہلے دو عدد مسلح ڈھاٹا پوشوں کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ میں نے پھرتی سے اپنے میگارڈ کا رخ ان کی طرف کیا اوپر اوپر تلے دو فائر جھونک مارے۔ دونوں کراہت انگیز چیخ مار کر گر پڑے۔

"وہ حرامی اندر ہے۔" باہر سے ایک چلاتی آواز اُبھری جسے سن کر میری کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ یہ آواز غفورے کی تھی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ ایک ڈھاٹا پوش کی لاش کے قریب پڑی، سب مشین گن اٹھا لی۔ میں پھرتی کے ساتھ پلٹا تو گولیوں کی بوچھاڑ آن پڑی۔ ایک ہی جگہ محبوس رہنا موت کو از خود دعوت دینے کے مترادف تھا۔ حملہ آوروں کے فاسٹ ایکشن سے عیاں تھا کہ انہوں نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کا بہت کم سے کم وقت متعین کر رکھا تھا۔ چنانچہ میں نے بہ سرعت اپنا میگارڈ جیب میں رکھا اور سب مشین گن سنبھال لی۔

میری جوابی فائرنگ پر حملہ آوروں کو دوبارہ اندر قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ میں نے جنوبی دیوار کی کھڑکی سے ذرا سر ابھار کر دیکھا تو چار پانچ مسلح ڈھاٹا پوش گیٹ سنبھالتے ہوئے دائیں بائیں ہو کر کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جبکہ باقی دو ہائی روف پک اپ کے دائیں بائیں گرد و پوش پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ان پانچوں کی طرف جیسے ہی اپنی گن کا رخ کیا وہ فوراً زمین پر گر پڑے۔ میں نے بھی اس وقت لبلبی دبا دی۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ کے درمیان دو حملہ آوروں کی کریہہ انگیز چیخیں ابھریں۔ باقی تینوں نے زمین پر گرتے ہوئے مجھ پر اپنی گنوں کے دھانے کھول دیئے۔ مگر میں گن کی آتشیں پیاس بجھانے کے فوراً بعد نیچے جھک گیا تھا۔ اچانک میری نگاہ سامنے بائیں جانب کی کھڑکی پر پڑی اور اگر میں پل کے پل نیچے نہ جھک جاتا تو ایک مسلح ڈھاٹے پوش کے چلائے ہوئے برسٹ سے میری کھوپڑی چھلنی ہو جاتی۔ گولیوں کی وحشیانہ باڑ نے کھڑکی کے شیشوں کو چکنا چور کر دیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس ڈھاٹا پوش نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور تیزی کے ساتھ کھڑکی سے ذرا سامنے آ کر ایک بار پھر مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں صوفے کے عقب میں رینگ گیا لیکن جانتا

تھا کہ یہ صوفہ پل بھر میں گولیوں سے چھلنی ہو کر جالی بن جائے گا اور پھر میں بھی نہ بچ سکوں گا۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنی پوزیشن بدلی۔ کھڑکی کی طرف گن کا رخ کرتے ہی لبلبی دبا دی۔ میری گن نے آتشیں قہقہہ اُگلا۔ جرأت مندانہ انداز دکھانے والا وہ حملہ آور آواز تک نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

میری جوابی فائرنگ نے اب باقی مسلح حملہ آوروں کی پیش قدمی جام کر کے رکوا دی۔ تاہم غفورے کو اپنے ٹال کے احاطے سے بے دخل اور جوابی کارروائی کو بدستور برقرار رکھنا تھا۔

''واپس چلو......... جلدی!''

دفعتہً ہی چلاتی ہوئی غفورے کی آواز اُبھری۔ میں نے پھرتی سے مگر نہایت احتیاط کے ساتھ سمت کی کھڑکی سے ذرا جھانکا تو مجھے باقی ماندہ حملہ آور، ہائی روف پک اپ میں تیزی کے ساتھ سوار ہوتے نظر آئے۔ چونکہ ان سب نے چہروں پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے اس لئے میں غفورے کو پایا تھا۔ ہائی روف پک اپ اسٹارٹ ہو کر تیزی کے ساتھ ریورس ہوتی ہوئی گیٹ سے باہر نکلتی چلی گئی۔ میں بھی پھرتی کے ساتھ ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر گولی کی طرح اپنے قریب کھڑی جیپ کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ پھر چشم زدن میں اسے اسٹارٹ کر کے تیزی سے بیک کرتا ہوا گیٹ سے کھلی سڑک پر آ گیا۔ اور پھر ہائی روف پک اپ تیزی سے دوڑتی ہوئی جاتی دکھائی دی۔ میں نے بہ سرعت گیئر بدلا اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔ جیپ غراتی ہوئی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور جاتی ہوئی ہائی روٹ پک اپ کے تعاقب میں دوڑنے لگی۔ فائرنگ کے باعث راہ گیر اور دیگر علاقے کے لوگ سہم کر محفوظ جگہوں میں جا دبکے تھے ......... ہر سمے مصروف نظر آنے والی سڑک پل بھر میں ویران ہو گئی تھی۔

میں پوری رفتار کے ساتھ جیپ دوڑائے جا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرا یوں ان خونخوار حملہ آوروں کے تعاقب میں نکل پڑنا دانش مندانہ قدم تھا یا نہیں۔ مگر یہ بھی درست تھا کہ اس وقت میرا وجود کسی آتش فشاں کی طرح دہک رہا تھا۔ میرے دماغ میں انگارے سلگ رہے تھے اور دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا جنون سر پر سوار تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو غفورے کی آواز پہچان کر مجھے معلوم ہو چکا تھا، مجھ پر یوں اچانک قاتلانہ حملہ کرنے والوں کا تعلق اشفاق شاہین کے آدمیوں سے تھا۔ دوسرے یہ کہ ان میں مردود غفورا بھی شامل تھا اور میں اسے کسی قیمت پر بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

میں جیپ کی رفتار بتدریج بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ ہائی روف پک اپ سوار حملہ آوروں کو میرے تعاقب کا علم ہو گیا ہو ......... مگر انہوں نے گاڑی روکی نہیں تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اپنے ہی پیچھے مجھ کو تعاقب میں آتا دیکھ کر چاہتے بھی یہی ہوں کہ کسی دوسرے ویران مقام تک پہنچنے کے بعد مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں۔ تاہم میں بھی اتنا تر نوالہ نہ تھا۔ تعاقب جاری تھا۔ لالہ زار سے بائیں جانب مڑنے والی بل کھاتی سڑک صنوبر کے گھنے لانبے پیڑوں کے درمیان جاتی ہوئی نظر آئی تو میں نے دشمنوں کی ہائی روف پک اپ کو اسی سمت کی جانب مڑتے ہوئے دیکھا۔ پھر جب میں مذکورہ چوراہے پر پہنچا تو بائیں جانب مڑنے والی سڑک کی بجائے تیزی کے ساتھ آگے نکلتا چلا گیا۔ ایسا میں نے دانستہ کیا تھا۔ درحقیقت میں جانتا تھا کہ لالہ زار سے بائیں طرف مڑنے والی یہ سڑک آگے جا کر تقریباً تین میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سیدھی موٹر وے سے جا کر ملتی تھی۔ یہ وہی سڑک تھی جس پر میں نے شاہین کے آدمیوں گنگل خان وغیرہ کا تعاقب کیا تھا۔ مگر اس بار میں دوسری سمت پر تھا۔

لیکن ابھی میں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ عقب سے مجھے پولیس سائرن کی چیختی چنگھاڑتی آواز سنائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



دی۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ یہ پولیس موبائل تھی جو طوفانی رفتار سے میرے تعاقب میں ہولناک سائرن بجاتی ہوئی آ رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی ہیڈ لائٹس کو جلا بجھا کر مجھے رکنے کا اشارہ بھی کر رہی تھی۔ ناچار میں نے جیپ کی رفتار بتدریج کم کر دی اور بالآخر سڑک کے کنارے روک دی۔ پولیس موبائل تیزی کے ساتھ سائرن بجاتی ہوئی میرے قریب آن رکی۔ میں انجن سوئچ آف کرنے کے بعد نیچے اتر آیا۔ میں نے موبائل گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن سے انسپکٹر شمس کو اترتے دیکھا اور ساتھ ہی موبائل کے پچھلے حصے سے چند مسلح پولیس والے بھی چھلانگیں لگاتے اتر پڑے۔

انسپکٹر شمس کو دیکھ کر مجھے تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔ وہ میری طرف معاندانہ نظروں سے گھورتا ہوا آگے بڑھا اور قریب پہنچ کر درشت لہجے میں بولا۔

''یہ کیا خون خرابہ پھیلا کر آئے ہو تم اپنے ٹال پر؟''

مجھے اس کا لہجہ ناگوار گزرا اور میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ ''یہ خون خرابہ میں نے نہیں بلکہ میرے دشمنوں نے کیا تھا۔''

''تم ماں بیٹوں کا تو پورا شہر ہی دشمن بنا ہوا ہے۔ ہے نا.........؟'' اس نے دانت پیس کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔

میں اس کے طنزیہ اور کاٹ دار لہجے میں چھپی کینہ پروری کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا۔ کیونکہ یہ شاہ بر اور نظر حیات کی زر خرید کالی بھیڑ تھی۔

''چلو......... موبائل میں بیٹھو۔ تمہیں تھانے چلنا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے......... میں اپنی جیپ میں چلوں گا۔'' میں نے بھی رکھائی سے کہا تو وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ پھر اس نے اپنے دو پولیس والوں کو میرے ساتھ میری جیپ میں سوار ہونے کا کہا۔

میں جیپ میں بیٹھا تو ایک پولیس والا میرے برابر کی نشست پر اور دوسرا عقبی نشست کی طرف چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے جیپ اسٹارٹ کی، یوٹرن لیا اور واپس ہو لیا۔ پولیس موبائل میرے عقب لگ گئی۔

جیپ چلانے کے دوران میں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور چوہدری ذیشان سے رابطہ کیا اور اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ نیز دو پولیس والوں کی موجودگی کے باعث میں نے اشفاق شاہین اور بالخصوص غفورے کا نام لینے سے گریز کیا تھا۔ تاہم میں نے چوہدری ذیشان کو اشاروں کنایوں میں ساری باتیں سمجھا دیں۔

''یہ بہت برا ہوا۔ مگر تم بالکل فکر مت کرو۔ میں ابھی متعلقہ ایس پی سے بات کر لیتا ہوں۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔ ''ویسے تم ٹھیک تو ہو نا بیٹا؟'' ان کے لہجے میں شفقت تھی۔

''جی انکل! اللہ کا شکر ہے۔ میں اس قاتلانہ حملے سے بال بال بچا ہوں۔''

''او کے......... میں ابھی آئی جی سے بھی بات کرتا ہوں اور اسپیشل پولیس ٹیم بھجواتا ہوں۔ تم بالکل فکر مت کرنا۔ اور ہاں، تمہارے ساتھ جو پولیس والا بیٹھا ہے اپنا موبائل ذرا اُسے دینا۔''

''جی اچھا۔'' میں نے یہ کہہ کر اپنے برابر بیٹھے ہوئے پولیس والے کی طرف دیکھا اور اپنا موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔

''لو......... بات کرو۔ ایم این اے چوہدری ذیشان صاحب بات کریں گے۔''

چوہدری صاحب کا نام سن کر پولیس والا ایک دم مرعوب سا نظر آنے لگا۔ پھر میرے ہاتھ سے موبائل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



لے کر کان سے لگا لیا اور مؤدبانہ بولا۔

"جی سر!.....حکم کریں۔"

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سنتا رہا، اس کے بعد شاید دوسری طرف سے چوہدری ذیشان نے انسپکٹر اعجاز شمس کا موبائل نمبر پوچھا تھا کیونکہ وہ پولیس والا انہیں یہ کہہ کر موبائل نمبر بتانے لگا۔

"جی.....جی سر!.....انسپکٹر صاحب کا موبائل نمبر مجھے معلوم ہے۔ نوٹ کریں۔"

نمبر نوٹ کروانے کے بعد پولیس والے نے موبائل مجھے لوٹا دیا۔

میں نے کان سے لگایا تو دوسری جانب چوہدری صاحب لائن پر موجود تھے۔

"ہاں بیٹا!.....میں ابھی انسپکٹر اعجاز شمس سے بھی بات کر لیتا ہوں.....ٹھیک ہے.....او کے خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر موبائل اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اب میں مطمئن تھا۔

❄❄❄

چوہدری ذیشان کے بیچ میں پڑنے سے میری حد تک معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ورنہ انسپکٹر اعجاز شمس تو مجھے پہلے ہی "اندر" پہنچانے کے بارے میں پکا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرے تعلقات اتنے وسیع بھی ہو سکتے ہیں۔

بہرطور.....اسے مجھے چھوڑنا ہی پڑا۔ معمولی سی ضابطے کی کارروائی اس نے ضرور نمٹائی تھی۔ چوہدری صاحب کے حکم پر ایس پی ظہیر قریشی صاحب اسپیشل پولیس ٹیم کے ہمراہ خود وقوعے کا جائزہ لینے آئے پہنچے تھے۔

میرے ہاتھوں دو حملہ آور مارے جا چکے تھے جبکہ تیسرا زخمی حالت میں مزدوروں نے پکڑ لیا تھا۔

بظاہر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ مگر مجھے رہ رہ کر یہ خیال بھی فکرمند کرتا تھا کہ اسپیشل ٹیم کی کارروائی سے اشفاق شاہین اور بالخصوص غفورا پولیس کی گرفت میں آ گیا تو معاملہ الٹا میرے گلے بھی پڑ سکتا تھا۔ کیونکہ یہ بات میرے دشمن شاہ میر اور نظر حیات (مگر اب صرف نظر حیات) بھی جانتے تھے کہ صدف مرڈر کیس میں غفورے کی گرفتاری کس قدر اہم تھی اور نظر حیات انسپکٹر اعجاز شمس کو غفورے کی تلاش کے سلسلے میں پیسوں کے زور پر الرٹ رکھے تھا۔ کیونکہ نظر حیات کی بیٹی صدف مرڈر کیس میں، غفورے گواہی میری ماں کو پھانسی پر چڑھانے کا باعث بن سکتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ غفورے نے مجھے بھی ملک شیر خان کا قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یوں غفورے کا پولیس کی گرفت میں آنا ہم دونوں ماں بیٹوں کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ ادھر غفورے کی بھی میرے خلاف چیرہ دستیاں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ اشفاق شاہین کے دیگر آدمی بھی پولیس کی گرفت میں آ چکے تھے اور ان سے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری تھا۔ ممکن تھا کہ کوئی، اشفاق شاہین یا غفورے کے سلسلے میں زبان کھول سکتا تھا۔ چنانچہ کم از کم غفورے کو اب میرے لئے جلد سے جلد ٹھکانے لگانا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ یوں بھی وہ کئی بے گناہ لوگوں کا قاتل بن چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے غفورے کو جلد از جلد اپنے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مجھ پر ہونے والے قاتلانہ حملے سے ماں اور انکل اعظم خان خاصے پریشان ہو گئے تھے۔ مگر میں نے انہیں نہیں بتایا تھا کہ میرے دشمن کون تھے۔ پھر چوہدری ذیشان جیسی بھاری بھرکم شخصیت نے بھی



پولیس کی الجھنوں سے بچایا تھا اس پر دونوں کو خاصی حیرت ہوئی تھی کہ میرے بھلا چوہدری صاحب طرح کس طرح تعلقات پیدا ہو گئے تھے؟.....تاہم میں نے دشمنوں کے سلسلے میں بدستور یہی ظاہر کیا کہ وہ نامعلوم تھے۔ مگر ماں اور انکل اعظم خان کا خیال تھا کہ یہ حرکت پھاگل والی مہم کا ردِعمل ہو سکتی جس کے پیچھے یقیناً نظر حیات وغیرہ کا ہاتھ تھا۔ "جھوٹ" سے مجھے یہ پریشانی ہو گئی تھی۔ کیونکہ ماں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ میں نظر حیات کا کانٹا اب نکال ہی دوں۔ یوں میں نے جو نظر کے خلاف "اعصابی جنگ" شروع کر رکھی تھی وہ متاثر ہونے لگی تھی۔ تاہم مجھے ماں سے یہ جھوٹ بولنا پڑا کہ یہ حرکت غفورے کے آدمیوں کی تھی جو ہمارے لئے خطرہ بنتا جا رہا تھا۔

اس ضمن میں ماں سے میں نے یہی کہا تھا کہ تھوڑے دنوں پہلے ہی غفورے نے مجھ سے ایک خفیہ ملاقات کی تھی اور مجھے بلیک میل کرنا چاہ رہا تھا کہ اگر میں نے اسے ماہانہ پچاس ہزار کی رقم باقاعدگی سے ادا نہ کی تو وہ پولیس کو صدف مرڈر کیس اور ملک سردار خان کے قتل کے سلسلے میں وعدہ معاف گواہ بن کر پھنسا دے گا اور اس سلسلے میں نظر حیات نے اس کی بھرپور مدد کرنے کا بھی وعدہ کر رکھا ہے وغیرہ۔

غفورے کے ذکر پر ماں بھی پریشان سی ہو گئی تھی۔ مجھ پر قاتلانہ حملے کی خبر اخبارات میں بھی شہ سرخیوں سے شائع ہوئی تھیں۔ کاشانہ بھی مجھ سے ملنے آئی۔ اس نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ حرکت رب نواز کی ہو سکتی ہے۔ تاہم اس نے یہ بھی کہا تھا کہ گزشتہ دنوں ٹرکوں کی چوری والے کیس کے بعد سے اس کے میرے خلاف متوقع ردِعمل کے باعث اس نے رب نواز پر کڑی نگاہ رکھنی شروع کر رکھی ہے۔ میں نے کاشانہ کو تسلی دی تھی کہ سردست اس کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے اور اب وہ میرے خلاف کسی "مہم جوئی" کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اعظم خان نے البتہ ہم ماں بیٹے کی سکیورٹی پر زور دینا شروع کر دیا تھا اور مجھے کچھ عرصے کے لئے ٹال پر جانے سے منع کیا تھا۔ مگر میں نہیں مانا تھا۔ میں نے بھی باقاعدگی سے ٹال پر جانا تھا۔

بہ ظاہر حالات معمول پر آ گئے تھے۔ مگر مجھے اشفاق شاہین اور غفورے کی طرف سے بدستور دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس وقت یہ مسئلہ "ہرننگ پوائنٹ" پر تھا۔ باقی دشمنوں کو میں نے سردست نکیل ڈال رکھی تھی۔

سکیورٹی کے سلسلے میں البتہ میں نے ماں کی حفاظت کے پیش نظر گرین لاج میں مسلح گارڈز کی تعداد بڑھا دی تھی۔ میں نے اب اشفاق شاہین اور بالخصوص غفورے والے معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا اور سردست غفورے کو میں نے ٹارگٹ بنا لیا تھا۔ جو ملزمان گرفتار ہوئے تھے ان سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ کسی وقت بھی دھماکا خیز انکشافات کی توقع تھی۔

چوہدری ذیشان بھی اپنا پورا زور لگا رہے تھے۔

ایک روز میں گرین لاج سے ٹال پر جانے کے لئے جیپ میں سوار ہونے لگا تو اچانک مجھے چوہدری ذیشان کی کال موصول ہوئی۔

"ناصر بیٹا!.....ایک زبردست خوش خبری ہے تمہارے لئے۔" ان کا لہجہ پُرمسرت تھا۔ مگر میرا دل "خوش خبری" پر ایک متوقع اور پُرتشویش خیال سے دھڑکنے لگا۔

"جی.....کیا خوش خبری ہے؟" میں نے بہ مشکل اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"دونوں طرف کے ملزمان نے زبان کھول دی۔ اب یہ مردود اشفاق شاہین نہیں بچ سکتا۔" چوہدری ذیشان نے دھماکا کیا۔ مجھے غفورے کی طرف سے زیادہ پریشانی ستانے لگی تھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



"اچھا......... یہ تو بڑی زبردست خوش خبری سنائی ہے آپ نے.........تو پھر اس کے خلاف پولیس کارروائی ہوئی؟"

"اسپیشل پولیس ٹیم نے اشفاق شاہین کی لاہور میں گلبرگ والی کوٹھی پر چھاپہ مارا ہے۔" وہ بتانے لگے۔ اور میرا دل جیسے کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔

"مگر اس بدبخت کو شاید پہلے ہی سے علم ہو گیا تھا۔ وہ اپنے چند قریبی ساتھیوں سمیت روپوش ہو گیا ہے۔" وہ پُرجوش لہجے میں بتانے لگے۔ "مگر وہ اب بچ کر نہیں جا سکتے.........ان کے خلاف ہم نے بہت مضبوط نیٹ ورک بنا لیا ہے۔ اس کے گرفتار شدہ ساتھیوں سے مزید پوچھ گچھ جاری ہے۔"

"انکل!......... کیا اسپیشل پولیس ٹیم کو چھاپے کے دوران کوئی ثبوت ملے ہیں؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"گلبرگ والی کوٹھی سے تو کچھ نہیں ملا۔ البتہ دو دیگر اڈوں پر چھاپے کے دوران کچھ آبرو باختہ لڑکیوں، عورتوں اور مردوں کو گرفتار کیا ہے۔ وہاں سے بڑے سنسنی خیز ثبوت ملے ہیں۔ باقی تفصیل آج کا اخبار لے کر پڑھ لو۔" انہوں نے آخر میں کہا۔

"تھینک یو انکل!......... آپ نے مجھے ایک بہت بڑی خوش خبری سنائی۔" میں خوش ہو کر بولا۔ انہوں نے آخر میں توصیفی انداز میں کہا۔

"نادر بیٹے! یہ سب تمہاری بہادری اور ذہانت کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ شاید ہم کبھی اشفاق شاہین جیسے بڑے گینگسٹر کو نہیں چھاپ سکتے تھے۔"

"نہیں، اس میں آپ کی بھی ذاتی دلچسپی اور نیک جذبوں کا دخل ہے۔" میں نے کسرِ نفسی کے ساتھ کہا۔ اس کے بعد انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میرے لئے یہ ایک بڑی خوش خبری تھی کہ بالآخر اشفاق شاہین کے خلاف موثر انداز میں کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ یقیناً کئی اہم ثبوت بھی ہاتھ لگے ہوں گے۔ اگرچہ وہ روپوش ہو گیا تھا، تاہم اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا تھا کہ کالا دھندہ بند ہو چکا تھا۔

میں ٹال پر پہنچا تو منیجر مشتاق کو اپنے آفس روم میں اخبار کھولے اور اپنے گال پیٹتے ہوئے پایا۔

"توبہ.........توبہ......... کیسے کمینے لوگ ہمارے سماج میں پیدا ہونے لگے ہیں۔"

وہ اخبار پڑھے جا رہا تھا اور ایک ہاتھ کانوں کو لگائے، بڑبڑائے جا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے اخبار جھپٹا اور اپنی چیئر پر بیٹھ کر اشفاق شاہین کے متعلق خبر پڑھنے لگا۔

شہ سرخیوں میں خبریں چھپی تھیں۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ انڈر ورلڈ فلم مافیا کے چیف اشفاق شاہین کے خلاف اسپیشل پولیس نے کارروائی کے دوران اس کی گلبرگ والی کوٹھی اور دو دیگر خفیہ اڈوں پر چھاپہ مارا تھا۔ کوٹھی سے تو کچھ برآمد نہیں ہوا تھا البتہ اس کے دو اڈوں سے آبرو باختہ عورتیں اور مرد گرفتار کر لئے گئے تھے اور وہاں سے ویڈیو کیمرہ اور فلم میکنگ کے دیگر لوازمات کے علاوہ قابل اعتراض سی ڈیز پولیس کے ہاتھ لگی تھیں جس سے یہ گھناؤنی حقیقت سامنے آئی کہ اشفاق شاہین کا گروہ قابل اعتراض فلمیں بنانے کا گھناؤنا کاروبار کرتا تھا۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

خبر کے علاوہ ایک چھوٹے سے چوکھٹے میں اشفاق شاہین کے دست راست غفورے کو بھی ہلاک کیا گیا تھا۔ بالخصوص اس خبر نے مجھے بری طرح چونکا کر رکھ دیا تھا۔ میں اس خبر کو بھی بہ غور پڑھنے لگا۔ غفورے کے سلسلے میں یہ انکشافات تھے کہ وہ اداکارہ سپنا کے قتل میں بھی ملوث تھا۔ بلکہ ٹھیکیدار



کی جواں سال بیٹی صدف کا بھی قاتل تھا۔ علاوہ ازیں ملک سردار خان کے قتل کا چشم دید گواہ بھی گرفتار شدہ ملزمان سے بھی مزید پوچھ گچھ جاری ہے۔ ایک دوسرے چوکھٹے میں لکھا تھا کہ اشفاق شاہین کو متوقع قانونی حراست سے بچانے اور اس کی قبل از گرفتاری ضمانت کے لئے بعض بااثر شخصیت بیرون خانہ حرکت میں آ چکی ہیں۔

غفورے سے متعلقہ خبر نے مجھے ایک بار پھر متفکر کر دیا۔ میرے چہرے پر طاری غیر متوقع پریشانی کے تاثرات دیکھ کر میرے سامنے بیٹھا منیجر مشتاق جانے کیا سمجھ کر بولا۔

"سر جی! آپ کو مردود اشفاق شاہین کے گروہ کی گرفتاری پر کوئی خوشی نہیں ہوئی، جی کڑا کے، سر!"

میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا۔ "کیا مطلب؟"

"م......... م......... مطلب......... کک......... کچھ نہیں......... سر!......... جی کڑا کے۔" وہ گھبرا کر بولا۔

اچانک میں نے اپنے آفس کے گلاس ڈور سے ایک پولیس جیپ تیزی سے اندر داخل ہوتے دیکھی۔ میں چونک سا گیا۔ پھر جیپ سے جب میں نے دو پولیس والوں کے ساتھ انسپکٹر اعجاز شمس کو بھی نیچے اترتے دیکھا تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ تاہم میں یہی سمجھا تھا کہ شاید وہ گزشتہ دنوں مجھ پر قاتلانہ حملے کے واقعے کے سلسلے میں کچھ ضروری پوچھ تاچھ کی "باقیات" نمٹانے آیا ہے۔

وہ سیدھا میرے آفس روم کی طرف بڑھا۔ میں نے منیجر مشتاق کو وہاں سے جانے کو کہا۔ انسپکٹر شمس اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں وہ دونوں پولیس والے بھی اندر داخل ہو گئے۔ میں نے بہ غور انسپکٹر شمس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ مجھے اس کے چہرے پر گہرے معاندانہ جوش کے تاثرات محسوس ہوئے۔

میں نے طوعاً و کرہاً کھڑے ہو کر جبراً مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور مصافحہ کرنے کے بعد اسے بیٹھنے کا کہا۔ باقی دو پولیس والے بھی دائیں بائیں کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

"جی.........!" میں نے استفسار طلب لہجے میں اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا وہ ذرا کھنکھار کر عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔

"نادر صاحب! میرے سوال کا جواب آپ ذرا سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح یاد کر کے دیجئے گا۔ کیونکہ آپ کا جھوٹ یا بھول پن ہمارے شبہے کو تقویت دینے کا باعث بن سکتا ہے۔"

میں اس کے اس عجیب و غریب پوچھنے کے انداز پر ذرا پریشان سا ہوا تاہم دوسرے ہی لمحے پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "جی......... پوچھئے۔ کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

وہ ہولے سے کھنکھار کر اور میرے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ کر بولا۔ "آپ پر کئے گئے قاتلانہ حملے سے چند روز پہلے اشفاق شاہین آپ سے ملنے یہاں آیا تھا؟"

اس کی بات پر مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ مجھے اس کا فوری طور پر سوچ کر جواب دینا تھا جو میری بیدار مغزی کا امتحان بھی تھا۔

"کیا مطلب؟"

"میں نے بالکل سلیس اُردو میں آپ سے پوچھا ہے نادر صاحب! کہ اشفاق شاہین گزشتہ دنوں یہاں آپ کے ٹال پر آپ سے ملاقات کرنے آیا تھا؟"

اس نے ایک ایک لفظ چبا کر اور پورے مستحکم لہجے میں اپنا سوال دہرایا تو میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن نے فوری طور پر اس کے لہجے کی مضبوطی اور چہرے پر طاری متوقع فاتحانہ جوش کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



سرخی کو بھانپ کر یہ یقینی اندازہ قائم کر لیا تھا کہ چند دنوں پہلے اشفاق شاہین کی یہاں آمد سے متعلق
کے ہاتھ کوئی ٹھوس ثبوت لگ چکا تھا اس لئے میرا جھوٹ بولنا مجھے کمزور اور اسے مضبوط بنا سکتا تھا
میں نے بہ ظاہر بے پرواہانہ انداز میں اسے گول مول جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے یہاں وہ کسی کاروباری سلسلے میں آیا ہو۔ اوپن اسپاٹ ہے..... لکڑیوں کے
وغیرہ دینے کے لئے یہاں لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔''

''ہوں..... ٹھیک کہا آپ نے۔'' میری بات پر اس نے اسرار بھرے لہجے میں ایک گہری ہنکار
خارج کرتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ نے اشفاق شاہین کو اس سے قبل دیکھا تھا؟..... یا آپ اسے پہچانتے تھے؟''
نے اگلا سوال داغا۔ اس کے طرزِ تخاطب سے اعتماد کی جھلک صاف محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ایسا لگ
جیسے میرے خلاف ایک گہری سازش کے تحت ہی مجھ پر جال ڈالنے کی غرض سے آیا تھا اور اس کے
یقیناً کوئی ٹھوس وجہ تھی۔ نیز وہ اس کی پہلے سے بھرپور تیاری بھی کر کے آیا تھا۔ البتہ میں اس کے
سوال پر کچھ اُلجھ سا گیا تھا کہ میں اسے فوری طور پر کیا جواب دیتا؟ مجھ سے جواب نہ بن پڑا تو میں
الٹا اس سے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کر ڈالا۔

''انسپکٹر!..... آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟..... ذرا کھل کر بات کریں۔''

اس کی بھانپتی ہوئی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''میں نے بات واضح کر دی ہے۔ پھر وضاحت کرتا ہوں۔ آپ کے اشفاق شاہین سے خفیہ تعلقات
رہے ہیں؟'' بالآخر اس نے کہا۔

''یہ جھوٹ ہے..... میں تو اسے جانتا تک نہیں ہوں۔ اور نہ ہی کبھی ملا ہوں اس سے۔'' مجھے
غصہ آ گیا۔ انسپکٹر اعجاز شمس میرے تیز لہجے سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا بلکہ اس کے بجائے اس کے ہونٹوں
زہریلی مسکراہٹ اور آنکھوں سے بلا کے اعتماد کی جھلک نمایاں تھی۔ کم بخت کا یہی پُراعتماد لہجہ مجھے
سے پریشان کئے دے رہا تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنی شرٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

''اسے کھول کر دیکھئے..... کیا یہ بھی جھوٹ ہے؟'' اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ اس بار
شمس کی آنکھوں میں تندی عود کر آئی تھی۔

میں نے لفافے کی طرف دیکھا۔ پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اسے الٹایا اور اس کے اندر سے چار
پوسٹ کارڈ سائز کی تصویریں برآمد ہوئیں۔ میں نے ان پر نظر ڈالی اور میرے تنفس کی رفتار تیز
ہونے لگی۔ پورا وجود بری طرح سائیں سائیں کرنے لگا۔ حواس مختل سے ہونے لگے اور ہاتھوں سے
جان نکلتی ہوئی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے انسپکٹر شمس کی طرف دیکھا۔

اس کے ہونٹوں پر بڑی اسرار بھری مسکراہٹ تھی جیسے وہ میری کیفیات سے اندر ہی اندر حظ اٹھا
ہو۔ پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔

''کیوں نادر صاحب!..... یہ ثبوت کافی ہے؟''

میں نے بے اختیار اپنے خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیری اور ایک بار پھر تصویروں پر نگاہ ڈالی۔
چاروں تصویروں میں مختلف زاویوں سے میری اور اشفاق شاہین کی ملاقاتوں کا منظر دکھایا گیا تھا۔
تصویریں تو وہ تھیں جن میں پہلی ملاقات میری، اشفاق شاہین کی لاہور میں گلبرگ والی کوٹھی میں ہوئی



تیسری تصویر میری جیپ کی تھی جو اس کی کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ جبکہ آخری اور چوتھی تصویر
تھی جب گزشتہ دنوں اشفاق شاہین بہ نفسِ نفیس خود اپنی کار میں مجھ سے ملنے ٹال پر آیا تھا۔

یہ تصویریں کب اور کس نے اتاری تھیں، یہ سوچنا بعد کا کام تھا۔ مگر یہ وقت سامنے خطرناک ارادوں
اور تیوروں کے ساتھ بیٹھے انسپکٹر اعجاز شمس کو اس کا جواب دینے کا تھا۔ چنانچہ میں بل کے بل اپنی بدلتی
کیفیات پر قابو پاتے ہوئے فوراً اپنے ذہن کو بروئے کار لایا اور بے پرواہی سے مسکرا کر بولا۔

''میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ ممکن ہے میری اس شخص سے کاروباری ڈیلنگ ہوتی رہی
ہو۔ اب جبکہ آپ نے یہ تصویریں دکھائیں تو مجھے یاد آ گیا ہے کہ اس شخص نے اپنی لاہور گلبرگ والی کوٹھی
میں لکڑی کا کچھ کام کروانا تھا۔ اس کے لئے لکڑی درکار تھی۔ پھر جب میں نے آج کا اخبار پڑھا تو اس
کی تصویر دیکھ کر میں بھی یقیناً چونکا تھا۔''

میں نے دیکھا میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ تھوڑی دیر قبل اس کے
چہرے سے جو بلا کے اعتماد اور فتح مندی کے آثار مترشح تھے وہ اب ماند ہونے لگے تھے جس سے مجھے خود
اندازہ ہوا تھا کہ میرا جواب برمحل ہی نہیں بلکہ بہت مناسب اور جچا تلا تھا جس کے باعث اب میرا اعتماد
بھی بحال ہونے لگا تھا۔

''ہوں۔'' اس نے میری طرف گھورتی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک طویل ہنکاری لی۔ وہ بے بس
سا نظر آنے لگا۔ مگر بدستور اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہوئے بولا۔

''میں یہ چاروں تصویریں اسپیشل پولیس ٹیم کے آفیسر اور ایس پی ظہیر قریشی کو بھیجوں گا۔ اس کے
ساتھ تمہارے خلاف اپنے ریمارکس بھی۔ اور دوبارہ میں تمہاری گرفتاری کے وارنٹ کے ساتھ آؤں گا۔
لیکن میں نے سوچا تھا کہ اگر تم مجھ سے تعاون کرنے پر تیار ہو تو میں بالا ہی بالا تمہارے تعاون سے ان
دونوں مفرور ملزمان اشفاق شاہین اور غفورے کی تلاش میں اسپیشل پولیس پارٹی کی مدد کروں گا۔ اس طرح
میرا یہ فائدہ ہو گا کہ میری رکی ہوئی پروموشن بھی جلد ہو جائے گی۔''

اس نے اپنے پروموشن والے جس ''فائدے'' کا ذکر کیا تھا وہ فائدہ نہیں بلکہ ایک دیرینہ سازش تھی
اور میرے دشمن نظر حیات کے ساتھ اس کے خفیہ گٹھ جوڑ کی سازش کا طوق تھا جو وہ میرے گلے میں فٹ
کرنا چاہتا تھا۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ بڑے شوق سے یہ تصاویر جن کے حوالے کرنا چاہیں کر دیں۔ مجھے اس
کی پرواہ نہیں۔ رہی بات آپ سے تعاون کر کے آپ کا پروموشن بڑھانے کی تو اس کار خیر کے لئے مجھ
سے جو ہو گا میں کرنے کے لئے تیار ہوں..... اور ہاں.....'' میں نے آخر میں اس کے چہرے سے
چھلکتی بے اعتمادی پر ایک اور کاری ضرب لگاتے ہوئے مزید کہا۔

''اشفاق شاہین کے گروہ کے خلاف جو کارروائی ہوئی ہے وہ میری ہی نشاندہی پر کی گئی ہے۔ اور
رہا یہ کہ یہ بات بھی آف دی ریکارڈ ہے۔''

میری اس بات پر اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اُلجھن آمیز تاثرات نمایاں ہوئے۔
میں نے آخر میں پوچھا۔ ''بائی دا وے، میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ تصاویر آپ کو کس ذات شریف
سے مہیا کی تھیں؟ ممکن ہے وہی اشفاق شاہین کا ساتھی بھی ہو اور مجھے اس دشمنی کی بنا پر پھنسوانا چاہتا ہو۔''
بات میں نے اس سے اس لئے کی تا کہ وہ سمجھ سکے کہ میرے پاس بھی اپنے دفاع اور صفائی میں کہنے
کے لئے بہت کچھ ہے۔

''یہ کانفیڈینشل ہے۔'' اس نے مختصراً کہا۔ میرے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ویسے ایک بات تو ڈن ہے۔'' وہ آخر میں بولا۔ ''کہ اشفاق شاہین نہیں تو کم از کم غفورے کی گرفتاری تم اور تمہاری مظلوم ماں کبھی نہیں چاہیں گے، اس لئے کہ یہ بات صرف میں ہی جانتا ہوں کہ صدف اور ملک سردار خان مرڈر کیس میں غفورا ایک اہم گواہ ہے اور تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ میری اس وقت ساری توجہ غفورے کو گرفتار کرنے پر مرکوز ہو چکی ہے۔ او کے.....''

یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھی تصاویر اٹھا کر لفافے میں ڈالیں اور اپنے دونوں سپاہیوں کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔

وہ خبیث جاتے جاتے غفورے کے سلسلے میں مجھے ایک گمبھیر پریشانی میں مبتلا کر گیا تھا۔ غفورے کی اہمیت کا اسے بھی خوب اندازہ تھا اور نظر حیات نے اپنی بیٹی صدف کے قتل میں جو الزام میری ماں اور مجھ پر تھوپ رکھا تھا، انسپکٹر شمس انہی خطوط پر اپنی ''مہم'' جاری رکھے ہوئے تھا۔ گویا اندر ہی اندر نظر حیات میرے اور میری ماں کے خلاف گہری سازش تیار کرنے میں مصروف تھا۔

وہ شاید اب اپنے حلیف شاہ میر کے زندہ لاش میں تبدیل ہو جانے کے بعد ہمارے خلاف ''مار ماری'' کا میدان ترک کر کے انسپکٹر شمس کے ساتھ ساز باز میں لگا ہوا تھا۔ یوں دونوں کی توجہ اب غفورے کی جلد یا بہ دیر گرفتاری پر مرکوز تھی۔ یہ ہمارے لئے ایک تشویش ناک امر تھا۔

رہی بات ان چار پوسٹ کارڈ تصاویر کی، جن میں میری اور اشفاق شاہین کی ملاقاتوں کو دکھایا گیا تھا۔ یہ کس کی حرکت ہو سکتی تھی؟..... اس بارے میں مجھے خاصا غور و فکر کرنا تھا۔ اگرچہ اس بارے میں انسپکٹر اعجاز شمس کو میں نے مدلل جواب سے نواز دیا تھا مگر پھر بھی میں سوچ رہا تھا کہ کم از کم چوہدری ذیشان کو اس سلسلے میں پہلے سے آگاہ کر دوں تاکہ کبھی انسپکٹر شمس ان تصاویر کو میرے خلاف ہتھیار بنا کر استعمال نہ کر سکے۔

اس وقت چوہدری ذیشان ہی وہ واحد شخصیت تھی جو مجھے مکمل طور پر قانونی اور دیگر مسائل میں میرا تحفظ کر رہی تھی۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے چوہدری ذیشان سے رابطہ کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک میرا موبائل گنگنایا۔ میں نے موبائل نکالا۔ کال انکل اعظم خان کی تھی۔ میں نے فوراً کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

''جی انکل!..... میں نادر بول رہا ہوں۔ خیریت تو ہے؟''

دوسری جانب سے انکل اعظم خان کی تشویش ناک آواز ابھری۔ ''تم نے کچھ سنا؟'' ان کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

''نن..... نہیں..... کیا ہوا انکل؟..... خیریت تو ہے نا؟'' مجھ پر یکایک ہی بے چینی سی طاری ہونے لگی تھی۔

''ایم این اے..... چوہدری ذیشان کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔''

دوسری طرف سے انکل اعظم خان نے بتایا۔ اور میں جیسے سن ہو کر رہ گیا.....!


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چوہدری ذیشان کی اس طرح ہلاکت کی خبر میرے لئے سراسر غیر متوقع تھی۔ اس اچانک اطلاع نے میری سوچنے سمجھنے کی، کچھ بولنے تک کی صلاحیتیں گویا سلب کر لی تھیں۔ ریسیور میرے کان سے لگا تھا اور اس میں سے اعظم خان کی آواز ابھر رہی تھی مگر میری سماعت تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ یہ خبر ہی ایسی تھی کہ مضبوط سے مضبوط اعصاب رکھنے والا شخص بھی اس کے صدمے سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ چوہدری ذیشان میرے دشمن کے خلاف میرا بہت بڑا پشت پناہ تھا۔ اس کا اس طرح مارا جانا میرے لئے مشکلات و مصائب پیدا کر سکتا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر اس صدمے کی کیفیت میں رہا۔ پھر انکل اعظم کی ہیلو ہیلو نے مجھے گویا جھنجھوڑ کر اس حالت سے باہر نکالا۔

''ہیلو نادر!.....'' وہ دوسری طرف سے پوچھ رہے تھے۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟..... تم میری آواز سن رہے ہو؟''

''جی..... جی.....'' میں نے ایک گہرا سانس لے کر انہیں جواب دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔''

''تمہاری اس طویل اور پراسرار خاموشی نے مجھے تشویش میں ڈال دیا ہے..... کیا بات ہے؟ تم کچھ چھپا تو نہیں رہے؟'' ان کے لہجے میں تشویش کے ساتھ ساتھ تادیب کا عنصر بھی موجود تھا۔

''آپ نے خبر ہی ایسی سنائی ہے کہ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ چلے تھے۔'' میں نے جھینپی جھینپی سی آواز میں جواب دیا۔ ''چوہدری ذیشان سے میرے نہایت قریبی تعلقات استوار ہو چکے تھے۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ ''مگر میں تمہیں اس قدر کمزور اعصاب کا مالک نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے مجھے تشویش ہو رہی ہے۔ اصل معاملہ کیا ہے؟''

''اس کے لئے ضروری ہے کہ میں آپ سے تفصیلی ملاقات کروں۔'' میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری مگر اس سے وہ تر نہ ہو سکے۔ کیونکہ میری زبان بھی خشک ہو رہی تھی۔

''تو اس کے لئے انتظار کس بات کا ہے؟'' انہوں نے فوراً کہا۔ ''تم ابھی آ جاؤ۔ بلکہ ایسا کرو ابھی گھر سے نہ نکلو۔ میں گارڈ بھیج رہا ہوں۔ اس کی ہمراہی میں میری طرف آ جاؤ۔''

''نہیں انکل! گارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ میں درحقیقت انکل اعظم کو نہ صرف انسپکٹر اعجاز شمس کے عزائم کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ میرا خیال تھا کہ اب مجھے ان سے اشفاق شاہین اور غفورے کے مابین تعلق کی تفصیلی بات چیت کر لینی چاہئے تھی۔ غفورے کی گرفتاری عین ممکن تھی۔ نیز مجھے اس بات کا بھی علم تھا کہ چوہدری ذیشان کے اس اندوہناک قتل میں اشفاق شاہین اور غفورے کا ہی ہاتھ ہو سکتا تھا اور اب شاید چوہدری ذیشان کے بعد میں ان دونوں سفاک درندوں کی ہٹ لسٹ پر سب سے پہلے نمبر پر تھا۔ انہی سوچوں کے گرداب میں اٹھا اور اپنی جیپ میں سوار ہو کر انکل اعظم خان کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ان کی رہائش گاہ میرے ٹال سے زیادہ دور نہ تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں، میں انکل اعظم خان کی رہائش گاہ پر جا پہنچا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ہم دونوں نشست گاہ میں جا بیٹھے۔ میں نے اشفاق

شاہین سے لے کر ''پھاگل'' والے واقعے اور پھر انسپکٹر اعجاز شمس سے متعلق سارے واقعات تفصیل
ان کو سنا دیئے۔

انکل اعظم خان نے بڑے غور سے میری باتیں سنی تھیں۔

''اس میں شک نہیں ہے کہ انسپکٹر اعجاز شمس درپردہ نظر حیات کے ٹاسک پر کام کر رہا ہے
پہلے ہی سے ہمارے خلاف ہائر کر لیا گیا ہے۔'' انکل اعظم خان نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''
انسپکٹر شمس جیسی بھیڑوں سے نمٹنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لئے تم اپنی طرف سے اس خبیث
موقع نہ دینا۔ البتہ اشفاق شاہین اور غفورے کا معاملہ خصا تشویش ناک ہے۔ اس پر ذرا غور کرنا پڑے
دونوں قانون کی نظروں میں تو آ چکے ہیں اور اگر واقعی چوہدری ذیشان جیسی بھاری بھر کم شخصیت
میں اشفاق شاہین کا ہی ہاتھ ہے تو........''

''آف کورس انکل! دونوں کے علاوہ اتنی بڑی جرأت اور کون کر سکتا ہے؟'' میں نے فوراً پُر زور
میں کہا۔

''ہاں۔ میں سمجھ رہا ہوں۔'' انکل اعظم خان نے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے پُر خیال
میں کہا۔

''لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان دونوں خطرناک درندوں کو آخر کہاں تلاش کیا جائے؟''

میں نے جو کہنا تھا، کہہ چکا تھا۔ مجھے جانے کیوں گرین لاج جانے کی بے چینی ہو رہی تھی۔
اور غور کرنے کے لئے حالات بھی موافق تھے، وقت بھی۔ چنانچہ میں نے فوراً اجازت چاہی۔ انکل
خان کو میری جلد واپسی پر حیرت ہوئی۔ ان کا خیال ہو گا کہ میں دیر تک وہاں بیٹھ کر پیش آمدہ و پیش
معاملات پر تفصیلی گفتگو کروں گا۔ تاہم انہوں نے مجھے نہیں روکا۔

چوہدری ذیشان کے اندوہناک قتل کے بعد میری چھٹی حس بہ دستور خطرے کا الارم بجا رہی تھی
مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ چوہدری ذیشان نے اشفاق شاہین کے خلاف بڑی مؤثر کارروائی کی تھی اور اس
گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہونے کے وہ تمام ثبوت حاصل کر لئے تھے جو اس کو قرار واقعی سزا دلا
کے لئے کلیدی کردار ادا کر سکتے تھے۔ اس کام کے لئے وہ بقول خود نجانے کتنے عرصے سے تگ و دو
مصروف کار تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی اشفاق جیسے گاڈ فادر گینگسٹر سے ٹکر لی تھی اور اس
میں ان پر پھاگل کے ویران برف زاروں میں قاتلانہ حملہ بھی ہوا تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ عین
پر یہ سازش مجھ پر ''سرائے سیاں'' میں اچانک ہی آشکار ہو گئی تھی اور یوں میری مداخلت کے باعث
بال بال بچے اور اشفاق شاہین کے جو کارندے میرے ہاتھوں زخمی ہو کر حوالۂ پولیس ہوئے تھے انہیں
میں چوہدری ذیشان ہی کے حکم پر اسپیشل پولیس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ بعد میں ان سے ضروری کڑی
تاچھ کے فوراً بعد ہی اشفاق شاہین کے خلاف مؤثر اور کامیاب کارروائی کی گئی تھی لیکن ابھی چوہدری
کا مشن ادھورا ہی تھا کہ اشفاق شاہین اور غفورا نہ صرف راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے
انہوں نے پلٹ کر وار کرنے میں تاخیر نہیں کی تھی اور وار بھی ایسا جس کے باعث چوہدری ذیشان کو
جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔

یہ جاننے والے میرے علاوہ صرف دو ہی افراد تھے جنہیں اس حقیقت کا ادراک تھا کہ اشفاق شاہین
جیسے بڑے گینگسٹر کے خلاف چوہدری ذیشان کی کامیاب مہم میں میرا ہی ہاتھ تھا۔ ایک چوہدری ذیشان


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرا اشفاق شاہین۔

اور اب........ میں بھی ان ہی دونوں کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ ممکن ہے مقتول چوہدری ذیشان کی طرح
میرے خلاف بھی کوئی جان لیوا منصوبہ تیار کر چکے ہوتے۔ نظر حیات جیسے دشمن کے معاملے میں تو
شکار کا کھیل کھیلا جا سکتا تھا مگر اشفاق شاہین اور غفورے کے سلسلے میں ایسا کرنا صریحاً اپنی موت کو دعوت
دینے کے مترادف ہوتا۔ وہ دونوں اس وقت میرے لئے زخمی درندے بنے ہوئے تھے اور کسی بھی وقت
نزول چوہدری ذیشان کی طرح مجھے بھی پھاڑ کھانے کے لئے بے چین تھے۔

اب حالات تخت یا تختہ جیسی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ہم دونوں میں سے جس کا داؤ چل جاتا وہ
دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے میں لمحہ بھر کی دیر نہ کرتا۔ میں بظاہر خاموشی سے ڈرائیونگ میں
مصروف تھا مگر اندر میرے زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔

اچانک موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے حسب عادت موبائل کی اسکرین پر دیکھا اور چونک پڑا۔ وہ
ماں کی کال تھی۔

''ہیلو........ ماں! کیا بات ہے؟''

''تم کہا ہو؟........ خیریت تو ہے نا؟'' دوسری جانب سے ماں کی فکرمند آواز اُبھری۔

''ہاں ماں!........ میں بالکل ٹھیک ہوں اور گھر ہی آ رہا ہوں........ مگر........''

''اللہ تمہیں خیریت سے پہنچائے۔'' ماں نے بے اختیار دعائیہ لہجے میں کہا۔ میرے دل میں کھٹک سی
پیدا ہوئی اور فوراً ہی مضطربانہ بے چینی سے بولا۔

''کیا بات ہے ماں!........ تُو پریشان ہے؟''

''میں نے گرین لاج کے باہر کچھ مشتبہ لوگوں کو دیکھا ہے۔'' ماں نے گویا بادل ناخواستہ مجھے آگاہ کیا
اور ایکا ایکی میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔

''کتنی دور ہیں وہ؟........ اور تعداد میں کتنے ہیں؟'' میں نے تیزی کے ساتھ دھڑکتے دل سے
دریافت کیا۔

''میں اس وقت بالائی منزل کے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی ہوں۔ فی الحال تو مجھے تین ہی نظر
آئے ہیں۔'' ماں بتانے لگیں۔

''ارے........ ایک قریب آ رہا ہے۔'' ماں نے آخر میں اچانک چونک کر کہا۔ میرا دل کنپٹیوں میں
دھڑکنے لگا۔ اس کے بعد ماں نے بھی رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے فوراً موبائل جیب میں رکھا اور جیپ کی
رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

صنوبر اور چیڑ کے گھنے درختوں کے درمیان بل کھاتی سڑک پر میری جیپ آندھی طوفان کی طرح
دوڑنے لگی۔ میرے پورے وجود میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ میری نظروں کے سامنے بار بار ان
دونوں زخمی درندوں اشفاق شاہین اور غفورے کے بھیانک اور مکروہ چہرے گردش کر رہے تھے۔ دل و
دماغ وسوسوں کی زد میں تھے۔ بل کھاتی سڑک پر اس قدر تیز رفتار ڈرائیونگ میرے لئے خطرناک بھی
ثابت ہو سکتی تھی۔ مگر میں نے پوری مہارت کے ساتھ اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا۔ ایک قدرے تنگ سے
موڑ پر تو شکر تھا کہ میں نے بروقت بے قابو ہوتی جیپ کو سنبھال لیا تھا ورنہ جیپ دائیں جانب بنی اندھی
کھائی میں لڑھک چکی ہوتی۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر گرین لاج جا پہنچوں۔ اگرچہ اب گرین لاج کا فاصلہ کم ہی رہ

گیا تھا لیکن میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور موبائل نکال کر ماں سے رابطہ کرنا چاہا مگر ایک خیال ذہن میں ابھرتے ہی میں نے ارادہ بدل دیا۔ ممکن تھا کہ ماں کسی گوشے میں چھپی بیٹھی میری کال پر اس کا گنگناتا موبائل خطرے کا الارم نہ بن جائے۔ چنانچہ موبائل دوبارہ جیب میں رکھنے کے بعد میں نے اب اپنی ساری توجہ جیپ دوڑانے پر مرکوز کر دی تھی۔ میرے اعصاب تن کر اب تناؤ کا شکار ہونے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی بڑی قیامت آنے والی ہو۔

بالآخر ذرا دور سے مجھے کاہو اور چیڑ کے درختوں کے جھنڈ سے گرین لاج کی سبز چوبی عمارت نظر آنے لگی اور پھر ذرا ہی دیر بعد جب میں گرین لاج کے قدرے قریب پہنچا تو اچانک میری سماعتوں میں گولیاں چلنے کے بیک وقت تین دھماکے گونجے۔

میرے اندر مچی ہوئی ہلچل میں یکدم ہی اضافہ ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے گرین لاج کے قریب پہنچ کر جیپ کو گیٹ کے سامنے بریک لگائے۔ جیپ کے ٹائر پختہ ڈرائیو وے پر زور سے چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں نے اپنی جیب سے میگارد نکالا اور بہ سرعت دروازہ کھول کر باہر اتر آیا اور محتاط مگر تیز نظروں کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ ہر سُو خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ سہ پہر ڈھل چلی تھی اور دور کہیں مغربی پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے سورج کی گیند لڑھک رہی تھی۔

آسمان پر غروب ہوتے سورج کی سرخ تمازت خوب صورت شام کا منظر پیش کر رہی تھی۔ گیٹ پر متعین کردہ دونوں مسلح گارڈز بھی غائب تھے۔

ابھی میں گرین لاج میں داخل ہونے کا ارادہ کرنے ہی والا تھا کہ اچانک میری واپس پلٹتی نظروں نے بائیں جانب ذرا ڈھلوانی سمت پر دو گن بردار آدمیوں کو اُبھرتے دیکھا۔ میں ذرا ٹھٹکا۔ مگر دوسرے لمحے ان دونوں کو پہچان کر میں نے بے اختیار گہری سانس لی اور فوراً ان کی طرف دوڑا۔ وہ دونوں گرین لاج پر متعین مسلح گارڈز تھے۔ ان کے قریب پہنچ کر میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کیا ہوا؟.........ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔''

ایک نے جواباً کہا۔ ''بیگم صاحبہ کے حکم پر ہم ان تین مشتبہ افراد کے پیچھے لپکے تھے۔ گولیاں انہوں نے ہی چلائی تھیں مگر پھر ہماری جوابی فائرنگ پر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔''

''کس طرف گئے ہیں وہ؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

دوسرے نے جنوبی سمت کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہیں چیڑ کے جنگل میں ہم نے ان تینوں کو غائب ہوتے دیکھا ہے۔''

''ماں تو ٹھیک ہیں نا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں.........وہ بالکل ٹھیک ہیں۔'' پہلے والے نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا تو میں تیزی کے ساتھ گرین لاج کے بڑے سے محراب نما داخلی دروازے کی جانب پلٹا ہی تھا کہ مجھے ماں بھی دکھائی دیں۔ میں دوڑ کر ان کے قریب پہنچا۔

''ماں! تُو ٹھیک ہے نا؟'' میں نے اسے دونوں شانوں سے تھام کر پوچھا۔

''ہاں بیٹا!.........میں ٹھیک ہوں۔ مگر.........''

''میں ابھی آتا ہوں ماں!'' یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ اپنی جیپ کی طرف پلٹا اور اسٹارٹ کر کے تھوڑا سا ریورس کیا اور تیزی سے گیئر بدل کر دوسری سمت موڑ کاٹا اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔ میری طاقتور وہیل پوٹھوہار کمان سے نکلے تیر کی طرح نکلی اور مختصر سے ڈرائیو وے پر فراٹے بھرتی ہوئی سڑک پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



میں سڑک کی جانب رخ کرنے کی بجائے اس سمت گیا جہاں گارڈز نے ان تینوں مشتبہ افراد کو راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے اوجھل ہوتے دیکھا تھا۔

میں صنوبر اور کاہو کے درختوں کے درمیان خلا سے اپنی جیپ کو زگ زیگ انداز میں دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ شام ابھی پوری طرح سے گہری نہیں ہوئی تھی۔ ڈوبتے سورج کی کندنی کرنیں چھتنار پیڑوں سے چھن کر برچھیوں کی طرح خود رو جھاڑیوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ ان تینوں مشتبہ افراد کی تلاش میں سرسری طور پر یوں نکلنا بے شک ایک اندھا جواء کھیلنے کے مترادف سہی لیکن میں ایک یہ بھی محتاط اندازہ رکھتا تھا کہ ان تینوں مشتبہ افراد کی راہ گزر یہی ہو سکتی تھی بشرطیکہ ذرا آگے جا کر وہ اپنی کہیں قریب کھڑی گاڑی میں سوار نہ ہو جاتے۔ کیونکہ وہ یقیناً گاڑی میں ہی یہاں تک آئے ہوں گے اور اسے کہیں قریب کھڑا کرنے کے بعد پیدل ہی آگے بڑھے ہوں گے۔ مجھے اپنے اندازے کی درستی کا پورا یقین تھا۔

یہی سبب تھا کہ میں نے ابھی جنگل سے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک مجھے اس بل کھاتے رستے پر خاصی دور اونچے پیڑوں کے درمیان جیپ نما گاڑی حرکت کرتی نظر آ گئی۔ جسے دیکھتے ہی میرا سینہ جوش سے تن گیا اور پھر میں یکلخت ہی بائیں جانب موڑ کاٹ کر پوری رفتار کے ساتھ جیپ دوڑانے لگا۔

اس ویران اور آبادی سے دور، سنسان جنگل میں بروقت کسی گاڑی کا نظر آنا اس امر کی دلیل تھی کہ ابھی ذرا دیر پہلے ہی گرین لاج کے گرد منڈلاتے ہوئے تینوں مشتبہ افراد اس گاڑی میں ناکام و نامراد راہِ فرار اختیار کئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے ٹکر لینے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔

میں اب ایک شارٹ کٹ راستہ اپنا کر ان کا راستہ کھوٹا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُبھرا۔ میں نے ان سے درّانہ وار بھڑنے کا ارادہ ترک کر کے ان کا تعاقب کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ اب میں ان کا بڑی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ پیچھا کرنے لگا۔ یوں کہ انہیں اپنے تعاقب کا احساس بھی نہ ہو سکے۔ ان کی گاڑی مجھے نظر آ رہی تھی۔

جنگل سے نکل کر گاڑی ایبٹ آباد جانے والی سڑک پر آ گئی۔ میں نے بھی اپنی جیپ اس سمت موڑ دی۔ آگے جا کر اس سڑک سے تین اور سڑکیں بھی نکلتی تھیں۔ ایک تو مری واپس جاتی تھی جبکہ باقی دو ہری پور ہزارہ اور کھر پار کی طرف جاتی تھیں۔ اس وقت ہم ہزارہ ڈویژن میں داخل ہو چکے تھے۔

اچانک ان کی گاڑی ہری پور جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ یہ ممکن تھا کہ انہیں اپنے تعاقب کا احساس نہیں تو خدشہ ضرور ہو سکتا تھا اس لئے میں نے چند دوسری آنے جانے والی گاڑیوں کے عقب میں ہی اپنی جیپ کو رکھنے کی کوشش کی تھی تا کہ ان کی نظروں میں نہ آ سکوں۔ یوں بھی ان کے سان گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں اس طرح ان کے پیچھے آ سکتا ہوں۔

اس وقت بھی میں نے اپنی جیپ کو ایک تیز رفتار ہائی ایس ویگن اور لگژری مسافر کوچ کے عقب میں چھپا رکھا ہوا تھا۔ مشتبہ افراد کی گاڑی لینڈ کروزر ٹائپ کی لمبی سی، پرانے ماڈل کی جیپ ہی تھی جو اب درمیانی رفتار سے دوڑے جا رہی تھی۔ ہری پور جانے والی سڑک کے دونوں جانب سرسبز ڈھلوانوں پر کچے پکے مکانوں کی بے ترتیب قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ اچانک ایک مقام پر میں نے دیکھا کہ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی اور بالآخر وہ سڑک کے کنارے رک گئی۔ میں نے بھی فوراً ہی اپنی جیپ سڑک کے بائیں جانب درختوں کے جھنڈ میں روک لی اور پھر بلی کی سی سرعت سے دروازہ کھول کر نیچے اترا اور تیزی کے ساتھ خود رو جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا گاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔

میں ان کے قریب پہنچ کر ان کی صورتیں پہچاننا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں چھپتا چھپاتا ان کی گاڑی کے بالآخر قریب پہنچ گیا تا کہ بہ آسانی ان کے چہرے دیکھ سکوں۔ ان کی تعداد تین ہی تھی۔ لہٰذا اس بات کی تصدیق تو ہو ہی گئی تھی کہ میں نے درست آدمیوں کا تعاقب کیا تھا۔ میں بہ غور انہیں پہچاننے کی کوشش کرنے لگا تو دو افراد کو میں نے اجنبی ہی پایا تھا۔ ان میں سے ایک گاڑی کا بونٹ کھولے اس پر جھکا ہوا تھا۔ شاید ان کی گاڑی میں کوئی خرابی واقع ہو گئی تھی۔ البتہ تیسرا شخص دوسری جانب منہ کئے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ نہ دیکھنے کے باوجود میں نے اس کے ڈیل ڈول سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی، وہی میرا اصل ہدف غفورا تھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد اپنی جیب سے موبائل سیٹ نکالا اور میری جانب مڑ کر کسی سے رابطہ کرنے لگا تو یکلخت میرے پورے وجود میں سنسنی پھیل گئی۔ وہ غفورا ہی تھا۔ میں تھوڑا اور قریب ہو گیا تا کہ اس کی موبائل پر گفتگو سن سکوں۔

''چیف!......... کیا آپ کا موبائل آف تھا؟......... میں آپ سے کافی دیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' رابطہ ہوتے ہی وہ مؤدبانہ بولا۔

''چیف! میں آپ کو بتانا چاہ رہا تھا کہ ہمیں کامیابی نہیں ہو سکی۔ ہم نادر علی کی ماں کو اغواء کرنے میں ناکام رہے ہیں عین وقت پر نہ جانے کس طرح ہم نظروں میں آ گئے اور ان کے گارڈز نے ہم پر حملہ کر دیا۔ شاید نادر علی بھی گرین لاج کے اندر ہی موجود تھا۔ اس نے بھی بالائی منزل سے ہم پر فائر کر ڈالے تھے۔ ہماری مہم خفیہ نہ رہ سکی۔ اور آپ کو تو حالات کا علم ہی ہے۔ وہ وقت جم کر مقابلہ کرنے کا یا زبردستی کرنے کا نہ تھا اس لئے.........''

دوسری جانب سے بات کاٹی گئی تھی۔ شاید اس کا چیف جو یقیناً اشفاق شاہین ہی ہو سکتا تھا، اسے گالیاں دے رہا تھا۔ کیونکہ غفورے کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔

''جج......... جی چیف! ہم واپس ہی لوٹ رہے ہیں۔ بس ہم ابھی تھوڑی دیر میں پہنچنے والے ہیں۔ او کے چیف! ہم آ رہے ہیں۔ نہیں، نہیں......... آپ بے فکر رہیں، ہمارا کسی نے تعاقب نہیں کیا ہے۔ ویسے چیف! اگر آپ حکم کریں تو میں جیدے اور بشیرے کو آپ کی طرف روانہ کر کے خود اکیلا ہی واپس گرین لاج جا کر صرف نادر کو ہی گولی مار دوں، جس طرح چوہدری ذیشان کو میں نے اپنی گولی کا نشانہ بنایا تھا؟......... ٹھیک ہے چیف! جیسے آپ کی مرضی......... میں بھی واپس پہنچ رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے موبائل آف کر کے جیب میں رکھا اور بونٹ پر جھکے ہوئے اپنے ساتھی سے بولا۔

''جیدے! کیا بڑی خرابی پیدا ہو گئی ہے جو اب تک ٹھیک نہیں ہوئی؟'' وہ اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔ اور میرا دماغ اس کی اشفاق شاہین سے ہونے والی گفتگو پر اس بری طرح سائیں سائیں کر رہا تھا مجھے اپنا لہو جلتی سلگتی کنپٹیوں پر اچھال مارتا محسوس ہونے لگا۔ گویا یہ بات میرے سامنے آشکارا ہو چکی تھی کہ چوہدری ذیشان کو خبیث غفورے نے ہی قتل کیا تھا اور اب یہ لوگ اشفاق شاہین کے خفیہ ٹھکانے جا رہے تھے۔ گویا اب میرا اشفاق شاہین اور غفورے سے فیصلہ کن ٹکر لینے کا وقت بہت قریب آ پہنچا تھا۔

❋❋❋

ذرا دیر بعد گاڑی کی خرابی دور کر لی گئی۔ میں تیزی کے ساتھ واپس پلٹا اور اپنی جیپ کے پاس پہنچا۔ غفورے کی گاڑی آگے روانہ ہو گئی۔ میں بھی تیزی سے اپنی جیپ میں سوار ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ صورتِ حال اب کافی حد تک واضح ہو چکی تھی۔ اگر غفورے کے ساتھ صرف ملک سردار خان والا معاملہ ہوتا تو یقیناً میں اس وقت اسپیشل پولیس فورس کو انفارم کر دیتا۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ اس


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسپکٹر اعجاز شمس کا ہم ماں بیٹے سے نظریات کے حوالے سے ذاتی عناد تھا۔

چنانچہ یہی سبب تھا کہ دیگر خونی اور سنسنی خیز معرکوں کی طرح یہ معرکہ بھی مجھے مارنا تھا۔ اشفاق شاہین اور وہ دونوں ناقابل معافی مجرم تھے۔ تقدیر اس وقت میرا بھرپور انداز میں ساتھ دے رہی تھی۔ اگرچہ اس کے پیچھے میری تدبیر کا بھی ہاتھ تھا۔ میں اس وقت نہ صرف غفورے کے بلکہ اشفاق شاہین کے ٹھکانے سے بھی واقف ہونے والا تھا۔ کیونکہ میں بروقت ہوشیاری اور حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے فوراً ہی ان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا تھا اور یوں اشفاق شاہین اور غفورے کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ ان دونوں نے ہم ماں بیٹے کے خلاف جو گھناؤنی سازش تیار کی تھی، اب انہی پر الٹنے والی تھی۔ اب میرے لئے اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ میں ان کے اصل ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے نہایت احتیاط کے ساتھ ان تینوں کا تعاقب جاری رکھوں۔ ورنہ میری ساری محنت اکارت چلی جاتی۔

ہری پور ہزارہ جانے والی یہ سڑک خاصی طویل تھی اور انہیں اپنے تعاقب کا پتہ نہ چلنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سڑک بل کھاتی ہوئی تھی۔ تقریباً کوئی پندرہ بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک چھوٹے سے مضافاتی گاؤں کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے تو گاڑی نے اس جانب ہی موڑ کاٹا۔ گاؤں کی آبادی زیادہ نہ تھی اور نہ ہی یہ کوئی بڑا گاؤں تھا۔ سڑک سے ہٹ کر ایک کچا اور ناپختہ راستہ وہاں تک جاتا تھا۔ راستہ دو رویہ قد آدم خودرو جھاڑیوں کے علاوہ کریر کے ٹھگنے چھتنار درختوں کا بھی سلسلہ ساتھ ساتھ دُور تک چلا گیا تھا۔

گاڑی کبھی آنکھوں سے اوجھل ہو رہی تھی تو کبھی نمودار ہوتی تیزی کے ساتھ ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا ان لوگوں کا ٹھکانا اس گاؤں میں کہیں ہو گا۔ مگر میرا خیال غلط تھا۔ ان کی جیپ گاؤں کے برابر سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ آگے کا سارا علاقہ کا ہو اور جنگل جلیبی کے درختوں سے اٹا پڑا تھا۔ گاڑی اس جنگل میں داخل ہوئی۔ میری نظریں آس پاس کے علاقے کا بغور جائزہ لے رہی تھیں کہ اچانک ہی مجھے ایک گول گنبد نما عمارت کی جھلک سی نظر آئی۔ پھر میں نے جیسے ہی دیکھا کہ گاڑی اس عمارت کے سامنے پہنچ کر رک چکی ہے تو میں نے بھی ذرا دور ہی اپنی جیپ روک دی اور نیچے اتر آیا۔

اس کے بعد میں قد آدم جھاڑیوں کی آڑ کا فائدہ اٹھاتا ہوا جھکا جھکا تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اس عمارت کے بالکل نزدیک جا پہنچا۔

قریب پہنچنے پر پتہ چلا کہ وہ کوئی سرائے ٹائپ کی عمارت تھی۔ مگر اس کی خستہ حالی اور کہنہ سالی سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نے یہاں رہنا تو ایک طرف، ذرا دیر کو رکنا بھی شاید ہی گوارا کیا ہو گا۔ عمارت کی چھت ڈھلوانی تھی۔ رقبہ بھی کچھ ایسا زیادہ نہیں تھا۔ زیادہ تر کام لکڑی ہی کا نظر آتا تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ پہلی اور دوسری منزل کی طویل گیلری کے ساتھ کمروں کے دروازے اور چوبارے نظر آ رہے تھے جہاں کہنہ سالی اور سال خوردگی چپکی ہوئی تھی۔ محرابی دریچوں کے پٹ ٹوٹ، کر اکھڑ گئے تھے اور بغیر ڈیلوں والی آنکھوں کی طرح تاریک اور ہولناک نظر آ رہے تھے۔ بڑی ہی پراسرار عمارت تھی۔ ماحول میں بھی اسرار بھری خاموشی کا راج تھا۔

گاڑی عمارت کے احاطے میں داخل ہو کر بیرونی دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ تینوں گاڑی سے نیچے اترے اور اندر داخل ہو گئے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے بھی ان کے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی تیزی کے ساتھ حرکت کی تھی اور نہایت محتاط تیز رفتاری سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



چلتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ اندر مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے دروازے کے قریب پہنچ جھانکا۔ یہ ہال نما کمرہ تھا۔ چار پانچ ٹوٹی پھوٹی جھلنگا سی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایک جانب آتش دان بنا ہوا تھا جو سرد تھا۔ دو تین کرسیاں اور ایک لمبی سی میز بھی دھری تھی روشنی بائیں جانب کے کسی کھلے کمرے سے آتی محسوس ہو رہی تھی، جس پر ابھی میری نظر نہیں پڑی تھی۔

غفورے اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اندر داخل ہوتے ہی شاید کمرے کا رخ کیا تھا۔ کیونکہ وہ تینوں نظر نہیں آ رہے تھے۔ تاہم ذرا غور کرنے پر مجھے اس سمت سے باتوں کی گونج سنائی دی مگر سمجھ نہیں آ سکے تھے۔ یہ تسلی ہوتے ہی کہ اب ہال میں کوئی نہ تھا، میں داخلی دروازے سے آگے ذرا اندر داخل ہوا اور مذکورہ سمت کی طرف سر ابھار کر دیکھا تو اسی وقت میری گردن سے ایک سرد نال اور ساتھ ہی ایک درشت آواز عقب سے اُبھری۔

''خبردار!.....کوئی غلط حرکت مت کرنا.....ورنہ گولی چلا دوں گا۔''

❄❄❄

میرے پورے وجود میں کاٹ دار سنسناہٹ دوڑ گئی۔ عین لب بام پر مجھے اپنی ساری محنت اکارت جاتی محسوس ہوئی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے میرے اندر کے جنگجو اور ایتھلیٹ انسان نے چلاّ کر کہا۔

'نادر! یہی تو وقت ہے دشمن پر شب خون مارنے کا۔'

دوسرے ہی لمحے میں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جھکائی دی اور گن پوائنٹ سے ''آؤٹ'' ہوتے ہی میں نے اپنے دائیں بازو کی کہنی بھرپور قوت کے ساتھ اپنے مدمقابل کے پیٹ پر رسید کر دی۔ کہنی کے حلق سے بے اختیار اوغ کی گھٹی گھٹی آواز خارج ہوئی مگر ساتھ ہی اس بدبخت نے دانستہ یا غیر ارادی طور پر پستول بھی چلا دیا۔

پُرہول سناٹے میں گولی چلنے کے دھماکے کی آواز جنگل میں بہت دور تک گونجی تھی۔ میں چونکہ پھرتی سے کام لے کر گن پوائنٹ سے دور ہو چکا تھا اس لئے گولی کی بھیانک قربت سے محفوظ رہا۔ اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ گولی چلنے کے دھماکے نے اندر موجود افراد کو یقیناً چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اب جو بھی کرنا تھا نہایت پھرتی اور چابک دستی کے ساتھ کرنا تھا۔

میری کہنی کی بھرپور ضرب مدمقابل کے پیٹ پر پڑنے کی وجہ سے وہ بے اختیار اپنا پیٹ پکڑے کے بل جھک گیا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا ذرا بھی موقع دیئے بغیر گھٹنے کی ضرب اس کی ناک پر دی اور ساتھ ہی اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پر بھی کراٹے والے انداز میں ہاتھ رسید کر دیا۔

وہ دہری تہری تکلیف کے باعث ڈھے سا گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکلتے ہی میرے ایک پر وہ جھاڑیوں میں جا گرا۔ آخری بھرپور ضرب میں نے اپنی لات کی اس کے پیٹ اور ناف کے نازک ترین مقام پر جڑ کر اسے ڈھیر کر دیا۔ میری یہ کارروائی لمحوں میں مکمل ہو گئی تھی اس لئے جیسے ہی سرائے کے ہال میں دوڑتے قدموں کی گونجیلی آواز سنائی دی، میں پھرتی کے ساتھ قد آدم جھاڑیوں اندر رینگ کر اس سال خوردہ عمارت کی جنوبی دیوار کی آڑ میں آ گیا اور اپنی نظریں دروازے پر گاڑ دیں۔

مجھے غفورے سمیت اس کے وہی دونوں ساتھی نظر آئے جن کے تعاقب میں تھوڑی دیر پہلے یہاں تک پہنچا تھا۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں پستول نظر آ رہے تھے۔

پھر شاید غفورے کی نگاہ اپنے زمین بوس ساتھی پر پڑی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے



ساتھیوں سے جلدی جلدی کچھ کہتے سنا اور پھر یکدم واپس پلٹا۔ باقی اس کے دونوں ساتھی باہر نکل کر نہایت محتاط انداز میں گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے دائیں بائیں کی جھاڑیوں کی سمت تیزی کے ساتھ بڑھے تھے۔

مجھے غفورے کے اچانک پلٹنے پر اچنبھا ہوا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ ممکن تھا سرائے کے عقبی حصے کی طرف بھی کوئی دروازہ ہو اور غفورا اسی جانب سے باہر نکل کر مجھے عقب سے گھیرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ میں بھی بہ سرعت سرائے کی عقبی دیوار کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے عقب میں سرکا۔ مگر دوسری سمت پہنچ کر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ سرائے کی عقبی دیوار سپاٹ تھی۔ یعنی وہاں کوئی دروازہ نہ تھا۔ تب پھر اچانک غیر اختیاری طور پر میری نظریں بالائی منزل پر پڑیں۔ میرے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ اگر میں بروقت اور بہ سرعت اپنی جگہ تبدیل نہ کرتا تو پہلی منزل کی سال خوردہ بالکونی پر کھڑے اپنی پستول سے میرا نشانہ باندھے غفورے کی چلائی ہوئی گولی کی زد میں ضرور آ جاتا۔ چنانچہ جونہی میں نے اپنی جگہ چھوڑی، اسی لمحے غفورے نے بھی مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ عین وقت پر جگہ تبدیل کرتے ہی میں نے بھی پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے میگارڈ نکال کر اس پر فائر کر دیا۔ میرے نیلگوں میگارڈ کی طاقت ور گولی غفورے کی بجائے بالکونی کی کھڑکی میں پیوست ہو گئی۔ غفورے نے اوپر تلے مجھ پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ میرے لئے بھی جوابی فائرنگ ضروری تھی۔ مگر میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا اور تیزی سے قد آدم جھاڑیوں میں رینگ کر قدرے دور چلا گیا۔

شام کے سائے دراز ہو کر اندھیرے میں بدلنے لگے تھے۔ تاریکی کا فائدہ اٹھانا میں خوب جانتا تھا۔ اچانک مجھے اپنی داہنی جانب جھاڑیوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں میگارڈ کی نال کا رخ مذکورہ سمت کر کے سانس روکے دبک گیا۔ اچانک روشنی ہوئی۔ میں لمحے بھر کو ٹھٹکا۔ یہ ٹارچ کی روشنی تھی جو دو مختلف سمتوں سے آ رہی تھی۔ ایک سامنے کی جھاڑیوں سے، دوسری بائیں جانب سے۔ یہ دونوں غفورے کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے۔

میں غفورے کی نظروں میں آ چکا تھا۔ میں نے بالکونی کی طرف بھی دیکھا تھا، وہ اب وہاں موجود نہ تھا۔ گویا وہ یہ جاننے کے لئے ہی بلندی پر آیا تھا کہ دیکھ سکے، حملہ آور کون تھے اور کتنے تھے؟ اب صرف ٹھکانے کو دیکھ کر وہ نئے عزم کے ساتھ دوبارہ نیچے آ کر مجھ سے نمٹنا چاہتا تھا۔

ٹھیک اسی وقت میں نے سامنے کی جھاڑیوں سے ایک ہیولے کو ابھرتے دیکھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اس کے ٹارچ والی ہاتھ پر گولی چلائی۔ ایک کریہہ چیخ اُبھری اور ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر جھاڑیوں میں جا گری۔ دوسری سمت سے اُبھرنے والی روشنی نے حرکت کی اور میں نے اسی وقت تیزی کے ساتھ اپنی جگہ تبدیل کر ڈالی۔ میں نے اس سمت پر گولی چلا دی۔ میں جھاڑیوں کی اوٹ لیتے ہوئے ایک بار پھر متروک سرائے کی عمارت کی جانب پیش قدمی کرنے لگا اور ٹھیک اس لمحے میں بری طرح چونکا۔ میں نے اشفاق شاہین اور غفورے کو تیزی کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا۔ میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میرے لئے یہ ان کی غیر متوقع حرکت تھی۔ وہ دونوں فرار ہو رہے تھے۔

مگر کیوں.....؟ میں نے جیپ میں سوار ہوتے وقت اشفاق شاہین کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی دیکھا تھا۔ میرے دماغ میں الجھا ہوا سوال اُبھرا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جب غفورے نے مجھے یہاں تنہا دیکھ بھی لیا تھا تو اسے اشفاق شاہین کے ساتھ اس قدر جلدی یہاں سے فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ انہیں تو میرے مقابلے پر اتر آنا چاہئے تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



کیا انہیں کہیں پہنچنے کی جلدی تھی؟.........مگر کہاں؟

ٹھیک اسی وقت جیپ اسٹارٹ ہوئی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھی۔ ایکا ایکی میرے پورے وجود میں بجلی سی دوڑ گئی۔ میں بھی پلٹا اور اس سمت پر بے درنگ دوڑنا شروع کر دیا جدھر میری جیپ کھڑی تھی۔

میں جب تک اپنی جیپ کے نزدیک پہنچا، ان کی گاڑی آگے نکل چکی تھی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی جیپ کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی جیپ آگے بڑھا دی۔

راستہ بل کھاتا ہوا اور ناہموار تھا۔ دونوں گاڑیاں زبردست ہچکولے کھاتی ہوئی آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ تاریکی کے باعث میں نے اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن کر رکھی تھیں۔ یقیناً اشفاق شاہین اور غفورے کو بھی اپنے تعاقب کا احساس تھا۔ یہی سبب تھا کہ اب وہ دونوں بھی اپنی توجہ راہِ فرار اختیار کرنے پر مرکوز کئے ہوئے تھے۔ اس طرح مجھ سے مقابلہ کئے بغیر راہِ فرار اختیار کرنے پر مجھے سخت حیرت تھی۔ ان کے لئے تو یہ سنہری موقع تھا کہ وہ مجھے تنہا دیکھ کر اپنے ارمان پورے کر سکتے تھے۔ میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

کہیں یہ دونوں مردود ملک سے ہی تو کوچ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے؟........ اور اس وقت انہیں شاید ایئر پورٹ پہنچنے کی جلدی ہو؟

مگر پھر میں نے اُلجھے ہوئے ذہن سے سوچا کہ بھلا اس طرح مجھے اپنے پیچھے لگا کر یہ یوں فرار ہونے کا ارادہ کیسے کر سکتے تھے؟......... میں پولیس کو بھی ان کے بارے میں مطلع کر سکتا تھا۔ یا پھر ممکن تھا کہ غفورے کی طرح اشفاق شاہین بھی جانتا تھا کہ میں کم از کم پولیس کو انفارم کرنے کی ''غلطی'' کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اشفاق شاہین کے سلسلے میں تو یہ ہو سکتا تھا۔ لیکن غفورا اس کے ساتھ تھا لہٰذا یہ ناممکن تھا۔ کیونکہ لامحالہ وہ بھی پولیس کی گرفت میں آ جاتا اور یوں غفورے کی گرفتاری سے ''صدف اینڈ ملک سردار خان مرڈر کیس'' ایک بار پھر ری اوپن ہو جاتا۔

ان کے اچانک نکل بھاگنے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی تھی کہ میں ان کے خفیہ ٹھکانے سے واقف ہو چکا تھا اور ممکن تھا کہ میں اپنے ساتھیوں وغیرہ کو مطلع کر کے مدد کے لئے بلا لیتا۔ مگر اس کا مجھے یقین کم ہی تھا۔ لے دے کر پہلی ہی صورت قرین قیاس تھی۔

بہرطور، کچھ بھی تھا، میں اب ان دونوں کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ جبکہ غفورے کو تو زندہ ہی نہیں چھوڑنا تھا۔ وہ کئی بے گناہ لوگوں کا قاتل تھا۔ اگرچہ اس نے یہ سب اشفاق شاہین کے کہنے پر کیا تھا مگر اشفاق شاہین کو میں نے قانون کی گرفت میں دینے کا عزم کر رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں گاڑیاں اندھا دھند ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتی ہوئی پختہ سڑک پر آ گئیں۔ پختہ سڑک پر آتے ہی ان کی گاڑی کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ ادھر میں نے بھی اپنی پوٹھوہار کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ سڑک کے دو رویہ چیڑ اور صنوبر کے درختوں پر ڈھیرے ڈھیرے رات کی سیاہی پھیلنے لگی تھی۔ ایسے وقت میں ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ سڑک مری پور جاتی تھی۔

میرے ذہن میں دو ہی شہر تھے جہاں کا یہ دونوں رخ کر سکتے تھے۔ ایک اسلام آباد، دوسرا لاہور۔ مگر جب تک یہ مری روڈ پر نہیں آ جاتے، ابھی کچھ کہنا محال تھا۔ اچانک ان کی گاڑی نے بائیں جانب موڑ کاٹا تو میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ کیونکہ یہ راستہ نہ اسلام آباد کی طرف جاتا تھا اور نہ ہی لاہور کی طرف سے کوئی شارٹ کٹ آتا۔



طرح اُلجھ کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کہاں کا رخ کئے ہوئے ہے؟ تب پھر اچانک میرے ذہن میں ایک ہولناک خدشہ اُبھرا۔

کہیں دونوں مردود اس ویران علاقے میں مجھے گھیرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے تھے؟' یہ خیال اچانک میرے ذہن میں اُبھرا اور مجھے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔

ٹھیک اسی وقت آگے ایک تنگ موڑ آیا۔ ان کی گاڑی کی رفتار دھیمی پڑی۔ مگر میں نے اپنی جیپ کی رفتار نہیں گھٹائی تھی۔ ان کی گاڑی نے تیزی کے ساتھ موڑ کاٹا، موڑ کے قریب پہنچتے پہنچتے میں نے بھی اپنی جیپ کی رفتار دھیمی کر دی اور پھر جیسے ہی موڑ کاٹا، میرے ہولناک اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔

موڑ کاٹتے ہی ان کی گاڑی سڑک کا راستہ روکے عین بیچوں بیچ کھڑی ہو گئی۔ میں نے فوراً بریک لگائے۔ میری جیپ کے ٹائر زور سے چرچرائے مگر پھر رکتے رکتے وہ سڑک کے درمیان میں ترچھی کھڑی گاڑی سے ٹکرا ہی گئی۔

جیپ ایک جھٹکے سے رکی تھی کہ دفعتہً دائیں بائیں جانب سے گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ میں تیزی کے ساتھ نیچے کو جھک گیا۔ اندھا دھند برسائی ہوئی گولیاں گونجیلی آوازوں کے ساتھ میری جیپ کی باڈی میں پیوست ہونے لگیں۔ کھڑکیوں کے شیشے بھی زبردست چھناکوں کے ساتھ چکنا چور ہو گئے۔ ونڈ اسکرین بھی ایک چھناکے دار دھماکے سے ٹوٹ کر بکھر گئی۔ میں سیٹ پر نیم دراز سا ہو کر اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ پل کے پل میں فائرنگ کے ''آہنگ'' سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ پستولوں کی فائرنگ تھی۔ ورنہ اگر برسٹ چھوڑنے والی خودکار رائفلیں ہوتیں تو بچنا محال ہی تھا۔

میرا پورا وجود بری طرح سنسنا رہا تھا۔ میں اسی طرح جھکے جھکے اگلی دونوں سیٹوں پر پڑا رہا۔ مگر اس دوران میں میں نے میگارد نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ مگر اب میں پشت کے بل ہو گیا تھا تاکہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی اور ونڈ اسکرین کے باہر کا منظر میری آنکھوں کے سامنے رہے۔

فائرنگ رک گئی۔ ہر سُو پُراسرار اور ہولناک خاموشی طاری ہو گئی۔

کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تب میرے دل میں ایک خطرناک خیال اُبھرا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے میگارد کو پکڑ لیا اور اپنے پیروں کی طرف والے دروازے پر نال کا رخ کر کے ایک لات سکیٹر زوردار انداز میں دروازے پر دے ماری۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور سامنے ہی مجھے اشفاق شاہین پستول ہاتھ میں لئے محتاط انداز میں بڑھتا ہوا نظر آیا۔ وہ بری طرح ٹھٹکا۔ مگر میں ٹرائیگر دبا چکا تھا۔ میرے میگارد کی مہیب نال سے شعلہ نکلا مگر ادھر اشفاق شاہین نے بھی بروقت غیر محسوس پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حرکت کی اور میری چلائی ہوئی گولی اس کے پستول پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تیزی کے ساتھ ایک طرف دوڑا۔ میں نے بھی جیپ سے کودنے میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ اسی دوران دائیں جانب سے غفورا ہاتھ میں پستول لئے نمودار ہوا۔ میں نے حواس بحال رکھتے ہوئے اس کے پستول والے ہاتھ پر لات جما دی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکلا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اپنے میگارد کا رخ اس کی طرف کرتا، اس کے چہرے پر ایک لمحے کو زردی کھنڈ گئی۔ مگر اسی لمحے اچانک کسی نے عقب سے میری پشت پر زوردار لات رسید کر دی۔ میں غفورے سے ٹکرایا۔ غفورا موقع پاتے ہی میرے پستول پر جھپٹا۔ پستول اس کے قبضے میں تو نہ آ سکا البتہ دور سڑک کے کنارے اُگی ہوئی خود رو جھاڑیوں میں جا گرا۔ اس نے میری ٹھوڑی پر مکا رسید کرنا چاہا مگر میں نے ایک ہاتھ کی کلائی سے اس کے گھونسے کو روک کر اس کے پیٹ پر دوسرے ہاتھ سے گھونسا رسید کر دیا اور پلٹا۔ عقب سے اشفاق شاہین جو تھوڑی دیر

پہلے ہی میری پشت پر اپنی لات رسید کر چکا تھا اور اب دوبارہ مجھ پر حملہ کرنے کو پر تول رہا تھا، مگر یکدم جھک کر اس کے پیٹ پر اپنے سر کی ٹکر رسید کر دی اور اسے دھکیلتا ہوا خاصی دور تک لے گیا۔ وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔ اسی لمحے غفورے نے خود کو فوراً ہی سنبھالتے ہوئے مجھ پر چھلانگ لگا دی اور مجھے رگیدتا ہوا سڑک پر آ رہا۔ میں پارے کی طرح مچلا اور ریچھ جیسے بھاری بھر کم غفورے کو اپنے اوپر سے دھکیل دیا۔ اس وقت قریب ہی پشت کے بل گرے ہوئے اشفاق شاہین نے لات چلا دی جو میرے چہرے پر پڑی۔ ایک لمحے کو مجھے اپنا دماغ جھنجھناتا محسوس ہوا۔ میں ابھی سنبھلنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ بدبخت غفورا وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر دوبارہ جھپٹا۔

اس کے بھاری ڈیل ڈول میں جانے کیسی پھرتی سمائی ہوئی تھی کہ اس نے مجھ پر جھپٹتے ہی اپنے دائیں ہاتھ کا شکنجہ میری گردن کے گرد کس دیا اور ساتھ ہی مجھے دھوبی پاٹ لگا کر گرا دیا۔ اب اس کی گرفت میری گردن کے گرد اور بھی مضبوط ہو گئی تھی۔ میرا دماغ گھٹنے لگا۔

''مار ڈالو اسے غفورے!......... مار ڈالو۔ ہماری فلائٹ نکلنے والی ہے۔''

اشفاق شاہین نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا جس میں میرے لئے شدید نفرت بھری ہوئی تھی۔ غفورے کو مکمل طور پر گرفت جمانے کی پوزیشن حاصل تھی اور میں بے بس تھا۔ اس کا یہ داؤ خالصتاً دیسی طرز کا تھا جس میں مدمقابل کے پاس بے بسی کے ساتھ اپنی موت کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر مجھے اپنے دفاع کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے مگر گردن پر غفورے کے آہنی بازو کے شکنجے نے میرے جسم کی طاقت ہی گویا مفلوج کر کے رکھ دی تھی۔ تب پھر اچانک ہی میرے اندر جوش جنوں خیز کی شدید لہر اُبھری اور میں نے دائیں ہاتھ کی کہنی اس کے پہلو پر رسید کر دی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ شاید میری کہنی کا وار بھرپور نہ تھا۔ ادھر وہ خبیث اپنے دوسرے ہاتھ سے بھی میری گردن کے گرد لپٹے ہوئے شکنجے کو جکڑ کر میری گردن کی ہڈی توڑنے میں اب دونوں بازوؤں کی قوت صرف کرنے لگا۔ میرے بجھتے ہوئے وجود میں ایک بار پھر جوشِ جنوں خیز کی لہر اُبھری اور پھر میں نے اپنے دونوں بازو غفورے کی کمر اور پیٹ کے گرد کس لئے۔

غفورا بے شک ریچھ جیسا گٹھا ہوا ڈیل ڈول رکھتا تھا مگر میں بھی لمبے چوڑے جثے کا مالک تھا چنانچہ میں نے ایک آخری کوشش کے تحت اپنے وجود کی پوری طاقت اپنے دونوں بازوؤں پر مجتمع کرتے ہوئے غفورے کو پورا زور لگا کر زمین سے تقریباً ایک دو فٹ اوپر اٹھا لیا اور پھر عقب میں اس کے سمیت خود کو بھی سڑک پر گرا دیا۔ سڑک پر گرنے سے ہم دونوں کو کوئی خاص چوٹ تو نہیں لگی تھی البتہ اتنا ضرور ہوا کہ گرنے سے غفورے کے بازو کی گرفت میری گردن کے گرد ذرا ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ نیز مجھے بھی اس کے پہلو پر زوردار کہنی کا وار کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ ضرب کھاتے ہی اس کے حلق سے بھیانک ڈکراہٹ اُبھری اور میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی بھرپور طاقت صرف کرتے ہوئے اس کے ڈھیلے پڑتے بازو کے شکنجے کو مزید وا کر دیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ اس کے خطرناک شکنجے سے اپنی گردن چھڑا چکا تھا۔

اشفاق شاہین جو ایک جانب خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا، مجھے غفورے کے شکنجے سے نکلتا دیکھ کر تیزی کے ساتھ اپنی گاڑی کی جانب لپکا۔ اسے شاید ایئر پورٹ پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ ابھی ذرا دیر پہلے ہی اس نے غفورے کو میرا معاملہ ''نمٹانے'' کی تلقین کرتے ہوئے یہی کہا تھا کہ ان کی فلائٹ کا وقت ہوا جا رہا ہے۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرا دھیان ذرا ہٹا تو غفورے نے دوبارہ مجھ پر جھپٹنا چاہا مگر میں اب اس کے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ ایک زوردار مُکا میں نے اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ ایک لمحے کو وہ جھنجھنا سا گیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور جیپ میں سوار ہوتے ہوئے اشفاق شاہین کی طرف بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ مگر ابھی گیئر ڈالنے ہی والا تھا کہ میں نے کھڑکی سے ہی ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن ناپ لی۔

ادھر غفورے کی طرف سے بھی میں غافل نہ تھا، جو تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا میری جانب آ رہا تھا۔ ادھر اشفاق شاہین نے ایک عجیب حرکت کر ڈالی۔ وہ بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی گردن پر میری گرفت کی پرواہ کئے بغیر گیئر بدلا اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔ گاڑی کے پچھلے دونوں ٹائر تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ گردش کرنے لگے اور گاڑی ایک طوفانی جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی۔ میں اس خبیث بدمعاش کو کسی قیمت پر بھی فرار ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اس کی گردن کے گرد کسا ہوا اپنے بازو کا شکنجہ نہیں چھوڑا اور چلتی ہوئی گاڑی کے دروازے پر جھول گیا۔ اس کی گردن میرے بازو تلے ایک طرف جھک گئی۔ وہ اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت قائم نہ کر سکا۔ نتیجتاً طوفانی انداز میں بتدریج اسپیڈ پکڑتی ہوئی گاڑی سڑک سے کنارے میں اتر گئی اور زوردار دھماکے سے درخت سے جا ٹکرائی۔ میں اچھل کر دور جھاڑیوں میں جا پڑا۔ مگر گرتے ہی پھرتی کے ساتھ اٹھا۔ میں نے اشفاق شاہین کا سر اسٹیئرنگ پر پڑا پایا۔ پتہ نہیں وہ زندہ تھا یا نہیں؟......... البتہ میں اس وقت بری طرح چونکا جب غفورا دوسری جانب کے دروازے کی کھڑکی سے ایک بریف کیس نکال رہا تھا۔ میں لپک کر آگے بڑھا۔ وہ بریف کیس اپنے قبضے میں کئے میری جیپ کی طرف دوڑ رہا تھا اور میں اس کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا، وہ اچانک رک گیا اور پھر بڑے ڈرامائی انداز میں میری طرف پلٹا۔ میں بھی سڑک پر قدرے ٹھٹک کر رک گیا۔

ہم دونوں حریفوں کی وحشیانہ نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تب غفورے نے ہانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔

''نادر علی! اشفاق شاہین ختم ہو چکا ہے......... مجھے اب جانے دو۔ اسی میں تمہاری اور تمہاری ماں کی بھلائی ہے۔ ورنہ اگر میں پکڑا گیا اور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو یاد رکھو، تمہارے دشمن مجھے وعدہ معاف گواہ بنانے میں دیر نہیں کریں گے۔''

میں اس خبیث کی بکواس پر بھنا اُٹھا اور دانت پیس کر خوف ناک لہجے میں بولا۔

''میں تجھے زندہ چھوڑوں گا تو تُو وعدہ معاف گواہ بنے گا نا......... خبیث! تُو نے معصوم غزالہ اور بے گناہ چوہدری ذیشان کا قتل کیا اس سے پہلے تُو نے غزالہ کی بہن سپنا کا بھی خون کیا تھا۔ تیرا ناپاک وجود میرے لئے ہی نہیں، اس دھرتی پر بھی بوجھ بن چکا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی جانب قدم بڑھائے۔ وہ اپنے ایک ہاتھ میں بریف کیس پکڑے پیچھے ہٹتے ہوئے دوبارہ بولا۔

''ہوش میں آؤ نادر علی!......... تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے جانے دو۔ میں ہمیشہ کے لئے یہ ملک چھوڑنے والا ہوں۔''

''اب تو صرف تیری روح ہی تیرا جسم چھوڑے گی ذلیل کتے!'' میں نے دانت پیس کر کہا اور پھر اس پر جھپٹا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس کو فضا میں لہرا کر میرے چہرے پر رسید کرنا چاہا مگر میں نے پھرتی کے ساتھ جھکائی دیتے ہوئے ایک زوردار لات اس کے پہلو پر رسید کر ڈالی۔ وہ کئی

قدم عقب میں لڑکھڑاتا ہوا میری جیپ کے بونٹ سے جا ٹکرایا۔ اس نے بریف کیس سڑک پر پھینکا اور کسی وحشی سانڈ کی طرح میری طرف لپکا۔

ایک بار پھر ہم گتھم گتھا ہو گئے تھے اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی اپنی سی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ہم لڑتے لڑتے بے حال سے ہونے لگے۔ ایک موقع پر ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو کر چند قدموں کے فاصلے پر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے اور بری طرح ہانپنے لگے۔

”اب بھی وقت ہے......... میری بات مان لو نادر! مجھے یہاں سے جانے دو۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“ وہ ہانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے بولا۔

”ہرگز نہیں......... کتے! میرے بازوؤں میں اب بھی اتنا دم ہے کہ میں تیرا خاتمہ کر سکوں۔“ میں نے جنوں خیز لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا اور اچانک ہی میں نے اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت اُبھری اور وہ میرے عقب میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہا ہو۔ اچانک میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا اور یکدم میں نے عقب میں مڑ کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اچھل کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اسی لمحے میرے عقب میں سڑک پر لیٹے ہوئے اشفاق شاہین نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھامے پستول کا ٹرائیگر یکدم دبا دیا تھا۔ گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور غفورا ایک بھیانک چیخ مار کر اپنے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے لہراتا ہوا گرا۔ ادھر میرے بجائے اپنے ہی ساتھی کو گولی لگتے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اشفاق شاہین کو سانپ سونگھ گیا۔ میں نے اس کی اس کرب ناک حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے پستول کی نال کا رخ میری جانب موڑنا چاہا مگر میں اس سے پہلے ہی پل کے پل اس کے اوپر گرا۔ میری ایک لات اس کے سر پر پڑی تھی۔ اس کا سر زور سے سڑک پر لگا۔ اس کے حلق سے بھیانک کراہ خارج ہوئی۔ پستول ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

میں ایک لمحے سڑک پر کھڑا ہانپتا رہا، پھر سڑک پر اوندھے منہ پڑے اشفاق شاہین کے بے سدھ وجود کا جائزہ لیا۔ میں نے چاند کی مدھم روشنی میں سڑک پر خون کے بڑے بڑے دھبوں کی بے ترتیب لکیر دیکھی جو درخت سے ٹکرا کر کھڑی ان کی گاڑی سے ہو کر یہاں آتی محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے یہ جاننے میں چنداں دیر نہ لگی کہ اشفاق شاہین گاڑی کے درخت کے موٹے تنے سے ٹکرانے کے بعد ذرا دیر کے لئے زخمی ہو کر نیم بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ مگر پھر نہ جانے کس طرح اپنی سخت جانی یا پھر جوشِ انتقام کے جذبے تلے وہ کسی طرح جیپ سے اُترا۔ پھر کسی طرح اپنا ہی گرا ہوا پستول اس کے ہاتھ لگا اور شدید زخمی ہونے کے باعث شاید اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو پایا تو سڑک پر ہی اپنے لہولہان زخمی وجود کو گھسیٹتا ہوا میرے ذرا عقب میں پہنچ کر اس نے مجھے گولی سے نشانہ بنانا چاہا تھا۔ یہ تو اچانک ہی غفورے کی میرے عقب میں نگاہ پڑی تھی تو میں نے اس کے ایکاایکی بدلتے ہوئے تاثرات کو دیکھ کر پل کے پل کسی ہولناک خطرے کو بھانپتے ہی نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ عین اس وقت چھوڑی تھی جب اشفاق شاہین نے مجھ پر گولی چلائی، جو بالآخر اس کے مقرب خاص غفورے کے پیٹ میں جا لگی۔

میں نے پستول کو ٹھوکر مار کر پرے سرکا دیا اور سب سے پہلے غفورے کی جانب بڑھا۔ وہ بھی گولی کھا کر سڑک پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی اور ساکت تھیں۔ میں نے نبض چیک کی، وہ مر چکا تھا۔ پھر میں اشفاق شاہین کی طرف بڑھا۔ وہ بھی آخری سانسوں پر تھا۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاڑی کے درخت سے ٹکرانے کے باعث اس کی پسلیاں بری طرح مجروح ہو چکی تھیں۔ سر پھٹا ہوا تھا۔ ناک اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔

اچانک اشفاق شاہین کے بے سدھ وجود نے ایک تشنجی جھٹکے کے ساتھ ہچکی لی اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

خس کم جہاں پاک......... شرم ناک اور گھناؤنا دھندا کرنے والے یہ دونوں ابلیس صفت جہنم واصل ہو چکے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور بریف کیس اٹھا لیا اور اپنی جیپ کے بونٹ پر رکھ کر اسے کھولا۔

اس کے اندر دونوں کے پاسپورٹ وغیرہ موجود تھے۔ دو عدد ہوائی ٹکٹ بھی تھے۔ چند کریڈٹ کارڈز کے علاوہ سوئس بینک کی چیک بکس اور کتابچے بھی نظر آئے۔ خاصی تعداد میں امریکی ڈالرز بھی تھے۔ گویا یہ دونوں امریکہ فرار ہونے والے تھے۔

میں نے بریف کیس وہیں پھینک دیا اور اپنی جیپ کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

❄ ❄ ❄

اس اعصاب شکن اہم ترین مہم کو کامیابی کے ساتھ سر کرنے کے بعد میں گرین لاج پہنچا اور ماں کو یہ خوش خبری سنا دی کہ اب غفورے کی طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ہی ساتھی کی گولی کا نشانہ بن چکا ہے۔ انکل اعظم کو بھی میں نے اشاروں کنایوں میں آگاہ کر دیا تھا۔

غفورے کے سلسلے میں نظر حیات کی ہم ماں بیٹے کو قانونی جال میں پھنسانے کی جو دیرینہ آرزو تھی وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ ”سرائے سیاں“ میں نظر حیات کو ذہنی طور پر ٹارچر کرنے کے بعد میں اب اس کے دوسرے مرحلے پر کام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اگلے دن میرا سارا وقت ٹال میں گزرا اور شام ہوتے ہی میں نے پنڈی کا رخ کیا۔

میں نے سنا تھا کہ قسمت کی دیوی ایک بار دروازہ ضرور کھٹکھٹاتی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ جب انسان یہ محسوس کرنے لگے کہ ایسی تقدیر و خالصتاً تدبیر پر منتج ہو کر ہر محاذ پر انسان کو فتح و کامرانی سے دوچار کرے تو پھر انسان کو کسی محاذ پر بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ بلا تاخیر دشمنوں کے خلاف ڈٹ کر میدانِ کارزار میں اُتر آنا چاہئے۔

میری سب سے پہلی کامیابی نگینہ کو خبیث کیلاشی عامل عاروب کے شیطانی چنگل سے چھڑانا اور اپنے سفاک ترین دشمن کالا ناگ کو لگے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس کے بعد شاہ میر میرے اور ماں کے ہاتھوں اپنے بھیانک انجام کو پہنچ کر زندہ لاش کی مثل قرار پایا۔ اس کے بعد رب نواز کے خلاف مہم کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور اب اشفاق شاہین اور غفورا بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔

میں سمجھتا تھا کہ اب نظر حیات ہی میرا ایک اہم دشمن باقی بچا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے بیٹے کبیر کا کیلاشی عامل سے گٹھ جوڑ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہ تھا۔

یہ گٹھ جوڑ ممکن ہے پہلے پہل اس نے اپنی خلاصی کے لئے کیا ہو۔ مگر اب جبکہ نگینہ بھی کیلاشی مہم کے بعد سے اس سے شدید نفرت کرنے لگی تھی اس لئے کبیر کے ہاتھ میں میرے خلاف، میری اور نگینہ کی راہ کھوٹی کرنے کے لئے عامل عاروب کی صورت ایک مؤثر ہتھیار آ گیا تھا۔

اخبارات میں غفورے اور اشفاق شاہین کی موت کی خبر آ چکی تھی۔ اسپیشل فورس نے دونوں کی ”پُراسرار“ موت کا یہی سبب نکالا تھا کہ دونوں میں کسی بات پر ان بن ہو گئی اور پھر سخت مقابلے کے بعد

دونوں ہی ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کیونکہ اشفاق شاہین کے پستول کی چلائی ہوئی گولی سے ہی غفورا ہلاک ہوا تھا۔ جبکہ اشفاق شاہین کی موت ایکسیڈنٹ قرار دی گئی تھی۔

شام کی ملگجاہٹ رات کی تاریکی میں بدل رہی تھی جب میں پنڈی پہنچا۔ نظر حیات جس علاقے میں رہتا تھا، وہ زیادہ دور نہ تھا۔ میں نے قریب ہی ایک گیراج میں اپنی جیپ روکی اور ٹیوننگ کرانے کے بہانے اسے وہیں چھوڑ کر پیدل ہی آگے چل پڑا۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ گیراج والے نے مجھے بارہ سے پہلے پہلے آ کر اپنی جیپ لے جانے کا کہا تھا۔ ابھی میرے پاس تین گھنٹے تھے۔

غفورے کے جہنم واصل ہونے کے بعد میں اب اور بھی دلیر ہو گیا تھا۔ انسپکٹر اعجاز شمس کی طرف سے اب مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ تاہم مجھے باوجود اس کے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا تھا۔ سرائے سیالہ میں نظر حیات کو نفسیاتی طور پر ٹارچر کرنے کے دوران میں نے اسے یہ دھمکی بھی دے رکھی تھی کہ میں دوبارہ اس کے پاس وہی زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے ضرور آؤں گا اور اس وقت تک کھیلتا رہوں گا جب تک کہ اسے ہلاک نہ کر دوں۔ یقیناً اسے بھی میری دھمکی اچھی طرح یاد ہو گی۔ اور اس کا ہر گزرتا لمحہ اسے اپنے سائے سے بھی ٹھٹکنے پر مجبور کر رہا ہو گا۔

یہی سبب تھا کہ جب میں نظر حیات کی عظیم الشان رہائش گاہ کے ذرا نزدیک پہنچا تو وہاں مجھے غیر معمولی سکیورٹی کا احساس ہوا۔ چار مسلح گارڈز گیٹ پر مستعد کھڑے تھے بلکہ ان میں سے دو تو باقاعدہ رہائش گاہ کے گرد گشت بھی کر رہے تھے۔ باقی ہر سُو گہری خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ میری تصویر ان چاروں مسلح گارڈز کو ضرور دکھائی گئی ہو گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے اس طرح مٹرگشت کرتے دیکھ کر شبہے میں مبتلا ہو سکتے تھے۔

میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ عقبی سمت کا رخ کیا۔ رہائش گاہ کے چہار اطراف گردش کرنے والے باقی دو گارڈز ایک ایک کر کے رہائش گاہ کا نصف طواف کر کے واپس لوٹ جاتے۔ باقی نصف دوسرا گارڈ طے کرتا۔

عمارت ایک ہی منزلہ تھی۔ عقب میں آ کر میں نے باؤنڈری وال کا جائزہ لیا جو کافی بلند تھی اور منڈیروں پر خم دار آہنی بریکٹ نصب تھے۔ جبکہ ان میں تین رویہ خاردار باڑ بھی کھنچی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ ''التزامات'' دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی تھی۔ گویا نظر حیات میری طرف سے بری طرح خوف میں مبتلا تھا۔

بہرطور اب میرے لئے مسئلہ اندر کود کر کسی آرام دہ بیڈ روم میں محوِ خواب نظر حیات کی شہ رگ تک پہنچنا تھا۔ اس نے اپنی حفاظت اور سکیورٹی کا جس قدر سخت بندوبست کر رکھا تھا، اسی قدر میرا اس تک پہنچنا اسے پہلے سے بھی زیادہ ذہنی ہی نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی ٹارچر کرنا تھا۔

میں اطراف میں بنی کوٹھیوں اور بنگلوں کی بیرونی دیواروں تک پھیلی ہوئی کیاریوں اور پودوں کی آڑ لیتا ہوا گشتی مسلح گارڈز کی نظروں میں آئے بغیر رہائش گاہ کی تین اطراف پھیلی ہوئی کمپاؤنڈ وال کا بغور جائزہ لیتا رہا تو مجھے شمال مغربی سمت کی دیوار کی طرف اچانک چند نوجوان لڑکے کھڑے نظر آئے۔ ان کی تعداد سات آٹھ کے قریب تھی اور انہوں نے ایک سیاسی تنظیم کے بینر، جھنڈے پکڑ رکھے تھے۔ ایک جانب لکڑی کی اونچی ''گھوڑی'' بھی کھڑی نظر آئی۔ وہ کافی بلند تھی۔ اس پر دو رویہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جس پر چڑھ کر بلندی پر بینر وغیرہ ایک پول سے دوسرے پول یا دیواروں کی اُبھری ہوئی آہنی ''گل میخوں'' پر لپیٹ کر باندھے جاتے تھے۔ لکڑی کی گھوڑی کے نیچے چار چوبی پہیے بھی نصب تھے تاکہ


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے اِدھر اُدھر دھکیل کر لے جایا جا سکے۔

اچانک میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُبھرا۔ اگر نظر حیات کی رہائش گاہ پر نقب لگانے کے لئے اس چوبی گھوڑی کو بروئے کار لاتا تو میرا کام بن سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ اتنے سارے لڑکوں کی موجودگی میں یہ کام مجھے مشکل تو کجا ناممکن ہی نظر آتا تھا۔ اس پر مستزاد میں نے نظر حیات کے ایک مسلح گارڈ کو بھی وہیں کھڑے پایا جو ان پر نظر رکھے ہوئے مگر خاموش کھڑا تھا۔

میں ابھی پودوں کی آڑ میں دبکا اپنے ہونٹ باہم پیوست کئے کوئی ترکیب لڑانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک لڑکے کے موبائل کی بیل گنگنائی۔ اس نے موبائل نکال کر کان سے لگایا اور کہا۔ ''ہیلو!''

میری نظریں اس لڑکے کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات اُبھرتے دیکھے۔ اس کے بعد اس نے غصیلی آواز میں گالی دیتے ہوئے کہا۔

''ان حرام زادوں کی تو......... اکرم! تم فکر مت کرو، ہم ابھی پہنچتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے جلدی سے موبائل آف کیا اور اپنے ساتھیوں سے با آواز بلند بولا۔ ''شیخ بھاٹا پر بینر لگاتے ہوئے مخالف تنظیم کے لڑکوں سے ہمارا جھگڑا ہو گیا ہے۔ چلو......... جلدی کرو۔''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ وہ سب لڑکے جھنڈے اور بینر وہیں پھینک کر ایک طرف دوڑ پڑے۔ میرا دل یکبارگی مسرت کی لہر تلے زور سے دھڑکا۔ شاید ان لڑکوں کے دوسرے ساتھیوں کا کسی مخالف تنظیم کے لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ سب بِل کے بَل دوڑ پڑے تھے۔ میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ ساتھ ہی میری نظریں قریب کھڑے مسلح گارڈ پر بھی جمی ہوئی تھیں۔ وہ بھی چند ثانیے وہاں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس کے بعد اپنا سر جھٹکتے ہوئے وہاں سے پلٹ گیا۔

میں نے اطراف میں ایک نگاہ ڈالی اور چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے اُبھرا اور چوبی گھوڑی کی طرف بڑھا۔ پھر چوبی گھوڑی کو آہستہ آہستہ دھکیلتے ہوئے باؤنڈری وال کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ کسی بھی لمحے گشتی گارڈ دوبارہ یہاں آ سکتا تھا۔ اس اندیشے کی خاطر میں نے ایک قلیل وقت مقرر کیا اور پھر تیزی کے ساتھ چوبی گھوڑی پر چڑھتا ہوا باؤنڈری وال تک جا پہنچا۔

اس کے بعد نہایت احتیاط کے ساتھ میں نے منڈیر پر ایک قدم جمایا اور اس خم دار آہنی بریکٹ پر لگی خاردار فولادی باڑ میں اُلجھے بغیر میں نے دوسری جانب ایک ایک کر کے اپنے دونوں پاؤں جمائے اور پھر پنجوں کے بل نیچے سے نیم تاریک خلا میں کود گیا۔

میں نے کریپ سول کے جوتے پہن رکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے کودنے سے کچھ زیادہ دھمک نہیں اُبھری تھی۔ تاہم پھر بھی میں چند ثانیے وہیں دبکا اطراف میں ''مشتبہ'' سن گن لیتا رہا۔ مگر ہر سُو خاموشی چھائی رہی۔ گویا سب ٹھیک تھا۔

لیکن ایک سقم رہ گیا تھا۔ باہر چوبی گھوڑی کا دیوار کے ساتھ لگے رہنا گشتی گارڈ کو شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ بشرطیکہ وہی گارڈ وہاں آ کر چوبی گاڑی کی بدلی ہوئی جگہ کو دیکھتا۔ بصورت دیگر دوسرے گارڈ کو علم نہ تھا کہ یہ ''گھوڑی'' کچھ دیر پہلے کہاں ''کھڑی'' تھی۔

میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے چہرے پر رومال کی نقاب چڑھا لی۔ بہرطور اب میں اندر داخل ہو چکا تھا۔ چند ثانیے میں نے آگے پیش قدمی کی۔ سامنے وسیع و عریض لان تھا جہاں چھوٹے سائز کے پائپوں والے قمقمے روشن تھے۔ مجھے کتوں کا بھی خدشہ تھا اس لئے میں نہایت احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا۔ میں

جہاں موجود تھا، یہ باؤنڈری وال اور کوٹھی کی دیوار کا درمیانی خلا تھا جس نے ایک طویل راہداری کی صورت میں کوٹھی کی اصل چار دیواری کو تین اطراف سے گھیرا ہوا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر رومال کے نقاب کو ذرا درست کیا اور آخری سرے پر ذرا سر اُبھار کر دیکھا۔ سامنے خوب صورت ڈرائیو وے تھا۔ گیٹ بند تھا۔ اندر کی طرف کوئی ذی نفس نظر نہ آتا تھا۔ کار پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اوپر بالکونی تھی۔ یہ اوپر بنے ہال کمرے کی ہی غالباً بالکونی تھی اور اندر داخل ہونے کا اس مذکورہ بالکونی سے بڑھ کر شارٹ کٹ راستہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کام میں کار پورچ کے نیچے کھڑی گاڑیوں کی چھت پر چڑھ کر انجام دے سکتا تھا۔ لیکن اس طرح باہر موجود چوکنا کھڑے مسلح گارڈ کی نظر مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔ اس لئے یہ خیال میں نے سردست رد کر ڈالا۔

گیٹ کے دائیں جانب سیمنٹ کا بنکر نما کیبن اس طرح بنا ہوا تھا کہ اس کا نصف حصہ باہر اور نصف اندر تھا۔ یوں بڑے گیٹ کے علاوہ ''گارڈ کیبن'' کے اندر اور باہر کھلنے والے دروازوں سے بھی کوٹھی میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔

میں پلٹا، راہداری کا ایک طویل تین چوتھائی چکر کاٹ کر دوسری جانب سے اُبھرا۔ یہاں راہداری کا سرا دوسرے لان سے جا ملتا تھا۔ یہاں سے گیٹ دور تھا مگر کوٹھی کا خوبصورت اور ساگوان کی بیش قیمت لکڑی والا محرابی چوکھٹا صاف نظر آتا تھا اور قریب ہی پڑتل کا مرکزی دروازہ تھا۔ میں نے رومال کی نقاب کے افق سے گیٹ کی طرف دیکھا، مجھے ابھی وہاں کھڑے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک میں نے باہر کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنی۔ میں ذرا ٹھٹکا۔ ٹھیک اسی وقت گارڈ کیبن میں انٹر کام سسٹم کی بیل بھی گونجی۔ ذرا دیر بعد گیٹ کھول دیا گیا۔

ایک کار اندر داخل ہوئی اور دوسرے ہی لمحے کوٹھی کے داخلی دروازے سے میں نے کبیر کو عجلت میں باہر نکلتے دیکھا۔ کار محرابی دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی تھی۔ میں دیوار کی آڑ کے عقب سے نظریں جمائے ہوئے تھا۔ تب میں نے کار سے تین کیم تحیم اور سرخ و سفید افراد کو اترتے دیکھا۔ کبیر ان سے بڑے پُرتپاک انداز میں ملا۔ میں ان تینوں افراد کے رنگ و روپ سے فوراً ہی یہ اندازہ قائم کر چکا تھا کہ ان کا تعلق شمالی علاقے سے لگتا تھا۔ ان کے نقوش چینی اور کوریائی نمونے کے لگتے تھے۔ ناک چپٹی، آنکھیں چندی ہوئیں۔ یہ مجھے کیلاشی باشندے لگتے تھے۔ میرا خیال فوراً کیلاشی عامل عاروب کی طرف چلا گیا اور بے اختیار میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ عامل عاروب کے تین کارندے نئے محاذ کے ساتھ یہاں آن پہنچے تھے اور ان کی میزبانی کا شرف کبیر کو حاصل تھا۔

وہ ان تینوں کو لئے اندر داخل ہو گیا۔ اب مجھے دو مسلح گارڈز کیبن کے اندر بھی چوکس کھڑے نظر آنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت گارڈ کیبن کے دروازے سے میں نے ایک تیسرے گارڈ کو قدرے بوکھلائے ہوئے انداز میں نمودار ہوتے دیکھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک سا گیا۔ یہ وہی گارڈ تھا جسے میں نے باہر کوٹھی کے شمال مغربی سمت کی دیوار کے قریب کھڑے دیکھا تھا۔

وہ اندر کھڑے اپنے دونوں ساتھی گارڈز سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے میں نے گارڈز کو تیزی سے حرکت کرتے دیکھا۔ ایک نے سامنے کا رخ کیا تھا جدھر پورچ کی طرف سے راہداری کا سرا اُبھرتا تھا۔ جبکہ دوسرا راہداری کے اس سمت تیز تیز قدموں سے بڑھنے لگا جدھر میں چھپا کھڑا تھا۔

ان دونوں کی بیک وقت چوکنا انداز کی حرکات و سکنات نے مجھے پریشان سا کر دیا۔ صاف لگتا تھا کہ اس گارڈ نے باہر شمالی دیوار سے لگی کھڑی ''چوبی گھوڑی'' کو دیکھ لیا تھا اور ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو گیا تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی اندر داخل ہوا ہے۔

ممکن ہے، ایسا اس نے اپنا خدشہ ختم کرنے کی غرض سے بھی کیا ہو۔ مگر مجھے کیا کرنا تھا؟.........

بڑی طور پر سوچنے والی بات یہ تھی۔ وہ گارڈ نہایت تیزی کے ساتھ اس سمت آ رہا تھا جبکہ دوسرا گارڈ دوسری جانب سے راہداری میں اب تک داخل ہو چکا ہوگا۔ گویا میرے لئے دونوں جانب ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' والا معاملہ پیدا ہو گیا تھا۔

فوری طور پر مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا، میں نے سر اٹھا کر کھڑکی کے چھجے کی طرف دیکھا اور پھر تیزی کے ساتھ کھڑکی کی آہنی گرلوں پر پاؤں اٹکاتا پھنساتا ہوا اونچے چھجے پر جا چڑھا۔ یہ خاصا بلند تھا۔ میں چھجے کے ''سلیب'' پر بالکل سپاٹ ہو کر سینے کے بل لیٹ گیا تاکہ نیچے راہداری پر بھی نظر رکھ سکوں۔ مگر چھجے کی سلیب پر میرا لمبا چوڑا وجود پوری طرح نہ چھپ سکا۔ چنانچہ قریب کی سمت سے اندر راہداری میں داخل ہونے والے اس گارڈ کی نظروں میں تو میں نہیں آ سکا البتہ عقب سے پورا چکر کاٹ کر آنے والے سامنے دور سے اُبھرنے والے دوسرے گارڈ نے چھجے پر مجھے کسی شے کی صورت میں دیکھ لیا۔ مجھے اس کا تب پتا چلا جب وہ مذکورہ گارڈ اپنے ساتھی سے ذرا بلند آواز میں بولا۔

''بشیرے!......... تیرے سر کے اوپر والے چھجے میں مجھے کچھ نظر آ رہا ہے۔ ذرا اُچھل کر تو دیکھنا۔ کہیں وہی چور تو نہیں ہے جو گھوڑی دیوار سے لگا کر اندر داخل ہوا ہے؟''

اب تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ گویا ساری محنت اکارت چلی گئی۔ اب جو بھی کرنا تھا، پل کے پل کرنا تھا۔ جس گارڈ کی مجھ پر نگاہ پڑ چکی تھی، وہ مجھے گولی کا بھی نشانہ بنا سکتا تھا چنانچہ میں نے چھجے پر پھرتی کے ساتھ لوٹ لگائی اور گارڈ پر آن گرا۔

اس نے سنبھلنے کی کوشش میں مجھ پر آہنی گن کا کندا رسید کرنا چاہا تو میں نے اس کی کنپٹی پر اپنے گھونسے کی زوردار اور جچی تلی ضرب رسید کر ڈالی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

سامنے سے آنے والا گارڈ یکدم رک کر مجھ پر اپنی گن تانے کھڑا ہو گیا۔ مگر میں نے عقل مندی یہ کی کہ اس کے بے ہوش ساتھی کے بے سدھ وجود کو ایک ہاتھ سے تھام کر اپنی ڈھال بناتے ہوئے دوسرے گارڈ پر اس کی گن تان لی اور غراہٹ سے مشابہہ آواز میں بولا۔

''اپنی گن پھینک دو.........ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔''

وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ مجھ پر فائر کرنے کی پوزیشن میں بھی نہ تھا۔ کیونکہ میں نے اس کے بے ہوش ساتھی کے بے سدھ وجود کو اپنے ایک بازو کے حلقے میں خود سے ڈھال بنائے چمٹا رکھا تھا۔

''میں آخری بار کہہ رہا ہوں، گن پھینک دو۔ ورنہ.........''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میرے سر کے پچھلے حصے پر قیامت ٹوٹی اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا.........!

❊❊❊

ہوش آیا تو میرے دونوں ہاتھ پشت کی سمت پر مضبوطی کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے اور دونوں پیروں میں بھی نائلون کی مضبوط رسی بندھی ہوئی تھی۔

یہ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ میں فرش پر بچھے دبیز قالین پر بے بسی سے گٹھری بنا پہلو کے بل پڑا ہوا تھا۔ سامنے صوفے پر نظر حیات، سلیپنگ گاؤن پہنے بیٹھا میری جانب نفرت انگیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بیٹا کبیر بھی براجمان تھا۔ اس کا چہرہ بھی جوشِ غیظ سے پھنک رہا تھا۔ جبکہ دوسرے

قریب کے صوفے پر تینوں کیلاشی باشندے بھی فروکش تھے اور سنسناتی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔
نظر حیات بری طرح تلملاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر میرے چہرے پر رسید کر ڈالی۔ میرا اوپری ہونٹ پھٹ گیا اور خون رِسنے لگا۔ اذیت کی لہر میرے وجود میں نفرت کی چنگاریاں بن کر بھڑکی تھی۔

''تم خود کو بڑا تمیں مار خان سمجھتے تھے......... ہے نا؟'' وہ نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑ کر قہرناک لہجے میں بولا۔ ''لیکن اب دیکھ لو کہ کس طرح ہم تمہیں حقیر کیڑے کی موت مارتے ہیں۔''

''پپا! آپ کیوں غصے میں خود کو ہلکان کر رہے ہیں؟'' کبیر نے میری جانب نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔ ''آپ یہاں آرام سے بیٹھ جائیں، اس کے کریا کرم کا بندوبست میں نے کر لیا ہے۔''

نظر حیات قہر و غضب کے عالم میں لرزتا کانپتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

''تم لوگوں کا شکار حاضر ہے۔'' باپ کے صوفے پر دھنسنے کے بعد کبیر نے ان تینوں کیلاشی باشندوں سے کہا تو نظر حیات چونک کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر حیرت سے بولا۔

''کیا مطلب؟......... یہ تو ہمارا شکار ہے بیٹا! ہم اسے ہرگز زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''پپا! زندہ تو یہ لوگ بھی اسے نہیں چھوڑیں گے۔ آپ بے فکر رہیں۔'' کبیر نے اپنے باپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میرا ان سے معاہدہ ہوا تھا کہ میں نادر علی کو ان کے حوالے کر کے چھوڑوں گا۔''

''مگر بیٹا! یہ لوگ اس کا کیا کریں گے؟......... یہ بہت شاطر اور چالاک انسان ہے۔ اس کے جسم میں جن کی روح ہے۔ یہ انہیں بھی چکمہ دے کر بہ آسانی نکل بھاگے گا۔ میری مانو تو اسے گولی مار کر اس کی لاش راول ڈیم میں پھینک دو۔'' نظر حیات نے دانت پیس کر کہا۔ وہ میری طرف سے بری طرح دہشت میں مبتلا تھا۔

''پپا! آپ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' کبیر نے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ان لوگوں کو آپ معمولی نہ سمجھیں۔ آپ بھول گئے، میں انہی لوگوں کی قید میں تو تھا اتنے عرصے۔ پھر ان کے روحانی پیشوا عارِدب سے میں نے اپنی جان بخشی کے سلسلے میں یہ معاہدہ کیا تھا کہ میں ان کے مجرم نادر علی خان کو ان کے حوالے کرنے میں ان کی بھرپور مدد کروں گا۔ کیلاشی وادی میں ان کی پوری قوم آباد ہے۔ یہ اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ اور ہم ان لوگوں کی دشمنی مول نہیں لے سکتے۔ آپ بے فکر رہیں۔ یہ معاملہ میرے سپرد کر دیں۔ میں نے پہلے سے جال پھیلا رکھا تھا۔''

کبیر نے اتنا کہا اور پھر ان تینوں کیلاشی باشندوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے.........تمہارا شکار حاضر ہے۔''

اس کی بات پر ان تینوں نے ایک دوسرے کے چہروں کی طرف دیکھا اور اپنی زبان میں کھسر پھسر کی۔ پھر ایک نے کبیر نے گونجیلی آواز میں ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

''مگر ہمارا دوسرا شکار ابھی باقی ہے.........وہ کب ملے گا؟''

جواباً کبیر نے کہا۔ ''وہ پرسوں صبح کی فلائٹ سے یہاں پہنچ رہی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ اپنے باپ کے علاج کی غرض سے امریکہ گئی ہوئی ہے۔ اس کی رہائش گاہ بھی تمہیں میں نے دکھا کر کرا دی تھی......... مگر یہ شکار میں سمجھتا ہوں تم لوگوں کے لئے زیادہ اہم ہے۔ پہلے اسے اپنے ٹھکانے لے جاؤ۔ دوسرا شکار ہاتھ لگنا بہت آسان ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ یہ بہت خطرناک ہے۔ ابھی تم لوگ اسے سنبھالو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''ہاں......... یہ تو ہمارا مجرم ہے۔ اس بدبخت نے ہمارے روحانی پیشوا کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔'' دوسرے نے میری طرف دیکھ کر خوفناک لہجے میں دانت پیس کر کہا۔

ان کی گفتگو سن کر میری کنپٹیاں بری طرح سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی کبیر کے بھیانک عزائم بھی کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ ان کا آپس میں ''دوسرے شکار'' کے متعلق سوال جواب کرنا مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے بخوبی ادراک تھا کہ ان کی دوسرے شکار سے مراد لامحالہ نگینہ ہی ہو سکتی تھی۔ اور مردود کبیر کا یہ کہنا کہ دوسرے شکار کا ہاتھ لگنا آسان تھا، مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر رہا تھا اور یہ بات حقیقت بھی تھی کہ نگینہ ان کے بھیانک عزائم سے ناواقف تھی اور بہ آسانی ان خبیثوں کے ہاتھ لگ سکتی تھی۔ میرے وجود میں کبیر کے خلاف نفرت کی ایک طوفانی لہر اُبھری اور میں نے رسن بستہ ہونے کے باوجود حلق کے بل دھاڑ کر کبیر سے کہا۔

''کتے!.........اگر نگینہ کا بال بھی بیکا ہوا تو میں تجھے بھیانک موت سے دوچار کروں گا۔ سن لے کان کھول کر اچھی طرح تُو۔''

میری دھمکی پر نظر حیات کے چہرے پر ہلکی تشویش کی لہر سی اُبھری تھی۔ مگر کبیر بڑی طمانیت سے مسکرا کر بولا۔ ''ممکن ہے تمہاری بدروح مجھ سے انتقام لینے کی کوشش کرے۔ مگر نادر! میں تمہیں جس کے حوالے کر رہا ہوں، تم اسے اچھی طرح جانتے ہو.........وہ انسان کی روح کو نہیں چھوڑتا۔''

''آگے کیا ہوگا، اس کا تجھے کیا پتہ۔'' میں نے نفرت سے منہ بگاڑ کر کہا۔ ''کس کی جان جاتی ہے اور کس کی بچتی ہے، اس کا فیصلہ تُو کیسے کر سکتا ہے؟''

''اسے لے جاؤ۔ ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔'' اس بار نظر حیات نے بپھر کر ان تینوں کیلاشی باشندوں سے کہا۔ اس کے بعد ان میں سے ایک نے کہا۔

''ہم ابھی اسے ادھر اپنے خفیہ ٹھکانے پر رکھیں گے۔ جب دوسرا شکار بھی ہمارے ہاتھ آ جائے گا تب ہم اپنی وادی کا رخ کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے دیکھا، کیلاشی کی بات سن کر باپ بیٹا کچھ بے چین سے نظر آنے لگے۔ تب پھر کبیر نے کھڑے ہو کر ان سے کہا۔

''تم نہیں جانتے، یہ کس قدر خطرناک انسان ہے۔ بہتر یہی ہوگا اسے یہاں کہیں اپنے کسی خفیہ ٹھکانے میں یرغمال بنانے کی بجائے فوراً اپنی وادی میں لے جاؤ۔ اگر یہ تمہاری قید سے نکل گیا تو ہم سب کا برا حشر کر دے گا۔ کیا تم اپنے پہلے دو ساتھیوں کا انجام بھول گئے؟''

مجھے کبیر کے لہجے میں چھپی تشویش اور بے نام خوف کی جھلک صاف محسوس ہوئی تھی۔

''یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم چھوڑو ان باتوں کو۔ چلتے ہیں اب ہم۔'' ایک کیلاشی نے روکھے لہجے میں کہا میں نے دیکھا، کبیر اور نظر حیات بے بسی سے دانت پیس کر رہ گئے۔ صاف نظر آتا تھا کہ ان دونوں خبث بلپ بیٹوں کو ان تینوں کیلاشیوں کی فرمائش ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ بہرطور انہوں نے چپ سادھ لی۔

ایک کیلاشی نے مجھے بوری کی طرح اٹھا کر کاندھوں پر لاد لیا اور پھر یہ سب لوگ باہر آ گئے۔ ایک جیپ باہر موجود تھی۔ مجھے عقبی دروازہ کھول کر سیٹوں کے درمیان فرش پر ڈال دیا۔ ایک کیلاشی وہیں سیٹ پر براجمان ہو گیا جبکہ باقی دونوں اگلی سیٹوں پر سوار ہو گئے۔ جیپ کے اسٹارٹ ہونے کی گھرگھراہٹ اُبھری اور پھر وہ ایک جھٹکے سے ریورس ہوتی ہوئی گیٹ سے باہر نکلی۔ اس کے بعد ذرا رک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



کر آگے نامعلوم منزل کی طرف بڑھ گئی۔ میں اپنے گٹھڑی بنے وجود کے ساتھ جیپ کے عقبی حصے پر فرش پر پڑا بری طرح مچل رہا تھا۔ مجھے اس بات کی تسلی تو تھی کہ سردست یہ مجھے فوری طور پر اپنے ساتھ کیلاش وادی لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ان کے آئندہ منصوبے کے مطابق یہ لوگ نگینہ پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے اور اس کے بعد یہ ہم دونوں کو لئے کیلاش وادی روانہ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں ان کا خطرناک مجرم تھا اور ان کی نظروں میں میرا ناقابل تلافی جرم یہ تھا کہ میں نے ان کے بدخصلت روحانی پیشوا عامل عاروب کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ میرے ہاتھوں مرتے مرتے بچا تھا۔ جبکہ نگینہ کا معاملہ اپنی جگہ سنگین تھا۔ وہ مردود کیلاشی عامل عاروب نگینہ کو اپنے ''دابولا مینزی'' نامی خودساختہ دیوتا کے آگے قربانی کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا۔ گویا ہم دونوں ہی کی زندگیاں شدید خطرے سے دوچار تھیں۔ لیکن مجھے خود سے زیادہ نگینہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

وہ پہلے سے ہی جاں گسل حالات سے گزر رہی تھی اور اپنے باپ شاہ میر کی زندہ لاش واپس لا رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہاں اس کے خلاف کس قدر بھیانک سازش تیار کی گئی تھی۔ اگرچہ کیلاشی مہم کے دوران ہم جن کڑے حالات سے گزر کر یہاں پہنچے تھے اس کے ہنگامہ خیز روز و شب اس کے ذہن میں بھی ابھی تازہ ہوں گے۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ ابھی اس کی قیمت ہم دونوں سے چکائی جانے والی تھی۔

میں بے شک رسیوں سے بندھا ہوا تھا لیکن میں نے باوجود اس کے یہ پختہ عزم کر رکھا تھا کہ میں عامل عاروب کے ان تینوں کارندوں کو اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اور شاید مجھ سے اس ''خطرے'' کا ان دونوں سانپ اور سنپولیے باپ بیٹوں کو بہ خوبی ادراک تھا۔

اب برفیلے پہاڑوں کا علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ کافی دیر بعد جیپ ایک ویرانے میں ایک کاٹیج کے باہر رکی۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ انہوں نے مجھے جیپ سے نکالا اور مکان کے اندر ایک کمرے میں بند کر دیا اور دروازہ بند کر کے کمرے سے نکل گئے۔ مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر وہاں پڑا رہا تھا۔

راہِ فرار کی ابھی تک کوئی صورت نظر نہ آئی۔ حتیٰ کہ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی بندشوں کو بھی زور لگا کر کھولنے اور توڑنے کی سعی کی تھی مگر کامیاب نہ ہو پایا تھا۔

عالم تشویش کی ان گھڑیوں میں مزید وقت سرکا اور شام ہو گئی۔

مجھے حیرت تھی کہ ابھی تک کوئی بھی اندر میرے کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا۔

'آخر یہ لوگ کہاں چلے گئے تھے؟' میں اُلجھ کر سوچنے لگا۔ 'کہیں یہ لوگ مجھے یہاں دور برف زار ویرانوں میں بھوکا پیاسا چھوڑ کر واپس کبیر کی میزبانی کا شرف حاصل کرنے اور نگینہ کی صورت میں اپنے دوسرے شکار پر ہاتھ ڈالنے کے لئے نظر حیات کی رہائش گاہ پر ڈیرا تو نہیں ڈالے بیٹھے تھے؟'

ممکن تھا کہ میرا یہ خیال درست ہی ہو۔ اس خیال نے جہاں مجھے انجان سی تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا وہاں پہلی بار ایک موہوم سی امید بھی پیدا ہو چلی تھی کہ اب میں اس منحوس کاٹیج میں تنہا تھا۔ گویا میں اب پورے اطمینان کے ساتھ کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا۔

لہٰذا یہ سوچتے ہی میرا ذہن پہلے سے بھی تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا۔ میں دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے دونوں ہاتھ کلائی کی طرف سے جکڑ کر باندھے گئے تھے مگر میرے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آزاد تھیں۔ میں سب سے پہلے پشت کے بل ہو کر دروازے کے لٹو کو گھما کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین جھٹکے دیئے۔ دروازہ مضبوطی کے ساتھ



اور تب اچانک ہی دوسری سمت سے قدموں کی چاپ اُبھری اور اگلے ہی لمحے دروازہ زوردار جھٹکے سے کھلا۔ میں نے غیر ارادی طور پر پلٹنا چاہا مگر اسی وقت کسی نے میری پشت پر لات رسید کر دی اور میں منہ کے بل ذرا دور فرش پر جا پڑا۔ میرے حلق سے بے اختیار کراہ آمیز آوازیں برآمد ہو گئیں۔

پہلو کے بل ذرا ہٹ کر میں نے دیکھا تو ان تینوں کیلاشیوں میں سے ایک کو ہاتھ میں پستول لئے اپنی طرف خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے پایا۔ مجھے سانپ سونگھ گیا۔ میرا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ کاٹیج میں میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

''م........ مجھے پپ........ پیاس لگی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کھایا پیا۔'' بند دروازے پر زور آزمائی کا کوئی جواز پیش کرنا لازمی تھا۔

میری بات پر وہ غراہٹ سے مشابہہ آواز میں بولا۔ ''یہاں کسی قسم کے کھانے پینے کی توقع نہ رکھو۔ سمجھے تم؟''

''ل.........لیکن مجھے......... چند گھونٹ پانی تو پلا دو۔'' میں نے کہا۔

''بکواس بند کرو اپنی۔'' وہ غصیلی آواز میں گھور کر بولا۔ ''اور ہاں......... اپنی جگہ سے ہلنا بھی مت، ورنہ مار مار کر بھرکس نکال دوں گا تمہارا۔'' یہ کہہ کر اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ زوردار دھماکے کی آواز سے بند ہوا تو اچانک میری سماعتوں سے ایک چھنکتی، کھنکتی آواز ٹکرائی۔ بالکل یوں جیسے کوئی کنگن پختہ فرش پر گرنے کی آواز اُبھری ہے۔

میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو مجھے ایک گول رِنگ (Ring) پڑا نظر آیا۔ میں بہ غور اسے تکنے لگا۔ فولادی رِنگ یقیناً دروازے پر لگے لٹو سے اُکھڑ کر گرا تھا۔ اور ایسا دروازہ زور سے بند کرنے کے باعث ہوا ہوگا۔ شاید یہ ڈھیلا تھا۔ لیکن میں اس کا کیا کرتا؟.........تب پھر اچانک میری نگاہ دروازے پر پڑی۔ لٹو کے عقب میں رخنہ نظر آیا جو غالباً رِنگ کے اُکھڑ کر گرنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس میں کچھ خاص فرق محسوس ہوا۔

میں بہ مشکل دروازے تک آیا اور ذرا جھک کر لٹو کے عقب میں بنے اس آہنی رخنے کو دیکھنے لگا جس سے رِنگ گرا تھا۔ کمرے کے اکلوتے بلب کی روشنی میں مجھے رخنے والی جگہ پر ایک کند فولادی دھار اُبھری ہوئی دکھائی دی۔ میرے ذہن میں یکبارگی ایک خطرناک خیال اُبھرا۔ اگر میں اپنی کلائیوں میں بندھی رسّی کو کسی طرح اس تیز دھار پر رگڑتا تو یہ ممکن تھا کہ میری پیہم کوشش سے رسّی کٹ جاتی۔ ''خطرناکی'' کا عنصر یہ تھا کہ رسّی کو زور سے رگڑنا تھا اور ایسی صورت میں دروازے پر زور لگا کر رگڑنے سے آواز اُبھرتی اور باہر کہیں قریب موجود دشمن باخبر ہو سکتا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ وہ اس بار مجھے دروازے سے زور آزمائی کرتے دیکھ لیتا تو میرے دونوں پیروں میں رسّی باندھ دی جاتی اور میں بالکل ہی بے بس ہو کر رہ جاتا۔

مگر اس خطرے کو اگر میں خاطر میں لاتا تو پھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہی بیٹھا رہتا۔ چنانچہ میں نے فی الحال اس کوشش کو ترک کرنا ہی مناسب سمجھا۔ رات کے کسی نصف پہر میں یہ عمل کرنا زیادہ مناسب تھا کیونکہ ممکن تھا اس پہر باہر موجود تینوں کیلاشی بھی سو رہے ہوتے۔ ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں آیا تھا کہ ہو سکتا ہے، اس کے دو ساتھی کہیں چلے گئے ہوں اور یہاں ایک ہی پہرے دار موجود ہو۔

بہرطور میں نے صبر کا دامن ہاتھ میں تھامے رکھا اور دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھ گیا۔ میری نظریں کھڑکی کے پار مقدور بھر آسمان پر جمی ہوئی تھیں جہاں شام کی ملگجاہٹ رات کی تیرگی

میں بدل رہی تھی۔

مزید دو تین گھنٹے اس صبر و خاموشی کے ساتھ بیت گئے تو میں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کو اٹھ کھڑا ہوا اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کے قریب پہنچ کر ذرا رکا۔ چند ثانیے باہر کی سن گن لیتا رہا۔ سناٹا پا کر میں پشت کی طرف گھوما......... میری انتہائی کوشش یہی تھی کہ دروازے پر کھٹ پٹ نہ اُبھرنے پائے۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنی سی ''کوشش'' شروع کر دی۔ ذرا رکوع کے بل جھک کر میں نے رسّی لٹو کے عقبی کند دھار پر رگڑنا شروع کر دیا۔ احتیاط کے پیش نظر پورا زور نہیں لگا پا رہا تھا۔ رسّی بالکل انداز میں رگڑ کھانے لگی جس کا مطلب تھا کہ رسّی پر اب تک ذرا سا بھی چرکا نہیں لگا تھا۔ بہ صورت رسّی کا اگر ایک ''ریشہ'' بھی اُدھڑ جاتا تو وہ ''رف'' انداز میں رگڑ کھاتی اور مجھے بھی اپنی امید بیم آنے کا تھوڑا بہت احساس ہوتا۔

چنانچہ میں نے زور بڑھا دیا اور دروازے پر تھوڑی کھڑبڑاہٹ اُبھری۔ میں نے یکدم اپنی ترک کر ڈالی۔ میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ میں چند ثانیے باہر کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ دوسری جانب اتھاہ خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں نے دوبارہ کوشش شروع کر دی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ اس رگڑ سے رسّی کھردری ہونے لگی تھی۔ میرے اندر ایکا ایکی امید بھری مسرت کی لہر اُٹھی۔ میں نے انگلیوں کی مدد سے رسّی کو چھوا۔ اس کے کچھ ریشے اُدھڑے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

لگاتار کوئی نصف پون گھنٹے کی محنت نے مجھے تھکا ڈالا۔ میں ذرا سستانے کے لئے واپس اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ وقت گزر رہا تھا۔ صبح ہونے میں چند ہی گھنٹے رہ گئے تھے۔ اور نگینہ......... نگینہ کی کل ہی کی واپسی کی فلائٹ تھی۔ نہ جانے ان بدبختوں نے اسے کہاں اور کس جگہ سے کڈنیپ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا؟......... مگر میں تو اس سے پہلے ہی ان مردودوں کو ان کے گھناؤنے منصوبے سمیت ڈھیر کر دینا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر ہانپنے اور سستانے کے بعد میں پھر دیوار کا سہارا لئے ابھی کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ سامنے وہی کیلاشی کھڑا تھا جس نے کچھ دیر قبل میرے پر لات رسید کی تھی۔

اسے دوبارہ دروازے پر دیکھ کر یکبارگی میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ وہ بڑی تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں یہ بدبخت میرے ہاتھ میں بندھی رسّی کا جائزہ لینے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ اسے اُدھڑے ہوئے ریشے نظر آ جاتے اور وہ شک میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ شاید وہ اپنے اطمینان کی خاطر آیا تھا۔ میں نے لہجے میں بے چارگی سموتے ہوئے ایک بار پھر اس سے کہا۔ ''مجھے پیاس لگی ہے، پانی تو پلا دو۔''

مگر اس نے بڑی نفرت کے ساتھ مجھے دیکھ کر ''ہنہ'' کہا اور دوبارہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

میں نے بے اختیار طمانیت کی سانس خارج کی۔ میرے ذہن نے اس کی اچانک مگر ''خاموش'' آمد پر یہی محمول کیا تھا کہ وہ شاید آخری بار اطمینان کرنے کے بعد اب اپنی جگہ پر جا کر سونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے بھی مزید نصف گھنٹے کے لئے اپنی ''کوشش'' مؤخر کر ڈالی۔

پھر خاصی دیر بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بالآخر کافی دیر بعد میری پیہم کوشش رنگ لائی اور رسّی کٹ


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ے دونوں ہاتھ اب آزاد تھے۔ میں نے اپنی کلائیوں کو سہلایا۔

میرے سینے میں اب مسرت کے علاوہ جوش کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ میں دشمنوں کی گردن مروڑنے کے لئے اب بری طرح بے چین تھا۔ قید و بند سے مفر کی طرف میری کوششوں کا یہ پہلا مرحلہ کامیابی سے سر ہو چکا تھا۔

اب اس کمرے سے نکلنا باقی تھا۔ ظاہر ہے، میں دروازے پر دستک دے کر تو نکلنے سے رہا۔ تاہم اس کا دوسرا حل سوچنے لگا۔

اس کے لئے میں دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر سابقہ پوزیشن میں اپنے دونوں ہاتھ پشت کی سمت کر کے اس طرح بیٹھ گیا گویا میرے دونوں ہاتھ ہنوز جکڑے ہوئے تھے۔ اگر کوئی اچانک میرے کمرے میں در آتا تو اسے پتہ بھی نہ چلے۔

رات شاید اپنے آخری پہر پر تھی۔ ایک تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور اب دوسری تدبیر کرنا تھی۔ کمرے سے نکلنے کی اب دو ہی صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں دوبارہ دروازے پر کھڑپڑ کروں یا پھر زور زور سے پانی کے لئے چلاؤں اور سامنے آنے پر اس کیلاشی کو چھاپ لوں۔

دوسری صورت یہ ذہن میں آتی تھی کہ میں اطمینان سے کسی کے اندر داخل ہونے کا انتظار کرتا اور دھوکے سے ان پر قابو پانے کی کوشش کرتا۔

مگر انتظار مجھ سے نہیں ہو رہا تھا۔ میرے پاس اب بہت کم وقت بچا تھا۔ صرف چند گھنٹے یا شاید اس سے بھی کم۔ ایسے میں ذرا سی بھی جلد بازی سارے کئے کرائے پر پانی پھیر سکتی تھی۔ میں ایک بار پھر غور کرنے لگا۔ بالآخر یہی سمجھ میں آیا کہ مجھے کچھ کرنا چاہئے۔ لہٰذا یہ سوچ کر میں اٹھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے کے لٹو کو پکڑا اور اسے زور زور سے ہلانے لگا۔ دروازے پر اگر میں دونوں ہاتھوں سے ''تھڑ'' مارتا تو یقیناً پتہ چل سکتا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ آزاد ہو چکے تھے۔ یوں وہ چوکنا ہو جاتے۔ اس طرح کم از کم وہ اس زعم میں تو ہوتے کہ میرے دونوں ہاتھ ابھی تک جکڑے ہوئے تھے۔

کافی دیر تک میں اسی طرح دروازے کو کھڑکھڑاتا رہا۔ مگر مجھے خاصی حیرت ہوئی کہ خاصی دیر تک کسی نے بھی ادھر توجہ نہ دی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ گہری نیند سو رہے ہوں۔ تب میں نے یہی مناسب سمجھا کہ مزید کھڑپڑ کرنے کی بجائے زور زور سے چلا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا ہی زیادہ بہتر تھا۔ چنانچہ ابھی میں نے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک میری سماعتوں میں کسی گاڑی کے انجن کی گھرگھراہٹ اُبھری۔ میں یکدم سناٹے میں آ گیا اور ساتھ ہی ایک سنسناتا ہوا خیال اُبھرا۔

'کہیں یہ لوگ اپنے دوسرے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لئے روانہ تو نہیں ہو رہے؟'

میں نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ ''پانی......... مجھے پانی چاہئے......... سخت پیاس لگی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے ناچار دونوں ہاتھوں سے دروازے کو دھڑدھڑانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد باہر کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ گاڑی کی آواز دور جاتی ہوئی سنائی دی۔

'کیا یہ لوگ چلے گئے تھے؟......... نگینہ اب ان کے ہاتھوں اغواء ہونے والی تھی؟'

میرے دل و دماغ میں اذیت ناک خیال اُبھرا۔

ٹھیک اسی وقت دروازے کے باہر قدموں کی آہٹ اُبھری جسے سن کر یکلخت میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ گویا ان کا ایک ساتھی ادھر ہی رہ گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



اچانک دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے میں نے رائفل کی نال دروازے سے نمودار ہوتے دیکھی اور تو جیسے میرے بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے جھپٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے نال پکڑ کر کھینچ دی اور ساتھ ہی ایک ٹھوکر رائفل بدست کو لگا دی۔

وہ اس اچانک حملے کے لئے قطعی طور پر تیار نہ تھا۔ نتیجتاً رائفل اس کی گرفت سے نکل گئی اور وہ دو قدم عقب میں لڑکھڑا گیا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں جب تک رائفل کی نال چھوڑ کر پوری طرح اس پر گرفت جماتا، اس نے اچانک ہی مجھ پر چھلانگ لگا دی اور مجھے رگیدتا ہوا اندر کمرے میں آ پڑا۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ اس بدبخت نے مجھے سنبھلنے کا ذرا بھی موقع دیئے بغیر میرے چہرے پر مُکا رسید کر دیا۔ مجھے ایک لمحے کو اپنا دماغ جھنجھناتا محسوس ہوا۔ وہ مجھے چھوڑ کر قریب گری رائفل کو اٹھانے کے لئے لپکا۔ یہ بڑے فیصلہ کن اور جان گسل لمحات تھے۔ لہٰذا میں نے پل کے پل سنبھلتے ہی اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ منہ کے بل فرش پر گرا مگر گرتے گرتے بھی اس کا ایک ہاتھ رائفل تک پہنچ ہی گیا اور اس نے وہیں سے ایک ہی ہاتھ میں رائفل پکڑ کر لٹھ کی طرح گھما دی جو میرے سر پر تو نہ لگی البتہ میرے بائیں کاندھے پر پڑی۔ مجھے اپنا کاندھا ٹوٹتا محسوس ہوا۔

مگر یہ وقت اپنی چوٹ سہلانے کا نہ تھا۔ اس نے رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کرنی چاہی مگر میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کر اپنے سر کی زوردار ٹھوکر نہ صرف اس کے پیٹ پر رسید کر دی بلکہ اسے دھکیلتا ہوا دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس نے اپنا دایاں گھٹنا چلا دیا۔ جو میرے پیٹ پر لگا۔ مارے اذیت کے میرے حلق سے کراہ خارج ہو گئی۔ اس نے رائفل کا بٹ دوبارہ میرے سر پر رسید کرنا چاہا مگر میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اب ہمارے درمیان ایک دوسرے سے رائفل جھپٹنے کی کشمکش ہونے لگی۔ ہم دونوں ڈیل ڈول میں برابر ہی تھے اور اپنی سی پوری کوشش کر رہے تھے کہ اچانک اس نے رائفل چھوڑ کر مجھے زور سے پرے دھکیل دیا۔ میں رائفل سمیت کئی قدم پیچھے جا کر لڑکھڑایا مگر چونکہ یہ اپنے اور اس کے دیے ہوئے دوسرے دھکے کا اثر تھا اس لئے میرے قدم زمین سے اکھڑ گئے اور وہ چشم زدن میں دروازے سے نکل کر باہر کو دوڑا۔ میں پرے جا کر گرا اور گرتے ہی سنبھل کر میں نے اس پر برسٹ فائر کرنا چاہا مگر وہ کمرے سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں رائفل ہاتھ میں سنبھالتا ہوا بہ سرعت اٹھا اور تیزی کے ساتھ باہر کو دوڑا۔ میرا رواں رواں اس وقت جوش غیظ کے مارے کپکپا رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، کاٹیج بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ میں نے پورا کاٹیج دیکھ ڈالا مگر وہ نظر نہ آیا۔ میں باہر آ گیا۔ دور مغربی پہاڑیوں کی سمت سے صبح کاذب کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ فضا میں ابھی تیرگی نیم شب کا اثر غالب تھا۔ سامنے جنگل تھا۔ میں پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ کر دشمن کو تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

مجھے اس کے نکل جانے کا از حد افسوس تھا۔ تاہم مجھے خوشی بھی ہوئی تھی کہ اب میں آزاد تھا۔ مگر اس وقت میری خوشی ایک اندیشے میں بدل گئی کہ اب میں کس طرح ان دور دراز برف زار ویرانوں سے نکلوں جبکہ مفرور کیلاشی کے دو ساتھی نکل چکے تھے۔ ان کے پاس تیز رفتار جیپ تھی۔ جبکہ خود میرے پاس دور دراز علاقے سے نکلنے کے لئے کوئی سواری نہ تھی۔

میں گہری اور اُلجھن آمیز تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہئے تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ صبح کی سپیدی اب روشنی میں بدل رہی تھی۔ میں نے وقت کا



لگایا صبح چھ اور سات بجے کا وقت ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے شدید بے چینی نے آ لیا۔ میرے پاس بہت ہی باقی بچا تھا۔ میں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی تھی۔ حسب توقع میرا میگارد اور موبائل اس وقت لیا گیا تھا جس وقت نظر حیات کے گارڈ نے اچانک عقب سے میرے سر پر وار کر کے مجھے بے دیا تھا۔ حتیٰ کہ میری رسٹ واچ تک اُتار لی تھی۔ گویا یہ واچ ٹرانسمیٹر ہو۔

کنپٹیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بار بار یہی خیال میرے دماغ کو جھنجھنائے دے رہا تھا کہ اب میں کیا کر سکتا تھا؟ کدھر جاتا؟

خیال ذہن میں آیا کہ کسی قریبی آبادی تک پہنچ کر میں ٹیلی فون پر انکل اعظم سے رابطہ کر کے والے خطرے سے آگاہ کر دوں یا پھر اِدھر ہی کہیں چھپ کر ان دونوں کیلاشیوں کی واپسی کا کہ نگینہ کو اگر وہ ایئرپورٹ سے ہی اغواء کرنے میں (جس کا مجھے قوی اندیشہ تھا) کامیاب ہو تو یقیناً وہ اِدھر ہی کا رخ کریں گے۔ اور پھر میں بڑے آرام سے ان دونوں پر ہاتھ ڈالنے کی کرتا۔ لیکن پھر اچانک مجھے ان کے تیسرے ساتھی کا خیال آیا۔ وہ کمبخت جانے کس طرح مجھ سے بھاگا تھا۔ اس کی جانب سے ہی مجھے انجانا خطرہ لگا ہوا تھا۔

میں یہاں چھپ کر اول الذکر ان دونوں کیلاشیوں کا انتظار کرتا تو ممکن تھا کہ ان کا تیسرا ساتھی جو تھا، عین وقت پر میرا کام بگاڑ سکتا تھا۔ جبکہ مجھے سردست دور دور تک کسی ایسی قریبی آبادی کے نہیں آ رہے تھے کہ میں وہاں کا رخ کرتا اور کسی طرح فون وغیرہ پر انکل اعظم خان سے رابطہ بہرطور دھاگے کے دونوں سروں میں سے ایک سرا میرے ہاتھوں سے نکل چکا تھا جبکہ دوسرا میرے۔ اگرچہ وہ بھی ابہام کا شکار تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ کچھ نہ کچھ کیا جاتا۔ جتنی جلدی تھی، اتنا ہی وقت بھی تیزی کے ساتھ میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں سے پہلے بلندی کی جانب رخ کیا اور آگے قدم بڑھا دیئے۔ ایک سبزے اور برف سے ڈھکی پہاڑی پر چڑھ کر میں نے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ مشرقی برفیلے اُفق سے سورج اُبھر آیا تھا۔ چٹانوں کے کگر کسی اونچے گنبد پر لگے کلس کی طرح چمک رہے تھے۔

دور پار کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں سخت مایوس ہو رہا تھا۔ وقت کا ایک سرا ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ اب میں دوسرا سرا گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں آبادی کی واپسی میں بھٹک جاتا اور میری غیر موجودگی میں وہ دونوں کیلاشی باشندے کاٹیج کا رخ کرتے نہ پا کر وہ کیلاش وادی کی طرف کوچ کر جاتے۔ کم از کم یہاں رہ کر میں ان کی واپسی کا انتظار کر چھاپ تو سکتا تھا اور نگینہ کو بھی ان کے متوقع چنگل سے چھڑا سکتا تھا۔

آخر مجھے یہ تسلیم کرنا ہی پڑا کہ میں اب سردست نگینہ کو اغواء ہونے سے تو نہیں بچا سکتا تھا۔ پھر کم از اِدھر ہی رہ کر ان کی واپسی کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔

دوسری طرف مجھے تیسرے مفرور کیلاشی باشندے کی طرف سے بھی تشویش ہو رہی تھی۔ کہیں وہ اپنے ساتھیوں کو میری طرف سے محتاط نہ کر دیتا۔ اتنا تو مجھے بھی یقین تھا کہ وہ بھی کہیں آس پاس ہی ہوگا۔ اب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لوگ موبائل کا استعمال جانتے تھے کہ نہیں۔

آخر کافی غور و خوض کے بعد میں نے یہی سوچا کہ جس راستے سے یہ لوگ آئے تھے اور پھر دوبارہ مجھے بھی اس راستے پر آگے بڑھنا چاہئے۔ کیونکہ پھر دوبارہ (نگینہ سمیت) ان کی واپسی بھی اسی سے ہو سکتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk


بہرطور یہ تجویز مجھے زیادہ بھائی تھی۔ لہٰذا میں نے رائفل سنبھالی۔ گرد و پیش پر ایک نگاہ ڈالی اور نام لے کر اس اکلوتے راستے پر آگے بڑھ گیا۔

❄❄❄

اس بار میرے ستارے گردش میں نظر آ رہے تھے۔

نگینہ کے واپس ملک پہنچنے کے بعد میری خوشی ادھوری ہی رہ گئی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے کھاتے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت میں بھربھری مٹی والے راستے پر مٹی کے درمیان برف کے کندن ریزے بھی چمک رہے تھے۔ میں خاصی دیر تک بغیر رُکے چلتا رہا۔ مجھے مفرور کیلاشی کی طرف سے بھی اچانک حملے کا دھڑکا لگا ہوا تھا کیونکہ اس کے دوسرے ساتھیوں کے کے بعد بازی پلٹ کر کسی حد تک میرے حق میں ہو گئی تھی اور یہ بات وہ بھی جانتا تھا۔ مگر اس کے ساتھی نہیں۔ ہو سکتا ہے اس نے بھی میری طرح اس راستے کا انتخاب کیا ہوتا کہ راستے ہی میں دونوں لوٹتے ہوئے ساتھیوں سے مل کر وہ انہیں موجودہ صورت حال سے آگاہ کر دے۔

مجھے اب اپنی اس موجودہ پیش قدمی کا خیال بروقت اور درست ہی معلوم ہوا تھا۔ میرے اندا کے مطابق اب دس بج چکے تھے۔ گویا اب تک عامل عاروب کے ان دونوں کارندوں نے نگینہ کو اغوا لیا ہو گا یا اغواء کرنے والے تھے۔ اگر وہ دونوں خبیث اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو بھی گئے تب بھی انہیں واپس یہاں تک پہنچنے میں دو سے تین گھنٹے درکار تھے۔

اچانک میں چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گیا۔ ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ بڑی مبہم آواز تھی۔ مجھے چونکہ تیسرے مفرور دشمن کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا اس لئے میں اپنے سائے چوکنا ہو کر چل رہا تھا۔

میں نے رک کر آواز پر ذرا غور کیا تو یہ آواز مجھے اپنے دائیں جانب ایک قدرے اونچے ٹیلے محسوس ہوئی۔ تاہم آواز میں کرب کا تاثر موجود تھا۔

میں نے فوراً مذکورہ ٹیلے کی طرف رخ کیا۔ ٹیلا زیادہ وسیع نہ تھا۔ اس کی ڈھلان پر بھی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ذرا قریب پہنچنے پر میں بری طرح ٹھٹکا۔ دو افراد مجھے زخمی حالت میں پڑے ہوئے ملے۔ میں جلدی سے ان کی طرف لپکا۔ بغور ان کی طرف دیکھا۔ یہ دو جواں سال لڑ تھے۔ نوعمر ہی تھے۔ لڑکی کے مقابلے میں لڑکا زیادہ زخمی اور لہولہان نظر آ رہا تھا اور اس کا جسم ساکت تھا۔ جبکہ لڑکی زخمی حالت میں کراہ رہی تھی۔

دونوں نے قیمتی مگر مقامی پوشاکیں پہن رکھی تھیں۔ میں سب سے پہلے لڑکی کی طرف بڑھا۔ خوب صورت تھی۔ بال ہلکے براؤن تھے۔ اس نے فر کا قیمتی لباس پہن رکھا تھا اور پیروں میں لانگ تھے۔ ذرا دیر کے بعد اس کا سر بھی ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

میں نے جلدی سے اس کی نبض چیک کی اور سینے کی دھڑکنیں سنیں۔ وہ ابھی زندہ تھی مگر بے ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً لڑکے کی طرف رخ کیا۔ وہ بھی ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ مجھے دونوں لڑ کی صورتوں میں بہن بھائی کی مماثلت محسوس ہوئی۔ میں نے لڑکے کی نبض چیک کی اور دھڑکنیں افسوس ناک انکشاف ہوا کہ وہ جان کی بازی ہار چکا تھا۔

ناچار مجھے بے ہوش پڑی لڑکی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس برف زار ویرانے میں مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟..... یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مگر میں لڑکی کو زخمی حالت میں چھوڑ کر بھی نہیں جانا چاہتا

گوارا نہیں کر رہا تھا کہ میں ایک انسان کو یوں موت و زیست کی کشمکش میں چھوڑ کر اپنی راہ لیتا۔ ان دونوں بے چاروں پر کس نے قیامت ڈھائی تھی؟

کی عمر بیس سال کے قریب لگتی تھی جبکہ لڑکی بہ مشکل سترہ اٹھارہ کے پیٹے میں نظر آتی تھی۔ میں کے زخموں کا جائزہ لیا۔ اس کے صرف سر پر چوٹ تھی اور چہرے پر بھی خراشوں کے نشان نظر غے۔ گردن پر بھی سرخی مائل لکیریں تھیں۔ جبکہ لڑکے کا سر بالکل پھٹ چکا تھا اور پیشانی بھی تڑخی ظر آتی تھی۔ اور یہی زخم اس کے لئے مہلک ثابت ہوا تھا جس نے بالآخر اس کی جان لے لی تھی۔

ڑائن سے کچھ یوں لگتا تھا کہ انہوں نے ایک یا ایک سے زائد حملہ آوروں کے ساتھ نبرد آزمائی کی زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکے تھے۔ یوں بھی یہ نوعمر ہی تھے۔ لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی تھی یہ دونوں یہاں اکیلے اس ویرانے میں کیا کرنے آئے تھے؟

کیا ان کا گھر قریب ہی تھا؟..... یہی ایک بات میرے ذہن میں آئی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔ میں نے زمین کا بہ غور جائزہ لیا تو مجھے چوڑے ٹائروں پ کے واضح نشان دکھائی دے گئے۔ یہ ان کی کسی پرانی قبائلی دشمنی کا شاخسانہ معلوم ہوتا تھا۔

بہرطور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کم از کم لڑکی کو اٹھا کر واپس کاٹیج کا رخ کرنا چاہئے یا پھر یہاں زدیکی آبادی کو تلاش کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا اور ٹیلے کی بلندی پر چڑھ کر چہار اطراف میں دوڑائی۔ تب ایک جانب بہت دور مجھے سبزے اور برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی ڈھلان پر چھدری سی کے آثار نظر آئے۔

یہاں سے دیکھنے پر وہ قریب ہی محسوس ہوتی تھی۔ ممکن تھا جب میں وہاں کا قصد کرتا تو فاصلہ طویل پڑتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک بل کھاتا راستہ بھی اس سمت کی طرف جاتا ہوا ہی آ رہا تھا۔

میں نے زخمی لڑکی کو فوراً اپنے کاندھے پر اٹھایا اور اس سمت کا رخ کیا۔ لڑکی کا وجود نازک اور پھول رح ہلکا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ابھی میں نے بہ مشکل تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا اچانک مجھے سامنے آبادی کی طرف جاتے ہوئے راستے پر گرد و غبار کے بادل اُڑتے ہوئے دکھائی میں ٹھٹک کر رک گیا اور بہ غور اپنی آنکھیں سکیڑے سامنے تکنے لگا۔ یہ تین چار کے قریب بھاری ہیں تھیں۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ ذہن میں یہی خیال اُبھرا کہ شاید ان دونوں بدنصیب بھائی کے وارثوں سے ان کا تعلق ہو۔ یہ بھی اچھا تھا۔ میرا کافی وقت بچ گیا تھا۔ تاہم دل و دماغ کو ایک ب پریشانی بھی لاحق ہونے لگی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں تینوں گاڑیاں آندھی طوفان کی طرح اُڑتی ہوئی میرے قریب پہنچ کر ایک جھٹکے ک گئیں۔ گرد و غبار کا ایک طوفان سا اُمڈا اور پھر میں نے تقریباً دس بارہ لحیم شحیم مقامی افراد کو سے دیکھا۔ ان کی پشت سے رائفلوں کی نالیوں کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے انہیں دیکھ کر کاندھے سے بے ہوش لڑکی کو اٹھا کر آہستگی سے زمین پر لٹا دیا تو وہ لوگ تیزی سے میری جانب اور اپنی رائفلیں پشت سے اتار کر مجھ پر تان لیں۔

جو ایک لڑکی کی طرف بڑھے اور تب ایک نے چلا کر مقامی زبان میں کہا۔

یہ تو شہزادی صاحبہ ہیں۔"

یہ زبان آتی تھی۔ میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔ لڑکے کا سن کر ان کے چہرے تاریک ہو

گئے۔ پھر کچھ لوگ میری نشاندہی پر اس طرف دوڑے جہاں بدنصیب لڑکے کی لاش پڑی ہوئی تھی
اس کی لاش اٹھائے وہاں آگئے اور بیشتر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

''لالہ مجھے یہ بھی انہی کا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔ اسے گولیوں سے بھون دینا چاہئے۔'' ایک پُرطیش لہجے میں نسبتاً دراز قامت اور بارُعب شخصیت والے آدمی سے کہا۔ اس کی انگارے برساتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں پریشان ہوگیا۔ بارعب شخص نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا تو میں نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''اگر میں آپ کے دشمنوں کے ساتھ ہوتا تو بھلا میں فرار ہونے کی بجائے لڑکی کو آبادی کی طرف کیوں اٹھا کر لے جاتا؟ میں تو یہ چاہ رہا تھا کہ اس کی جان بچ جائے۔''

میری دلیل معقول تھی۔ اب ان کے چہروں پر چھائے درشتی کے آثار تذبذب اور اُلجھن آمیز خاموشی میں بدل گئے تھے۔ تاہم باوجود اس کے وہ مجھ سے مطمئن نظر آرہے تھے۔

اس بارعب شخص نے مجھ سے گونج دار آواز میں کہا۔ ''جب تک شہزادی بیٹی کو ہوش نہیں آجاتا اور وہ ہمیں اصل حقیقت نہیں بتاتی، تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''

اس کی بات سن کر میں بری طرح پریشان ہوگیا۔ مجھے یہ نیکی گلے پڑتی نظر آرہی تھی۔ انہوں نے میری بات سنے بغیر مجھے جیپ میں سوار ہونے کا حکم دیا اور ناچار مجھے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

بستی زیادہ گنجان اور بڑی نہ تھی مگر بہرحال زندگی اپنی پوری ہماہمی کے ساتھ متحرک تھی۔ بستی میں کہرام مچ گیا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ دونوں بدنصیب نوعمر لڑکا لڑکی آپس میں واقعی سگے بہن بھائی تھے اور یہاں کے سردار زورآور خان کی اولاد تھے۔ جبکہ وہ بارعب شخصیت سردار زورآور خان کا چھوٹا سگا بھائی وزیر خان تھا۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سردار زورآور خان کی عمر ساٹھ کے پیٹے میں تھی۔ مگر اپنی قابلِ رشک صحت سے ساٹھا پاٹھا ہی نظر آتا البتہ سر اور بھنوؤں کے بال سفید دودھیا تھے۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔

اریب قریب ڈھلوانی کھپریل کی چھتوں والے جھونپڑ اور مکانات نظر آتے تھے۔ جبکہ سردار کا مکان وسیع قطع اراضی پر محیط ایک حویلی نما تھا جس کے گرد نو فٹ اونچی دیواروں کا ایک قلعہ نما ''کوٹ'' بنا ہوا اندر اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کا طویلہ بھی تھا۔ سردار زورآور خان کے بدنصیب بیٹے کا نام شہ زور خان تھا بیٹی کا نام شہزادی تھا۔

ماحول میں بڑے غم و غصے کی لہر پائی جاتی تھی۔ مجھ پر بھی پُرطیش نظروں کی برچھیاں پڑ رہی تھیں۔ ے خلاف بھی فتوے جاری کئے جا رہے تھے جس کا لب لباب روایتی ہی تھا۔ یعنی میں حملہ آوروں کا تھا۔ کم و بیش سردار زورآور خان کا بھی یہی خیال تھا۔ جبکہ اس کا لمبا تڑنگا بھائی وزیر خان سمجھ دار آدمی ں نے میری دلیل دہراتے ہوئے اپنے بھائی اور دیگر مشتعل لوگوں کو قدرے ٹھنڈا کیا مگر میرے سلسلے ر بھی دبا دبا اشتعال پایا جاتا تھا۔

ردار کی حالت غم ناک ہو رہی تھا۔ مگر وہ مرد تھا۔ اپنے کرب پر ضبط کئے ہوئے تھا جبکہ اس کی بیوی ا جواں مرگی پر مارے غم کے نڈھال ہو رہی تھی۔ اس پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

نہزادی کو ہوش آگیا تھا۔ اس سے فوراً اس اندوہناک واقعے کے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے سے پہلے اپنے بھائی شہ زور کے بارے میں دریافت کیا۔

اس کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے یہی جھوٹ بولا گیا کہ وہ زندہ ہے۔ تب اس کی حالت کچھ سنبھلی اور ں نے جو کچھ بتایا وہ دیگر لوگوں کے لئے تو اتنا چونکا دینے والا ثابت نہ ہوتا مگر میں بری طرح تشویش یشان کن بے چینی کا شکار ہوگیا۔

نہزادی نے بتایا کہ وہ اور اس کا بھائی اپنی گاڑی میں سیر کی غرض سے نکلے تھے۔ دونوں بہن بھائی لکھے تھے اور شہر میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہیں ہوسٹل میں رہتے تھے۔ آج کل اپنے گاؤں آئے تھے۔

اتے میں ایک لحیم شحیم شخص نے ہاتھ کے اشارے سے ان کی جیپ کو روکا۔ اس کے بعد اچانک اس نے ملہ کر دیا۔ وہ ان کی جیپ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شہ زور جوش میں آگیا اور اس سے بھڑ گیا۔ شہزادی ہمیں آئی تو اس اجنبی حملہ آور نے اسے بھی پتھر اور ڈنڈے مار کر زخمی کر دیا اور بعد میں جیپ کی فولادی شہ زور کا سر بے دردی سے مار مار کر بری طرح زخمی کر ڈالا اور ان کی جیپ لے کر فرار ہوگیا۔

دار زورآور کی بیٹی شہزادی نے اس اجنبی حملہ آور کا جو حلیہ بتایا تھا اسے سن کر میں بری طرح چونک گیا اعامل عاروب کا مفرور کارندہ معلوم ہوتا تھا اور میں سمجھ گیا تھا کہ وہ بدبخت ان کی جیپ کیوں حاصل رنا تھا۔ اس کے بعد شہزادی سے میرے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے میرے سلسلے میں قطعاً

لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

مگر اس کے باوجود میری گلوخلاصی نہ ہوئی اور قبیلے کے معتبر لوگوں کے سامنے مجھے پیش کیا گیا۔ میرے سلسلے میں چھوٹا موٹا جرگہ ہوگیا جس میں سردار زور آور خان اور اس کا بھائی وزیر خان بھی شامل تھے۔ مجھ سے میرے بارے میں تفصیلات پوچھی گئیں کہ میں اکیلا وہاں کیا کر رہا تھا؟ اب مجھے لازماً سچ سچ بتانا پڑا تھا کہ میرے ساتھ بھی کیسی ٹریجڈی ہوگئی تھی۔ نیز یہ کہ میں اس اجنبی حملہ آور قاتل کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایسا میں نے اس لئے کیا تھا کہ اب تک اس سارے "کھٹ راگ" میں میرا جتنا وقت ضائع ہوا تھا، اس کی تلافی ہوسکے۔

یہی سبب تھا کہ میں نے انہیں اپنے بارے میں تفصیلاً آگاہ کر دیا تا کہ وہ میرے سلسلے میں تصدیق اور تشفی کرسکیں......... لیکن میری کہانی پر انہیں شاید پوری طرح یقین نہ آیا۔ تاہم سردست جرگے کے اراکین اور سردار وغیرہ میری کہانی غور سے سنتے رہے۔ اس کے بعد آپس میں وہ دھیمے لہجے میں کھسر پھسر کرتے رہے۔

مجھے سردار زور آور خان کے بھائی وزیر خان سے امید تھی کہ وہ میری گلوخلاصی کی کوشش کرے گا۔ کافی دیر تک آپس میں کھسر پھسر کرنے کے بعد بالآخر سردار زور آور خان نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بلکہ مسلط کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے بیٹے شہ زور کا وہ قاتل بے شک تمہارا دشمن سہی لیکن وہ تمہاری وجہ سے ہی یہاں آیا تھا اور تم سے جھگڑے کے دوران وہ کا ٹیج سے فرار ہوا۔ یوں راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے اس مردود کا سامنا ہمارے دونوں بچوں سے ہوا۔ اس طرح سے تم بھی قصوروار ثابت ہوئے ہو۔ لیکن ابھی ہم تمہاری سزا کے سلسلے میں حتمی فیصلہ محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر تم ذہنی طور پر خود کو کڑی سے کڑی سزا کے لئے تیار کرلو۔"

وزیر خان کی بے تکی ضد نے مجھے بری طرح جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ میری بے گناہی سمجھنے کے باوجود اپنے سردار بھائی زور آور خان کے فیصلے پر مجبور ہو۔ لیکن میں بری طرح اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر نگینہ کا خیال پریشان کر رہا تھا اور اس کے حوالے سے میرے دل و دماغ میں وسوسوں کے سانپ کلبلانے لگے تھے۔

جیپ نے واپسی کے سفر پر یوٹرن لیا اور پوری رفتار سے دوڑنے لگی۔ میرا ذہن تیزی سے موجودہ سنگین حالات اور اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور کرنے لگا۔ میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ پہلا تو یہ کہ میں خاموشی سے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتا۔ سردار زور آور خان کے فیصلے کا انتظار کرتا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں اس وقت ان سے بھڑ جاتا اور مارا ماری کر کے ان کے چنگل سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ میں نے لمحوں میں دونوں راستوں پر باریک بینی سے غور کیا۔ مجھے پہلا راستہ زیادہ سودمند لگا۔ کیونکہ موجودہ حالات کا تقاضا تھا کہ میں زیادہ خطرات مول لئے بغیر صبر و استقامت کے ساتھ بہتر وقت کا انتظار کروں۔ اگر میں دوسرا راستہ اپنانے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے سردار زور آور خان کے پورے قبیلے کی نظروں میں مجرم بنانے کا باعث بنتا اور موجودہ حالات اس نئی دشمنی کے آغاز کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لیکن مجھے اس بات کی بھی پریشانی ستا رہی تھی کہ نگینہ اگر ان تینوں کیلاشیوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی تو وہ اسے بلا تاخیر کیلاش لے جا کر عامل عاروب کے حوالے کر سکتے تھے جہاں اس شیطان نے نگینہ کو اپنے نام نہاد مقدس دیوتا "دابولا میزی" کی بھینٹ چڑھانے کا ناپاک اور خطرناک عزم کر رکھا تھا۔ ایسا نہ ہوتا کہ میں دوسری بار تاخیر کی وجہ سے خدانخواستہ ہمیشہ کے لئے نگینہ کو کھو بیٹھتا۔

جیپ کا سفر جاری تھا اور میں نگینہ کے حوالے سے ایک بار پھر شدید شش و پنج کا شکار ہوگیا تھا۔ مجھے


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فیصلہ ہو نہیں پا رہا تھا۔ میں نے دوبارہ اور آخری بار غور کیا کہ اگر میں چپ چاپ ان کے ساتھ ہو لیتا تو ضروری تھا کہ ہٹ دھرم سردار زور آور خان مجھے یوں آسانی سے چھوڑ دیتا؟ اس طرح بہتر وقت کے انتظار میں تو نگینہ کی جان کو لاحق خطرے کی سنگین گھڑیاں مختصر ہوتی چلی جاتیں۔ بالآخر میں نے پہلے راستے پر چلنے کا ارادہ ترک کر ڈالا اور دوسرے مگر خطرناک راستے کو اپنانے کا آخری اور پُرعزم فیصلہ کر لیا۔ اس "خطرے" میں بہرحال نگینہ کی زندگی کو فائدہ تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر میں نے پیشاب وغیرہ کی حاجت کے لئے وزیر خان سے درخواست کی۔ اس نے بڑی ناگوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر بالآخر اس نے ڈرائیور سے جیپ روکنے کو کہا۔

ڈرائیور نے جیپ سڑک کے کنارے پر روک لی۔ دو گن بردار افراد میرے ساتھ ہی جیپ سے اترے۔ میں نے سڑک کے کنارے قدرے نشیب میں جھاڑیوں کی سمت پیش قدمی کی تو ایک گن بردار میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ تب پھر موقع پاتے ہی میں نے یکدم پلٹ کر اس پر حملہ کر دیا۔

سب سے پہلے میں نے اس کی گن پر جھپٹا مارا اور اپنا گھٹنا اس کے پیٹ پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے "اوغ" کی بھیانک کراہ خارج ہوگئی اور گن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی میں نے برق رفتاری سے وہ اس سے جھپٹ لی۔ گن میرے قبضے میں آتے ہی اس کا ٹھوس آہنی بٹ میں نے دشمن کے جھکے ہوئے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ اپنے حلق سے بھیانک کراہ خارج کر کے زمین بوس ہوتا چلا گیا۔ اس کا دوسرا ساتھی ہی نہیں، سڑک کے کنارے کھڑی جیپ میں موجود وزیر خان سمیت اس کے دیگر ساتھیوں کو بھی جھاڑیوں کی اوٹ میں ہونے والی گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا۔ پھر جب تک وہ سب قریب آتے، میں تیزی کے ساتھ ایک جانب جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا رینگ گیا۔ دفعتہً ہی پھر عقب میں مجھے وزیر خان کی طیش میں جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی زبان میں اپنے ساتھیوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن ادھر میں نے اپنی "چور" پیش قدمی ترک کی۔ میرا ارادہ ان کی جیپ پر قابض ہونے کا تھا اس لئے میں سردست ان پر گولیاں چلانے کی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں تیزی سے جھاڑیوں کی اوٹ لیتا، سڑک کے کنارے آگے بڑھتا رہا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر دوسری طرف اُبھرا تو میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسرت و کامرانی کی مسکراہٹ اُبھری۔

میں دشمنوں کو بھٹکانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کیونکہ ان کی جیپ ذرا فاصلے پر کھڑی نظر آ گئی تھی۔ مگر وہ لوگ سب غائب تھے۔ ان سنگین اور پُرخطر لمحات میں ایک پل بھی ضائع کرنا حماقت ہوتی۔ چنانچہ میں نہایت پھرتی مگر محتاط روی کے ساتھ جیپ کی سمت بڑھا۔ جیپ کے قریب پہنچتے پہنچتے میں نے ایک نگاہ اطراف میں ڈالی اور ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہوگیا۔ حسب توقع چابی اگنیشن سوئچ میں موجود تھی۔ میں نے جیسے ہی چابی گھمائی، اچانک گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ مجھے اپنے چہرے کے قریب سے گزرتی گولی کی مہیب "سنک" صاف محسوس ہوئی تھی جس نے دوسری طرف کی کھڑکی کا شیشہ ایک دھماکے سے چکنا چور کر دیا۔ میں لرز سا گیا۔ تاہم اوسان بحال رکھتے ہوئے میں نے جیپ کے اسٹارٹ ہوتے ہی اسے ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ پھر تو عقب میں جیسے طوفان اُمڈ پڑا۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ نے خاموش فضا کے سناٹے کو بری طرح مجروح کر ڈالا تھا۔ کئی گولیاں جیپ کی باڈی میں پیوست ہوئی تھیں مگر شکر تھا کہ کسی بھولی بھٹکی گولی نے جیپ کے ٹائروں تک رسائی نہیں حاصل کی تھی۔

میں بتدریج جیپ کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ "فائرنگ رینج" سے خاصی دور نکل گیا۔ مخدوش تر حالات میں اپنی اس کامیاب اور دلیرانہ وار پیش قدمی نے میرے حوصلے دوچند کر ڈالے۔ اب میری ساری

توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی

ذرا دور تک تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد میں نے شارٹ کٹ اپنایا۔ اب میرا رخ نتھیا گلی کی بجائے مری کی طرف تھا۔ میں سب سے پہلے انکل اعظم خان سے ملنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے میں اپنے نال پہنچا۔ مزدور اپنے کام میں مگن تھے۔ میں نے جیپ روکی اور اپنے آفس میں آ کر انکل اعظم خان کے موبائل پر ان سے رابطہ کیا۔ اس دوران میں نے کئی بار نگینہ کے موبائل پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

"تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے نادر؟ تمہاری ماں بہت پریشان.........."

میں نے ان کی بات کاٹی اور دھڑکتے دل کے ساتھ جلدی سے بولا۔ "انکل! پہلے میری بات سن لیں۔" اور پھر میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔

"اوہ مائی گاڈ!.........تو آج صبح اسلام آباد ایئر پورٹ پر اغواء ہونے والی واردات نگینہ کے متعلق تو نہیں تھی؟" میری مختصراً صراحت پر وہ اچانک چونک کر بولے۔ میں سر تا پا لرز گیا۔ وہی ہوا تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میرا دل کنپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا اور رگوں میں سنسناتی ہوئی لہو کی گردش خود بخود ہی بڑھنے لگی تھی۔

"انکل! اب میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ میں نے آپ کو ساری باتیں بتا دی ہیں۔ آپ پلیز ماں کو میری خیریت اور موجودہ حالات کے بارے میں بتا دیجئے گا۔ میں اس وقت نکل رہا ہوں۔" پھر اچانک ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال کے تحت میں نے دوبارہ ہانپتی سی آواز میں کہا۔ "انکل! آپ پلیز میرا ایک اور کام کر دیجئے گا۔"

"ہاں، ہاں نادر!.........بولو، کیا بات ہے؟" وہ پُرشفقت لہجے میں بولے۔ البتہ ان کے لہجے سے پریشانی اور تشویش مترشح ہو رہی تھی۔

"انکل! میں آپ سے رابطے میں رہنے کی کوشش کروں گا۔ آپ تب تک یہ بات واقعی کنفرم کر لیں کہ کیا واقعی نگینہ کو امریکہ سے لوٹتے وقت اغواء کیا گیا ہے؟"

"ٹھیک ہے بیٹا! یہ کون سی بات ہے۔ میں ابھی اسلام آباد کی انتظامیہ سے کنفرم کر لیتا ہوں۔ لیکن تم بھی نگینہ کے موبائل پر رابطہ تو کر کے دیکھو۔" وہ بولے۔

"وہ میں کر کے دیکھ چکا ہوں۔ کوئی جواب نہیں ملا تھا مجھے۔ اچھا انکل! ایک اور اہم بات۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں، میں سن رہا ہوں۔"

"سردار زور آور والے معاملے سے متعلق میں نے آپ کو ساری بات بتا دی۔ ممکن ہے وہ گرین لاج کا رخ کریں۔ کیونکہ میں نے انہیں.........."

"نادر! میں سب سمجھ چکا ہوں۔ اور سنبھال بھی لوں گا ساری سچویشن۔ تم اللہ کا نام لے کر بس نکلنے کی کرو۔" وہ میری بات کاٹ کر مہربان اور متفکر آواز میں بولے۔ میرا دل ان کی مہربانی پر بھر آیا۔

"اچھا انکل! میری کامیابی کی دعا کیجئے گا، خدا حافظ۔" آخر میں میری آواز رندھ گئی۔

میں نے ٹریولنگ ایجنسی کو فون کیا اور چترال کے لئے کسی فلائٹ میں جگہ طلب کی۔ خوش قسمتی سے مجھے ساڑھے چار کی فلائٹ میں جگہ مل گئی۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ چنانچہ میں نے منیجر مشتاق سے نقد رقم لی اور آندھی طوفان کی طرح راولپنڈی ایئر پورٹ روانہ ہو گیا۔

میرے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں پلک جھپکتے میں اسلام آباد تو کیا سیدھا وادی کیلاش جا پہنچوں۔ میری جلتی ہوئی چشم تصور نگینہ کو لمحہ بہ لمحہ جیسے مقتل گاہ کی جانب بڑھتے


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میری تشویش آمیز پریشانی اور بے چینی اب وحشت میں بدلنے لگی تھی۔ میری فلائٹ براستہ پشاور تھی جو اسلام آباد سے 172 کلومیٹر مغرب میں واقع تھا اور بہ مشکل آدھے گھنٹے کا فضائی سفر تھا۔ وہاں سے پچاس منٹ کی پرواز مجھے چترال پہنچا دیتی۔ اس کے بعد کسی فلائنگ کوچ یا ویگن کے ذریعے ڈھائی تین گھنٹوں میں کیلاش پہنچا جا سکتا تھا۔

فاصلہ تیزی سے سمٹنے کی امید پر دل و دماغ کو کچھ قرار ملا تھا۔ کیونکہ میں نے مجموعی طور پر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اگلے چند گھنٹوں کے اندر اندر کیلاش وادی میں قدم رکھ چکا ہوں گا جبکہ وہ تینوں کیلاشی نگینہ کو اگر اغواء بھی کر چکے تھے تو یہ واردات آج صبح دس یا گیارہ کے درمیان کی گئی ہو گی اور اب یہ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کب اور کون سے راستے سے اپنے تیسرے "مفرور" ساتھی سے ملنے کے بعد واپس کیلاش کا عزم ہوں گے۔

بہر طور میں تیز رفتاری اور نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اسلام آباد پہنچا اور سب سے پہلے ایئر پورٹ کے قریب ہی جیپ سے چھٹکارا پانے کے بعد میں نے ایک قریبی پی سی او سے انکل اعظم خان سے رابطہ کیا تو انہوں نے میرے خدشے کی تصدیق کر ڈالی کہ آج صبح ایئر پورٹ سے واپسی پر لگ بھگ گیارہ بجے نگینہ کو دو نامعلوم افراد نے ان کی ٹیکسی روک کر اغواء کر لیا تھا۔ شاہ میر کو وہ ٹیکسی ڈرائیور کے پاس ہی چھوڑ گئے تھے اور ٹیکسی ڈرائیور تھانے میں تھا۔ نیز انکل اعظم خان سے میں نے شاہ میر کو اپنے ساتھ لے جانے کی گزارش کی اور پھر رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں سیدھا پیدل ہی ایئر پورٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ٹھیک ساڑھے چار بجے جہاز نے پشاور کے لئے ٹیک آف کیا۔ نصف گھنٹے کی پرواز کے بعد میں پشاور ایئر پورٹ پر اترا اور ساڑھے پانچ بجے دوبارہ وہی فلائٹ چترال روانہ ہو گئی۔

چترال ایئر پورٹ پر پہنچنے میں طیارے نے پچاس منٹوں کی بجائے پورا ایک گھنٹہ لگایا تھا۔ یوں تقریباً سوا چھ بجے میں چترال ایئر پورٹ سے نکلا۔ اب مجھے کیلاش وادی جانے کے لئے کسی جیپ یا ویگن کا سفر کرنا تھا۔

اڈے پر پہنچا تو مسافر ویگن نہ ملی مگر ایک جیپ والے سے کرایہ طے کیا۔ اس نے پورے ہزار روپے لے کر کیلاش وادی کے علاقے "بمبریت" پہنچانے کا وعدہ کیا۔

نگینہ کے سامنے بھلا اس معمولی رقم کی کیا حیثیت تھی! میں اس میں سوار ہو کر تقریباً دو ڈھائی گھنٹوں بعد رات نو بجے "بمبریت" پہنچا۔ یہاں ایک ہوٹل میں، میں نے رہائش اختیار کی۔ یہ وہی ہوٹل تھا جہاں میں کیلاش وادی کی اپنی پہلی مہم کے دوران آ چکا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مجھے دوسری بار یہاں کا رخ کرنے میں کسی معمولی سی بھی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

یہ علاقہ پاکستان کے انتہائی شمال میں ہونے کی وجہ سے بہت سرد تھا اور میں جن حالات اور تیزی کے ساتھ یہاں تک پہنچا تھا، مجھے گرم کپڑوں کا خاص اہتمام کرنے کا موقع یا وقت تک نہ مل سکا تھا۔ تاہم حسب معمول میں نے پینٹ شرٹ اور لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔

منحوس عامل عاروب "رمبور" کے علاقے "کالاش آگرم" میں رہتا تھا اور وہیں نواح میں آبادی سے متصل علاقے میں اپنے پگوڈا نما عبادت خانے میں ہی رہتا تھا۔

ہوٹل پہنچ جانے کے بعد میں پیش آمدہ حالات پر غور کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اغواء کنندگان کیلاشیوں نے یہاں پہنچنے کے لئے ہوائی جہاز ہرگز استعمال نہیں کیا ہو گا۔ یہی صورت ٹرین یا پبلک ٹرانسپورٹ وغیرہ کی تھی۔ وہ یقیناً اپنی جیپ میں ہی کیلاش کے لئے روانہ ہوئے ہوں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



میں ان کے بائی روڈ سفر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسلام آباد سے پشاور بائی روڈ 172 کلومیٹر یعنی تقریباً تین سے چار گھنٹے، پھر پشاور سے چترال سات سے آٹھ گھنٹے، اس کے بعد وادی کیلاش، چترال شہر سے کوئی 40 کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ یعنی لگ بھگ انہیں اسلام آباد سے بارہ تیرہ گھنٹے کا سفر درکار تھا۔ جس میں دو تین گھنٹوں کا اضافہ بھی ہو سکتا تھا۔

اب اگر وہ نگینہ اور اپنے تیسرے ساتھی کے ساتھ ایک بجے اسلام آباد سے روانہ ہوئے تھے تو اب تک وہ نو دس گھنٹوں کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ جبکہ یہاں پہنچنے تک انہیں مزید پانچ سے چھ گھنٹے درکار تھے۔ گویا رات تین بجے کے بعد ان کی بمبریت آمد متوقع تھی۔

مجھے چونکہ ان پر اب چھ گھنٹے پہلے کی برتری حاصل ہو گئی تھی اس لئے میری کوشش تھی کہ میں انہیں اپنے قبیلے یا عامل عاروب تک پہنچنے سے قبل ہی چھاپ لوں۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ چترال سے کیلاش وادی میں داخلے کے تین راستے تھے۔ یعنی "رمبور"، "بمبریت" اور "بریر" خدا جانے وہ کون سے راستے کا انتخاب کرتے؟ تاہم کافی غور و فکر کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ جدھر عامل عاروب کا پورا قبیلہ آباد تھا، اس کا ایک ہی راستہ تھا یعنی "کیلاش آگرم" یہ ان کے علاقے سے آٹھ، نو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

تاہم یہاں معاملہ اب صرف نگینہ کو ان کے چنگل سے چھڑانے کا ہی نہ تھا بلکہ اس مردود عاروب کا قضیہ بھی ہمیشہ کے لئے نمٹانا تھا ورنہ ان خبیثوں کا خطرہ ہر وقت میرے اور نگینہ کے سر پر سوار رہتا۔ ان معاملات پر غور کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ کیلاش قبیلے کا ایک سردار "آگرموشی" عامل عاروب کے قبیلے کا دشمن تھا۔ اگر میں اس سے ملاقات کرتا تو ممکن ہے ہمارا مفاد "مشترکہ" ہونے کی وجہ سے میرا کام بھی آسان ہو سکتا تھا مگر اس سے پہلے یہ ضروری تھا کہ میں ان تینوں کا راستہ روک کر نگینہ کو عامل عاروب کے چنگل میں جانے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں۔

میری یہ تنہا کوشش ناکامی سے بھی دوچار ہو سکتی تھی۔ کیونکہ میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہ تھی اور میں کم از کم اس آخری اور نازک وقت میں اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟........ کیا اس وقت کیلاش قبیلے کے سردار آگرموشی سے ملنا چاہئے تھا؟........ میرے ذہن میں فوراً ہی ایک خیال ابھرا۔

میرے پاس ابھی پانچ چھ گھنٹے تھے۔ سردار آگرموشی کا قبیلہ بھی اس علاقے میں تھا۔ لیکن اس وقت رات کے نو دس بجے اور اس کاٹ دار سردی میں جبکہ ہر سمت گہری دھند اور پُرہول ٹھٹھرتے ہوئے سناٹے کا راج تھا، کسی "خچر سواری" کے ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

اچانک مجھے اس نوعمر چترالی گائیڈ داور خان کا خیال آیا، جو قریب ہی ایک جھونپڑی میں اپنے ماموں کے ساتھ رہتا تھا۔ داور خان وہی چترالی لڑکا تھا جس نے میری پہلی کیلاشی مہم میں خاصی مدد کی تھی اور وہ ایک ہوشیار اور سمجھدار لڑکا تھا اور غریب بھی۔ اپنے ماموں کے ساتھ وہ تنہا رہتا تھا۔ وہ سیاحوں کے لئے گائیڈ کا کام کرتا تھا۔ پہلی کیلاشی مہم میں بھی اس نے ہی میری رہنمائی کی۔ اس کے پاس ایک موٹا تازہ خچر بھی تھا۔ چنانچہ داور خان کا خیال آتے ہی میں اسی وقت ہوٹل سے نکلا اور پیدل ہی سنسان، ٹھٹھرتے ہوئے راستوں پر اس کی جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ داور خان اپنی اس جھونپڑی کو مڑھی کہتا تھا جو ہوٹل سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھی۔ یہ حصہ آبادی کے کچے پکے مکانوں سے ذرا ہٹ کر شمال مغرب میں تھا۔

دیہاتی علاقہ ہونے کے باعث ہر طرف اندھیرا اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ آوارہ کتے تک سردی کے مارے کہیں کونوں کھدروں میں دبک گئے تھے۔ ہر سو ہُو کا عالم تھا۔ میں اللہ کا نام لئے اپنی جیکٹ کی زپ گلے



تک لگائے، دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

داور خان کی "مڑھی" تک پہنچنے میں مجھے بمشکل پندرہ بیس منٹ لگے تھے۔ مڑھی کے آس پاس ویرانی کا راج تھا۔ ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مڑھی کے دروازے پر ٹاٹ جھول رہا تھا۔ دائیں جانب چھپر نما سائبان تلے دو خچر توبڑوں میں منہ دیئے کھڑے تھے۔ ایک خچر چھوٹی عمر کا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کا ٹاٹ ہٹایا۔ سنگل پٹ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی، کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دوسری بار اور ذرا تیز دستک دی تو اندر سے ہلکی کھٹر پٹر کی آواز ابھری۔ میں دل میں یہی دعائیں مانگنے لگا کہ آنے والا داور ہی ہو۔ کیونکہ پہچاننے کے بعد اس وقت وہی میری مدد کو تیار ہو سکتا تھا۔ دفعتاً اندر سے کھانسنے کی آواز کے ساتھ ہی بلغمی آواز ابھری۔ یہ آواز قدرے ضعیف اور عمر رسیدہ شخص کی محسوس ہوتی تھی۔ اجنبی زبان میں ہی شاید اندر سے کچھ پوچھا گیا تھا۔ داور خان کو اردو بھی ٹوٹی پھوٹی آتی تھی۔ یقیناً اس کے ماموں کو بھی ٹوٹی پھوٹی اردو آتی ہوگی۔ کیونکہ آخر کو بقول داور خان کے "راہبر" کا کام اس کے ماموں نے ہی اسے سکھایا تھا۔ اور ان لوگوں کو ٹوٹی پھوٹی ہی سہی، مختلف زبانیں بھی آتی ہوں گی۔ بہرطور میں نے ذرا کھنکار کر بلند آواز سے کہا۔

"میں مسافر ہوں........ رات گزارنا چاہتا ہوں۔ مناسب کرایہ دے دوں گا۔" میں نے دانستہ یہ کہا تھا۔ کیونکہ داور خان کی زبانی مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ اکیلے دکیلے مسافر کو رات گزارنے دیا کرتے تھے۔

دروازہ فوراً ہی کھلا۔ لالٹین تھامے ایک عمر رسیدہ شخص نمودار ہوا۔ اس نے موٹی سرمئی اور بوسیدہ چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔ اس نے لالٹین والا ہاتھ ذرا اونچا کیا اور میرے چہرے کو آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ مجھے یہ داور خان کا ماموں ہی لگا تھا۔ وہ بہ غور میرا جائزہ لینے کے بعد بولا۔

"اور کون ہے تمہارے ساتھ؟........ تمہارا سامان؟"

وہ خاصا محتاط معلوم ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کی آنکھوں سے مجھ اکیلے اور خالی ہاتھ مسافر کو دیکھ کر شک کی رمق ابھری تھی۔

"میں اکیلا ہی ہوں۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔ مگر اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اسے تذبذب میں پا کر میں مزید بولا۔ "تم شاید داور خان کے ماموں ہو۔ اس سے پہلے بھی میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں آ چکا ہوں۔ داور نے ہمیں یہاں کی سیر کروائی تھی۔ دراصل ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھے فوراً تنہا اور خالی ہاتھ نکلنا پڑا۔ کیونکہ اس بار میں سیر کرنے نہیں اپنے کچھ ساتھیوں کی تلاش میں آیا ہوں۔"

اس بار مختصراً وضاحت اور اپنے بھانجے کا ذکر سن کر اس نے مجھے اندر آنے کا کہا۔ میں اس کے عقب میں چلتا ہوا اندر تنگ و تاریک کوٹھڑی میں آ گیا۔ اندر دو جھلنگا سی چارپائیاں رکھی تھیں۔ ایک پر کوئی موٹا سا بوسیدہ کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ بابا نے لالٹین دیوار پر ابھری ہوئی کیل پر لٹکا دی۔ مجھے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ داور خان کے مقابلے میں اس کی اردو صاف تھی۔ میں خاموشی سے چارپائی پر پاؤں جھلائے بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کیا نام ہے تمہارا........؟"

"نادر۔" میں نے جواب دیا۔

"کہاں سے آئے ہو؟" وہ گھاگ اور تجربہ کار لگتا تھا۔

"لاہور سے۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"تمہارے کون سے ساتھی کھو گئے ہیں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



"میرا دوست اور اس کی بیوی۔ وہ دونوں دراصل ایک اخبار کے لئے کام کرتے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی اخبار میں کام کرتا ہوں۔ ان کی تلاش میں آیا ہوں۔"

"ہاں......... یہاں سیاحوں کے علاوہ اخبار والے بھی آتے ہیں۔" وہ سر ہلا کر بولا۔ میں نے شکر کیا کہ وہ میری باتوں سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔ میں نے یونہی لقمہ دیا۔

"بابا! تمہارا کیا خیال ہے، میری اس معاملے میں کون مدد کر سکتا ہے؟"

"پولیس میں رپورٹ درج کروائی تھی تم نے؟" اس نے غالباً کسی خیال کے تحت مجھ سے پوچھا۔

"ہاں۔ چترال کے ایک تھانے میں۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "لیکن وہ بھی ناکام ہو گئے ہیں۔ یا پھر انہوں نے کوئی خاص کوشش نہیں کی ہو گی۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ یہاں برف پوش وادیوں میں کسی کو تلاش کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔"

"ہاں بابا! اس لئے میں خود بھی آیا ہوں۔ میرا خیال ہے میری اس معاملے میں کوئی مقامی بااثر شخصیت ہی مدد کر سکتی ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے گینداس کی کورٹ میں پھینکی تو وہ کچھ سوچنے لگا۔ میں بھی اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سردار آگرموشی سے ملنے کا ہی مشورہ دے گا مگر اس کے برعکس وہ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولا۔

"تمہیں خود ہی کوشش کرنا پڑے گی۔ یہاں کے سردار کسی ایسے معاملے میں نہیں پڑتے۔ میرا خیال ہے میرا بھانجا داور خان تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ اگر تم کچھ دینے دلانے کی بات کرو تو۔"

اس نے گویا میرے دل کی بات کر ڈالی۔ وہ مجھے لالچی لگا تھا۔ ممکن ہے اس نے کسی سردار کے اس معاملے میں نہ پڑنے والی بات بھی اسی لئے کی ہو۔ بہر طور میں نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"درحقیقت میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے بھانجے داور خان کی قابلیت پر پورا بھروسہ ہے۔ کیا تمہارا بھانجا داور خان سو رہا ہے؟" میں نے آخر میں سامنے والی ایک دوسری چارپائی پر سوئے شخص کی طرف اشارہ کر کے پوچھا تو اس نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

میں نے اب اصل بات کی طرف آتے ہوئے اس سے کہا۔ "بابا! درحقیقت بات یہ ہے کہ میں اس معاملے کو خود بھی خفیہ رکھنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں......... کوئی خاص بات؟" اس نے قدرے چونک کر پوچھا تو میں نے دانستہ عامل عاروب کے قبیلے کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا۔ "میرے دونوں گمشدہ ساتھی درحقیقت یہاں کے کسی مخصوص قبیلے پر تفصیلی فیچر لکھنا چاہتے تھے جو کسی دابولا میزی نام کے دیوتا کے پجاری ہیں۔ سنا ہے کہ ان کا ایک روحانی پیشوا جس کا نام غالباً عاروب ہے، وہ بہت بڑا عامل ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ میرے دونوں ساتھیوں کی گمشدگی میں اسی قبیلے کا ہاتھ ہے۔" یہ کہہ کر میں اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری اس بات پر وہ بری طرح چونک کر میرا چہرہ تکنے لگا۔ میں نے دیکھا، اس کے ضعیف اور جھریوں بھرے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ وہ بغور اور مسلسل میرا چہرہ تکنے لگا کہ بالآخر میں نے پوچھا۔

"کیا ہوا بابا! کیا میری بات پر یقین نہیں آیا تم کو؟"

"نہیں......... ایسی بات تو نہیں۔" وہ جلدی سے میرے چہرے سے اپنی نظریں ہٹا کر بولا۔

"میں درحقیقت یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تمہارے ساتھی واقعی عامل عاروب کے قبیلے والوں کے ہتھے چڑھ چکے ہیں تو ان کا زندہ بچنا بہت مشکل ہے۔"



"یہ کیا کہہ رہے ہو بابا تم؟" میں نے دانستہ اپنے چہرے پر پریشانی سموتے ہوئے اس سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں اس مہم میں اپنے بھانجے داور خان کی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ ہاں، تم رات یہاں گزار سکتے ہو مگر صرف آج کی رات۔" اس کے متوقع جواب پر میں نے اصل بات کی ...ی آتے ہوئے کہا۔

"اچھا بابا! ......... مگر میں اکیلا ہی اس مہم کو سر کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن دراصل پہلے یہ بات کر ...ہتا ہوں کہ آیا میرے دونوں ساتھی انہی لوگوں کے قبیلے میں ہیں بھی یا نہیں؟ اگر وہ دونوں ان کی قید ... زندہ ہیں تو میں فوراً واپس چترال جا کر پولیس کو خبر دوں گا اور پھر ساری آگے کی کارروائی وہ لوگ کریں ... اور اس مہم کے لئے بہترین وقت یہی ہے۔ اگر تم اپنے بھانجے کو میرے ساتھ نہیں بھیجنا چاہتے تو مجھے اپنا ...ے دو۔ میں واپس لوٹ کر خرچ تمہارے حوالے کر دوں گا۔ تم بے شک اس کا جتنا چاہے معاوضہ مجھ سے ...۔"

...را خیال تھا وہ میری اس بات پر کچھ لیت و لعل سے کام لے گا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے حیرت ہوئی ... بلا تامل میری بات مان گیا۔ پھر چارپائی سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"اچھا......... سردی میں نکلو گے ......... میں تمہارے لئے قہوہ بنا کر لاتا ہوں۔ تم آرام سے بیٹھو۔"

...نع کرنے کے باوجود وہ قہوہ بنانے کے لئے کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔

اس کے یوں اچانک مان جانے اور پھر قہوہ کی دعوت دینے پر نہ جانے کیوں میرے دل و دماغ کو ...ک انجانی بے چینی نے جکڑ لیا۔ مگر پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک چھوٹی سی پیالی میں میرے لئے قہوہ بنا کر ...یا اور مجھے تھما دیا۔

"لو......... قہوہ پیو۔"

...نے قہوے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ قہوہ خوش ذائقہ اور خوشبودار ...یسے ہی میں نے قہوے کی پیالی ختم کی، اچانک مجھے اپنے وجود میں بے جانی کی سی کیفیات محسوس ...یں۔ میرے ہاتھ سے قہوے کی خالی پیالی بھی چھوٹ کر گر پڑی۔ پھر میں بھی چارپائی پر بے جان ہو ...ڑا۔ بڑی عجیب کیفیت ہو گئی تھی .......... میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ...اعت بھی پوری طرح بیدار تھی مگر میرا پورا جسم بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے اپنے بے ...جود کو ہلانے جلانے کی بھی کوشش کی مگر بے سود۔ میں تو اپنی ایک انگلی کو بھی جنبش دینے کا روادار نہ ...یرا اعصاب کا مالک ہونے کے باوجود میں سرتاپا لرز اٹھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر میرے ...چانک یہ ہوا کیا تھا؟ ......... میں نے اپنی آنکھوں کو گردش دی اور قریب بیٹھے میزبان کی طرف مدد ...ظروں سے دیکھا۔ مگر اس کے چہرے پر عجیب سی سرد مہری کھنڈی ہوئی تھی۔ پھر وہ چارپائی سے اٹھا ...ی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

...نے حلق کے بل منہ کھول کر چلانے، چیخنے کی کوشش بھی کی مگر آواز تک نہ نکل سکی۔ حتیٰ کہ منہ بھی اپنا ...ا سکا تھا میں۔ بڑی ہی عجیب و غریب اور پراسرار و پیچیدہ مصیبت تھی یہ۔ اور اس کا مقصد؟ ... دیکھنے اور سوچنے کے قابل تھا۔ میزبان بابا کی نیت پر مجھے شبہ ہونے لگا۔ اس کے سرد مہر رویے اور ... کے ساتھ کوٹھڑی سے باہر نکل جانے پر مجھے یقین ہونے لگا کہ اب تو یہ ساری کارستانی اسی ...ھے کی تھی۔ اس نے مجھے کوئی ایسی دوا قہوے میں گھول کر پلا دی تھی کہ جس نے میرا تمام وجود ...ر ڈالا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''مگر کیوں؟''

یہ سوالیہ نشان نشتر کی طرح میرے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پتہ نہیں میری تقدیر میں کیا لکھا تھا۔ میں جب بھی نگینہ کو مشکل حالات سے نکالنے کی تگ و دو کرتا۔ کسی نہ کسی نئی مصیبت میں گرفتار ہو جایا کرتا تھا۔ وقت ہر ایک لمحہ مجھے ٹائم بم کی ٹک ٹک کی طرح گزرتا محسوس ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خبیث بڈھا کچھ دیر بعد واپس لوٹے گا۔ مگر کافی دیر گزر گئی، وہ نہ لوٹا اب تو میری پریشانی فزوں تر ہونے لگی۔ ادھر مجھے نگینہ کی بھی تشویش کھائے جا رہی تھی۔ شاید ایک بار پھر میں تاخیر کی زد میں آ رہا تھا۔

میں اپنی گردن بھی ہلانے کا روادار نہ تھا۔ میں نے پھر حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کرنی چاہی تاکہ قریب کی چارپائی پر لیٹے ہوئے داور خان کو نیند سے بیدار کر دوں۔ جب میں نے خود کو ہر طرح سے بالکل بے بس پایا تو میں یہی دعائیں مانگنے لگا خدا سے کہ کاش داور خان خود ہی بیدار ہو جائے۔ وہ خبیث نہ جانے مجھے یوں مفلوج بنانے کے بعد کہاں دفعان ہو گیا تھا۔ اچانک پھر جیسے میری دعا قبول ہو گئی۔ میں نے کھانسنے کی آواز سنی۔ میں اپنی گردن تو نہیں موڑ سکتا تھا مگر محسوس کر سکتا تھا کہ یہ آواز داور خان کی چارپائی سے اُبھری تھی۔ میرا دل امید تلے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر میں نے چارپائی کے چرچرانے کی آواز سنی۔ میرا دل پھر یکبارگی دھڑکا۔ میرا چہرہ چھت کی طرف تھا۔ تاہم آنکھوں کے ڈیلے گھما کر میں نے قریب بچھی چارپائی کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تو میں نے کسی کو کمبل ہٹا کر چارپائی پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔

تب پھر دوسرے ہی لمحے میری نظروں کے سامنے داور خان کھڑا تھا جو مجھے یوں بے سدھ چارپائی پر اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکے جا رہا تھا۔ میری آنکھیں بھی اس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ میری آنکھوں میں التجا آمیز بے بسی کے سائے تھے۔ داور خان لالٹین کی مدھم روشنی میں شاید میرا چہرہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے شاید پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے فوراً آگے بڑھ کر دیوار سے لالٹین اُتار لی۔ اس کی لو بڑھا کر پھر لالٹین میرے چہرے کے ذرا قریب لاتے ہوئے خود بھی جھک کر بہ غور میرے چہرے کو تکنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ شناسائی کی چمک اُبھرتے دیکھی۔ تب بے اختیار اس کے لبوں سے برآمد ہوا۔

''ارے صیب! تم......... تم تو وہی والے صیب ہو۔'' وہ مجھے پہچان چکا تھا۔

''پھر......... تم بولتے کیوں نہیں ہو؟......... کیا ہوا ہے تمہیں؟'' وہ حیرانی سے بولا مگر میں اپنے ہونٹوں کو باوجود کوشش کے ایک ذرا سی جنبش بھی نہ دے سکا۔ تب اس نے خود ہی میرے بے سدھ وجود کو ہلایا جلایا اور میں پھر بھی کچھ نہ بول سکا تو وہ سیدھے کھڑے ہو کر اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ماموں کو چترالی زبان میں آوازیں دیں۔ وہ باہر بھی گیا۔ ذرا ہی دیر بعد لوٹا تو اچانک اس کی نظر شاید فرش پر گری ٹوٹی ہوئی قہوے کی پیالی پر پڑی۔ میری کھلی نظریں بدستور اس کے چہرے کا طواف کئے جا رہی تھیں کہ شاید اب یہ میرے لئے کچھ کرتا۔

وہ چند ثانیے ہاتھ میں اپنی لالٹین پکڑے پُرسوچ انداز میں کھڑا رہا۔ اس کے بعد خود کلامیہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ضرور ماما کی ہی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس نے تمہیں ہڑ کی بوٹی گھول کر پلا دی ہے۔ کیوں؟......... کیا وہ تمہیں کوئی چور یا راہزن سمجھتا تھا؟''

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اپنا حلق پھاڑ کر اس سے یہ استدعا کروں کہ خدا کے لئے مجھے اس



غریب فالج زدہ حالات سے نجات دلانے کی فوری طور پر کوئی تدبیر کرے۔ اس نے ابھی جس ''ہڑ'' کے نام والی بوٹی کا ذکر کیا تھا، یقیناً اس میں کوئی ایسی تاثیر تھی جس کے گھول کر پینے سے انسان کی حالت ہو جاتی تھی جیسی کہ میری ہوئی تھی۔

''صیب! تم فکر نہ کرو۔'' معاً داور خان نے مجھ سے ازراہِ تشفی کہا۔ وہ شاید میری آنکھوں کی التجا پڑھ چکا تھا۔ ''لگتا ہے، میرے ماما کو تمہاری طرف سے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر وہ کہاں غائب ہو گیا ہے؟ ویسے تمہاری یہ حالت مستقل نہیں رہے گی۔ میں کوشش کرتا ہوں۔'' بالآخر اس نے کہا تو بے اختیار میں نے سکون کی سانس لی۔ اس نے لالٹین آگے بڑھ کر دوبارہ دیوار میں نصب کیل پر لٹکائی اور پھر ایک چھوٹی سی کٹوری میں جانے کیا شے بھر لایا۔ اس میں کوئی روغن تھا جسے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر ملنے کے بعد میرے ہاتھوں پیروں پر رگڑنے لگا۔ ابھی اسے یہ سب کرتے ہوئے ذرا سی دیر ہوئی تھی کہ اچانک مڑھی کے باہر خچروں کے خرخرانے کے علاوہ چند لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں اُبھریں۔

میرا دل یکبارگی کسی نامعلوم اندیشے سے دھڑک اٹھا۔ میرے ہاتھوں پیروں پر ہلکی ہلکی سی روغنی مالش کرتے ہوئے داور خان بھی چونک پڑا اور پھر وہ میری چارپائی سے اٹھ کر جیسے ہی تیزی کے ساتھ باہر نکلنے لگا، اچانک کوٹھڑی میں اس کا خبیث بڈھا ماموں دو تین لحیم شحیم پہاڑی افراد کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ نہ جانے کیوں وہ تینوں مجھے شناسا سے محسوس ہوئے۔ اس خبیث نے اپنے بھانجے داور خان کو گھورا۔ اس دوران اس کے ہمراہ آنے والے تینوں پہاڑی سرخ و سپید افراد میری چارپائی کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور بہ غور میرے چہرے کو گھورنے لگے۔ اس دوران اس خبیث بڈھے نے اپنے بھانجے داور خان سے غصیلے لہجے میں مقامی زبان میں کچھ کہا۔ غالباً یہی پوچھ رہا ہو گا کہ یہ میرے ساتھ کیا کر رہا تھا۔

داور کی آنکھوں میں حیرت تھی اور وہ حیران پریشان تھا۔ اس نے اپنی زبان میں اپنے خبیث ماموں سے کچھ پوچھا بھی تھا لیکن اس کے ماموں نے اسے جھڑک کر خاموش کرا دیا۔ پھر ان تینوں سے میری طرف اشارہ کر کے کچھ پوچھا۔ ان تینوں لحیم شحیم سرخ و سپید پہاڑی افراد کی جلتی سلگتی نظریں بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ان کی آنکھوں سے نفرت و غیظ کی چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرے لئے ان کے تاثرات بالکل ایسے ہی تھے، جیسے کوئی بہت عرصے بعد اپنے جانی دشمن کو قریب سے دیکھ رہا ہو۔ ان تینوں کی جلتی اُبلتی کیفیات پر میرے اندر بھی ہولناک خدشات نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ اب تو میرے باقی ماندہ اوسان بھی خطا ہونے لگے تھے اس اندیشناک خیال سے کہ کہیں یہ تینوں اس خبیث عامل عاروب کے گماشتوں یا کارندوں میں سے تو نہیں تھے۔ یوں یہ خبیث بڈھا میزبان دھوکے سے مجھے اب ان کے حوالے کرنے والا تھا۔

تب پھر ان تینوں نے بیک وقت اثبات میں سر ہلایا اور پھر مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے خچر گاڑی تک لے گئے۔ لڑکا داور خان بھی ایک طرف حیران پریشان کھڑا تھا۔ یہ لوگ مجھے خچر گاڑی میں ڈال کر روانہ ہو گئے۔ یہ چھکڑا یعنی خچر گاڑی قدیم طرز کی تھی۔ ہالی وڈ کی فلموں میں برف باری کے دوران سانتا کلاز ایسی چھکڑا گاڑی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے تھے۔ میں بے حس و حرکت تقدیر کی اس کارفرمائی پر حیران و پریشان تھا۔ میری ساری تدبیریں دھری رہ گئی تھیں اور میں اپنی بدقسمتی یا عاروب کی خوش قسمتی کے باعث خود ہی اس کا شکار بن گیا تھا۔ دوسری طرف نگینہ تو اس کے کارندوں کے قبضے میں تھی ہی اور اب میں ایک فالج زدہ شخص کی طرح عاروب کی طرف کشاں کشاں لے جایا جا رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk





داور خان کو اگر کچھ وقت مزید مل جاتا تو وہ یقیناً میرے ہاتھ پیروں کی اس مخصوص روغن سے مالش کر کر درست حالت میں لا سکتا تھا۔ مگر عین وقت پر اس کا خبیث ماموں ان تینوں دشمنوں کے ساتھ آن ٹپکا تھا۔

چھکڑے کا سفر جاری تھا۔ میں پچھلے حصے میں بھیڑ بکری کی طرح پھینک دیا گیا تھا۔ عامل عاروب کا ایک ہرکارہ میرے ساتھ موجود تھا۔ دوسرا چھکڑا اچلا رہا تھا۔ تیسرا شاید چھت پر تھا۔

راستہ ناہموار تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ چھکڑے کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ میں چھکڑے کے چوبی تختے پر بے سدھ پڑا کسی بوری کی طرح اِدھر اُدھر لڑھک رہا تھا۔

اچانک میں نے پہلی بار اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں اور پیروں کے تلووں میں سنسناہٹ اُبھرتی محسوس کی۔ اب پتہ نہیں یہ روغن کی مالش کے تھوڑے بہت اثرات تھے یا پھر چھکڑے کے ہچکولوں کی اٹھاخ پٹاخ کہ جس نے میری سن پڑتی رگوں میں خون کی گردش تیز کر ڈالی تھی۔ یوں بھی مجھے یاد آیا کہ داور خان نے میری کیفیات دیکھتے ہی مجھے تسلی دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ میری یہ کیفیت عارضی ہو گی۔ میں نے فوراً اس اٹھاخ پٹاخ کے دوران اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت دینا شروع کر دی، جن میں جان پڑتی محسوس ہوئی تھی۔ چھکڑے میں ڈولتی ہوئی لالٹین کی یرقان زدہ روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر اس کے باوجود وہ ہرکارہ میری حرکات و سکنات پر غور کرنے سے قاصر تھا۔ کیونکہ میں ہچکوؤں سے ہلنے جلنے کے دوران اپنے ہاتھوں پیروں کو اس طرح ہلا رہا تھا کہ اسے شبہ نہ ہو کہ میں وارم اپ کر رہا تھا۔ تب پھر جس طرح اچانک میرے ہاتھوں پیروں کی طاقت زائل ہوئی تھی، وہ اب یکدم دوبارہ بحال ہوتی محسوس ہونے لگی۔ چند ہی لمحوں میں میرے وجود کی کھوئی ہوئی طاقت بحال ہو گئی۔ اس کے ساتھ جوش میرے روئیں روئیں میں بجلی بن کر دوڑنے لگا۔ میں موت بن کر اندر بیٹھے ہرکارے پر جھپٹا۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ رہا ہو گا کہ میں قضا کی طرح اس پر آ پڑوں گا۔ اس کی گردن میرے بازوؤں کے شکنجے میں آ گئی۔ اس وقت میری نس نس میں جنون کا جوالا مکھی اُبل رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اسے ایک لمحے کا بھی موقع دیئے بغیر اس کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا۔ ''کڑاک'' کی آواز سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس نے سمور کا لباس پہن رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اس کی تلاشی لی تو ایک عجیب وضع کی ''سنان'' برآمد ہوئی جس کی دھار دو دھاری اور تیز تھی۔

چھکڑا کمرہ نما تھا۔ عقبی حصہ کھلا ہوا تھا جہاں سے چاندنی میں نہایا ہوا برف زار علاقہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دور برف پوش چوٹیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں ''سنان'' ایک ہاتھ میں لئے مذکورہ کھلے حصے کے ایک بیرونی چوبی تختے پر اپنے دونوں پاؤں جمائے کھڑا ہوا اور چھت کی طرف جھانکا۔ مجھے دوسرا اگر گا بیٹھا ہوا نظر آیا۔ وہ بے خبر تھا۔ میں نے سر دست ان دونوں سے بھڑنے کا فیصلہ ترک کیا اور چھکڑے کے چوبی تختے سے برف زار راستے پر چھلانگ لگا دی۔

چھلانگ میں نے مخالف سمت کی بجائے چھکڑے کے رخ پر متوازی لگائی تھی اور ذرا دیر تک دوڑتا رہا تھا۔ ورنہ میں گر سکتا تھا۔ پھر میں رک گیا اور ہانپتا ہوا کھڑا ہو گیا اور چھکڑے کو دور تاریکی میں جاتا دیکھتا رہا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ چھکڑا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے اپنی سانسیں بحال کیں، پھر اپنی ریڈیم ڈائل والی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بجنے والا تھا۔ گویا تین چار گھنٹوں بعد عامل عاروب کے وہ تینوں ہرکارے نگینہ کو اپنی جیب میں لئے یہاں والے تھے۔ لیکن اب بات میرے حوالے سے بھی خاصی تشویش ناک ہو چکی تھی۔



اگر تو یہ چھکڑا سوار ہرکارے عامل عاروب کے ہی ساتھی تھے، جس کا امکان بہرحال بہت زیادہ تھا تو اب پوری وادی میں میری تلاش جاری ہو سکتی تھی۔ یعنی اب میری اس علاقے میں موجودگی راز نہیں تھی۔

اب مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟........ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا تھا کہ مجھے واپس پلٹ کر اس بڈھے میزبان کی خبر لینا چاہئے تھی جس نے مجھے دھوکے سے قہوے میں کوئی ہڑ نامی جڑی بوٹی پلا کر اپاہج کر دیا تھا اور بعد میں ان کے حوالے بھی کیا تھا۔ اس سے کم از کم یہ تو دریافت ہو سکتا تھا کہ آیا ان ہرکاروں کا کیا واقعی عامل عاروب سے ہی تعلق تھا؟ اور اگر تھا تو کیا وہ فریبی بڈھا ان کے ساتھ ملا ہوا ان کا پیروکار بن چکا تھا؟

ابھی میں اسی شش و پنج میں کھڑا تھا کہ اچانک جس طرف سے میرا چھکڑا آیا تھا، اس سمت ایک حرکت ابھی۔ میری پوری توجہ اس جانب مرکوز ہو گئی۔ اسی وقت ایک خوف ناک خیال میرے ذہن میں اُبھرا اور میں تیزی سے قریبی جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ یہ جھاڑیاں ایک برفیلی ڈھلان میں اُگی ہوئی تھیں۔ چند لمحوں بعد میں نے ذرا سر ابھار کر دیکھا تو وہ کوئی خچر سوار تھا۔ اس نے گرم موٹا بوری نما لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ذرا قریب آیا تو میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہ داور خان تھا۔ میں فوراً جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا۔ وہ بھی ٹھٹکا مگر پھر مجھے پہچاننے کے بعد فوراً خچر کی پیٹھ سے اتر کر میری جانب لپکا۔

''صیب!........ صیب! تم........ ٹھیک تو ہو نا؟''

میرا دل اس لڑکے کی محبت اور دوست نوازی پر بھر آیا۔ میں نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔

''تمہارے روغن نے میرے مفلوج جسم کی طاقت لوٹائی ہے۔'' میں نے تشکر آمیز لہجے میں اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا اور پھر اسے ساری بات بتا دی۔

''صیب!........ یہ تینوں، عامل عاروب کے ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔'' وہ پُرجوش لہجے میں بتانے لگا اور میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔ میری استفسار طلب نظریں اپنے چہرے پر مرکوز پاتے ہوئے اس نے مزید بتایا۔ ''میرا ماموں یوشے، ایک لالچی انسان ہے۔ تم نے یقیناً اپنے بارے میں اسے سب بتا دیا ہو گا۔''

''ہاں........ مگر کچھ زیادہ نہیں........ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ........''

''صیب! آپ کی جان کو یہاں سخت خطرہ ہے۔'' وہ اچانک میری بات کاٹ کر متوحش لہجے میں بولا۔ ''یہ انہی لوگوں کا علاقہ ہے۔ پہلے یہاں سے فوراً نکلنا ہو گا۔ آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے خچر پر سوار ہو گیا اور مجھے اپنے پیچھے سوار ہونے کا کہا۔

''یہ وزن سہار لے گا ہم دونوں کا؟''

''ہاں صیب! یہ بہت سخت جان ہے۔ آ جاؤ۔'' وہ مسکرا کر بولا اور میں اس کے پیچھے خچر کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ داور خان نے خچر کی لگام تھام کر اسے واپس موڑا اور درمیانی رفتار سے دوڑانے لگا۔

''کیا اب تم مجھے واپس مڑھی کی طرف لے جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''میں آپ کو وادی سے باہر کسی محفوظ مقام پر چھوڑ آتا ہوں۔''

''تم ایسا کرو۔'' میں نے اس کی بات سن کر کہا۔ ''میں نے یہاں سے قریب ہی ایک ہوٹل میں کمرہ لے رکھا ہے۔ تم اس طرف چلو۔''

''مگر صیب! آپ کی جان کو خطرہ ہے۔''

''تم چلو۔ وہاں مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس کے بعد ہم ہوٹل میں آ گئے۔ اس نے ہوٹل کے پچھواڑے اپنا خچر باندھا اور پھر میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ ''اب تم مجھے سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ماموں پوشے کا کیا معاملہ ہے؟ پھر میں تمہیں اپنے یہاں آنے کا مقصد بتاؤں گا۔''

میری بات پر اس نے مجھ سے جو سنسنی خیز انکشافات کئے ان کا لب لباب یہ تھا کہ میری سابقہ مہم جو اور اس کے نتیجے میں ہونے والی خونریزی اور میری فتح کے بعد پوری وادی میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ اس معرکے میں عامل عاروب کے زخمی ہونے سے اس کا حریف قبیلہ بہت خوش تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عاروب کسی کے مقابلے میں ہلکا پڑا تھا۔ اس سے پہلے خود آگرموشی سردار کے قبیلے کا دو مرتبہ عاروب اور اس کے پیروکاروں سے مقابلہ ہو چکا تھا اور دونوں مرتبہ بدقسمتی آگرموشی سردار کے ساتھ رہی۔ یہی سبب تھا کہ جب آگرموشی کو عاروب کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر عاروب کے قبیلے پر حملہ کیا۔ مگر حیرت ناک طور پر اس مرتبہ بھی عامل عاروب کے قبیلے نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور انہیں تیسری مرتبہ شکست دے دی تھی۔ تاہم اس فتح کے بدلے میں نہ صرف انہیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا بلکہ خود عاروب بھی مرتے مرتے بچا تھا۔ اس مقابلے کے بعد دونوں طرف سے خاموشی طاری تھی۔ مگر واقفانِ حال سمجھتے تھے کہ یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ معاملہ ایک طرف تھا، دوسری طرف میرے ہاتھوں عاروب کی ہزیمت ایسا واقعہ نہیں تھا جسے اس کے قبیلے والے خاموشی سے بھلا دیتے۔ ایک طرف عاروب نے نگینہ اور مجھے پکڑوانے کے لئے اپنے مہم جو راولپنڈی بھجوائے تھے تو دوسری طرف اس کے ایک خاص گرگے بوغا نے اپنے جاسوس اس علاقے میں پھیلا دیئے تھے جن کا کام باہر سے آئے لوگوں پر نظر رکھنا تھا اور ان میں سے جب کوئی عامل عاروب کے متعلق بات کرتا تو اس کی اطلاع بوغا کو فراہم کرتے تھے۔ داور خان کا ماموں بھی اس جاسوس گروپ کا اہم رکن تھا۔

داور خان کی زبانی یہ ساری تفصیل جان کر میں حیران رہ گیا تھا۔ پھر میں نے داور خان کو اپنی تازہ ترین مہم کے بارے میں آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ درحقیقت میں ہوٹل سے اس سے ملنے اس کی مڑھی آیا تھا کہ میرا سامنا اس کے خبیث لالچی ماموں پوشے سے ہو گیا۔

''صیب! اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کو میرے ساتھ ابھی چلنا پڑے گا۔ کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ تینوں نگینہ بی بی کو کس راستے سے لے کر اپنے قبیلے کی حدود میں داخل ہوں گے۔''

یہ سنتے ہی میں ساری کلفت بھول گیا اور بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم نے تو میرا مسئلہ حل کر دیا۔ یہ بتاؤ، کب چلنا ہے؟''

''فوراً چلو صیب! وہ تینوں حرام زادے نگینہ بی بی کو اگر ایک بار اپنے قبیلے میں لے گئے تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔'' وہ آخر میں خاصے تفکر سے بولا۔

''چلو پھر.........'' میں نے کہا۔ اس کے بعد ہم ایک بار پھر تاریکی میں خچر پر سوار ہو کر آگے بڑھ گئے۔ عاروب کے پیروکاروں سے چھینی ہوئی ''سنان'' میرے قبضے میں تھی۔

داور خان نے مجھے بتایا کہ وہ تینوں فرستادے نگینہ سمیت جس راستے سے اپنے قبیلے کی حدود میں داخل ہو سکتے تھے، وہ یہاں سے تقریباً پندرہ سولہ کلومیٹر دور ویران برف زاروں میں تھا۔

داور خان نے مجھے اپنے بارے میں بھی بتایا تھا کہ وہ ایک یتیم و بے سہارا لڑکا تھا۔ اس کا آبائی وطن چترال تھا۔ مگر ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کا لالچی اور خود غرض ماموں پوشے اسے یہاں لے آیا تھا۔ پوشے خود بھی گائیڈ کا کام کرتا تھا مگر داور خان کے آنے کے بعد اس نے سارا بوجھ اسی پر ڈال دیا تھا اور کاہلوں کی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رح چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ تاہم داور اس کے باوجود خوش تھا۔

ابھی ہم نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ہمیں دائیں جانب کے ڈھلوانی برفیلے ٹیلوں سے جگنوؤں کی رح بہت سی روشنیاں اُڑتی نظر آئیں۔

''دشمن.........!'' داور خان سرسراتے لہجے میں ان روشنیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ میں بھی ٹھٹک گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ''صیب! یہ ہمارے دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں راستہ بدلنا پڑے گا۔ وہ شاید ماموں پوشے سے ملنے آ رہے ہیں۔ تمہارے فرار کا انہیں پتہ چل گیا ہو گا۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے راستہ تبدیل کر لیا۔ داور خان بہت ہوشیار اور وادی کے چپے چپے سے واقف تھا۔ جلد ہی وہ متوقع ٹیلوں سے دور ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی روشنیاں بھی غائب ہو گئیں

''کتنی دور ہے اب ہمارا مطلوبہ راستہ؟'' ذرا دیر بعد میں نے اس سے دریافت کیا۔

''بس تھوڑی دور ہے صیب!'' وہ بولا۔ لیکن ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہمارے دائیں جانب سے روشنیوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ میں اور داور خان بری طرح ٹھٹکے۔ پھر یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ تقریباً پندرہ بیس افراد کا مشعل بردار ٹولا تھا جنہوں نے سیاہ لمبے چغے پہن رکھے تھے اور ہاتھوں میں مشعلیں، سنان اور رائفلیں تھام رکھی تھیں۔

آن کی آن میں ان سب نے ہمیں گھیر لیا.........ان میں ایک نسبتاً دراز قد اور کرخت چہرے والا شخص بھی تھا۔

''صیب! برے پھنسے......... یہ بوغا ہے۔ عامل عاروب کا کمانڈر۔'' داور خان نے لرزتی آواز میں اس دراز قامت اور کرخت چہرے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ انہوں نے بھی شاید مجھے پہچان لیا تھا۔ سنان اور رائفلوں کا رخ میری جانب کر دیا گیا۔ اس کے بعد دراز قامت اور کرخت چہرے والا بوغا مجھے خوفناک نظروں سے گھورتا ہوا میری جانب بڑھا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا تھا۔ اس نے منگولوں کے انداز میں ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری جو شاید اپنے دشمن کو پہچان لینے کی فتح مندی کا نعرہ ہی ہو سکتا تھا۔ مگر اس بدبخت نے نہ صرف دل دہلا دینے والا یہ الفاظ دیگر فتح کے نشے سے چور نعرہ بلند کیا تھا بلکہ خونخوار اور وحشیانہ غراہٹ بھی حلق سے خارج کرتے ہوئے میرے چہرے پر مُکا جڑ دیا تھا۔

بوغا کا ہاتھ انسانی ہاتھ نہیں تھا، کسی روبوٹ کا ہاتھ تھا۔ اس کے ایک ہی زوردار مکے نے مجھے برف چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے چمک رہے تھے۔ میرے زمین پر گرتے ہی ٹولے کے چار تنومند افراد مجھ پر جھپٹے اور مجھے بے بس کر کے میری مشکیں کر دیں۔

میرا خیال تھا وہ داور کے ساتھ بھی کوئی ''مناسب'' سلوک کریں گے۔ مگر مقامِ شکر تھا کہ انہوں نے اس سے محض درشت لہجے میں کچھ گفتگو کر کے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں، بوغا اور اس کے گرگوں کی حراست میں کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

❄❄❄

عامل عاروب کے پیروکاروں کا یہ ٹولا گھوڑوں اور گھنے بالوں والے خچروں پر سوار اپنے قبیلے کی طرف بڑھا جا رہا تھا اور میرے دل و دماغ میں طوفان سے اٹھ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ اس بار میں حالات کے ہاتھوں پھنسا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس بار نگینہ کے معاملے میں میرے ستارے گردش میں تھے۔ میں ہر بار کسی نئی مصیبت کا شکار ہوا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی کچوکے لگا رہا تھا کہ نگینہ اس وقت خود بھی

مصائب کا شکار تھی اور تنہا ان برے لمحات میں وہ مجھے یاد کر رہی ہو گی۔ مگر میں اس کی مدد کے قابل نہ تھا۔ میں تو خود اسے یہ خوش خبری سنانا چاہتا تھا کہ میری ماں نے اس کے باپ شاہ میر کو معاف کر دیا تھا۔ میں اسے فون پر ہی یہ خوش خبری اس کے امریکہ میں قیام کے دوران ہی سنا ڈالتا۔ میں نے کیوں یہ سوچا کہ میں خود اس سے مل کر اسے یہ عظیم خوش خبری سناؤں گا جس کی وہ تمنائی تھی۔ میں نے کیوں اسے اچانک سرپرائز دینے کے چکر میں دیر کر دی تھی۔ کاش!......... کاش!......... مگر اب میرے پاس سوائے پچھتاوے کے اور کیا تھا؟ ان سارے خیالات اور پریشان کن سوچوں نے مجھے بالکل ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔

ادھر ان سفاک اور بے رحم کیلاشیوں کا سفر جاری تھا۔ سرد رات شاید اپنے آخری پہر میں تھی اور میں بے دست و پا ان خونی بھیڑیوں کے چنگل میں پھنسا اپنی قسمت کی ستم ظریفیوں سے اُلجھ رہا تھا۔

اندیشوں اور وسوسوں بھرا یہ سفر نصف گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ اپنے قبیلے میں داخل ہونے کے بعد ان کے دیگر مشعل بردار افراد بھی ان سے آن ملے تھے اور عجیب و غریب آوازوں کے ساتھ نعرے بلند کر رہے تھے۔ اپنے روحانی پیشوا پر قاتلانہ حملے کرنے والے کی گرفتاری پر وہ اپنے طور پر بیک وقت خوشی اور غم کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی تو جیسے دیرینہ مراد پوری ہو گئی تھی۔ اس کے بعد مجھے خچر سے اتار کر نہایت بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے اس کی مخروطی چھت والی پگوڈا نما عمارت سے اندر لایا گیا جہاں ان کے دیوتا دابولا میزی کی بدہیئت مورتی اور قربان گاہ تھی۔ اس میں وہ سنگلاخ قید خانہ بھی تھا جہاں میں پہلے بھی قیدی رہ چکا تھا۔

مجھے یہاں تک مکے، ٹھوکریں اور لاتیں مارتے، گھسیٹتے ہوئے لایا گیا تھا۔ ساتھ ہی بوغا اپنی زبان میں ایک ہاتھ بلند کر کے اونچی آواز میں کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ اس کے انداز و لہجے سے خوشی کا اظہار ہوتا تھا۔ میں ان کی زبان نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اگرچہ عامل عاروب سمیت اس کے چند قریبی ساتھیوں کو ٹوٹی پھوٹی اردو آتی تھی لیکن بوغا شاید اس سے بالکل ہی کورا دکھائی دیتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ عامل عاروب نے بھلا ایسے اجڈ کو کیوں کمانڈر بنا رکھا تھا؟ شاید اس کی وجہ بوغا کا غیر معمولی خونخوار جثہ، وحشیانہ انداز و اطوار، جنگجوانہ مہارت رہی ہو گی۔

اس وقت بوغا ہی مجھے نہایت بے دردی کے ساتھ خچر سے اتار کر جیکٹ کے کالر سے پکڑے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا۔ اندر ہال کمرے کے وسط میں لا کر مجھے پٹخ دیا گیا۔ پھر تین اطراف یہ سب لوگ ہاتھوں میں مشعلیں، سنان اور رائفلیں تانے کھڑے ہو کر وحشیانہ انداز میں اپنے حلق سے عجیب و غریب چیخیں خارج کرنے لگے۔ چوتھی سمت چبوترا تھا اور چبوترے کے وسط پر ان کے دیوتا دابولا میزی کا بدہیئت بت رکھا ہوا تھا۔ اس کے بالکل ساتھ ایک اونچی اور چوڑی پشت گاہ والی تخت نما عجیب وضع کی کرسی پر عامل عاروب بڑا چغہ پہنے بڑے طنطنے کے ساتھ براجمان تھا۔

اس نے دائیں ہاتھ میں بنل کے پیڑو کی ہڈی تھامی ہوئی تھی مگر درحقیقت یہ اس کی سنان تھی۔ عامل عاروب کی چندی چندی آنکھوں سے مقناطیسیت پھوٹ رہی تھی۔ ان میں میرے لئے نفرت کی چنگاریاں بھی مترشح تھیں۔

مجھے یوں لگا جیسے میں افریقہ کے کسی دور دراز جزیرے کے وحشی قبائل کے نرغے میں پھنس گیا ہوں۔ عامل عاروب جیسے ہی کھڑا ہوا، یکدم شور تھم گیا۔ مخروطی چھت والی عبادت گاہ میں ایکا ایکی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ کا اشارہ کیا تھا۔ یکدم دو افراد نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ پاؤں کھول دیئے اور مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ عامل عاروب چبوترے کے مختصر قد مچے سے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اتر کر میرے قریب پہنچا اور بہ غور اپنی چھوٹی چھوٹی مقناطیسی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ گویا قریب سے دیکھ کر یہ تصدیق کرنا چاہ رہا ہو کہ میں اس کا وہی دشمن ہی تھا جو کچھ عرصہ پہلے یہاں بے جگری سے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے نہ صرف نگینہ کو ان کے چنگل سے چھڑا لے گیا تھا بلکہ اس مردود عاروب کو بھی شدید زخمی کر ڈالا تھا۔

"ہوں.........تو تم وہی ہو۔" معاً ہال میں عامل عاروب کی سنسناتی آواز اُبھری۔ پھر دوسرے ہی لمحے شدید غیظ و غضب کے عالم میں اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہڈی نما سنان کی انی سے میرے چہرے پر چرکا لگا دیا۔ مجھے اپنے گال کی کھال چیرتی ہوئی محسوس ہوئی اور اذیت کی شدت سے بے اختیار میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہو گئی۔ میرے گال سے خون کی پتلی دھار بہہ نکلی تھی۔ اس کے بعد نہ جانے عامل عاروب کے دل میں کیا سمائی کہ وہ فوراً ہی الٹے قدموں واپس ہوا پھر چبوترے کے مختصر قد مچے الٹے پیروں ہی طے کرتا ہوا واپس چبوترے پر جا کھڑا ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حکم صادر کرتا، اچانک باہر شور سا سنائی دیا۔ سب لوگ چونک پڑے اور میں بھی غیر ارادی طور پر چونک کر ہال کے بڑے سے بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اپنے زخمی گال پر رکھا ہوا تھا۔ ہال میں تین افراد داخل ہوئے۔ انہوں نے الم نصیب نگینہ کو دبوچ رکھا تھا۔

میں ان تینوں کیلاشیوں کو پہچان گیا۔ ان میں تیسرا وہی ہرکارہ تھا جو کمش پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے سردار زور آور خان کی بیٹی شہزادی کو زخمی اور بیٹے شہ زور کو بے دردی سے قتل کرنے کے بعد ان کی جیپ میں فرار ہو کر اپنے انہی دونوں ساتھیوں سے جا ملا تھا۔

نگینہ کو دیکھتے ہی میرے پورے تن بدن میں آتش فشاں سا دہکنے لگا۔ نگینہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اور پھر جیسے ہی وہ تینوں اسے قریب لائے تو مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکے۔ جیسے انہیں دہری خوشی کی توقع نہ تھی۔ دونوں شکار ان کے قبضے میں تھے۔ نگینہ نے جیسے ہی نڈھال نگاہوں کے ساتھ مجھے بھی ان کے قبضے میں دیکھا تو ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے مجھے دیکھ کر اس کے اندر جانے کدھر سے قوت اُمڈ آئی کہ وہ دامن چھڑا کر چیختی ہوئی میری طرف دوڑی۔

"نادر.........!"

لیکن راہ میں ہی مردود بوغا نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ نگینہ اس کی آہنی گرفت میں کسی بے بس کمزور چڑیا کی طرح تڑپنے لگی۔

میری سلگتی ہوئی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارتا خون پارے کی مانند تڑپ رہا تھا۔ مجھے بھی کچھ ہوش نہ رہا اور میں نے وحشت جنوں خیز انداز میں زخمی شیر جیسی دھاڑ ماری اور دوڑ کر بوغا پر جھپٹا۔ پھر اس کے چہرے پر زوردار مکا جڑ دیا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا۔ ڈیل ڈول میں ہم دونوں کا انیس بیس کا ہی فرق تھا۔ بوغا کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور پھر ان میں نفرت و غیظ کے الاؤ دہکنے لگے۔ اس وقت دیگر ہرکاروں نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ میری جانب جارحانہ پیش قدمی کی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے بوغا نے خوں ناک غراہٹ آمیز آواز کے ساتھ انہیں بڑھنے سے روک دیا۔ پھر بہ آواز بلند چیخ کر کچھ کہا اور ساتھ ہی نگینہ کو ایک جانب دھکیل کر دو ہاتھ فضا میں بلند کر کے کوئی مخصوص اشارہ کیا۔ اس وقت اس کے دیگر ہرکارے تین اطراف سے ہمارے گرد گھیرا ڈال کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔

اب درمیان میں صرف میں اور بوغا آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو غضب ناک نظروں سے گھورنے لگے۔ بوغا نے ایک نظر عامل عاروب پر ڈالی اور مؤدبانہ آواز میں اس سے کچھ کہا تو عامل عاروب

کے پتلے پتلے مکروہ ہونٹوں پر بدہیئت مسکراہٹ اُبھری۔ پھر وہ اپنی تخت نما کرسی پر براجمان ہو گیا اور دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پل کے پل میں جان چکا تھا کہ اب میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟.........میری قسمت کا فیصلہ حتمی طور پر بوغا کے سپرد کر دیا گیا تھا اور بوغا نے بھی غالباً میری اس جرأت کا مجھے مزہ چکھانے کی خاطر عامل عاروب سے یہ اجازت طلب کی تھی۔

ہال میں اب کسی وقت بھی رن پڑنے والا تھا۔

اس وقت بوغا نے غضب ناک چنگھاڑ ماری اور کسی وحشی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں پہلے ہی اس کی متوقع جارحانہ پیش قدمی کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ جیسے ہی وہ غضب ناک درندے کی مانند مجھ پر جھپٹا، میں نے اپنے گال کے زخم کو بھلا کر فوراً ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھکائی دی تو اس کا پیٹ میرے دائیں کاندھے کی زد میں آ گیا اور میں نے اپنے پورے لمبے چوڑے وجود کی طاقت صرف کرتے ہوئے بوغا کو اسی کاندھے پر اٹھا کر ہال کے پختہ فرش پر دے مارا۔

ہال میں غضب کا شور گونجا۔ بوغا کی کمر یقیناً درد سے دہری ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھی چیخ چیخ کر اس کی ہمت افزائی کرنے لگے۔ تاہم بوغا نے دوبارہ اٹھ کر کھڑے ہونے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ ان کا کمانڈر تھا۔ ابتداء میں ہی میرا گھونسا کھانے اور دوسری بار میرے ہاتھوں پٹخے جانے پر اس کا چہرہ احساسِ ذلت سے مسخ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں انتقام اور غیظ کی وحشیانہ چمک اُبھری۔ پھر دوبارہ وہ غراہٹ آمیز چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر جھپٹا۔ اس بار میں نے اسے ڈاج دینے کی غرض سے بظاہر دوبارہ وہی داؤ کھیلا۔ بوغا یکدم رک کر مجھے چھاپنے کے لئے جھکا تو میں نے ایک زوردار لات اس کے چہرے پر رسید کر دی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ بوغا جیسے حریف کو صرف پچھاڑنے کے لئے نہیں بلکہ اسے نابود کرنے کے لئے میری ہر ضرب زوردار اور کاری ہو۔ کیونکہ میں اس اکا دکی ہونے والے اپنے اور بوغا کے درمیان مقابلے کا مقصد جان چکا تھا۔

یہ بالکل ایسا ہی مقابلہ تھا جسے ''پٹ فائٹنگ'' (PIT FIGHTING) کہا جاتا تھا جو امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا اور نیو میکسیکو سٹی کے انڈر ورلڈ کے درمیان خفیہ تہہ خانوں میں دو حریفوں کے درمیان لڑی جاتی تھی اور اس کا فیصلہ دوسرے حریف کی صرف موت پر ہی ہوتا تھا۔ یہ غیر قانونی مقابلہ ہوتا تھا۔

یہاں بھی مجھے کچھ ایسا ہی لگتا تھا۔

بوغا نے عامل عاروب سے شاید اسی بات کی اجازت طلب کی تھی کہ وہ ایک طرف اپنی بے عزتی کا بدلہ اتارنا چاہتا تھا تو دوسری جانب دشمن کو بھی موت کی نیند سلانا چاہتا تھا۔

اور نادر علی خان بھلا ایسے مقابلوں سے کہاں پیچھے ہٹنے والا تھا۔ یہ تو میری سرشت میں تھا کہ اپنے حریف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے پنجہ آزمائی کا لطف ہی کچھ اور تھا۔

تیسری بار میرے ہاتھوں پٹخے کے بعد بوغا کی ساری مہارت دھری کی دھری رہ گئی اور وہ اس قدر مشتعل ہو گیا کہ ہوش وحواس کا دامن چھوڑ بیٹھا اور یہی میں چاہتا تھا۔ وہ غراتا، دھاڑتا ہوا میری جانب لپکا اور اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجے میری جانب بڑھا دیئے۔ یہ ایک چیلنج تھا پنجہ آزمائی کا۔ یعنی میں اِدھر اُدھر ہوئے بغیر اس کے پنجوں میں اپنے ہاتھوں کے پنجے پھنسا دوں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو بزدل تصور کیا جاتا اور میں نے اس کی یہ دعوت قبول کر لی میں نے پنجے سے پنجہ ملا دیا۔

بوغا کے ہونٹوں پر پیشگی فاتحانہ مسکراہٹ اُبھری اور آنکھوں کی خونخوار اور وحشیانہ چمک میں بھی اضافہ ہو


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گویا اپنے تئیں اس نے مجھے اپنی طاقت کے جال میں پھنسا دیا۔ اسے شاید اپنی جسمانی طاقت کا کچھ زیادہ ہی غرور تھا۔

اب ہماری نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ طاقت آزمائی شروع ہو چکی تھی۔

ہم دونوں پوری قوت صرف کر کے ایک دوسرے کے ہاتھ، پنجوں سمیت مروڑنے کی کوشش کر رہے تھے اس زور آزمائی کے دوران کبھی وہ مجھے اپنے زور پر چند قدم پیچھے دھکیل رہا تھا، کبھی میں اسے دھکیلتا ہوا پیچھے لے جا رہا تھا۔ پھر جب دونوں کی دال نہ گل سکی تو بوغا نے ایک روایتی سا داؤ آزمایا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مجھے لئے چند قدم پسپائی اختیار کرتے ہوئے یکدم رک کر بہ سرعت اچھلا اور پھر اپنے دونوں پیر میرے سینے پر جما دیئے۔ پھر مجھے زور سے عقب میں اچھال دیا۔ میں پشت کے بل اس کے ہرکاروں کے قدموں میں جا گرا۔ وہ خوشی سے شور مچاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ ادھر بوغا مجھے ذرا بھی سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر جھپٹا اور میری کمر پر سوار ہو گیا اور ریسلروں کے سے انداز میں دونوں ٹانگیں پشت کی سمت موڑ کر بل دیئے۔ اس پر اپنے بھاری بھرکم وجود کا دباؤ ڈالنے لگا۔ اس داؤ میں میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کا خدشہ تھا۔ تکلیف کے باعث پہلی بار میرے حلق سے تیز چیخ خارج ہوئی اور دشمن کی تکلیف دہ چیخ سن کر ہال میں موجود اس کے پیروکاروں نے خوشی سے نعرے بلند کر کے اپنے کمانڈر کی حوصلہ افزائی کی۔

ان چیخوں اور نعروں کے بیچ مجھے نگینہ کی دکھ بھری آہ بھی سنائی دی۔ میری جان پر نہیں بلکہ نگینہ مصیبت میں تھی اور میری زندگی خدا کے بعد نگینہ کی ہی امانت تھی۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو یقیناً نگینہ بھی زندہ نہ رہتی۔ یوں میں نے اپنے مضروب اور ریختہ وجود کی طاقت کو اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں فرش پر جما کر اپنا بالائی جسم بوغا کے بھاری بھرکم وجود سمیت اوپر اٹھانے لگا۔ اس جاں گسل اور پُر زور قوت سے مجھے دانتوں تلے پسینہ آ گیا اور میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ میں خاطر خواہ طریقے سے اپنے بالائی وجود کو ایک حد تک اوپر اٹھا چکا ہوں تو میں نے بازوؤں کے زور پر ہی زوردار پلٹی کھائی مگر بوغا نے میرا داؤ فوراً بھانپ لیا اور پھرتی کے ساتھ میری ٹانگیں پکڑ کر الف کھڑا ہو گیا۔ اب میں سر کے بل فرش پر جھول رہا تھا۔ بس یہی موقع تھا جب بوغا دوسرا مہلک داؤ مجھ پر آزمانے کی جسارت ہی کر سکا۔ کیونکہ میں نے سر کے بل جھولتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کے پیروں کی پنڈلیوں پر لائے اور مضبوطی سے پکڑ کر انہیں زوردار جھٹکا دیا۔ نتیجتاً بوغا کے قدم زمین سے اکھڑ گئے اور مجھ سمیت پشت کے بل ''دھپ'' کی زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گرا۔ ہال میں سب کو سانپ سونگھ گیا۔ اب بازی کسی حد تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اچھل کر اپنی ٹانگوں کے دونوں گھٹنے اس کے پیٹ پر رسید کر دیئے۔ اس کے حلق سے اذیت ناک اور کریہہ چیخ خارج ہوئی۔ میں تڑپ کر اس سے علیحدہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت مجمع سے کسی نے سنان بوغا کی طرف اچھال دی۔ بوغا نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اسی وقت مجھے یاد آ گیا کہ اس کے ایک ساتھی سے چھینی ہوئی سنان میری جیکٹ کے اندر قمیض کے نیچے بھی محفوظ تھی۔ میں نے فوراً گریبان میں ہاتھ ڈال کر پھرتی سے وہ سنان نکال لی۔ گویا اب مقابلہ پھر برابر کا تھا۔

ہم دونوں کے ہاتھوں میں سنانیں تھیں۔ سنانیں سنبھالے ہم دونوں ایک دوسرے کو خونی نظروں سے گھورتے ہوئے دائرے کی صورت میں گھوم رہے تھے۔ ہم دونوں ہی مدمقابل کی طرف سے پہل کے خواہشمند تھے یا پھر موقع ملتے ہی سنان پیوست کرنے کے متمنی۔ جب میری طرف سے کوئی جارحانہ پیش قدمی نہ ہوئی تو بالآخر بوغا نے ہی جارحانہ طور پر قدم بڑھایا۔ مگر مجھ پر اپنی سنان کا وار کرنے کی بجائے یکدم وہ فرش پر جھک کر لڑھکنی لگائی اور جب تک میں اس کی یہ مکارانہ داؤ سمجھتا، اس کی ایک ٹانگ فرش پر ''سوئپ''

کے انداز میں لہرائی اور میری ٹانگوں سے ٹکرائی اور میں اچھل کر پشت کے بل فرش پر گرا تو لامحالہ میرے ہاتھ سے سنان چھوٹ کر دور جا گری۔ پس یہی وہ موقع تھا جب عیار اور سفاک لڑاکا بوغا نے اپنی سنان اچھال کر میرے پیٹ میں گھونپنی چاہی مگر میں نے بھی گرتے ہی بروقت لوٹ لگا دی۔ بوغا خالی جگہ پر گرا اور میں نے زوردار لات اس کے چہرے پر رسید کر دی اور وہ چیخ مار کر الٹ پڑا۔ مگر سنان اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی تھی۔ میں نے اپنی سنان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا مگر وہ غائب تھی یا پھر ''غائب'' کر دی گئی تھی۔ ادھر بوغا وحشیانہ چنگھاڑ کے ساتھ دوبارہ مجھ پر جھپٹا۔ میری نظریں چونکہ فرش پر گری اپنی سنان کی طرف متوجہ تھیں اس لئے میں مار کھا گیا۔ بوغا نے اپنی سنان سے مجھ پر وار کر دیا۔ میں نے اپنے تئیں خود کو دہری سنان کے مہیب وار سے بچانے کی کوشش کرنی چاہی مگر وہ میرے دائیں بازو میں پیوست ہو گئی...... اذیت کی روح تک اترنے والی ناقابل بیان لہر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ اسی وقت عاروب کے چیلوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیا۔ مگر مجھے نگینہ کی پُر درد آواز اس شور پر بھاری لگی۔

''نادر......'' اُس نے دکھ بھرے لہجے میں بے اختیار پکارا تھا۔

بوغا نے سنان میرے بازو سے کھینچی اور اس بار میرے سینے میں اتارنے کی کوشش کی مگر میں اپنے زخمی بازو کی تکلیف بھلا کر یکدم ایک طرف ہٹا اور کوشش یہی کی کہ بوغا سے زیادہ دور نہ ہو سکوں۔ چنانچہ جیسے ہی بوغا کا سنان والے ہاتھ کا وار خالی گیا تو میں نے کراٹے کے انداز کا ایک زبردست وار اس کی کلائی پر کیا۔ سنان اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ بوغا جان چکا تھا کہ وہ خالی ہاتھ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اس لئے مجھ سے بھڑنے کی بجائے وہ فوراً فرش پر گری ہوئی اپنی سنان اٹھانے کو لپکا۔ مگر میں نے بھی اس کے ساتھ ہی سنان اچکنے کے لئے جست لگائی۔ ہم دونوں ہی کے ہاتھ سنان پر پڑے۔ مگر بدقسمتی سے میری گرفت میں سنان کا دودھاری پھل آیا تھا اور بوغا کے ہاتھ کی گرفت میں سنان کا دستہ۔ اس نے جیسے ہی دستے کو پکڑ کر سنان میرے ہاتھ کی گرفت سے کھینچی تو میری ہتھیلی کٹ گئی۔ بائیں بازو کی تکلیف ابھی تازہ تھی کہ سنان کے دودھاری چرکے نے مجھے نڈھال کر دیا۔ میرے منہ سے کرب ناک سسکاری خارج ہو گئی۔ سنان قابو میں آتے ہی بوغا نے پھرتی سے میرے پہلو پر وار کیا مگر میں نے پلٹ کر خود کو نہ صرف اس وار سے بچا لیا بلکہ اس کی پشت پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔ بوغا کئی قدم لڑکھڑاتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب جا پڑا۔ وہاں سے اس کے خونی ہرکاروں کا مجمع چھٹ کر دائیں بائیں ہو گیا۔ میں نے وہیں سے جست لگائی۔ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بوغا پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا بیرونی دروازے پر جا پڑا۔ اس کے حلق سے بھیانک اور کریہہ چیخ خارج ہوئی۔ گرنے کے باعث نہ جانے کس طرح اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سنان اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے پتہ ہی نہ چلا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ مگر جب بوغا نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے تو حقیقت کا ادراک ہوا۔ ٹھیک اسی وقت ہال میں کئی چیخیں گونج اُٹھیں۔ عاروب کے چیلوں کو اپنے کمانڈر کی اذیت ناک شکست اور موت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سب میری جانب لپکے۔ ایکا ایکی میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال اُبھرا۔

سرِ دست میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے۔

چنانچہ میں نے زخمی ہونے کے باوجود اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی اور چھلاوے کی طرح باہر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ ہرکارے چیختے دھاڑتے ہوئے میرے تعاقب میں ہو لئے تھے۔ مگر میں نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ باہر کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً عبادت گاہ کی دیوار سے چپک گیا تھا اور بیرونی


Courtesy www.pdfbooksfree.pk


دروازے کے باہر کو کھلے ایک دیوہیکل چوبی پٹ کے عقب میں جا چھپا تھا۔ وہ سارے وحشیانہ یلغار اور چیخوں کے ساتھ میری تلاش میں کافی دور وادی کی طرف لشکر کی صورت میں دوڑ گئے۔ اچانک مجھے عبادت گاہ کے اس چور دروازے کا خیال آیا جو درحقیقت بالائی منزل کے زینے میں کھلتا تھا۔ مگر اس کا ایک اور چھوٹا دروازہ اندر ہال کے چبوترے کی طرف بھی کھلتا تھا۔ کیونکہ پہلے والی مہم کے دوران میں نے اس راستے سے ہال عاروب پر شب خون مارا تھا۔ قدرت نے ایک بار پھر مجھے یہ سنہری موقع فراہم کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کے تقریباً سارے ہرکارے میری تلاش میں وہاں سے جا چکے تھے۔ مگر وہ جلدی واپس لوٹ سکتے تھے۔ وقت کم تھا اور مجھے فوراً منصوبے کے آخری مرحلے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ چنانچہ میں نے بہ احتیاط عبادت گاہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ تیزی کے ساتھ کھسکنا شروع کر دیا۔ پھر میدان صاف پاتے ہی میں مذکورہ دروازے کے قریب آ گیا۔ دروازے کو میں نے کھولنا چاہا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ میں دروازے کی متوازی جھری سے اندر جھانکنے کے لئے ابھی جھکا ہی تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں جیسے ہی پلٹا تو دو ہرکاروں کو وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ خود پر جھپٹنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ میں یکدم ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ دونوں دروازے سے ٹکرائے۔ میرا بایاں بازو اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہلے ہی بری طرح زخمی تھی مگر میں نے ان سے بھڑ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دونوں دروازے سے ٹکرا کر میری طرف پلٹے تو اچانک دم بخود تاریکی اور ٹھٹکی فضا میں گولی چلنے کے دو دھماکے ہوئے اور میں نے ان دونوں ہرکاروں کو کریہہ چیخوں کے ساتھ زمین بوس ہوتے دیکھا۔

میں نے بری طرح چونک کر فائر کی آواز کی سمت دیکھا تو مجھے چند قدموں کے فاصلے پر کوئی کھڑا نظر آیا۔ وہ دوڑ کر جیسے ہی میرے قریب آیا تو میں بری طرح چونک گیا۔ وہ میرا دوست، داور خان تھا۔

''صیب!......تم ٹھیک تو ہونا؟'' وہ ہانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے بولا۔ میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک عبادت گاہ کی دوسری دیوار کی سمت مشعل بردار ہراروں کا جلوس سا آتا دکھائی دیا۔

''صیب!......جلدی نکل چلو......آؤ'' داور خان مجھ سے بولا اور اب میرے پاس یہاں سے نکلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

میں اور داور خان تھوڑی دور دوڑتے ہوئے اس کے خچر کے قریب پہنچے، اس کے بعد اس نے اپنے خچر کو ایڑ لگائی۔ عقل مندی کا یہی تقاضا تھا کہ سردست وہاں سے میں نکل جاتا۔ مگر میں نگینہ کو عامل عاروب کے چنگل سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

داور خان مجھے برفیلی ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں لئے اپنے خچر پر سوار کئے بہت دور لے آیا۔

''صیب!......تم بہت زخمی ہو۔'' وہ بولا۔ ''مگر تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں سیدھا سردار آگرموشی کے پاس لے جا رہا ہوں۔''

''لیکن دوست! میری ایک ساتھی ان لوگوں کے قبضے میں ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔

''سردار آگرموشی تمہاری ضرور مدد کرے گا۔ جب اسے یہ پتہ چلے گا کہ تم نے ایک بار پھر عامل عاروب سے جنگ کی ہے تو وہ تمہاری بہت عزت اور قدر کے علاوہ تمہاری مدد بھی کرے گا۔ تم ایک بار میرے ساتھ اس کے پاس چل کر دیکھو۔''

میرے پاس اس کا مشورہ ماننے کے سوا اور کیا چارہ تھا۔ ناچار میں نے چپ سادھ لی۔

خاصی دیر بعد ہم سردار آگرموشی کے قبیلے کی حدود میں داخل ہوئے تو یکدم چند خچر سوار مسلح افراد نے ہمیں روک لیا۔ داور خان نے شاید انہیں پہچان لیا تھا۔ ادھر میرے بازو سے خون بہنے اور جاں گسل حالات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



نے میرے اعصاب شل کر دیئے تھے اور میرا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میرا سر چکرانے لگا اور مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

❋❋❋

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو آرام دہ مسہری پر پڑے پایا۔ میرے زخمی بازو اور ہتھیلی پر مرہم پٹی کی ہوئی تھی۔ تکلیف میں اب کافی حد تک کمی آ گئی تھی۔ میں نے حیران پریشان نظروں سے لیتے لیتے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہ تھا مگر اس کی چھت قدرے بلند اور ڈھلوان تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے صیب؟'' اچانک داور خان کی آواز پر میں چونکا۔ آواز کی سمت دیکھا جہاں ایک کرسی پر وہ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اٹھا تھا اور اب میرے قریب مسہری پر آ ٹکا تھا۔

''اب بہتر ہوں۔'' میں نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ''مگر.....''

''یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے صیب!'' وہ یکدم دوستانہ مسکراہٹ سے بولا۔

''مگر دوست! میری ساتھی نگینہ کی جان تو خطرے میں ہے۔'' میں نے تشویش آمیز تفکر سے کہا۔

''میں نے سردار آگر موشی سے مل کر انہیں ساری بات بتا دی۔ تم بے فکر رہو۔''

''کیا یہ جگہ.....''

''ہاں صیب! ہم سردار آگر موشی کے گھر میں ہی ہیں۔'' وہ بولا۔

''میں اب یہاں سے جانا چاہوں گا۔'' میں فکرمند ہو کر مسہری سے اٹھنے لگا تو اچانک ایک بھاری بھرکم، عمر رسیدہ مگر چاق و چوبند شخص زرق برق لباس میں اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ دو اور مسلح افراد بھی تھے۔ وہ ایک طرف مؤدبانہ انداز میں کھڑے ہو گئے جبکہ داور خان بھی احتراماً اپنے ہاتھ باندھے ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ میں اٹھ کر مسہری پر بیٹھ گیا تھا۔

''کیسے ہو نوجوان!'' آنے والی بارعب شخصیت نے ملائمت بھرے لہجے اور شستہ اردو میں مجھ سے پوچھا۔ میں نے اس کی بارعب شخصیت سے اندازہ لگایا تھا کہ یہی سردار آگر موشی تھا۔

''میں ٹھیک ہوں..... آپ.....؟'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بولا۔

''ہم سردار آگر موشی ہیں اور تم جیسے بہادر نوجوانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم ایک بار پھر اس ذلیل عاروب کو شکست دے کر زندہ سلامت لوٹ آئے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا اے بہادر، جری نوجوان؟''

''نادر علی خان۔'' میں نے ہولے سے اپنا نام بتایا۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

''پنڈی میں رہتا ہوں۔ مری کے ایک گاؤں میں۔''

''خوب!..... یہ لڑکا بتا رہا تھا کہ تمہاری کوئی نگینہ نام کی ساتھی لڑکی اس مردود عامل عاروب کی قید میں ہے؟'' اس نے قریب خاموش کھڑے داور کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا تو میں نے جلدی سے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے ساری بات بتا دی۔ جب اسے عامل عاروب کے کمانڈر بوغا کی میرے ساتھ دو بدو خون ریز جنگ اور پھر میرے ہاتھوں اس کی عبرت ناک شکست اور ہلاکت کا علم ہوا تو میں نے دیکھا، سردار آگر موشی کے چہرے پر پہلے حیرت اور ناقابل یقین تاثرات اُبھرے، پھر اس کے بعد دیدنی حد تک خوشی سے بھرپور لہجے میں گویا یقین طلب لہجے میں بولا۔



''کک..... کیا تم نے..... عاروب کے سالار..... بوغا کو موت کے گھاٹ اتار دیا؟''

اس کے لہجے میں ابھی تک بے یقینی کے تاثرات تھے۔

''ہاں..... مگر.....'' میں نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ مگر پھر فکرمندانہ لہجے میں دوبارہ اس سے بولا۔ ''لیکن..... میری ساتھی نگینہ کی زندگی اس وقت شدید خطرے میں ہے۔ عامل عاروب اسے اپنے کسی دیوتا دابولا میزی کی بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے۔ مم..... مجھے اسی وقت جانا ہو گا۔'' میں نگینہ کی طرف سے پھر بے چین ہونے لگا تو سردار آگر موشی نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔

''بہادر نوجوان! تم اب اس کی بالکل فکر نہ کرو۔ سالار بوغا کے مرنے کے بعد عامل عاروب کی طاقت بری طرح اس علاقے میں نصف ہو چکی ہے۔ ہم اس وقت عامل عاروب پر فوج کشی کرنے والے ہیں۔ مگر تم نگینہ کی طرف سے بے فکر رہو۔ کیونکہ یہ قربانی اس وقت نہیں بلکہ ان کے ایک خاص تہوار کے موقع پر عمل میں لائی جائے گی اور اس تہوار میں ابھی نو دن باقی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے ساتھی کو عاروب سے چھڑانے کے لئے یہ عرصہ بہت ہے۔''

سردار آگر موشی کی بات میں مجھے وزن محسوس ہوا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی نگینہ کو وہ مردود عاروب اپنے دیوتا دابولا میزی کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا تو بدقسمتی سے اس روز ہی ان کے خاص تہوار کا دن تھا۔ اسی کے باعث میں فوری طور پر حرکت میں آیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مجھے سردار آگر موشی کی بات پر کسی حد تک تسلی تو ہوئی تھی کہ نگینہ کی جان کو فوری طور پر خطرہ نہ تھا مگر اس دوران وہ ذہنی طور پر شدید پریشانی کا شکار ہو گی۔ اور میں جانتا تھا کہ اسے زیادہ پریشانی اپنے باپ شاہ میر کی طرف سے بھی لاحق ہو گی۔ کاش میں اسے بتا سکتا کہ اس کے باپ شاہ میر کو انکل اعظم خان کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔

''معزز سردار! مجھے آپ کی بات سے کچھ تسلی تو ہوئی ہے اور ساتھ ہی میں آپ کی مدد کا شکر گزار بھی ہوں۔ لیکن میری ساتھی بہت کمزور دل کی ہے۔ وہ ان خونی اور سفاک لوگوں کے نرغے میں جس ذہنی اذیت اور پریشانی کا شکار ہو گی اس کا صرف میں ہی تصور کر سکتا ہوں۔ اگر ہم اس سلسلے میں فوری قدم اٹھائیں تو کیا یہ بہتر نہ ہو گا؟'' ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے آگر موشی سردار سے کہا۔

''ہاں، مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے بہادر نوجوان!'' سردار آگر موشی نے کہا۔ ''میں اپنے سپاہیوں کو عاروب کے قبیلے پر آخری اور فیصلہ کن حملے کے لئے آج ہی تیار کر رہا ہوں اور.....''

''معزز سردار! معذرت چاہوں گا۔'' میں نے دھیرے سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میرا خیال ہے اس وقت میری ساتھی نگینہ کی جان خطرے میں ہے۔ ممکن ہے وہ جنگ کے نتیجے میں وقت سے پہلے ہی اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ جنگ سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اپنی ساتھی نگینہ کو عامل عاروب کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کروں۔''

سردار آگر موشی ایک سمجھ دار انسان تھا۔ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ چند ثانیے پُرسوچ خاموشی میں مستغرق رہنے کے بعد بولا۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے..... تمہیں میرے جتنے بھی آدمی چاہئیں، وہ تم لے جا سکتے ہو۔ مگر تم تو خود زخمی ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں معزز سردار!'' میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''یہ چھوٹے موٹے زخم مجھے آتے رہتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اپنے اس مشن کو میں تنہا اور خفیہ طریقے سے ہی پورا کر سکتا ہوں۔ آدمیوں کے ساتھ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔''

میری بات پر سردار آگرموشی حیرت بھری نظروں سے مجھے تکنے لگا، پھر اسی لہجے میں بولا۔
''تم تنہا......... یہ مہم سر کر سکتے ہو؟......... مگر کیسے؟''
''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں معزز سردار! کیونکہ میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ نہ صرف میں اپنی ساتھی نگینہ کو اس مردود عامل عاروب سے چھڑاؤں گا بلکہ اس خبیث کا پتا بھی ہمیشہ کے لئے صاف کر دوں گا۔ کیونکہ بعد میں بھی وہ پہلے کی طرح ہمارے سروں پر لٹکتی ہوئی تلوار بنا رہے گا۔ اس کے خاتمے کے بعد آپ اس کے قبیلے پر لشکر کشی کر سکتے ہیں۔''
میری بات پر سردار آگرموشی نے اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔
''مجھے تھوڑا اسلحہ درکار ہے......... صرف ایک پستول اور فاضل راؤنڈز۔'' میں نے آخر میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔
''وہ تمہیں مل جائے گا۔ ابھی تم آرام کرو۔ صبح ہونے والی ہے۔ میں کچھ کھانے کے لئے بھجواتا ہوں۔''
سردار آگرموشی یہ کہہ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی چپ سادھ لی۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔
سردار آگرموشی اور اس کے دونوں مصاحب خاص کے جانے کے بعد داور خان مجھ سے بولا۔
''صیب! میں بھی اب چلوں گا۔ خدا آپ کی مدد فرمائے۔''
''ستو!'' میں نے کہا۔
''جی صیب؟'' وہ دھیرے سے بولا۔
''تم اپنے ماموں پوشے کو کیا جواب دو گے؟ وہ تو تمہارا بھی دشمن بن گیا ہوگا۔'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا تو اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔
''ارے صیب! وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا......... میں اسے چھوڑ کر چترال واپس چلے جانے کی دھمکی دوں گا تو وہ تیر کی طرح سیدھا ہو جائے گا۔''
''اچھا، ایک بات تو بتاؤ۔'' میں نے کہا۔
''جی صیب!'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔
''کیا تم اپنے ماموں پوشے کے ساتھ یہاں خوش ہو؟''
''اور کیا کروں صیب!'' وہ عجیب سے دکھ سے بولا۔ ''میں چاہوں تو مجھے چترال میں اس سے زیادہ اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ مگر صیب! دل نہیں مانتا کہ اپنے بوڑھے ماموں کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ کچھ بھی کہا، وہ میری ماں کا بھائی ہے۔ میں اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا صیب! ماموں پوشے کی صورت میں مجھے اپنی ماں کا چہرہ نظر آتا ہے۔'' ماں کو یاد کرتے ہی اس کی آواز رندھنے لگی تو وہ جلدی سے کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔
''اچھا صیب!......... اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ میں اب چلتا ہوں۔ آتا رہوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں خاموش نظروں سے خالی دروازے کو گھورتا رہا۔ اس کے بعد خالی بستر پر لیٹ گیا۔ مگر نیند مجھے نہیں آئی۔
نگینہ کی طرف سے میرا دل سخت بے چین اور پریشانی کا شکار تھا۔ میں یونہی بے چین ہو کر اُٹھا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں نے وقت کا اندازہ کرنے کی خاطر کھڑکی ذرا وا کر کے باہر دیکھا۔ سرد اور کاٹ دار برفیلی ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ ممکن ہے صبح طلوع ہو چکی ہو لیکن آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا ہونے کے باعث ہنوز اندھیرے کا سا سماں تھا۔ میں نے کھڑکی بند کی، پھر اپنے زخموں کا جائزہ لیا۔ مرہم پٹی ہونے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب کافی آرام تھا۔
مسہری پر آ کر دراز ہو گیا۔ یونہی پُرسوچ انداز میں اپنی آنکھیں موند لیں۔ ابھی ذرا ہی دیر گزری مجھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں بظاہر سوتا بنا ہوا تھا تاہم میرا چہرہ دروازے کی طرف تھا۔ یونہی دل میں جانے کیا خیال آیا کہ میں آنکھیں کھولے بغیر سوتا بنا رہا۔ مگر ایک آنکھ کی جھری سے میں ے کی طرف دیکھتا رہا۔ دروازے کا ایک پٹ دھیرے دھیرے وا ہو رہا تھا۔ اس بات نے مجھے پر مجبور کیا تھا۔
میں نے ایک تنومند مگر گینڈے جیسی جسامت کے ٹھگنے قد و قامت والے شخص کو اندر داخل ہوتے میں اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ میں تیز دھار والی دبی ہوئی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ میں اب بھی سوتا بنا پڑا رہا اور اس مشکوک اجنبی شخص پر اپنی ادھ کھلی نگاہ جمائے رکھی۔ اس کے ارادے صاف جھلک رہا تھا کہ وہ مجھے قتل کرنے کی نیت سے آیا تھا یا بھیجا گیا تھا۔ مگر کیوں؟......... میں جب ں ''کیوں'' کے بارے میں سوچتا، وہ قرولی بدست نقاب پوش قاتل میری مسہری کے بالکل نزدیک یا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے جیسے ہی اپنا قرولی والا ہاتھ فضا میں لند کیا اور ابھی میرے سینے لرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک زوردار لات کے پیٹ پر رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑا گیا مگر سنبھلنے میں اس نے ذرا بھی دیر نہ لگائی تھی۔ میں نے مسہری سے کی کوشش کرنی چاہی مگر اس نے پھر مجھ پر وار کر ڈالا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی دبوچ لی بت کے پتے کی شکل کی نگینے جیسی سرخ انگشتری پر یونہی میری نگاہ پڑ گئی۔ وہ بھی بلا کی طاقت رکھتا تھا۔ نے میرے زخمی بازو پر زوردار ٹھوکر رسید کر ڈالی۔ میرے حلق سے چیخ سی نکل گئی اور میں مسہری پر جا میرا خیال تھا یہ ڈھاٹا پوش قاتل مجھ پر دوبارہ حملہ کرے گا مگر وہ نہایت پھرتی کے ساتھ دروازے سے نکل گیا اور اتنی ہی تیزی کے ساتھ باہر سے دروازے کو کنڈی بھی چڑھا دی۔
میں ہونٹ بھینچ کر اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر ایک ہاتھ سے دروازہ پیٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد متعدد دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس بدبخت ڈھاٹا پوش کی ٹھوکر سے میرے بازو کا زخم بھی کھل تھا۔ سفید پٹی خون بہنے سے سرخ ہونے لگی تھی۔
باہر سے دروازے کی کنڈی کھولی گئی اور چار پانچ مسلح افراد اندر داخل ہو گئے۔ میں نے انہیں ساری بتا دی۔ وہ چاروں الٹے پیروں دوڑ گئے۔ ذرا دیر بعد ایک مسلح شخص ایک عمر رسیدہ آدمی کو لے کر آ یہ کوئی وید تھا۔ اس کے ہاتھ میں چوبی باکس تھا۔ اس نے مجھے لیٹ جانے کو کہا اور پھر میرے بازو پٹی کھول کر نئے سرے سے دوبارہ باندھ دی۔ وہ مسلح شخص چلا گیا۔ وید نے مجھے ایک پیالی میں دوائی کو کہا۔ نارنجی رنگ کے محلول والی وہ دوائی خوش ذائقہ تھی جسے پیتے ہی مجھے بدن میں توانائی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔
وید ایک باریش شخص تھا۔ اس نے ایک نظر دروازے پر ڈالی، پھر رازدارانہ لہجے میں مجھ سے بولا۔
''تم نے حملہ آور کی صورت دیکھی تھی؟''
''نہیں......... اس نے چہرے پر ڈھاٹا چڑھا رکھا تھا۔'' میں نے جواباً کہا۔ وہ کچھ سوچتا بن گیا۔
''کون ہو سکتا ہے یہ؟'' میں نے اسے سوچتا پا کر پوچھ لیا۔ وہ بولا۔
''راس کے سوا یہ حرکت کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس نے ہی تمہیں قتل کرنے کے لئے اپنے کسی آدمی کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



بھیجا ہوگا۔“

”رامس؟.........یہ کون ہے؟“ میں نے الجھے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”رامس، سردار آگرموشی کا چھوٹا بھائی ہے۔“

”اوہ.........“ حیرت کے باعث میرے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔ پھر پوچھا۔ ”مگر رامس یہ حرکت کیوں کرنا چاہتا تھا؟ اس کی بھلا مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔“

اس سے پہلے کہ وید کوئی جواب دیتا، اچانک کمرے میں سردار آگرموشی اپنے دو مسلح ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر پریشانی اور تشویش کے آثار تھے۔ شاید اسے مجھ پر ہو والے قاتلانہ حملے کے متعلق آگاہ کر دیا گیا تھا۔ باریش وید فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم خیریت سے تو ہو نا؟“ اس نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

”ہاں.........ٹھیک ہوں۔ عین وقت پر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو میرا بازو زخمی کر گیا تھا۔ اب دوبارہ مرہم پٹی کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم نے اس کی صورت دیکھی تھی؟“

”نہیں.........اس نے چہرے پر ڈھاٹا چڑھا رکھا تھا میں نے اس سے مقابلہ بھی کیا تھا مگر وہ مجھے دے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ باہر سے دروازے کو بھی کنڈی چڑھا دی۔“

”ہوں۔“ سردار آگرموشی نے ایک گمبھیر اور پُرسوچ ہنکاری بھری۔ پھر مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”فکر نہ کرو.........میرے آدمی اس نامعلوم حملہ آور کو تلاش کر رہے ہیں۔ اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ میں تمہارے کمرے کے باہر دو پہرے دار بھی تعینات کر دیئے ہیں۔“

”کیا پوچھ سکتا ہوں معزز سردار! یہ حرکت کس کی ہوسکتی ہے؟“ میں نے سردار آگرموشی کے چہرے نظریں گڑتے ہوئے پوچھا تو وہ تھوڑا متذبذب سا دکھائی دینے لگا۔ پھر گومگو سا جواب دیتے ہوئے بولا۔

”فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا.........خیر، جلد پتہ چل جائے گا۔“ اس کے بعد اس نے قریب خاموش کھڑے بوڑھے وید سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہو کر اپنی زبان میں کچھ پوچھا شاید میرے زخم کے بارے میں پوچھا تھا۔ وید نے میرے زخم کی طرف دیکھ کر اسے مختصراً کوئی جواب دیا تھا۔ اس کے بعد دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے چلا گیا۔ اس کے بعد جب وید بھی وہاں سے جانے لگا میں نے آواز دے کر اسے روکا۔ وہ رکا اور میری جانب مڑا۔

”تم مجھے رامس کے بارے میں بتانا چاہ رہے تھے؟“ میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ میرے ذرا قریب آ کر انتہائی رازداری سے بولا۔ ”ابھی اس کا نام بھی مت لینا.........بس محتاط رہو اور میرا مشورہ مانو، یہاں سے چلے جاؤ۔“

”لیکن مجھے.........“ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ تیز تیز قدموں سے میری بات سنی ان سنی کر کے کمرے سے نکل گیا۔ میں عجیب کشمکش و پیچ کا شکار ہو گیا۔

مجھے اب دوہری بے چینی نے آن گھیرا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سارا کیا چکر تھا۔ سردار آگرموشی کے چھوٹے بھائی رامس کو بھلا مجھ سے کیا دشمنی ہوسکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میرے لئے ایک آدمی کھانے کی بڑی سی سینی اٹھائے اندر داخل ہوا اور نہایت ادب کے ساتھ میرے سامنے مسہری پر رکھ دی۔

”مجرم کا کچھ پتہ چلا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ وہ میرا منہ تکنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ ا



ری زبان نہیں آتی تھی۔ ناچار مجھے بھی چپ ہو جانا پڑا۔ وہ چلا گیا۔ میں نے ٹرے پر سے کپڑا ہٹایا۔ مرغ کی بھنی ہوئی ران، بڑے بڑے تین چار نان کے علاوہ ایک آب خورے میں نیلے رنگ کا مشروب تھا۔ میں نے نہ جانے کب سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ میری بھوک چمک اٹھی۔ کھانے کے بعد میں نے نیلے رنگ کا مشروب پیا تو جسم میں توانائی کی لہریں دوڑتی محسوس ہوئیں۔

کھانے کے بعد میری سوچوں کا دفتر ایک بار پھر کھل گیا تھا۔ ان سوچوں میں نگینہ کا خیال سب سے ایاں اور بھاری تھا۔

ذرا دیر بعد ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سرخ رنگ کا مخصوص لباس پہنا ہوا ۔ پشت پر رائفل جھول رہی تھی۔ پہلو میں نیام کے اندر سنان کا منقش دستہ بھی جھلک رہا تھا۔ اس نے ٹوٹی ٹی اردو میں مجھ سے کہا۔

”میرے ساتھ آئیں۔“

میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ کمرے سے نکلا تو دائیں بائیں دو مسلح پہرے داروں کو چوکس کھڑے پایا۔ وہ ص مجھے لئے ایک مختصر سی راہداری کے بعد ایک نسبتاً بڑے کمرے میں لے آیا۔ یہاں کسی دربار کا سا حول تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دائیں بائیں عجیب وضع کی کرسیاں اور صوفے بچھے ہوئے تھے۔ ان سرے پر سامنے دو اونچی اور چوڑی پشت گاہ والی کرسیوں میں سے ایک پر سردار آگرموشی خود براجمان تھا بائیں جانب ایک سرخ و سپید اور خاصی فربہی مائل عورت زرق برق لباس میں بڑے طمطراق کے ساتھ اجمان تھی۔ اس کے بال اخروٹی رنگ کے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور گال پھولے ہوئے تھے۔ وہ موٹے ے کی ہونے کے باوجود خاصی پُرکشش تھی۔ سردار آگرموشی کے دائیں جانب ایک صوفے نما چوڑی سی ست پر ایک چالیس سالہ تنومند شخص بھی براجمان تھا۔ بائیں جانب یعنی سردار کی بیوی کی قطار والی ستوں پر یقیناً قبیلے کے دیگر امراء بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کئی مسلح سنان بردار محافظ دائیں بائیں مستعد کھڑے تھے۔

سردار آگرموشی نے مجھے ایک قریبی نشست کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا۔

میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے سردار آگرموشی نے وہاں موجود سب سے اپنی زبان میں میرا رف کروایا۔ پھر مجھ سے اُردو میں ان سب کا تعارف کرواتے ہوئے آخر میں اپنے بائیں جانب بیٹھے اس یس سالہ کرخت رو چہرے والے سے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”یہ میرا چھوٹا بھائی رامس ہے۔“

میں اس شخص کے نام پر ذرا چونکا۔ اچانک ہی مجھے وید کی بات یاد آ گئی۔ میں بغور اس کا چہرہ تکنے لگا۔ کب سے میرے چہرے پر اپنی تیز اور چبھتی ہوئی نظریں مرکوز کئے ہوئے تھا۔ پھر میرے ساتھ آئے شخص کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”یہ ہماری فوج کا سالار موشد ہے۔“

موشد نام کا وہ شخص بھی ایک نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ سب کی نظریں اس وقت میرے چہرے پر جمی ہوئی ۔ ذرا دیر بعد آگرموشی نے ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔

”نوجوان! ہم سب نے ہی متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ عامل عاروب کے قبیلے پر لشکر کشی کرنے پہلے تمہیں اپنی ساتھی نگینہ کو عامل عاروب کے چنگل سے چھڑانے کا پورا پورا موقع دیا جائے۔ حالانکہ یہ ہمارے جنگی اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ ہماری اس سے پرانی عداوت چل رہی ہے۔ ہم کسی وقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



بھی اس پر جنگ مسلط کرنے کا غیر مشروط حق رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم نے عامل عاروب کے کمانڈر کو دوبدو لڑائی میں موت کے گھاٹ اتارا ہے اس لئے اب تم بھی ہمارے ساتھ براہِ راست اس جنگ میں شامل ہو چکے ہو۔ پھر تم نے عامل عاروب کو بھی ٹھکانے لگانے کا تہیہ کر رکھا ہے، اس لئے........"

وہ ذرا رکا۔ پھر کہنا شروع ہوا۔ "ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں تنہا اس خطرناک مہم پر بھیجنے کی بجائے تمہارے ہمراہ اپنے چھوٹے بھائی رامس کو بھی روانہ کریں گے۔"

میں سردار آگرموشی کی اس آخری بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ تاہم جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو میں نے کہا۔

"معزز سردار! کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ مجھے اس مہم پر تنہا ہی جانے کی اجازت دے دی جاتی۔"

میری بات پر سردار آگرموشی کی بجائے اسکا چھوٹا بھائی رامس مجھ سے مخاطب ہو کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔

"سردار کا یہی حکم ہے اور قبیلے کے دیگر معززین کا بھی۔ تمہیں کیوں اعتراض ہے؟"

میں نے محسوس کیا اس کا لہجہ جھٹکے دار تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں معزز سردار کی حکم عدولی کی بات نہیں کر رہا ہوں........ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ........"

"اب کچھ سوچنے یا سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں۔" رامس نے چبھتے ہوئے لہجے میں میری بات کاٹ ڈالی۔ "معزز سردار نے تمہاری بھلائی کے لئے ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ تمہارا تنہا اس مہم میں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ تم زخمی بھی ہو اور تمہاری جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

اس کی بات پر مجھے مجبوراً خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ تاہم مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس میں بھی خود اس کی مرضی کا دخل ہو گا۔ وہ میرے ساتھ دانستہ اس مہم میں جانا چاہتا تھا۔ حالانکہ سرار آگرموشی کے پاس آدمیوں کی کمی نہ تھی۔

ذرا دیر بعد نشست برخواست ہوئی اور ہم دونوں کی مہم پر روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سردار آگرموشی کے پاس ایک سے ایک جدید ہتھیار تھے۔ چینی ساختہ کلاشنکوف کے علاوہ راکٹ لانچر تک تھے۔ اس گوریلا مہم پر روانگی اسی وقت عمل میں لائی جا رہی تھی۔ رامس نے مجھے فقط ایک پستول تھمایا تھا۔ فاضل راؤنڈز بھی نہیں دیئے تھے۔ جبکہ خود اس نے بھی ساتھ کچھ خاص اسلحہ نہیں رکھا تھا۔ ماسوائے ایک سنان اور پستول کے۔ اسلحے کی تو مجھے بھی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ لیکن مجھے رامس کی طرف سے تشویش محسوس ہو رہی تھی۔

وجہ یہی تھی کہ اس بوڑھے وید نے مجھے پہلے سے رامس کی طرف سے محتاط رہنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ وہ اس اہم مشن میں میرے ساتھ کر دیا گیا تھا اور رامس کے ساتھ اپنے اس مشن پر نکلنے کا مقصد مجھے عاروب عامل کی سرکوبی نہیں بلکہ اپنے ہی گلے کا پھندا محسوس ہو رہا تھا۔

میرے معترض ہونے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے سردار آگرموشی کے چھوٹے بھائی رامس کے بارے میں شبہ کرنا سردار سے ناراضگی مول لینے کے مترادف ہی ہوتا۔ تاہم میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اگر رامس نے میرے ساتھ راہ میں دھوکا کرنے کی کوشش کرنی چاہی تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔

ہم دونوں خچروں پر سوار ہو کر عامل عاروب کے قبیلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایکا ایکی موسم کے تیور بدلنے لگے۔ آسمان پر کالے کالے بادلوں نے یلغار کر دی اور تیز موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔

میں اور رامس خاموشی کے ساتھ آگے پیچھے اپنے اپنے خچروں پر چلے جا رہے تھے۔ تیز بارش کی وجہ سے ہم ایک چٹانی چھجے کے نیچے آن رکے۔ میری نظریں بدستور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی



نہیں۔ میں نے اس کے چہرے سے البتہ دبا دبا جوش محسوس کیا تھا جس سے اس کے اندر کے منفی جارحانہ عزائم کا اندازہ ہوتا تھا۔ میرے سینے میں زبردست ہلچل جاری تھی۔

"یہاں کب تک رکنا پڑے گا؟........ بارش کے تو رکنے کے آثار نظر نہیں آ رہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ میری کوشش تھی کہ میں اس سے ذرا فاصلہ رکھوں اور ایک لمحے کے لئے بھی اس کی طرف سے غافل نہ رہوں۔ اس نے میری بات سن کر ایک لمحے کو بغور میری جانب دیکھا۔ اس وقت ہوتے آسمان پر زور سے بجلی کڑکی اور وہ اپنی جیب سے پستول نکال کر یونہی اس کا ہوائی نشانہ باندھنے لگا۔ میرا دل یکبارگی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ میرا پستول جیب میں تھا۔ جبکہ رامس کا ہاتھ میں۔ اسنے ابھی تک میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ اپنے پستول کے نشانے پر اپنی ایک آنکھ بھینچے ہوئے وہ نال کا رخ آہستہ آہستہ میرے چہرے کی طرف لا رہا تھا۔ میرے وجود میں تھرتھراہٹ اُبھری۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" میں نے بالآخر حلق تر کر کے پوچھا۔

اس نے فوراً پستول نیچے کر دیا۔ بے اختیار میرے حلق سے گہری سانس خارج ہو گئی۔

"تم مجھ سے خوف زدہ ہو نا؟" اس نے اچانک ایک چونکا دینے والا اور بالکل غیر متوقع سوال مجھ سے کیا اور میں اُس کے اسرار بھرے لہجے پر چونکے بنا نہ رہ سکا۔

"نہیں........ بھلا میں تم سے کیوں خوف زدہ ہونے لگا؟" میں نے ہولے سے ہنس کر کہا۔

"تمہارے انداز و اطوار اور چہرے کی چابک دستی اور ہر لمحے کے چوکنا پن سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔" وہ پھر اسی لہجے میں بولا۔ میں نے بے اختیار ایک گہری ہمکاری خارج کی اور نظریں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر تم ہی وجہ بھی بتا دو کہ بھلا مجھے تم سے کس بات کا خوف ہو سکتا ہے؟"

میری بات پر اس نے ایک عجیب سا قہقہہ لگایا۔ اس کے قہقہے میں عجیب سی سنسنی مجھے محسوس ہوئی تھی۔

"اس بڈھے وید نے ہی تمہیں یقیناً میری طرف سے خائف کیا ہو گا۔" اس نے میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں........ اس نے تو مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"میں نے سن لی تھی اس خبیث بڈھے کی بات کہ تم پر قاتلانہ حملہ میں نے ہی کروایا تھا۔" اس نے ایک اور چونکا دینے والا انکشاف کیا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں مچل رہا تھا۔ بارش کا زور ٹوٹنے لگا تھا۔ سردی کی کاٹ میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ پھر جیسے ہی بارش رکی تو برف باری شروع ہو گئی۔ ایسے بعید ترین شمالی علاقوں میں بارش کے بعد برف باری ہونا لازمی تھا۔

"کیا اب میں جھوٹ بولوں گا؟" اس نے میری طرف سرسراتی نظروں سے گھور کر کہا اور میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ میں اسے کیا جواب دیتا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ مجھ پر بلا تاخیر گولی چلا دیتا تو میں اپنے دفاع میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تب میں نے سچ کہنا ہی بہتر جانا اور پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

"ہو سکتا ہے اس بڈھے وید کو تمہاری طرف سے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو؟"

اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ اُبھری۔ "تو گویا اس نے تم سے میرے خلاف بات کی تھی؟"

"ہاں........ مگر وہ زیادہ تفصیل نہیں بتا سکا تھا۔ صرف اتنا ہی کہا کہ یہ حرکت تمہارے ہی کسی آدمی کی ہو سکتی ہے۔"

''میرا اندازہ درست نکلا۔''

''کیا مطلب؟......... کیا تم جھوٹ بول رہے تھے کہ تم نے اس کی باتیں سن لی تھیں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں......... اس نے ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کیونکہ اس نے میرے کہنے پر ہی تم سے وہ سب کہا تھا۔

اس بار اس نے ایسی بات کہہ ڈالی کہ میں سر سے پاؤں تک لرز اٹھا۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سانس سینے میں اٹکنے لگی اور حلق خشک ہونے لگا۔ وہ پھر بولا۔

''میں تمہیں اس کے ذریعے خوف زدہ کر کے یہاں سے بھگانا چاہتا تھا۔ مگر وہ......... خیر، اپنی پستول نکالو۔'' اچانک اس نے سنسناتی آواز میں کہا۔ میرا پورا وجود مرتعش سا ہونے لگا۔

''نکالو پستول۔'' اس بار اس کے لہجے میں تحکمانہ درشتی تھی۔ میں نے اپنا پستول نکال لیا۔

''اس میں نقلی گولیاں ہیں......... محض پٹاخے......... فلموں کی شوٹنگ میں استعمال ہونے والے پٹاخے۔ ہاہا.........'' اس نے سرسراتے لہجے میں کہا اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ ایسے میں وہ مجھے کوئی خطرناک پاگل محسوس ہونے لگا۔

یہ بات اب شک و شبہے سے بالاتر ہو چکی تھی کہ وہ میرے سامنے کھل چکا تھا۔ بلکہ اس نے خود میرے سامنے اپنی اصلیت کا اعتراف کیا تھا۔

''ڈرو نہیں......... یہ سچ ہے کہ پہلے میں تمہیں مروانا چاہتا تھا۔ مگر اب میرے ناکام حملے کے بعد صورت حال بدل چکی ہے۔'' وہ پھر یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ بدبخت میرے ساتھ چوہے اور بلی کا کھیل، کھیل رہا تھا۔

''اب تم مجھے یہاں چالاکی سے ویرانے میں لا کر قتل کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ کام مجھے بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔ مگر اب نہیں کر سکتا۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم میرے بڑے بھائی آگرموشی کے دل میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہو۔ اور دوسری خرابی یہ ہو گئی کہ مجھے تمہارے ساتھ کر دیا گیا۔ مگر پھر بھی میرے پاس تمہیں قتل کرنے کے سو بہانے ہیں۔ لیکن میں اپنے بھائی کے دل میں اپنے لئے ذرا سے بھی شک و شبہے کی گنجائش نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ تم مجھ سے معاہدہ کرو، اپنی جاں بخشی کے سلسلے میں۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''کیسا معاہدہ؟......... یہ بھی تم خود ہی بتا دو۔'' میں نے بظاہر بے پرواہانہ انداز میں پوچھا۔

''عامل عاروب کو قتل کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔''

''میری اس سے پہلے کوئی دشمنی رہی ہے نہ اب ہے۔'' میں نے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے مکاری سے کہا۔ ''وہ تو خود ہی میری ساتھی نگینہ کو اپنے دیوتا دابولامینزی کی بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے اس مقصد کے لئے ہی نگینہ کو اغواء کروایا تھا۔''

''اگر نگینہ تمہیں زندہ سلامت مل جائے تو؟'' اس نے پراسرار انداز میں میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''یہ......... یہ کس طرح ممکن ہے؟'' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں یا نہ میں جواب دو۔'' وہ سپاٹ و سرد آواز میں بولا۔ چھجے سے باہر برف روئی کے گالوں کی طرح



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گر رہی تھی۔

''مگر عامل عاروب نے تو نگینہ کو اپنے دیوتا کی بھینٹ چڑھانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اگر میں نگینہ کو اپنے ساتھ لے بھی جاتا ہوں تو بھی خطرہ اس کے سر پر بدستور مسلط رہے گا۔''

''عامل عاروب کو دوسری لڑکی مہیا کر دی جائے گی۔ میں خود اس سے جا کر مذاکرات کروں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

مجھے اس کی بات پر ناقابل بیان حیرت سی ہوئی اور میں اُلجھ سا گیا۔ پھر اسی لہجے میں بولا۔ ''عامل عاروب تمہاری یہ بات بھلا کیونکر مانے گا؟''

''اسے ماننا پڑے گی میری بات۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ چالاک شخص اندر ہی اندر کون سی گہری سازش کے تانے بانے بُننے میں مصروف تھا؟ کیا یہ درونِ خانہ اقتدار کی جنگ تھی؟

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ''تم نہیں جانتے کہ تم نے اس کے بہادر اور جنگجو سالار بوغا کو ہلاک کر کے اسے کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ ادھر میرا بھائی سردار آگرموشی اس پر حملے کے لئے پَر تول رہا ہے۔ اور مجھے ہی نہیں، عامل عاروب کو بھی اس بات کا پورا احساس تھا کہ اس بار عبرت ناک شکست اس کا مقدر ہو گی۔ اچھا ہی ہوا کہ تم میرے قاتلانہ حملے سے بچ گئے اور تمہاری وجہ سے جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔ اگر مجھے ناگاسی تم سے معاہدہ کرنے کا بروقت مشورہ نہ دیتی تو حالات مختلف ہوتے۔''

''ناگاسی......... یہ کون ہے؟'' میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

''ناگاسی......... میرے بھائی کی بیوی۔''

''تو......... تو گویا یہ بات.........'' میں چونکتے ہوئے بڑبڑایا اور اسے مزید کھولنے کی غرض سے بولا۔ ''مگر میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ عامل عاروب تمہاری بات مان لے گا، ہرگز نہیں۔''

ایسا میں نے اس کا منہ کھلوانے کے لئے کہا تھا جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ چنانچہ یہی سبب تھا کہ وہ ہولے سے خود کلامیہ بڑبڑایا۔

''لگتا ہے تمہیں پوری بات بتانا ہی پڑے گی۔''

''ہاں، تب ہی مجھے تسلی ہو سکتی ہے۔'' میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

وہ ایک گہری سانس لے کر صراحت بتانے لگا۔

''یہ دو قبیلوں کے درمیان اقتدار کی جنگ ہے۔ ناگاسی درحقیقت میری بیوی بننا چاہتی تھی مگر بعض حالات میں اسے میرے بھائی آگرموشی سے شادی کرنا پڑی۔ میرے بھائی کی یہ دوسری شادی تھی۔ خیر، قبیلے کی روایت کے مطابق سردار پچپن سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد از خود قبیلے کی سرداری سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کی سرداری اس کے جوان بیٹے یا خاندان کے کسی دوسرے فرد کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ مگر میرا بھائی بے اولاد ہے۔ اگر وہ صاحب اولاد ہوتا تو یقیناً اپنی دستار اپنے بیٹے کو پہنا دیتا۔ مگر اپنے سگے بھائی کے حق پر وہ ڈاکا مارے ہوئے ہے۔ پہلے اس نے مجھ سے ناگاسی کو چھینا اور اب سرداری کے حق سے بھی مجھے محروم کر دیا۔ یہی سبب تھا کہ میرے دل میں اپنے ہی بھائی کے خلاف نفرت جڑ پکڑنے لگی۔ میں نے انتقاماً بغاوت کرنا چاہی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ناگاسی سے میرے اب بھی خفیہ تعلقات ہیں۔ اس نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر سردار آگرموشی نے اپنی سرداری قبیلے میں کس قدر مضبوطی سے جما رکھی ہے۔ اس دوران عاروب سے جنگیں لڑی گئیں۔ مگر دونوں بار ہمیں شکست

اٹھانا پڑی۔ میں سمجھ گیا کہ عالل عاروب ہی وہ شخص ہے جو میرا اقتدار مجھے واپس دلانے میں میری مدد کر سکتا ہے۔ یوں میں نے اس کے ساتھ خفیہ معاہدہ کرلیا۔ اب تم خود سوچ لو کہ کون حق پر ہے، کون ناحق۔''

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ ایک لحاظ سے اس کی بات درست محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ یہ سب یکطرفہ داستان تھی تاہم مجھے ان کی آپس میں دو بھائیوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ تاہم اگر اس طرح بغیر کسی خون خرابے کے میرا اور نگینہ کا مسئلہ حل ہوا چاہتا تھا تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ اور اب میں رامس کی یہ بات بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ عاروب کو اب کس طرح قائل کر سکتا ہے۔

''اب عاروب سے جا کر میں کیا کہوں گا، اس کا تمہیں بہ خوبی اندازہ ہو چکا ہوگا۔ یا پھر کہو تو اس کی میں تفصیل سنا ڈالوں؟'' تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''ہاں.........اب تم اسے جا کر یہی کہو گے کہ وہ تمہارے بھائی کی لشکر کشی سے بچنا چاہتا ہے تو مجھے فارغ کر ڈالے۔ لیکن بات تو پھر وہی ہو جائے گی، یعنی تمہارا بھائی تو پھر اس پر چڑھائی کرنے سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔'' میں نے آخر میں کہا۔

''وہ زندہ رہے گا تو تب ہی کرے گا نا۔'' اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے آخر میں کہا۔

''تم نے شاید میری پہلی بات پر غور نہیں کیا۔'' وہ بولا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں ہلاک کرنے کی فاش غلطی کرنے لگا تھا۔ تمہارے زندہ رہنے سے تو ہمیں مہلت ملی ہے مگر صرف ایک دن کی۔ ناگاسی نے مجھے خوش خبری سنائی ہے کہ وہ اندر ہی اندر اس کے چند معتبر امراء کو اپنا ہم خیال بنا چکی ہے۔ درحقیقت قبیلے کی اکثریت عالل عاروب سے جنگ کرنا نہیں چاہتی۔ اس خیال کو ہم نے بھی اندر ہی اندر ہوا دے دی کہ سردار آگرموشی بلاوجہ پورے قبیلے کو دو جنگیں ہارنے کے باوجود جنگ کی آگ میں جھونک رہا ہے۔

اب ہم نے آج کی فیصلہ کن رات میں بیک وقت دو چالیں چلنے کی کوشش کی ہے۔ پہلی تو یہ کہ عالل عاروب سے جنگ ٹال دی ہے۔ کیونکہ اس بار ہمیں یقین تھا کہ سردار آگرموشی کو فتح ہو گی اور اس فتح کا مطلب اس کی سرداری کی درازی عمر ہے۔ دوسری چال یہ کہ میں تمہارے بہانے عالل عاروب کو اس خطرے سے آگاہ کر کے اسے اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ نگینہ کو تمہارے حوالے کر دے اور عین اس وقت سردار آگرموشی کے خلاف جنگ چھیڑ دے جب میرے باغی ساتھی اس کی صفوں میں خانہ جنگی کی صورتِ حال پیدا کر دیں۔ یوں سردار آگرموشی کا سورج غروب ہو جائے گا اور ایک معاہدے کے تحت سرداری مجھے سونپ دی جائے گی۔'' وہ اتنا بتا کر چپ ہو رہا۔

لیکن اس کی باتوں سے میں اب بھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اب بھی کئی سوال میرے دل و دماغ میں اُبھر رہے تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھ لیا۔

''مگر کیا ضروری ہے کہ تمہاری بغاوت کامیابی سے ہمکنار ہو؟.........وہ کچلی بھی تو جا سکتی ہے۔ بقول تمہاری منظورِ نظر ناگاسی کے شوہر سردار آگرموشی نے قبیلے میں اپنی سرداری مضبوطی کے ساتھ جما رکھی ہے۔ اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ عالل عاروب کے ساتھ تمہارے مذاکرات کامیاب ہوں۔ وہ تمہاری بات رد بھی تو کر سکتا ہے؟''

''اندر کے معاملات اور صورتِ حال کا مجھے علم ہے۔ تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''تم بھی میرے ساتھ عالل عاروب کے پاس چلو گے۔ اور ہاں، تمہیں اس حقیقت کا بھی اندازہ نہیں ہے کہ اگر تم آج کے دن عالل عاروب کے چنگل سے اپنی ساتھی نگینہ کو نہ چھڑا سکے تو سردار آگرموشی انتظار نہیں کرے گا


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آج ہی کی رات عالل عاروب پر لشکر کشی کر ڈالے گا۔ اور ممکن ہے کہ عالل عاروب تہوار والے دن کا انتظار کئے بغیر ہی تمہاری ساتھی کو موت کے گھاٹ اتار دے۔''

مجھے اس کی بات میں کچھ وزن محسوس ہوا تھا۔ ''کیا میرا تمہارے ساتھ عالل عاروب کے پاس مذاکرات کے لئے جانا ضروری ہوگا؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ہاں.........تمہاری موجودگی کے بغیر میں اسے قائل نہ کر سکوں گا۔'' وہ بولا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرے ذہن میں خدشہ بھی اُبھرا تھا کہ کہیں اس طرح یہ مجھے چالاکی سے عالل عاروب کے حوالے تو نہیں کرنا چاہ رہا ہے۔ مگر اس کی بغاوت والی بات نے میرے اس خدشے کو رد کر ڈالا۔ یوں بھی وہ اس وقت مجھے گولی مار سکتا تھا۔ میں پوری طرح اس کے رحم و کرم پر تھا۔

بالآخر میں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے.........لیکن میں تمہارے ساتھ عالل عاروب کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ یہ مذاکرات تمہیں خود ہی نمٹانے ہوں گے۔ البتہ میں تمہارا اس جگہ پر انتظار کروں گا۔ عاروب کی خانقاہ یہاں سے زیادہ دور تو نہیں ہے۔''

اگر اس کی نیت میں فتور تھا تو وہ میری یہ بات نہیں مانتا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور پُرجوش لہجے میں بولا۔

''لگتا ہے تم اب بھی مجھ پر شبہ کر رہے ہو۔ خیر، تم تسلی رکھو۔ تم پھر میرا ادھر انتظار کرنا۔ میں بہت جلد لوٹوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ پھر رکا اور میری جانب گردن موڑ کر عجیب سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''تمہارے پستول کی گولیاں نقلی نہیں، اصلی ہیں۔ چاہو تو ایک ہوائی فائر کر کے دیکھ سکتے ہو۔ چلتا ہوں۔''

وہ آگے بڑھ گیا اور میں گویا اپنی جگہ پر سن بیٹھا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

❄❄❄

برف باری اسی رفتار سے جاری تھی۔

رامس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ مجھے رامس کی باتوں پر یقین نہیں ہو پا رہا تھا کہ مردود عاروب، نگینہ کو رامس کے حوالے کر دے گا اور مجھے اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ کیا خبر، عاروب سے مل کر رامس میرے خلاف کوئی اور کھچڑی پکانا چاہتا ہو؟ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی واپسی نگینہ کی بجائے عاروب کے خونی ہرکاروں سمیت ہو اور یہاں پہنچ کر وہ لوگ آناً فاناً مجھے اپنی حراست میں لے لیں۔ غرضیکہ رامس کے جانے کے بعد میرے دل و دماغ میں عجیب و غریب وسوسے اور خدشات پلنے لگے تھے۔ بہرطور میں اپنی طرف سے محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔

میں نے پستول نکالا، اس کا چیمبر چیک کیا۔ پھر ایک گولی نکال کر دیکھی۔ گولی اصلی محسوس ہوئی۔ احتیاطاً میں نے اس کی اصلیت جانچنے کی خاطر ایک ہوائی فائر کیا۔ دھماکا ہوا اور گولی ایک برفیلی چٹان میں لگی۔ مطمئن ہونے کے بعد میں آرام سے بیٹھ گیا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ برف باری اب رک چکی تھی۔ میں نے احتیاط کے پیشِ نظر اپنی جگہ چھوڑی اور اس چٹانی چھجے سے خاصی حد تک دور ہو کر ایک ایسی جگہ پر آ گیا جدھر سے میں با آسانی اپنی پہلی جگہ پر بھی نظر رکھ سکوں۔

میرا دل و دماغ اب بھی رامس کی جانب سے شکوک و شبہات کا شکار تھا۔ مزید کافی دیر گزری، برف باری رک چکی تھی اور ماحول اب صاف ہو چکا تھا۔ تاہم سہ پہر ہو چلی تھی۔ دھوپ البتہ اب بھی نہیں نکلی تھی۔

میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، بادلوں کی آوارہ ٹولیاں ہنوز گردش کر رہی تھیں۔

اچانک میں نے ایک سمت سے ذرا دور دو افراد کو ایک خچر پر آتے دیکھا تو میرا دل یکبارگی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ وہی والی سمت تھی جدھر رامس نے رخ کیا تھا۔

کیا رامس اپنے وعدے کے مطابق عامل عاروب سے کامیاب مذاکرات کے بعد نگینہ کو لے کر واپس لوٹ رہا تھا.....؟ میرے ذہن میں یکبارگی یہ جاں فزا خیال اُبھرا تھا۔

نگینہ سے ملنے کی مسرت انگیز و متوقع گھڑیوں نے مجھ پر عجیب سی سرشاری طاری کر دی تھی۔ میں دھڑکتے دل اور پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ دور خچر پر سوار آتے ہوئے ان دونوں افراد کو دیکھ رہا تھا۔ پھر جب خچر چٹانی چھجے والی سابقہ پناہ گاہ کے قریب آن کر رکا تو میں دیوانوں کی طرح اس کی طرف دوڑ پڑا۔

میں خچر پر سوار رامس اور نگینہ کو پہچان چکا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری دنیا، میری کائنات، میری محبت، میری نگینہ یوں آسانی سے مجھے مل جائے گی۔ مجھے واقعی اب تک اس کی توقع نہ تھی۔

میں پاگل دیوانے کی طرح ہانپتا دوڑتا ہوا ان کے قریب پہنچا تو نگینہ نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو غیر یقینی کے تاثرات اُبھرے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر ''نادر'' چلاتی ہوئی یکدم خچر سے اُتری اور میری جانب دوڑ پڑی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے فلمی انداز میں لپٹ گئے۔

''نن.....نگینہ! تت.....تم ٹھیک تو ہو نا؟' میں اسے دھیرے سے خود سے الگ کر کے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بے تابانہ انداز میں بولا۔ رامس خچر سے اتر کر خاموش کھڑا ہماری طرف ہی تکے جا رہا تھا۔

''ہاں.....نن.....نادر! مم.....میں.....میں بالکل ٹھیک ہوں.....مگر تمہارا بازو؟''

''یہ معمولی زخم ہے.....تم بالکل فکر مت کرو۔ اب مردود عاروب کا خاتمہ قریب ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''مگر نادر! یہ سب کیا چکر ہے؟.....اس نے مجھے اتنی آسانی سے کیوں چھوڑ دیا؟ اور یہ.....یہ کون ہے؟'' اس نے متوحش لہجے میں قریب خچر کے پاس کھڑے رامس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو میرے کوئی جواب دینے سے قبل رامس بولا۔

''اب نکل چلو یہاں سے۔'' وہ یہ کہتا ہوا اپنے خچر کی رسّی پکڑے ہمارے قریب آ گیا۔ میرا خچر بھی ایک طرف چٹانی چھجے کے ساتھ بندھا کھڑا تھا۔

''آؤ نگینہ! میں تمہیں بعد میں ساری باتیں بتا دوں گا۔'' میں نے نگینہ سے کہا اور پھر اسے لے کر اپنے خچر کی طرف بڑھا۔ پھر پہلے نگینہ کو سہارا دے کر خچر پر سوار کروایا، اس کے بعد خود بھی اس کے عقب میں خچر کی لگامیں تھامے بیٹھ گیا۔

رامس بھی اپنے خچر پر سوار ہو کر آگے بڑھ چکا تھا۔ میرا خچر بھی اس کے عقب میں چلا جا رہا تھا۔ راستے میں، میں نگینہ کو اب تک کے سارے حالات سے آگاہ کرتا رہا۔

اسے یہ سن کر بہت خوشی و تسلی ہوئی تھی کہ اس کا باپ شاہ میر خیریت سے تھا اور جب اسے یہ پتہ چلا کہ ماں نے بالآخر شاہ میر کو معاف کر دیا تھا اور کن حالات میں معاف کیا تھا تو نگینہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا تھا۔

میں نے نگینہ کو مکش پور کے چھوٹے سے قصبے کے سردار زور آور خان کے متعلق بھی بتایا تھا، وہ تشویش زدہ ہو گئی۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تو پھر.....اب واپس جا کر وہ مصیبت بھی گلے پڑے گی ہمارے۔'' وہ فکرمندانہ لہجے میں بولی۔

''تم فکر نہ کرو نگینہ! میں وہ سب بھی سنبھال لوں گا۔ ویسے میں نے انکل اعظم خان کو آگاہ کر دیا تھا۔ ایمرجنسی میں ان کا اثر و رسوخ بہت کام آتا ہے۔ یوں بھی عاروب کے اس ہرکارے کو نظروں میں رکھا ہے۔ اس نے سردار زور آور خان کی بیٹی شہزادی کو شدید زخمی اور بیٹے شہ زور کو مار ڈالا تھا۔ پھر ان کی لاشیں لے کر اپنے دونوں ساتھیوں سے جا ملا تھا۔''

''ہاں.....میں بھی اس کے تیسرے ساتھی کو پہچانتی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''وہ ہمیں واپسی میں راستے ہی مل گیا تھا۔ اس نے تمہارے متعلق بتایا تھا۔ میں تب ہی سمجھ گئی تھی تم اسی لئے ایئر پورٹ مجھے ریسیو کرنے نہ آئے تھے۔''

''بس نگینہ! اب تم فکر نہ کرو۔ ہماری دوریاں ختم ہوا چاہتی ہیں۔ میں اب کسی طرح اس آدمی کو بھی وقت میں لینا چاہتا ہوں تاکہ اسے سردار زور آور خان کے سامنے پیش کر سکوں۔ کیونکہ مجھے پورا یقین ہے اس کی بیٹی شہزادی اپنے بھائی شہ زور کے قاتل کو پہچان لے گی۔''

''ہاں.....ایسا ہی کرنا پڑے گا۔'' نگینہ نے بھی کہا۔ ''ویسے نادر! مجھے اس آدمی کا نام معلوم ہے جو دونوں سے ملا تھا، جو مجھے ایئر پورٹ سے اغواء کر کے واپس مکش پور کی طرف لا رہے تھے۔''

''اچھا.....کیا نام تھا اس بدبخت کا؟'' میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

''بڑا عجیب سا نام تھا.....سنکھال۔''

''ہوں.....سنکھال۔'' میں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے گویا یہ نام ذہن نشین کر لیا۔

ہمارا خچروں پر سفر جاری تھا۔ جب منزل قریب تھی تو رامس نے مجھے ہدایت کی کہ آگرموشی کو یہی بتایا جائے کہ نگینہ کو ایک لڑائی کے بعد عاروب سے چھینا گیا ہے۔ مجھے اس کی بات ماننی تھی۔ چنانچہ سردار آگرموشی کو بھی ہم نے یہی بتایا۔

سردار آگرموشی نے مجھے اور اپنے بھائی رامس کو اس کامیابی کی مبارک باد دی۔ تب پھر اچانک سردار آگرموشی نے مجھ سے کہا۔

''تمہارے کچھ ساتھی مہمان گاہ میں موجود ہیں، ان سے مل لو۔''

سردار آگرموشی کی بات پر مجھے حیرت ہوئی۔ بھلا میرے یہاں کون سے مہمان ساتھی مجھ سے ملنے آ سکتے ہیں؟ سردار آگرموشی نے یہ بھی بتایا کہ انہیں یہاں میرا چترالی نوعمر دوست داور خان ہی لایا تھا۔ میں نے فوراً مہمان گاہ کا رخ کیا تو انکل اعظم خان اور وزیر خان سمیت اس کے تینوں ساتھیوں کو دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ نگینہ بھی اس وقت میرے ساتھ تھی۔

ان سب افراد کو غیر متوقع طور پر یہاں دیکھ کر مجھے حیرت اور دبی دبی پریشانی کا شدید جھٹکا لگا۔ رامس ہمارے پیچھے پیچھے وہیں چلا آیا تھا۔

''نادر بیٹے!.....کیسے ہو تم؟'' انکل اعظم خان یہ کہہ کر میری طرف لپکے۔ پھر نگینہ کو بہ خیریت پا کر اس کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے اس کی بھی خیر خیریت پوچھی۔ ازروئے اخلاق میں وزیر خان سے ملا۔

انکل اعظم خان نے مجھے بتایا کہ انہیں سردار آگرموشی نے سارے حالات سے آگاہ کر دیا تھا کہ میں اور رامس کس مقصد کے لئے اور کہاں گئے تھے؟ یوں اب خاصی حد تک وزیر خان کی غلط فہمی بھی دور ہو گئی اور انہوں نے دیکھ لیا تھا اور میں نے اسے بتا دیا کہ یہی وہ میری ساتھی تھی جس کی تلاش میں مجھے

یہاں پہنچنے کی اس قدر جلدی تھی۔

انکل اعظم خان نے مجھے وزیر خان سے متعلق یہ بھی بتایا تھا کہ جب میں نے انہیں سردار زور آور خان کے بیٹے شہ زور کے قتل کے معاملے پر یہاں آنے سے قبل آگاہ کیا تھا تو انہوں نے فوری طور پر یہ دانش مندانہ قدم اٹھایا تھا کہ اپنے چند ذمہ دار افسر دوستوں کے ساتھ مکش پور کے سردار زور آور خان سے ملاقات کی۔ اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے اور ہماری مدد کی خاطر یہاں کا رخ کیا تھا۔

رامس وہاں موجود تھا اور بڑے غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ عاروب اور سنکھال کے متعلق لرزہ خیز واقعے کے بارے میں سن کر وہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا تھا اور وہ کیوں پریشان ہو گیا تھا، اس کا بھی مجھے ادراک تھا۔

میں نے ایک نظر رامس پر ڈالی۔ درحقیقت مجھے اس کی یہاں آمد ناگوار ہی گزری تھی۔ بالآخر وزیر خان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"سنکھال کو ہم کسی صورت میں معاف نہیں کر سکتے۔ اور اسے ہم پکڑ کر اپنے سردار کے سامنے پیش کریں گے۔ یقیناً ہماری بھتیجی شہزادی اس قاتل سنکھال کو پہچان لے گی۔ اس کی تصدیق کے بعد ہی ہمارا اور تمہارا معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔"

اس کی بات ایک حد تک درست ہی تھی اور میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ سنکھال کو زندہ پکڑ کر ان کے سپرد کر دوں۔ اور یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ اب وزیر خان بھی انکل اعظم خان کے ساتھ یہاں آ گیا تھا۔

اتفاق تھا کہ ان لوگوں نے اسی ہوٹل میں رہائش اختیار کی ہوئی تھی جہاں میں نے بھی اپنے لئے کمرہ بک کروا رکھا تھا۔ میں نے جواباً وزیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ اس لئے میں نے تمہارے بھتیجے کے قاتل سنکھال کو اپنی نظروں میں رکھا ہوا ہے لیکن........"

اچانک انکل اعظم خان نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے مجھے ٹوکا۔ "نادر بیٹے! مجھے بات کرنے دو۔"

پھر وہ وزیر خان سے مخاطب ہو کر انتہائی متانت سے بولے۔ "دیکھو وزیر خان! تمہیں اب تک سچائی کا اندازہ ہو ہی چکا ہو گا۔ تمہارے بھتیجے شہ زور کا قاتل سنکھال اس وادی میں موجود ہے۔ مگر اب اسے پکڑنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ کام تمہیں خود نمٹانا ہو گا۔"

جواباً وزیر خان نے انکل اعظم خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سنکھال کو ہم نہیں پہچانتے۔ اسے ہم کیسے اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں؟ اس کی نشاندہی بھی نادر ہی کو کرنا ہو گی۔"

"لیکن یہ ایک غیر مشروط مدد تصور کی جائے گی۔" انکل اعظم خان نے بارعب لہجے میں وزیر خان سے کہا تو اس نے کچھ سوچ کر اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

اچانک رامس اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے فوری طور پر انکل اعظم خان اور وزیر خان کو روانہ ہونے کا مشورہ دیا۔ یہاں آج رات کیا ہونے والا تھا، اس کا میرے اور رامس کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ اس لئے میں نے یہاں سے نکل کر اپنے ہوٹل میں جانے کو ترجیح دی۔ یہاں کھل کر میں انکل اعظم وغیرہ سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

یوں بھی میں ہوٹل جا کر تنہائی پاتے ہی انکل اعظم خان سے چند مشورے بھی کرنا چاہتا تھا۔ کبھی میرے جی میں آتا کہ اسی وقت جا کر سردار آگرموشی کو آج کی رات اس کے خلاف ہونے والی بغاوت کے بارے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاہ کر ڈالوں۔ مگر پھر رامس کے ساتھ کئے گئے معاہدے کا خیال آتا تو اپنا ارادہ بدلنا پڑتا۔

ہم نے جب سردار آگرموشی سے جانے کی اجازت طلب کی تو اس نے انکار کر دیا۔ رات کے کھانے کے ساتھ اس نے وہ رات بھی مہمان خانے میں گزارنے پر اصرار کیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ آج رات کیا ہونے والا تھا۔ اس لئے میں نے مزید وہاں رکنے سے انکار کر دیا اور انتہائی معذرت کے ساتھ کچھ ضروری ...اش کر اسے قائل کر ہی لیا۔

البتہ رامس جانے کیوں ہمارے وہاں سے جانے پر شدید متذبذب نظر آ رہا تھا۔ صاف عیاں تھا کہ وہ ...ے بلکہ بالخصوص میرے اور نگینہ کے وہاں سے جانے پر قطعی تیار نہ تھا۔ اس بات پر میں اندر سے ذرا ...گیا تھا۔ تاہم جب ہم گاڑی میں سوار ہونے لگے، گاڑی چترال سے کرائے پر لی گئی تھی تو رامس نے ...ے پوچھا۔

"میرا خیال ہے اب تو تم لوگ ادھر ہی رہو گے، ہوٹل میں۔"

"ہاں........ کیونکہ سنکھال والا معاملہ بھی تمہارے علم میں آ ہی چکا ہے۔ وہ بھی نمٹانا پڑے گا۔" میں ...البتہ سنکھال والے معاملے کا ذکر کیا تھا۔

اس وقت سب لوگ جیپ میں سوار ہو چکے تھے۔ جیپ کا ڈرائیور بھی موجود تھا۔ صرف میں اور رامس ...ڑے باتیں کر رہے تھے۔ سردار آگرموشی ہمیں رخصت کر کے جا چکا تھا۔

"میں تم سے ملنے آؤں گا ہوٹل۔ پھر اس سلسلے میں مزید بات ہو گی۔ مگر تم مجھ سے ملے بغیر وادی سے ...نکلنا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مجھے اس کی اس بات نے ایک بار پھر تشویش میں مبتلا کر دیا۔ مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔ بہر طور ...ل جیپ میں سوار ہو گیا۔ ہم اپنے ہوٹل میں آ گئے۔ انکل اعظم نے دو کمرے لے رکھے تھے۔ میں نے ...ان کو صبح تک کے لئے ٹال دیا اور پھر نگینہ کے ساتھ انکل اعظم خان کو بھی لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ ...کمرے کا دروازہ اچھی طرح بند کیا۔ پھر میں اور انکل اعظم خان موجودہ صورتِ حال پر تبادلہ خیال ...نے کے لئے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے انہیں رامس کی باتوں سے آگاہ کر دیا۔

"تم نے بہت بڑی بے وقوفی کی ہے نادر بیٹے!" پوری بات جاننے کے بعد انہوں نے تشویش زدہ ...ل کہا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ رامس اور عامل عاروب نہ صرف سردار آگرموشی کے خلاف بلکہ تمہارے ...کے خلاف بھی ضرور کوئی گہری چال چلنا چاہتے ہیں۔ یہ تو تمہاری اور نگینہ کی خوش قسمتی تھی کہ ایسے ...میں جب رامس کے اقتدار حاصل کرنے والے معاملے پر زد پڑتی تھی تو اس نے کسی طرح عامل ...بھی اس معاہدے کے لئے سردست قائل کر لیا کہ وہ نگینہ کو رہا کر دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سردار ...بغاوت سے پہلے ہی عامل عاروب پر لشکر کشی کر دیتا۔ نگینہ والے مسئلے کی وجہ سے نہ صرف رامس ...ل عاروب کو بھی اپنے لئے خطرہ محسوس ہوا تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تم نے عامل عاروب کے ...بوغا کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا جس کے باعث عامل عاروب کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔ لہٰذا انہیں نگینہ کو ...پڑا تا کہ ادھر رامس مقررہ مدت کے اندر اندر قبیلے کی دستار حاصل کر لے اور ادھر عامل عاروب ...لے پر بھی فیصلہ کن جنگ کا خطرہ ٹل جائے۔ اور نادر بیٹے! میں تمہیں ایک بات بھی بتا دوں۔"

...کہہ کر انکل اعظم خان نے تھوڑا توقف کیا، پھر بولے۔

"اگر رامس کی یہ بغاوت کامیابی سے ہمکنار ہو گئی تو ایک بار پھر تم اور نگینہ عامل عاروب کے چنگل میں ...جاؤ گے۔ رامس خود تمہیں تحفتاً عاروب کے حوالے کر دے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



انکل اعظم خان کی باتوں اور تجزیے نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ انہوں نے اپنے جن خدشات کا اظہار کیا تھا، موجودہ حالات کے تناظر میں ایسا ہونا ہرگز ناممکن نہیں تھا۔

''تو پھر انکل! ہمیں سردار آگرموشی کو اس خطرے سے فوری آگاہ کرنا ہوگا۔''

''ایسا کرنا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔'' انہوں نے تائیدی اور تاکیدی دونوں انداز میں کہا۔ ''تم پر ویسے بھی یہ اخلاقی ذمے داری بنتی ہے۔ سردار آگرموشی بہرحال تمہارا محسن ہے۔ کم از کم اتنا ہی سہی، جب تم زخمی تھے تو سردار آگرموشی نے ہی تمہاری مرہم پٹی کروائی تھی۔ باقی رہی یہ رامس کی قصہ کہانی تو ان کے اندرونی معاملات میں ہمیں دخل اندازی نہیں کرنا چاہئے۔''

''تو پھر اب کیا، کیا جائے؟..... پانی تو سر سے گزر چکا۔'' مجھے پہلی بار تشویش کا احساس ہوا۔

''تم اسی وقت سردار آگرموشی سے ملنے کی کوشش کرو۔ اور میں نگینہ کو لے کر یہاں سے نکل جاتا ہوں۔'' وہ بولے۔ ''سردار آگرموشی کو عاروب کے قبیلے پر لشکر کشی کرنے دو۔ عاروب کی شکست سے ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ اس موذی سے ہمیشہ کے لئے جان چھوٹ جائے گی۔ اس کے ساتھ سنکھال بھی ہماری گرفت میں آ جائے گا جسے ہم وزیر خان کے حوالے کر دیں گے۔ میں صبح تڑکے یہاں سے نگینہ کو لے کر روانہ ہو جاؤں گا۔ جاؤ، اب دیر مت کرو۔''

ان کی باتوں سے میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ مگر نگینہ فوراً پریشان ہوگئی اور ساری شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میرا ہاتھ تھام کر تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

''نادر! میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔ تم بھی ہمارے ساتھ واپس چلو۔''

میں نے بڑی ملائمت سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نگینہ! حوصلہ رکھو..... اللہ نے اب تک ہماری مدد کی ہے۔ آگے بھی وہ کرم نوازی فرمائے گا۔ تم میرے لئے دعا کرنا۔''

نگینہ کی آنکھوں میں تشویش اور محبت دونوں کا تاثر تھا۔ طوعاً و کرہاً اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے روانگی کا ارادہ کیا تو انکل اعظم خان نے مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے ہم اس صورتِ حال سے وزیر خان کو بھی آگاہ کر دیں تو بہتر ہوگا۔ ورنہ وہ خواہ مخواہ تمہاری روانگی کے بعد الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کی گاڑی تمہارے کام بھی آسکتی ہیں۔''

ان کی بات معقول تھی۔ میں ٹھہر گیا اور پوچھا۔ ''کیا اسے ساری باتوں سے آگاہ کرنا ہوگا؟''

''ہاں..... میرا خیال ہے اس کا دل اب صاف ہو چکا ہے۔ سنکھال کو گرفت میں لینے کا وہ بھی خواہاں ہے۔''

ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ اور جیسے ہی میں نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا، اچانک رائفل کی لمبی نال میرے سینے سے آن لگی..... وہ دو افراد تھے۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ رائفل کی نال اپنے سینے سے ہٹا کر اس کے پیٹ پر لات جمادی۔ مگر رائفل پر اپنی گرفت مضبوط نہ کر سکا۔ وہ لڑکھڑا کر اپنے ساتھی سے جا ٹکرایا۔ دونوں نے سنبھلنے کی کوشش میں اپنی رائفلوں کی نالوں کا رخ میری جانب موڑنے کی کوشش کی۔ مگر ایک پر انکل اعظم خان نے حملہ کر دیا اور دوسرے پر میں پل پڑا۔ ہم نے ان کی رائفلیں چھین لیں اور اس سے پہلے کہ سنبھل کر ان کی رائفلیں ان پر ہی استعمال کرتے، وہ ناقابل یقین پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راہداری میں دوڑتے چلے گئے۔



میں نے ان کے عقب میں برسٹ فائر کرنے کی کوشش کی لیکن انکل اعظم خان نے مجھے منع کر دیا۔ تاہم میں دوڑتا ہوا ان کے تعاقب میں گیا اور ہوٹل کی مختصر سی مگر ویران لابی سے ہوتا ہوا باہر آ گیا۔ میں نے ایک ڈبل کیبن جیپ کو تیزی سے اسٹارٹ ہو کر تاریکی میں بڑھتے دیکھا۔ وہ دونوں نامعلوم حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ باہر چہار سُو تاریکی، سردی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں واپس پلٹا۔ انکل اعظم خان کو منتظر کھڑے پایا۔ ہم دونوں واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔

''یہ دونوں یقیناً رامس کے بھیجے ہوئے جاسوس ہو سکتے ہیں۔'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''اور یقیناً ان دونوں نے ہماری باتیں سن لی ہوں گی۔'' انکل اعظم خان نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''اس لئے یہ ہمارا راستہ روکنا چاہ رہے تھے۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے رامس نے ہی ہماری نگرانی کے لئے اپنے ان دونوں آدمیوں کو یہاں بھیجا ہوگا۔'' پھر تھوڑے توقف کے بعد مجھ سے بولے۔ ''نادر بیٹے! میرا خیال ہے اب تمہارا سردار آگرموشی کے پاس جانا مناسب نہ ہوگا۔ اب اللہ پر چھوڑ دو، جو ہوگا کل صبح دیکھا جائے گا۔ شاید اسی میں ہماری بہتری ہو۔''

وہ رات ہم نے اپنے کمروں میں گزاری۔ وزیر خان کو اس سلسلے میں کچھ بتانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا۔

❋❋❋

بقیہ رات بے چینی میں گزر گئی۔ میری خواہش تھی کہ انکل اعظم جلد از جلد نگینہ کو لے کر اس علاقے سے نکل جائیں۔ صبح ہوتے ہی ہم نے وزیر خان کو ان تمام معاملات سے آگاہ کیا۔ تمام واقعات جاننے کے بعد وہ بھی فکرمند ہو گیا تھا۔ تاہم اسے اعظم خان کی وہاں سے روانگی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ بلکہ اس کی تجویز تھی کہ وہ اپنے دو کارندوں کو آگرموشی کے حالات جاننے کے لئے وہاں بھجوا دے۔ ہماری تائید کے بعد اس نے دو افراد کو ان کی طرف روانہ کر دیا۔

یہ معاملات طے ہوئے تو اعظم خان نے روانگی کا ارادہ باندھ لیا۔ نگینہ ان کے ساتھ تھی۔ ہم لوگ اڈے پر انہیں چھوڑنے کے لئے ہوٹل سے نکل آئے۔

اڈہ آبادی سے کوئی سات آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور ابھی ہم نے تقریباً تین چار کلومیٹر کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے وزیر خان کے آدمی نے بتایا کہ عقب میں دو تیز رفتار جیپیں دکھائی دی ہیں۔ ان کے پیچھے پندرہ سولہ خچر اور گھوڑوں پر سوار مسلح افراد بھی ہمارے تعاقب میں نظر آ رہے تھے۔

میں درمیانی سیٹ پر نگینہ اور انکل اعظم خان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ وزیر خان اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر براجمان تھا۔ اس انکشاف پر ہم سب سناٹے میں آ گئے۔ میں نے چلا کر ڈرائیور سے کہا۔

''جیپ دوڑاؤ..... ہماری جانیں خطرے میں ہیں۔''

ڈرائیور بوکھلا سا گیا۔ کیونکہ اسے حالات کا اندازہ نہ تھا۔ وزیر خان نے پُرجوش آواز میں کہا۔

''ہمیں رک کر ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔''

''ہم اتنے سارے مسلح لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے وزیر خان!..... ڈرائیور سے کہو جیپ دوڑائے۔'' سنسنے تیز لہجے میں کہا تو وزیر خان نے وہی ہدایت ڈرائیور کو دی۔ مگر ڈرائیور پریشان ہو گیا۔ اس نے جیپ کی رفتار میں کچھ خاص اضافہ نہیں کیا تھا۔ میں نے غصے سے دانت پیس لئے اور گردن گھما کر دیکھا تو حالات واقعی خطرناک ہو گئے۔ متعاقب لشکر گویا سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو کالر سے پکڑ کر چلاتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



"جیپ دوڑاؤ خبیث آدمی!......... ہماری جانیں خطرے میں ہیں۔"

تب کہیں جا کر اس نے جیپ کی رفتار یکدم تیز کر دی۔ میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ڈرائیور کو گردن سے پکڑ کر اس کی سیٹ سنبھالنے کی کوشش کرتا۔

اچانک عقب سے گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ ہم سب غیر ارادی طور پر نیچے جھک گئے۔ عقب سے برسنے والی گولیاں "ٹھک.........ٹھک" کی آوازوں سے جیپ کی باڈی میں پیوست ہو گئیں۔ گولیاں عقبی شیشے کو توڑتی ہوئی اندر سے ہی آر پار ہو کر جیپ کی ونڈ اسکرین میں پیوست ہوئی تھی۔ دونوں اسکرینیں زوردار چھناکے سے ٹوٹ گئیں۔

نگینہ نے غیر ارادی طور پر چیخ ماری۔ ڈرائیور کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہکنے لگا۔ عقب سے بدستور فائرنگ جاری تھی۔ ہم سب نے اپنے سروں کو نیچے جھکا دیا۔ مگر بدقسمتی سے ایک گولی ڈرائیور کے سر میں عقب سے پیوست ہو گئی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈرائیونگ سیٹ پر لڑھک گیا۔ بھیجا پار ہونے کے باعث اس کے خون آلود لوتھڑوں کے چھینٹے میرے اوپر پڑے تو مجھے ڈرائیور کے افسوس ناک انجام کا ادراک ہوا۔ میرا پورا وجود سائیں سائیں کرنے لگا۔

اتفاق سے وزیر خان نے ہمت اور پھرتی سے کام لیا اور ڈرائیور کی لاش کو اپنی طرف کھینچا۔ میں نے بھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ عقبی سیٹ سے اچھل کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب بدقسمت ڈرائیور کی لاش بیٹھنے کے انداز میں میری اور وزیر خان کے بیچ میں پھنسی ہوئی تھی۔

اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی میں نے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ جبکہ وزیر خان نے اپنا پستول نکال لیا اور تیزی کے ساتھ عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔

اب وزیر خان اور اس کے آدمی نے متعاقبین حملہ آوروں پر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ بعد میں انکل اعظم خان بھی اپنا پستول نکال کر اس جوابی فائرنگ میں شریک ہو گئے۔ جبکہ میں نے نگینہ کو سختی سے دونوں سیٹوں کے درمیان لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔

میرے برابر میں ڈرائیور کی لاش دوسری خالی سیٹ پر لڑھکی ہوئی تھی۔ میری ساری توجہ اب جیپ دوڑانے پر مرکوز تھی۔ میری کنپٹیاں بری طرح سنسنا رہی تھیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ فائرنگ کا تبادلہ بدستور جاری تھا۔ مجھے ہر دم یہی خدشہ لاحق تھا کہ کہیں دشمن حملہ آوروں کی گولی سے جیپ کا ٹائر برسٹ ہو جائے۔

اچانک مجھے زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ شاید ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ مگر جلد ہی مجھ پر یہ خوش کن انکشاف ہوا کہ یہ دھماکے کی آواز تعاقب میں آنے والے نامعلوم دشمنوں کی گاڑی کے ٹائر برسٹ ہونے کی تھی۔ میرا حوصلہ سوا ہو گیا۔ راستہ بل کھاتا ہوا ہونے کے باعث جیپ کو زگ زیگ دوڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم جیپ زبردست ہچکولے کھا رہی تھی بلکہ ایک نسبتاً تنگ موڑ کاٹتے وقت جیپ تیس پینتیس ڈگری تک ایک جانب جھکتے ہوئے الٹتے الٹتے بچی تھی۔ مگر میری دونوں ہاتھوں کی گرفت اسٹیئرنگ پر مضبوط تھی۔

ہم آبادی سے کافی دور نکل آئے تھے۔ جیپ اب ایک دوسرے اور نسبتاً کشادہ راستے پر دوڑی جا رہی تھی۔ اگرچہ یہ راستہ بھی بل کھاتا ہوا اور ناہموار تھا۔ تاہم یہ خدشہ بدستور موجود تھا کہ میں اڈے کے راستے سے بھٹک سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں تو ایک کے بعد ایک دوسرا راستہ پہلے راستے کے بطن سے نکل رہا تھا اور مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ ہم برفیلے اور ٹھٹھرتے ہوئے ویرانوں میں بھی نکل سکتے تھے۔



اچانک مجھے اپنی جیپ کے عقبی حصے سے ایک کرب ناک انسانی چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ وزیر خان کے ...ی تھی۔ میں مزید پریشان ہو گیا۔

اچانک مجھے انکل اعظم خان کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "نادر!......... جیپ اور تیز دوڑاؤ۔ دشمن ...آتے جا رہے ہیں۔"

مجھے خود بھی عقب میں آتی ہوئی گاڑیوں اور خچروں وغیرہ کے دوڑنے کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی ...دے رہی تھیں۔ مگر راستہ بتدریج پُرخطر ہونے کے باعث میں اپنی جیپ کی رفتار اس سے زیادہ نہیں ...سکتا تھا۔

"ہمارے پاس فرار کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے......... فاضل راؤنڈز ختم ہونے لگے ہیں۔" وزیر ...نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی تھی۔ مجھے پورا یقین ہو چلا تھا کہ ہم راستے بھٹک چکے ...اور جیپ کی فیول بتانے والی سُوئی بھی خاتمے (E) کی طرف جھک رہی تھی۔

معاً مجھے سامنے بائیں جانب ایک تنگ موڑ نظر آیا۔ ادھر عقب میں متعاقبین حملہ آوروں کی گاڑیوں اور ...وں وغیرہ کے دوڑنے کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مگر یہ تنگ موڑ کاٹنے کے لئے ...وری تھا کہ میں جیپ کی رفتار چالیس سے بھی کم کروں اور میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ...جیسے ہی میں نے رفتار دھیمی کی اور موڑ کے قریب پہنچتے ہی اسٹیئرنگ بائیں جانب گھمایا، اچانک سماعت ...ن دھماکا ہوا۔ ہماری جیپ نے ایک زبردست جھٹکا کھایا۔ بدقسمتی سے موڑ کاٹنے کے دوران ہی کوئی گولی ...ر کو برسٹ کر چکی تھی۔ نتیجتاً جیپ اُلٹتے اُلٹتے بچی تھی۔ اگر میں فوراً بریک نہ لگا دیتا تو جیپ دائیں جانب ...ایک نمودار ہونے والی گہری کھائی میں جا گرتی۔ چشم زدن میں دشمنوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وزیر خان اور ...ل اعظم "سرنڈر" کر چکے تھے۔ میں نے بھی بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ...ڑ دیئے۔ جیپ کا انجن بند ہو چکا تھا۔

اس کے بعد ہجیم شحیم مسلح افراد نے ہم سب کو بے دردی کے ساتھ گھسیٹ کر باہر نکالا۔ ان سب کے ...ے پُرخونخواری تھی۔ آنکھوں سے پُرغیظ اور فاتحانہ چمک مترشح تھی۔ نگینہ سہم کر میرے ساتھ آن لگی تھی۔

انہوں نے ہم سے کوئی بات نہ کی اور ہماری تلاشی لے کر نہتا کرنے کے بعد گاڑیوں میں ڈال دیا گیا۔ ...لوگوں کے تیور اس قدر جارحانہ اور خطرناک نظر آ رہے تھے کہ ہمیں ان سے کچھ پوچھنے میں بھی جان کا ...ہ محسوس ہو رہا تھا

نگینہ کی حالت زیادہ خراب تھی۔ اس نے جوں ہی امریکہ سے پاکستان، اسلام آباد ایئرپورٹ پر قدم ...اٹھا، نامساعد حالات کی ایک کے بعد ایک تڑابڑی کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔

مختصر سا قافلہ ہمیں لے کر روانہ ہوا اور جب ہم سردار آگرموشی کے قبیلے میں داخل ہوئے تو وہاں ہر ...ف مجھے خانہ جنگی کا نقشہ نظر آیا۔ کئی خون آلود لاشیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ دھوئیں اور گرد و غبار کے ...ا بارود کی ناگوار سی بُو پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے یہ سمجھنے میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہ لگی تھی کہ وہ کچھ ہو چکا تھا جس کی مجھے اور انکل اعظم خان کو توقع تھی۔ ...ایسا لگتا تھا کہ گزشتہ شب بغاوت کے دوران سردار آگرموشی کے جاں نثاروں نے اس بغاوت کو کچلنے کی ...اپنی پوری کوشش کی تھی لیکن شاید وہ اپنی جانوں کا نذرانہ دینے کے باوجود بھی کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ لیکن میرے لئے تشویش کی بات یہ تھی کہ اگر راس اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی چکا تھا تو پھر اس

نے اپنے حواری ہمارے تعاقب میں کیوں روانہ کئے تھے؟.....کیا انکل اعظم خان کے بدترین خدشات درست ثابت ہونے والے تھے؟ مکار اور شاطر رامس نے ہمیں اپنے مقصد کی خاطر استعمال کیا تھا اور درحقیقت رامس نے میرے ساتھ نہیں بلکہ عامل عاروب کے ساتھ اصل معاہدہ کیا تھا۔ گویا اب اس طرح دونوں کے مقاصد پورے ہو چکے تھے۔ رامس ہمیں تحفے کی صورت میں عامل عاروب کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔

ہمیں سردار آگرموشی کے درباری حجرے میں پیش کیا گیا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

رامس کو میں نے سردار آگرموشی کی تخت نما کرسی پر زرق برق لباس میں ملفوف براجمان پایا۔ اس کے سر پر سرداری کی سرخ دستار بھی نظر آ رہی تھی جس میں سنہری تاروں سے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں جانب کی نشست پر سردار آگرموشی کی فربہ اندام سرخ و سپید بیوی ناگاسی بھی موجود تھی۔ رامس بلکہ سردار رامس کے چہرے پر کروفر اور پُرغرور تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ ہمیں اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

''رامس! یہ کیا حرکت ہے؟.....تم نے میرے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ پھر یہ سب کیا ہے؟'' میں نے رامس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے بلند لہجے میں اسے مخاطب کر کے کہا۔

اس کی آنکھوں میں مکارانہ جھلک اور ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ اُبھری۔ پھر وہ حقارت سے اور گونجیلی آواز میں بولا۔

''بددیانتی کی ابتداء تم نے کی تھی نادر! اس رات میرے دونوں آدمیوں نے ہوٹل میں تمہاری گفتگو سن لی تھی۔''

میں اس کی بات پر چونکا اور اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ گزشتہ رات ہمارے کمرے کے باہر باتیں سننے والے وہ دونوں جاسوس اس کے بھیجے ہوئے تھے جنہوں نے مجھ پر رائفل بھی تانی تھی۔ مگر بعد میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مگر میں نے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔

''میں جن حالات سے دوچار تھا، مجھے اس بات پر شبہ تھا کہ کہیں تم ہمارے ساتھ بھی دھوکا کر سکتے ہو۔ اگر میرا خدشہ غلط تھا تو پھر تم نے اپنے جاسوس کیوں روانہ کئے تھے ہمارے پیچھے؟''

وہ بڑی ڈھٹائی سے ایک بدمست قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''بے وقوف! تمہیں اگر خطرے کا احساس ہو گیا تھا تو پھر تمہیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔ بلکہ میں تو تمہارے یہاں سے جاتے ہی پریشان ہو گیا تھا۔ خیر.....اب تمہارا فیصلہ جلد ہو جائے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے مسلح حواریوں کو حکم دیا۔ ''انہیں لے جا کر قید خانے میں ڈال دو۔''

❋❋❋

میں نے اس بات پر خدا کا شکر تو ادا کیا تھا کہ نگینہ کو مجھ سے جدا نہیں کیا گیا تھا مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ خطرہ سر سے ٹل چکا تھا۔ بلکہ ہم چاروں ہی اس مہیب خطرے کی ان دیکھی ہولناک زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

یہ اٹھارہ بائی بارہ کا مستطیل نما کمرہ تھا۔ چھت قدرے بلند اور سپاٹ تھی۔ دیواروں کے دائیں بائیں چربی سے جلنے والے لیمپ نصب تھے۔ زمین پر گھاس پھونس بکھری ہوئی تھی۔ فرش کھردرا اور کہیں کہیں سے ناہموار تھا۔

بادی النظر میں یہ قید خانہ زمین دوز ہی نظر آتا تھا۔ بہ الفاظ دیگر تہہ خانہ ہی معلوم ہوتا تھا کہ جہاں روشن



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کی بجائے دائیں جانب کی دیواروں کی بلندی پر روزن نظر آ رہا تھا۔ وہاں سے روشنی کی ہلکی سی کرن پھوٹ رہی تھی۔

چربی جلنے کی بساند کے ساتھ ساتھ در و دیوار سے وحشت اور سیلن سی ٹپک رہی تھی۔ جی بہت گھبرا رہا تھا۔ آواز بھی ہماری گونج رہی تھی۔ ہم چاروں وسط میں کھڑے حیران و پریشان اردگرد دیکھ رہے تھے کہ اچانک نگینہ نے وحشت زدہ سی چیخ ماری۔

''کیا ہوا.....؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''وہ.....وہ کون ہے؟'' نگینہ ایک کونے کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے کپکپاتی آواز میں بولی۔

ہم تینوں نے مذکورہ سمت کی طرف دیکھا تو چونک پڑے۔ ہمارے علاوہ بھی کوئی قید تھا۔ کونے میں دیوار گیر آہنی کڑوں سے منسلک فولادی زنجیروں میں کوئی جکڑا ہوا سر جھکائے بیٹھا نظر آیا۔ میں ہی سب سے پہلے لپک کر اس کی جانب بڑھا.....مدھم روشنی میں قریب جا کر میں نے دیکھا، وہ قیدی تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ شاید وہ بے ہوش تھا۔ پکی عمر کے اس شخص کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ وہ زخمی بھی تھا۔ اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ خون لگا ہوا تھا۔ سر اور پیشانی سے بہتا ہوا خون بھی جم کر چپکا رہ گیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ کر اس کا سر دھیرے سے اوپر کیا تو مجھے زبردست جھٹکا لگا۔

وہ بدنصیب سردار آگرموشی تھا۔

معزول سردار آگرموشی کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے گہرے دکھ اور کرب کا احساس ہوا۔ وہ زندہ تھا۔ اس کی آتی جاتی سانسیں گواہ تھیں کہ اس کے مضروب جسم سے روح کا رابطہ ابھی باقی ہے

میں اس کا گال تھپتھپا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے دونوں پیروں میں ٹخنوں کے گرد آہنی کڑے لگے ہوئے تھے جن سے زنجیر منسلک تھی اور دوسرا سرا دیوار میں آہنی کنڈوں کے ساتھ لگا تھا۔

وہ میری ذرا سی کوشش کے بعد ہوش میں آ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر اور نیم مردہ آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔ پھر ہولے سے کپکپاتی آواز میں بولا۔

''افسوس!.....صد افسوس.....'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ مارے نقاہت کے اس کی سانسیں اکھڑ گئیں۔

میں نے ہولے سے کہا۔ ''معزز سردار! حوصلہ رکھئے۔''

میں صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے کیا کہوں؟''

''اب کیسا حوصلہ.....؟'' وہ ہمت کر کے اپنے ریختہ وجود کی طاقت کو بہ مشکل سمیٹتے ہوئے بولا۔ ''سب تباہ ہو گیا.....میرے اپنے ہی سگے بھائی نے میرے خلاف بغاوت کر دی۔ اقتدار کے لالچ میں.....لیکن اس کا کوئی قصور نہیں.....مم.....میری اپنی ہی بیوی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ کیسا بدنصیب شخص ہوں میں۔ مجھے دشمنوں نے نہیں اپنوں نے مارا۔ میری پیٹھ میں خنجر گھونپ کر۔''

اس کے ایک ایک لفظ سے کرب اور شکست خوردگی، اس کی بدنصیبی کی طرح ٹپک رہی تھی۔ مایوسی بھی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔

میں اب اس سے کیا کہتا کہ یہ سارا کیا دھرا اسی کا تھا۔ میں نے اس سے مزید کوئی بات نہ کی اور اٹھ کر رہا۔

بغاوت کا زہر نہ جانے کب سے اس کے بھائی کے وجود میں سرایت کئے ہوئے تھا جس سے یہ غافل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



دوئم

رہا تھا۔ اگر شب گزشتہ میں بتا بھی دیتا تو بھی یہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ بغاوت کا علم یکدم ہی بلند نہیں ہوتا۔ پہلے اس کی بنیادیں بھری جاتی ہیں، طویل عرصے تک۔ اس کے بعد شب خون مارنے کا وقت آتا ہے۔ اس لئے میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ تھا۔

انکل اعظم خان نے میرے کاندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم خود قیدی تھے، اس کی کیا مدد کرتے؟ اس لئے اسے مجبوراً ایسی حالت میں چھوڑ کر واپس اپنی جگہ پر آ کر فرش پر بیٹھ گئے۔

قید خانے کا دروازہ سپاٹ تھا۔ اس میں جھری تک نہ تھی۔ اندر کی جانب بھی کنڈی نہیں تھی۔ ہم چاروں سر جوڑے بیٹھ گئے۔

''نہ جانے یہ خبیث رامس ہم سے اب کیا سلوک کرتا ہے۔ اس چکر میں بلاوجہ میں بھی پھنس گیا۔'' وزیر خان نے تلملا کر کہا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور انکل اعظم خان سے بولا۔

''انکل! یہاں سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔''

''کون سا؟'' انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ وزیر خان کی مستفسرانہ نظریں بھی میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''دروازے کے ساتھ اکھاڑ پچھاڑ کرنا پڑے گی۔''

''یہ کس طرح ہوگا؟..... باہر یقیناً پہرے دار موجود ہوں گے۔'' انکل اعظم نے کہا۔

''میرا خیال ہے ہمیں ایسی کوشش کرنے کی بجائے وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔ ورنہ نیا سردار رامس مشتعل ہو کر ہمارے خلاف اس سے بھی زیادہ سخت قدم اٹھا سکتا ہے۔'' وزیر خان پریشانی سے بولا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھا اور چوکھٹ پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ میں نے کان لگا کر دوسری جانب سے سن گن لیے کی کوشش کی مگر گہری اور وحشت انگیز خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

''واپس آ جاؤ..... کوئی فائدہ نہیں۔'' اچانک قیدی سردار آگر موشی کی آواز ابھری۔ ''اب ہمیں موت ہی یہاں سے باہر نکال سکتی ہے..... روحوں کی صورت میں..... ہا..... ہا..... ہا۔''

وہ پاگل پن کے مارے قہقہے لگانے لگا۔ معزول ہونے اور قید میں ڈالے جانے کے بعد اس کے حواس بری طرح متاثر نظر آ رہے تھے۔

مجھے دروازے پر گرفت جمانے کا ایک ذرا سا رخنہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند گھنٹوں بعد دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہم سب غیر ارادی طور پر گردنیں گھما کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا، چار عدد مسلح لحیم شحیم افراد اندر داخل ہوئے۔ مجھے دروازے کے باہر بھی چند مسلح افراد کھڑے نظر آئے تھے اور ایک اوپر جاتے ننگی اینٹوں کے ننگی زینے کی بھی جھلک نظر آئی تھی۔

ہمیں گن پوائنٹ پر باہر چلنے کا درشت حکم دیا گیا۔ ہم چاروں خاموشی سے اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔

زینے چڑھنے کے بعد جب ہمیں سردار رامس کے بڑے سے درباری حجرے میں لایا گیا تو مجھے دھچکا لگا۔ نگینہ کے حلق کے بھی مارے سراسیمگی کے گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہوگئی۔

وہاں باغی سردار رامس سمیت اس کے دیگر امراء بھی موجود تھے اور انہی میں مجھے وہ مردود و ملعون عامل عاروب بھی بیٹھا ہوا نظر آ گیا۔ اس کے چند مسلح ہرکارے بھی اس کے عقب میں چوکس کھڑے تھے۔



عاروب بڑی پُر غضب خونخوار نظروں سے ہماری جانب ہی دیکھے جا رہا تھا۔ باغی سردار رامس نے بھری نگاہ ہم پر ڈالی اور پھر قریب بیٹھے عامل عاروب سے گونجیلی آواز میں بولا۔

نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ یہ لو عاروب! ہم تحفے کے طور پر یہ چاروں تمہارے حوالے کرتے ہیں ان کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔''

دماغ جلنے لگا۔ ہمارے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو چکی تھی۔ میرا اس وقت رواں رواں جوشِ نفرت کے مارے کانپ رہا تھا۔

دونوں میرے لئے اجنبی ہیں..... کون ہیں یہ؟'' عاروب نے انکل اعظم خان اور وزیر خان کی طرف اشارہ کر کے سردار رامس سے پوچھا۔

اس کا نام اعظم خان ہے۔ یہ نادر کا کوئی رشتے دار ہے۔ جبکہ یہ دوسرا شخص وزیر خان ہے۔'' رامس بولا۔ ''وزیر خان تمہارے ایک آدمی سنکھال کی تلاش میں آیا ہے۔ اُس نے اس کے بھتیجے شہ زور کا قتل کیا۔ وہ اپنے علاقے کے سردار کا بیٹا تھا۔ یہ وزیر خان اس کا بھائی ہے۔''

عاروب وزیر خان کے متعلق یہ سب رامس کی زبانی جان کر بری طرح چونکا۔ پھر دوسرے ہی لمحے لہجے میں رامس سے بولا۔

مجھے صرف یہ دونوں چاہئیں۔ بس۔'' اس کا اشارہ میری اور نگینہ کی طرف تھا۔ ''باقی یہ تمہارے حوالے جو چاہے ان کے ساتھ سلوک کرو۔''

عاروب یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اور نگینہ کو آناً فاناً بیڑیاں پہنائی جانے لگیں۔ میں غصے سے لال رامس کو خوف ناک نظروں سے گھورتے ہوئے شیر کی طرح دھاڑا۔

رامس! یہ تُو اچھا نہیں کر رہا..... تجھے اس کا حساب دینا پڑے گا۔''

لے جاؤ اسے..... کہیں میں اِدھر ہی ان دونوں کا خاتمہ نہ کر ڈالوں۔'' رامس نے شعلہ بار نظروں کی طرف گھور کر عامل عاروب سے کہا۔

کے بعد عامل عاروب کے پانچ چھ مسلح ہرکاروں نے مجھے اور نگینہ کو بازوؤں سے پکڑا اور نہایت کی کے ساتھ گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

تین چار جیپیں کھڑی تھیں۔ کچھ مسلح افراد خچروں اور گھوڑوں سمیت کھڑے تھے۔ ان کے مخصوص وں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سب عامل عاروب کے ہرکارے ہی تھے..... ایک بڑی سی بگھی ئی تھی جس میں چار تنومند خچر جتے ہوئے تھے۔ عامل عاروب کو میں نے اسی بگھی میں سوار ہوتے

نے یہ غور اطراف میں نگاہ ڈالی تھی۔ ہمیں لینے کے لئے عامل عاروب کا دستہ تقریباً بیس بچیس ں پر مشتمل تھا۔

عامل عاروب کے چنگل میں پھنسنے کی وجہ سے نگینہ بری طرح خوف زدہ تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ کہ وہ اس مردود کے خونی عزائم سے واقف تھی جو اسے اپنے دیوتا دابوا امینزی کی بھینٹ چڑھانے کا ارادہ باندھے ہوئے تھا۔ میں خود اندر سے بری طرح پریشان اور تشویش زدہ ہو رہا تھا۔ مگر میں نے واس تحمل ہونے نہیں دیئے۔

اب کک..... کیا ہوگا..... نن..... نادر!'' معاً نگینہ نے سہمی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔ پورا وجود کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور فی الحال خاموش رہنے کا

کہا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ میرے ہاتھ پاؤں آہنی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔

سفر جاری رہا۔ مجھے عامل عاروب کے قبیلے تک کے فاصلے کا یہاں سے بہ خوبی اندازہ تھا جو گھنے محیط تھا۔ راستہ تنگ اور ناہموار ہونے کے باعث گاڑی کی رفتار زیادہ نہ تھی۔ میں جلتے سلگتے ذہن پر زور دے رہا مگر لگتا تھا شاید اس بار یقینی طور پر مفر کی تمام راہیں ہی مسدود و مفقود ہو چکی تھیں۔ دل و دماغ میں طرح کے اندیشوں اور وسوسوں کے ناگ بار بار پھن کاڑھے ڈسنے کو تیار معلوم ہوتے تھے۔ کوئی راہ سجھائی دے رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ایکا ایکی بدلتی ہوئی خطرناک اور سنگین تر صورت سے کس طرح چھٹکارا پایا جاتا۔

جب سوچ و خرد کے تمام راستے مفقود ہو جائیں اور کوئی دوا کام نہ کرے..... جب مایوسیوں نا اُمیدیوں کے مہیب اندھیروں میں اُمید کی ایک کرن بھی نہ نظر آئے تو انسان ایسے میں اپنے خالق اور معبود ہی کو پکارتا ہے۔ اللہ..... جتنا بڑا نام ہے، اتنا ہی بڑا آسرا۔ میں نے بھی ایک مجبور و بے بس عاجز بندے کی طرح صدقِ دل اور بہ زبانِ دل اللہ کو پکارا۔

''اے اللہ!..... اے میرے معبود!..... تُو نے مجھے جتنی عقل اور طاقت دی، میں اسے اب بروئے کار لاتے ہوئے اپنے دشمنوں پر حاوی ہوتا رہا، ان پر غلبہ پاتا رہا۔ لیکن آخر کب تک۔؟ آج مجھے جسمانی طاقت ہی نہیں بلکہ ذہنی قوت بھی شاید ایسے کڑے حالات سے نہیں نکال سکتی۔ اب تُو ہی میری نگینہ کی دست گیری فرما سکتا ہے۔ تیرے فضل کی ایک ہی جھلک مجھے اور نگینہ کو اس نا اُمیدی کے اندھیر سے نجات دلا سکتی ہے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ سچے دل سے نکلی ہوئی دعا اور دیدۂ تر سے بہنے والی فریاد ضرور پوری ہوتی ہے۔''

دعا مانگنے کے بعد مجھے اپنے اندر عجیب سا روحانی سکون محسوس ہوا۔ میں ایکا ایکی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

میں اور نگینہ جیپ کے عقبی حصے میں تھے۔ ہمارے دائیں بائیں دو مسلح ہرکارے براجمان تھے۔ درمیانی سیٹوں پر، ایک ڈرائیور کے برابر والی نشست پر۔

سفر کو تقریباً نصف گھنٹہ گزر چکا تھا۔ گویا ''مقتل گاہ'' تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ باقی رہا تھا۔

عامل عاروب سمیت اس کے خونی ہرکاروں کا یہ قافلہ اس وقت برف زار ویرانوں سے گزر رہا تھا۔ پھر اچانک جیسے میری دعا سن لی گئی۔ لیکن جو بھی کچھ ہوا، وہ عقل سے بالاتر بہر حال نہیں تھا اور نہ ہی اسے کوئی معجزہ کہہ سکتے تھے..... تاہم جو کچھ ہوا تھا، وہ بالکل فطری اور منطقی انداز میں ہوا تھا۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ بھی ہوا تھا، وہ شاید غیر متوقع تھا۔ مگر فطری ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ رات کی تاریکی میں دشوار گزار راستوں پر عامل عاروب کے خونی ہرکاروں کے ٹولے کی جیپیں آگے پیچھے دوڑی جا رہی تھیں کہ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ ہم سب بری طرح چونک گئے۔ پھر ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ آنکھوں نے عقبی سیٹ سے سامنے ونڈ اسکرین کے پار ہماری جیپ کے آگے چلنے والی جیپ کو کسی راکٹ بلاسٹ ہوتے دیکھا..... شاید اس پر راکٹ لانچر داغا گیا تھا۔ یہی نہیں، ایسے پے در پے مزید دھماکے بھی سنائی دیئے تھے۔ مزید دو جیپوں کا مع سواروں کے خانہ خراب ہو گیا تھا۔ اب صرف ہماری اور ایک جیپ سلامت تھی، جس پر عامل عاروب سوار تھا۔

صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دونوں جیپوں کے سواروں نے مذکورہ سمت سے داغی جانے والیوں اور راکٹوں کی سمت پر اپنی گنوں کے منہ کھول دیئے اور پلک جھپکتے ہی جیپوں سے نیچے اتر گئے۔ جیپ سواروں کو اپنی پڑی تھی اس لئے وہ ہمیں بھی خاطر میں لائے بغیر اچانک شب خون مارنے والے نامعلوم ٹولے سے جنگ کرنے کے لئے نیچے اتر گئے تھے۔ میرے اندر زبردست ہلچل مچ گئی۔ تدبیر کے نہیں، تقدیر کے وسیلے قسمت نے ہمیں فرار ہونے کا موقع دیا تھا جبکہ نگینہ اس اچانک افتاد پر کچھ ہراساں ہو گئی تھی۔

گمان تھا کہ معزول سردار آگرموشی کے جاں نثار مسلح ٹولے نے عامل عاروب کے اس کارواں کو باغی قبیلے کا حلیف ہونے کی سزا دی ہو۔ اور اس خیال کو بھی مدنگاہ رکھنا ضروری تھا کہ کسی پل وہ ہماری جیپ پر بھی راکٹ لانچر کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ اسی لئے میں نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا فوری طور پر ارادہ کر لیا۔ سب سے پہلے نگینہ سمیت سیٹوں کے درمیان میں دبک گیا۔ کیونکہ گولیوں کی بوچھاڑ ہنوز جیپ کو نشانہ بنا رہی تھی۔ جیپ کے ٹائر، کھڑکیوں اور ونڈ اسکرین کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے، تاہم دونوں جیپیں سلامت تھیں۔ شاید بروقت جوابی کارروائی نے نامعلوم حملہ آور ٹولے کو کسی حد تک دور رکھنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔

''ہمت سے کام لو..... گھبرانا نہیں..... ہم یہاں سے نکلنے والے ہیں۔'' میں نے جوش سے لبریز آواز میں اسے مخاطب کیا۔ شکر تھا کہ ہمارے پاؤں آزاد تھے۔ میں نے ذرا سر ابھار کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ تاریک ماحول میں شعلہ فشاں لکیروں کے سوا کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ میں جھکے جھکے رینگ کر جیپ کی کھڑکیوں پر آ گیا اور نگینہ نے بھی ذرا حوصلہ پکڑتے ہوئے میرا ساتھ دیا تھا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیوں کے گرد فولادی زنجیریں جکڑی ہوئی تھیں، تاہم میں نے ہمت نہ ہاری تھی۔ حملہ بائیں جانب سے تھا جبکہ دائیں جانب کی جگہ خالی تھی۔ ہم دونوں جیپ سے باہر تاریکی میں اتر گئے۔ گولیوں کی سمع خراش تڑاہٹ جاری تھی۔ بادی النظر میں مجھے نامعلوم حملہ آور ٹولے کا پلڑا بھاری محسوس ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے عامل عاروب کے ہرکاروں میں سے چند ایک کی لاشیں بھی پڑی دیکھی تھیں۔ میں اور نگینہ

تاریکی کا حصہ بنے سنگلاخ چٹانوں کے خلا میں آ گئے۔ سردست ہمارا ادھر محبوس رہنا بہتر تھا۔ باہر گھمسان رن پڑا ہوا تھا۔ بے تحاشا فائرنگ کی زد میں ہم دونوں بھی آ سکتے تھے۔ بلکہ عاروب کے کسی خونی ہرکارے اگر ہم پر نظر پڑ جاتی تو مشتعل ہو کر وہ ہمیں بھی گولیوں سے چھلنی کر سکتا تھا۔

عامل عاروب کے خونی ہرکاروں کے ٹولے کے مقابلے میں نامعلوم حملہ آور کا گروہ شاید زیادہ بڑا اور خطرناک اسلحہ رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ نہ صرف گولیوں کی بوچھاڑ جاری رکھے ہوئے تھے بلکہ گاہے گاہے گرینیڈ، راکٹ لانچرز کا بھی آزادانہ استعمال کر رہے تھے۔ وہ یقیناً پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔

جبکہ عامل عاروب کا خونی ہرکاروں کا ٹولا بھی کم نہ تھا۔ تاہم انہیں اس حملے کی ذرا سی بھی توقع نہیں تھی وہ پیشگی ایسی کسی بھرپور تیاری میں تھے۔ مگر باوجود اس کے وہ بھی ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔

میں سمجھتا تھا کہ جس قدر سرعت کے ساتھ میرے ذہن نے اس بات کا اندازہ لگایا تھا کہ ہم پر اچانک ہلہ بول دینے والا گروہ کون ہو سکتا تھا؟ شاید عامل عاروب یا اس کے ہرکاروں کو ادراک نہ ہو سکا تھا۔ سبب تھا کہ انہوں نے واپسی پر متوقع جنگی ''احتیاط'' نہیں برتی تھی۔

بہرطور چونکہ مجھے سو فیصد اندازہ ہو چکا تھا اور میں نے کسی حد تک اس کی فائرنگ سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا اور ''ہرنگ پوائنٹ'' سے خود کو اور نگینہ کو بہ حفاظت نکال کر ''بلینک پوائنٹ'' پر آ گیا تھا۔

فائرنگ کا شور بتدریج تھمنے لگا۔ کہیں کہیں سے اِکا دُکا برسٹ چلنے کی آتشیں گرج اُبھرتی اور پھر طرف پراسرار اور بھیانک سناٹا چھانے لگتا۔

میں نے سنگلاخ خلاء سے ذرا اُبھر کر مدھم چاندنی میں گردوپیش کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو مجھے بے ترتیب پڑی لاشوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ فضا میں بارود کی ناگوار بُو رچی ہوئی تھی۔ دفعتہً میں نے چند ہیولوں کو متلاشی انداز میں مڑتے دیکھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ بہرحال عامل عاروب کے ہرکارے نہ تھے۔ اچانک پھر ایک کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں یکدم اندر ہو گیا۔ لیکن چونکہ دیکھ لیا گیا تھا اور ساتھ ہی کسی کو چلا کر کچھ کہتے سنا تو مجھے خدشہ ہونے لگا کہ کہیں ہمیں بھی دشمن سمجھ کر یہ ہم پر گولیاں نہ داغ دے۔ چنانچہ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ نگینہ کے ساتھ باہر نکل آؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

ہم دونوں بندھے ہوئے ہاتھ بلند کئے سنگلاخ خلاء سے باہر آ گئے۔

وہ بھی ادھر ہی کو تیزی کے ساتھ لپکے تھے۔ ہمیں ہاتھ اٹھائے نمودار ہوتے دیکھ کر وہ سب ٹھٹک کر رک گئے اور ہم پر گنیں تان لیں۔ ایک نے تیز روشنی ہم پر پھینکی تھی۔ کسی نے عجیب سی بولی میں اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے انہوں نے ہمیں کسی حوالے سے یا تو پہچان لیا تھا یا پھر ہمارے قیدی ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا۔

ہر سُو چٹکی ہوئی چاندنی میں کئی اور مسلح ساتھی بھی ان سے آن ملے۔ یہ سب چست لباس میں تھے۔ ان میں ایک نسبتاً خاصا لحیم شحیم بھی تھا۔ اس کی شخصیت خاصی رعب و دبدبے والی تھی۔

اس نے بہ غور ہماری طرف دیکھتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے کہا۔ ''تم دونوں وہی تو نہیں ہو سردار آگرموشی کے مہمان تھے؟''

''ہاں..... ہم وہی ہیں۔'' میں نے فوراً دھڑکتے دل سے کہا۔ ''میرا نام نادر ہے..... اور یہ میری ساتھی نگینہ ہے۔ ہمیں غاصب سردار رامس نے عامل عاروب کے حوالے کر دیا تھا۔''

میری بات پر وہ چند قدم چلتا ہوا میرے ذرا قریب پہنچ کر رکا تو میں نے بہ غور اس کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کی اور دوسرے ہی لمحے میرے اندر بھیانک وسوسوں نے سر اٹھایا۔ اس


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے تاثرات میں برہمی کا عنصر غالب تھا اور مجھے ڈر ہوا تھا کہ کہیں یہ ہمارے دشمن ہی نہ ہوں۔ کم از کم اس کے چہرے کے غصیلے تاثرات سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا۔

پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے سخت لہجے میں کچھ کہا اور یہ لوگ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے لگے۔

قریب ان کی دو تین لمبی لمبی اور اونچے چوڑے ٹائروں والی جیپیں کھڑی تھیں۔ ایک میں ہمیں سوار کرایا گیا اور پھر یہ لوگ ہمیں لے کر تاریکی میں انجان منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

میرا دل وسوسوں کے باعث بری طرح دھڑک رہا تھا اور بار بار ذہن میں یہی تشویش ناک خیال اُبھر رہا تھا کہ کہیں ہمارے ساتھ، آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ تو نہیں ہوا تھا؟..... بہرطور سفر خاموشی سے جاری رہا۔

لگ بھگ کوئی نصف، پون گھنٹے بعد جیپیں رکیں۔ ہمیں نیچے اتارا گیا۔ مجھے سامنے چند چھوٹی بڑی چھولداریاں نظر آئیں۔ یہاں پیٹرومیکس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں ایک نسبتاً بڑی چھولداری میں لایا گیا۔ یہاں بھی ایک پیٹرومیکس روشن تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے یہاں مقدور بھر ضرورت کا ہر سامان نظر آیا تھا۔ ہمارے ساتھ بارعب شخصیت والا لمبا تڑنگا آدمی بھی دو مسلح ساتھیوں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ ہمیں ایک طرف کونے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہی لحیم شحیم شخص ہمیں گھورنے لگا۔

میری تشویش ناک بے چینی فزوں تر ہونے لگی۔ میں کچھ دیر تو اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر جب وہ کچھ نہ بولا تو میں نے کہا۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے ہمیں عامل عاروب کے خونی چنگل سے رہائی دلائی۔ کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

میرے تشکر آمیز لہجے کے باوجود وہ بدستور مجھے سنسناتی نظروں سے گھورتا رہا۔ اس کے چڑھے ہوئے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی وقت بھی مجھے اور نگینہ کو گولی سے اُڑا دینے کا حکم جاری کرنے والا تھا۔ میں نے ہمت کر کے دوبارہ کہا۔

''مجھے کچھ اندازہ تو ہوتا ہے کہ ہم دوستوں میں ہیں۔ کیا وہ کمینہ عاروب مر گیا؟'' اس بار وہ بڑے نفرت آمیز لہجے میں مجھ سے بولا۔

''بکواس بند کرو اپنی۔ ہم صرف سردار آگرموشی کے جاں نثار ساتھی ہیں اور تم نے اپنے میزبان کے ساتھ دھوکا کیا۔'' اس کے انداز اور جملے نے مجھے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ صورت حال تقریباً وہی تھی جو میں نے سوچی تھی تاہم اس کا رخ تبدیل ہو چکا تھا۔ ہم مصیبت سے نکلنے کے باوجود مصیبت میں گھرے ہوئے تھے۔

میں نے امید اور حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سے قدرے حیرت زدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو دوست!..... تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''میں سب جانتا ہوں۔'' وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''تم نے رامس سے مل کر ہمارے سردار آگرموشی کے خلاف بغاوت کی سازش میں اس کی مدد کی۔''

''یہ غلط ہے۔'' میں نے بھی پُرزور لہجے میں احتجاج کیا۔ ''شاید تمہارے علم میں یہ بات نہیں کہ سردار آگرموشی نے خود مجھے اپنی ساتھی نگینہ کو عامل عاروب کی قید سے چھڑانے کی غرض سے رامس کے ساتھ روانہ کیا تھا اور.....''

''ہاں..... مجھے پتہ ہے۔'' وہ دانت پیس کر کونجیلی آواز میں بولا۔ ''اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ راستے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



میں رامس نے تمہارے ساتھ کیا سازباز کی تھی۔'' اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ مجھے جھٹکا لگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''تم نے عامل عاروب کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن راستے میں اس سازشی رامس نے تمہارے ساتھ ایک خفیہ سازباز کر ڈالی کہ اگر وہ خود عامل عاروب کے ٹھکانے پر جا کر تمہاری ساتھی کو مذاکرات کے ساتھ چھڑا لایا تو تم عامل عاروب کے خلاف سردار آگرموشی کے جنگ کے سلسلے کو روکنے کی کوشش کرو گے۔ تم نے فوراً ہامی بھر لی اور یوں رامس اپنے پرانے اور خفیہ دوست عامل عاروب کے پاس جا کر تمہاری ساتھی کو لے آیا۔ ہمیں تم پر پہلے ہی شبہ تھا۔ یوں بھی ہم کافی عرصے سے رامس کی جاسوسی کر رہے تھے۔ یہ باتیں ہمارے ہی ایک جاسوس نے بتائی تھیں جسے کچھ روز پہلے ہی رامس کی طرف سے متوقع بغاوت کو بے نقاب کرنے کے لئے اس کے پیچھے لگایا گیا تھا۔ اس نے یہ ساری باتیں خود سنی تھیں۔ بولو، اب کیا کہتے ہو؟'' اتنا کہہ کر وہ مجھے گھورنے لگا۔

میرے منہ سے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوگئی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کی غلط فہمی کی اصل وجہ کیا تھی۔ میں نے پُرسکون لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں معلوم ہوگا کہ جب میں معزز سردار آگرموشی کا مہمان ہوا تھا تو ہمارے درمیان مشترکہ طور پر عاروب عامل کو ہمیشہ کے لئے نابود کرنے کا منصوبہ طے پا چکا تھا۔ معزز سردار آگرموشی عامل عاروب کے خلاف تیسری بار فیصلہ کن جنگ کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اس سے استدعا کی تھی کہ اس طرح عامل عاروب اشتعال میں آکر میری ساتھی کو جانی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے پہلے مجھے خود تنہا جا کر اپنی ساتھی کو گوریلا آپریشن کے ذریعے اس کی قید سے چھڑانا ہوگا۔ اس کے بعد عامل عاروب کے خلاف جنگ کا بگل بجایا جا سکتا ہے۔ یہ معاملہ طے پا گیا مگر اس سے ایک رات قبل رات مہمان خانے میں مجھ پر کسی نامعلوم شخص نے قاتلانہ حملہ کیا۔ میں خوش قسمتی سے بال بال بچا تھا۔ پھر اسی رات ایک بوڑھے وید نے مجھے بڑی رازداری کے ساتھ بتایا تھا کہ مجھ پر یہ قاتلانہ حملہ کرانے والا معزز سردار آگرموشی کا بھائی، رامس ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عامل عاروب کے ساتھ رامس کے خفیہ دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ نہیں چاہتا کہ عامل عاروب کے خلاف جنگ کی جائے۔ اس لئے کہ میں نے ایک خون ریز مقابلے میں عامل عاروب کے کمانڈر بوغا کو ہلاک کر ڈالا تھا اور اس وقت عامل عاروب کی جنگی پوزیشن کمزور تھی۔ لہٰذا میں اب رامس سے بچنا چاہتا تھا کہ اگلے دن معزز سردار آگرموشی نے خود مجھے اس کے ہمراہ عامل عاروب کے خلاف میرے ساتھی کو چھڑانے کی مہم میں روانہ کر دیا۔ میں مجبور تھا۔ بغیر ثبوت کے میں بھلا کس طرح معزز سردار آگرموشی سے یہ کہتا کہ مجھے اس کے اپنے بھائی رامس سے بغاوت اور غداری کی بُو آتی ہے۔ ناچار مجھے اس مہم میں ایک دوست نما دشمن کے ساتھ روانہ ہونا پڑا۔ راستے میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے پستول میں گولیاں نہیں ہیں جبکہ بدخصلت رامس نے اپنی گولیوں سے بھرا پستول مجھ پر تان لیا اور مجھے اس معاملت پر مجبور کیا۔ میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ تاہم میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ چاہے کسی طرح بھی سہی، ایک بار اپنی ساتھی کو حاصل کر لینے کے بعد میں یہی چال رامس پر الٹ دوں گا۔ مگر افسوس کہ مجھے اس کا موقع نہ مل سکا اور ادھر راتوں رات رامس کے ساتھیوں نے معزز سردار کے خلاف بغاوت کر ڈالی۔ اور میں اور میرے دیگر ساتھی (انکل اعظم اور وزیر خان وغیرہ) بھی اس کے قیدی بنا لئے گئے۔ پھر ہمیں اس قید خانے میں ڈالا گیا جدھر معزز سردار آگرموشی بھی مقید تھے۔ اب تم ہی بتاؤ، اس میں میرا کیا قصور ہے؟..... میں تو آج بھی عامل عاروب پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھا ہوں۔''



میں نے یہ ساری باتیں بیان کرنے کے بعد خاموشی اختیار کر لی۔

میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر اب یکلخت درشتی اور نفرت کی جگہ اُلجھن آمیز تذبذب نے لے لی ہے۔ میں نے لوہا گرم ہوتے دیکھ کر ایک آخری چوٹ کی۔

''مجھے خود افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ معزز سردار آگرموشی میرا میزبان نہیں، میرا محسن بھی ہے۔ میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ اس سلسلے میں مجھ سے جو ہوگا میں اپنی جان کی بازی لگا کر انجام دوں گا۔ مجھے خوشی ہوگی کہ اگر مجھے تم اپنے ساتھ مہم میں شامل کر لو تو۔''

وہ میری بات پر چند ثانیے کچھ سوچتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر دوستانہ تاثرات نمودار ہونے لگے تھے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو کوئی حکم دیا۔ اس کے بعد سب سے پہلے میرے اور نگینہ کے ہاتھوں کی آہنی بیڑیاں توڑ دی گئیں۔ اب ہم مکمل طور پر دوستانہ ماحول میں فرش پر بچھی کھال کی دری پر بیٹھ گئے۔ اس شخص نے مجھے اپنا نام رشنی گال بتایا تھا اور وہ سردار آگرموشی کے اس خفیہ دستے کو کمانڈ کر رہا تھا۔

اس نے میرے دوبارہ استفسار پر بالآخر بتایا کہ اس کے تازہ حملے میں عامل عاروب بچ نکلا تھا۔

''ہمارے ساتھیوں کی تعداد کتنی ہے؟'' میں نے رشنی گال سے پوچھا۔

''پچیس، تیس کے قریب ہوں گے۔'' وہ جواباً بولا۔ ''جبکہ اس سے دگنی تعداد ابھی منتشر ہے۔ مگر ہم جلد انہیں اپنے ساتھ شامل کر لیں گے۔''

''قبیلے میں، سردار آگرموشی کے ہم خیال لوگوں کی تعداد کا کچھ اندازہ ہے تمہیں؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے..... تیس، چالیس فیصد لوگ ہوں گے۔''

''تمہارا آئندہ کا کوئی منصوبہ..... غاصب سردار رامس کے خلاف؟''

''اس کا قتل۔'' رشنی گال پُرغیظ لہجے میں بولا۔

''ابھی یہ ناممکن تو نہیں، مشکل ضرور ہے۔'' میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے سب سے پہلے ہمیں معزول سردار آگرموشی کو اس کی قید سے آزاد کرانا ہوگا..... میرے ساتھی بھی رامس کی قید میں ہیں۔''

''ہم یہ دونوں کام بیک وقت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں..... اور ساتھ ہی ساتھ، عامل عاروب کو بھی ٹھکانے لگانا چاہتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''سنو میری بات۔'' میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی رامس کا قتل قبل از وقت ہوگا۔ جب تک کہ ہم معزز سردار آگرموشی کو اس کی قید سے نہ چھڑا لیں۔ یہ معرکہ اگر ہم کامیابی سے سر کر لیں تو بہت ہوگا۔ بصورت دیگر رامس مظلوم قرار پائے گا۔ اقتدار اور سیاست جنگ میں ایسا ہی غلط قدم اٹھانے کے باعث مظلوم، ظالم اور ظالم، مظلوم قرار پاتا ہے۔ پھر کیا ہوگا، اس کی جگہ دوسرا سردار آ جائے گا۔ رامس اپنی کابینہ مضبوط بنا چکا ہے لیکن اگر ہم پہلے معزز سردار آگرموشی کو اس کی قید سے چھڑا لیں تو قبیلے میں ہمارے تیس فیصد ہم خیال لوگوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے، بلکہ میں ہماری رامس کے خلاف کارروائی بھی مؤثر ثابت ہوگی۔''

رشنی گال کے چہرے پر میری بات کی اثر پذیری کے تاثرات اُبھرے۔ میری تجویز اس کی سمجھ میں آ گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی راہ نہیں تھی۔ تھوڑی سی بحث کے بعد اسے میری بات ماننا پڑی۔

"اب میں تمہیں آئندہ کا لائحہ عمل بتاتا ہوں۔" میں نے آخر میں کہا۔ "اپنے ساتھیوں کو تین حصوں میں بانٹ دو۔ ایک قبیلے کے تیس فیصد ہم خیال آبادی میں داخل ہو کر ان کے ساتھ مل کر دیگر لوگوں کو غاصب سردار رامس کے خلاف اکسائیں گے۔ دوسرے عامل عاروب کے گروہ پر نگاہ رکھیں گے۔ اس کی کمانڈ تم کرو گے۔ جبکہ تیسرا میرے ساتھ غاصب سردار رامس کی رہائش گاہ پر شب خون مار کر معزول سردار آگرموشی اور دیگر قیدیوں کو چھڑانے کی مہم پر روانہ ہوگا۔"

میں نے اسے اپنے تئیں جنگی حکمت عملی ترتیب وار بتاتے ہوئے کہا۔ وہ بڑی توجہ اور غور سے میری بات سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے میرے لئے ستائش کے تاثرات جھلکنے لگے تھے۔

اب اس کا میرے ساتھ گفتگو کا انداز بھی احترام آمیز اور دوستانہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری جنگی حکمت عملی اسے بہتر لگی تھی۔ جس سے میرا اخلاص ظاہر ہوتا تھا۔ وہ آخر میں بولا۔

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تمہارے ٹولے والی مہم میں خود میں بھی شامل رہوں؟"

میں نے اس کے کاندھے پر دوستانہ انداز میں تھپکی دی اور اسی لہجے میں بولا۔ "دوست! میں نے مختلف مہمات کے لئے جن لوگوں کی گروپ بندی کی ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر کی ہے۔ تم دیکھنا، ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" بالآخر اس نے اس کی تائید کر ڈالی۔

غیر محسوس طریقے سے معزول سردار آگرموشی کے جاں نثار ٹولے کی کمان میرے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ چنانچہ میں نے ہی رشنی گال کے ساتھیوں کے ساتھ ایک نشست جمائی اور راتوں رات سب کو اپنی اپنی مہمات سر کرنے سے متعلق آگاہی دے ڈالی۔ میں نے اپنے ہمراہ صرف نو افراد رکھے تھے۔ دسواں میں خود تھا۔

ہم نے اگلے دن پہلے ایک ٹولے کو قبیلے کی طرف روانہ کر دیا۔ نیز دو مخبر بھی ہم نے الگ سے چن کر چھوڑ دیئے۔ ان دو مخبروں نے اگلے دن کا سورج ڈھلنے سے قبل ہمیں ایک خوف ناک خبر دی۔ اطلاع یہ تھی کہ معزول قیدی سردار آگرموشی کو عامل عاروب کے "بے گناہ" قبیلے پر تین مرتبہ جنگی جارحیت کے جرم میں اور اپنے قبیلے کو بھی بلاوجہ اس جنگ کی آگ میں جھونکنے اور تینوں بار ناکامی کی صورت میں دونوں طرف کے لوگوں کو بے گناہ اموات کی پاداش میں امراء کے متفقہ فیصلے کے مطابق علی الصباح سرعام پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ جبکہ اس کے دیگر معاونت کار دو مہمان قیدی ساتھیوں یعنی انکل اعظم خان اور وزیر خان کو بھی یہی سزا سنائی گئی۔ اس اطلاع نے نہ صرف مجھے پریشان کر ڈالا تھا بلکہ معزول قیدی سردار آگرموشی کے جاں نثاروں میں بھی غم و غصے اور تشویش کی لہر دوڑا دی تھی۔

"ہم آج ہی اس غاصب سردار رامس کی رہائش گاہ پر شب خون ماریں گے۔" رشنی گال نے غضب ناک لہجے میں کہا تو میں بولا۔

"نہیں دوست!..... یہ اتنا آسان نہ ہوگا۔ اس طرح اپنے ہی ساتھی بلاوجہ اور بے دردی سے موت کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ رامس سردار کی رہائش گاہ کسی معمولی انسان کی رہائش گاہ نہیں ہے بلکہ میرے ذہن میں اب موجودہ حالات کے مدنظر ایک نئی منصوبہ بندی تشکیل پا چکی ہے۔ اب گوریلا کارروائی ہی کرنا پڑے گی۔" میں نے آخر میں پُرسوچ لہجے میں کہا۔ مگر رشنی گال مطمئن نہ ہوا۔ وہ بولا۔

"اب اس نئی اطلاع کے بعد ہماری گوریلا کارروائی (کمانڈو ایکشن) کا کوئی مقصد؟"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو رشنی گال!" میں نے پُرزور لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "گوریلا


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کارروائی ہی موثر رہے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہمیں اب اپنی کارروائی کرنے کے لئے ایک آسان موقع مل چکا ہے۔"

"آسان موقع؟" رشنی گال نے اُلجھے ہوئے لہجے میں دہرایا۔

"ہاں..... آسان موقع۔" میں نے اسرار بھرے لہجے میں کہا اور مزید بولا۔ "تم نے شاید مخبر کی باتوں پر غور نہیں کیا۔ قیدیوں کو کل صبح سرِ عام پھانسی دی جائے گی اور اس کے لئے راتوں رات غاصب سردار رامس کی رہائش گاہ سے تقریباً گیارہ کلومیٹر دور ایک میدان میں پھانسی گھاٹ کی تعمیر بھی شروع کر دی گئی ہے۔ مذکورہ مقام آبادی کے بیچوں بیچ واقع ہے اور ظاہر ہے وہاں تک قیدیوں کو لانے کے لئے غاصب سردار رامس کی رہائش گاہ کے تہہ خانے والے قید خانے سے باہر بھی نکالا جائے گا۔ ہم درمیانی فاصلے پر گھات لگا کر بیٹھ جائیں گے۔ اور جیسے ہی قیدیوں کو پھانسی گھاٹ تک لے جانے والا یہ مختصر کارواں وہاں سے گزرے گا، ہم اس پر اچانک ہلّہ بول دیں گے۔ اب یہی صورت ہو سکتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے اپنے ٹولے کے ساتھیوں کی تعداد بڑھانا ہوگی۔"

"ٹھیک ہے..... پھر میں اس مہم میں شامل رہوں گا۔" وہ یکدم بولا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

اب میرے کاندھوں پر بڑی بھاری اور مشکل ذمے داری آن پڑی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ فکر انکل اعظم خان کی طرف سے لاحق تھی۔ انہوں نے ہم ماں بیٹے کا ہر مشکل وقت میں ساتھ دیا تھا اور اب تک دیتے چلے آ رہے تھے۔ میں ان کا مشفقانہ رویہ بھلا کیسے بھلا سکتا تھا؟

ہم نے بھی اپنی جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور علی الصباح منہ اندھیرے اپنی خطرناک مہم کی طرف نکل پڑنے کی تیاری مکمل کر چکے تھے۔ البتہ نگینہ میری طرف سے بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ ذرا تنہائی پاتے ہی مجھ سے بولی۔

"نادر! میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔"

میں نے مسکرا کر اسے ملائمت سے سمجھایا۔ "نگینہ! حوصلہ رکھو اور میری کامیابی کی دعا کرو..... اس وقت انکل اعظم کی زندگی داؤ پر لگی ہے۔ تم خود سوچو، بھلا میں انہیں کل بے گناہ پھانسی پر چڑھتا کیسے دیکھ سکتا ہوں؟"

میری بات پر نگینہ خاموش تو ہو گئی تھی لیکن اس کی سرمگیں آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ اسے روتا دیکھ کر میرا دل پسیج گیا۔ میں نے اس کے دونوں شانے محبت بھرے انداز میں تھامتے ہوئے کہا۔

"پلیز نگینہ!..... تمہارے یہ آنسو مجھے کمزور بنا دیں گے۔ کیا یہ خوشی کی بات نہیں کہ ہم اس خونی اور سفاک عامل عاروب کے شیطانی چنگل میں جانے سے بچ گئے ہیں اور اس وقت ہم دونوں محفوظ پناہ گاہ میں ہیں۔ بس صرف کل کا دن اور سہہ لو اور میرے لئے دعا کرو۔ پھر نامساعد حالات کے قفس سے ہماری قیدی زندگی آزاد ہو جائے گی اور ہمیشہ کی خوشیاں ہمارا مقدر ہوں گی۔"

"مم..... مگر..... نن..... نادر! کک..... کل ہماری زندگیاں ہمیشہ کے لئے غموں کے قفس کی قیدی بھی تو....." وہ لرزتی آواز میں کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ مگر میں اس کی دھوری بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔

"اللہ سے اچھی امید رکھو..... تم نے دیکھا، اس رب العزت نے آج تک مجھے ہر خطرناک مہم میں کامیابی ہی نصیب کی ہے اور ایسا ہوتا آیا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں ہمیشہ حق کی فتح ہی ہوئی ہے۔"

''حق کی جنگ میں خون کا نذرانہ دے کر بھی تو فتح حاصل ہوتی ہے نادر!'' اچانک نگینہ نے سراسیمہ اور گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مم.........مگر نادر! میرے اندر اتنا بڑا حوصلہ نہیں ہے کہ میں تمہاری اس کامیابی کو خون سے رنگا ہوا دیکھ سکوں۔''

میں نے بے اختیار نگینہ کو خود سے لگالیا۔ ہم یک جان دو قالب کی حقیقی تفسیر بنے اپنے جسم و جاں اور محبت فشاں وجود کی حلاوتیں کشید کرتے رہے۔ پھر میں نے ہولے سے اپنے مرتعش ہونٹ اس کے کان کی پُرتپش لو کے قریب وا کر کے دل کی عمیق گہرائیوں سے سرگوشی میں کہا۔

''نگینہ! جنگ میں صرف شہید تو نہیں ہوا جاتا.........غازی بن کر بھی تو لوٹا جاتا ہے نا۔ محبت کی قسم! مجھے پورا یقین ہے، تمہاری بے لوث چاہت کی طاقت مجھے زندہ ایک بار پھر تمہاری طرف کھینچ لائی گی۔''

میں نے محسوس کیا کہ نگینہ کا ڈھیلا پڑتا جسم ایکا ایکی تن گیا۔ شاید ہماری الوہی محبت کی قسم نے اسے پُراُمید اور باحوصلہ کر دیا تھا۔

ہم دونوں دھیرے سے علیحدہ ہوئے۔

اس وقت چھولداری میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ باہر ویران برف زاروں میں شام کا کاجل گہرا ہونے لگا تھا۔

❄❄❄

کئی گھنٹوں بعد جب دور برفیلی چوٹیوں پر طباق چاند کا روشن رتھ ماند پڑنے لگا اور دور مشرقی چوٹیوں کی سمت پوہ پھٹنے لگی تو میں اور رشنی گال اپنے گیارہ منتخب کردہ ساتھیوں کے ساتھ دو جیپوں میں روانہ ہوگئے۔

نگینہ کو رشنی گال کے دیگر ساتھیوں کی حفاظت میں دے کر میں اس کی طرف سے مطمئن تھا۔ ہم غاصب سردار رامس کے قبیلے کی طرف روانہ ہوگئے۔

ہم نے وقت کا خاص خیال رکھا تھا۔ ایک محتاط اندازے اور پری پلاننگ کے تحت ہمیں غاصب سردار رامس کی رہائش گاہ (قید خانے) سے لے کر پھانسی گھاٹ تک جانے والے راستے پر گھات لگا کر بیٹھنا تھا جہاں سے قیدیوں کو گاڑی میں ڈال کر مسلح افراد کا مختصر قافلہ گزرنے والا تھا۔

مذکورہ مقام تک ہمیں پہنچنے میں پون گھنٹہ لگا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو دو گروپوں میں بھانٹ لیا۔ ایک گروپ رشنی گال کی سرکردگی میں دے دیا۔ وہ راستے کے دوسری جانب برفیلی ڈھلوانوں میں گھات لگا کر فروکش ہوگیا اور دوسری مخالف سمت پر بعینہٖ ایسی ہی پوزیشن میں نے بھی اپنے گروپ کے ساتھیوں کے ساتھ سنبھال لی تھی۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اب کسی وقت بھی مختصر قافلہ قیدیوں کو یہاں سے لے کر گزرنے والا تھا۔ صبح کاذب کا اُجیارا ہنوز مشرقی چوٹیوں تک محدود تھا۔ باقی پوری وادی میں ملگجا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا جو ہمیں مکمل سپورٹ دے رہا تھا۔

ہماری بے چین و مضطرب نظریں راستے کے اس طرف مرکوز تھیں، جدھر سے مذکورہ قافلے کی آمد متوقع تھی۔ ابھی ہمیں وہاں گھات لگائے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہونے لگی۔

میری ٹھٹکی ہوئی نظروں نے مطلوبہ منظر کی جھلک دیکھ لی تھی۔ مذکورہ سمت کی طرف مجھے متحرک دھبے دکھائی دیئے۔ میں نے مخصوص آواز منہ سے نکال کر اپنے ساتھیوں کو باخبر کر دیا۔

میری عقابی نظریں بدستور مذکورہ سمت پر نظر آنے والے متحرک دھبوں پر مرکوز تھیں۔ ہم نے اپنی گنیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



سیدھی کرلیں۔ جب وہ متحرک دھبے ایک بڑی سی جیپ اور پانچ چھ خچر سواروں کے مختلف سے قافلے میں بدلتے نظر آنے لگے تو میرے اعصاب یکلخت تن گئے۔

میں نے بہ غور پہلے اپنی آنکھیں سکیڑ کر ان کی تعداد کا جائزہ لیا۔ چھ خچر سوار مسلح افراد کے علاوہ جیپ کے اندر بھی چار پانچ مسلح افراد کی موجودگی یقینی تھی۔ ان میں مجھے غاصب سردار رامس کے مسلح دستے کا سالار بھی دکھائی دیا تھا۔ اس کی مخصوص وردی سے میں اسے پہچان سکا تھا۔ سردار کی سواری ان میں شامل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اسی سمت میں روانہ ہونے والا تھا، اپنی الگ سواری پر۔

پھر جیسے ہی قافلہ نزدیک پہنچا تو میں نے سب سے پہلے اپنا سر تھوڑا مزید اُبھار کر جیپ کے اندر موجود ''سواروں'' میں قیدیوں کی موجودگی کی تصدیق کر ڈالی۔ مجھے تینوں قیدیوں بہ شمول معزول سردار آگرموشی سمیت انکل اعظم خان اور وزیر خان کی جھلک نظر آ گئی تھی۔

حملے کا وقت سر پر تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے ہم قیامت بن کر اس قافلے پر ٹوٹ پڑے۔ میرے ساتھیوں نے سب سے پہلے خچر سواروں پر اچانک اپنی گنوں کے منہ کھول دیئے۔ جبکہ میں نے جیپ کے ٹائروں کا نشانہ بنایا تھا۔

فضا میں بیک وقت گنوں کی گھن گرج گونجی تھی اور ہر طرف بھگدڑ اور افراتفری کا سماں بندھ گیا تھا۔

ہم نے یہ ''کام'' جلد سے جلد نمٹانے کا ایک وقت مقرر کر دیا تھا۔ یعنی پندرہ سے بیس منٹ۔ وقت کو ''مقرر'' کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ذرا سی بھی اضافی تاخیر پر غاصب سردار رامس کے دیگر ساتھی مسلح دستے بھی ہم پر ٹوٹ پڑتے۔ جبکہ ہماری گوریلا کارروائی (کمانڈو ایکشن) پورے مسلح لشکر سے بہرحال جنگ کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے میں نے رشنی گال کو بھی اس بات کی سختی سے تاکید کی تھی کہ اس محدود وقت کے اندر اندر ''کام'' نمٹانا ہوگا۔

خچر سوار مسلح دشمنوں میں سے سوائے سالار کے سب ہی چشم زدن میں لقمہ اجل بن گئے تھے جبکہ سالار نے بروقت خچر سے چھلانگ لگا کر خود کو بچا لیا تھا۔ پھر زمین پر گرتے ہی لڑھکنیاں کھاتا ہوا جیپ کی آڑ میں ہوگیا تھا۔ مگر جلد ہی دوسری سمت سے رشنی گال کے ٹولے نے اسے گولیوں سے بھون ڈالا۔ جبکہ جیپ کے اندر سے ہم پر دشمنوں نے جوابی فائرنگ کر ڈالی تھی۔

دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ جب طول پکڑنے لگا اور ہمارے پاس صرف آٹھ منٹ بچے تو میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ زمین پر رینگتا ہوا جیپ کی طرف بڑھا اور اس کے اگلے دونوں ٹائروں کے نیچے پہنچ جانے میں کامیاب ہوگیا۔

میرا یہ عمل بہت خطرناک تھا۔ اس طرح میں اپنے ہی ساتھیوں کی ''کراس فائرنگ'' کی زد میں بھی آ سکتا تھا۔ تاہم مجھے بہرحال انکل اعظم خان سمیت تین بے گناہ قیدیوں کی جان بچانے کے لئے جان کی بازی لگانا تھی۔ میں دوطرفہ چلنے والی گولیوں کی دھنا دھن میں جیپ کے نیچے سے رینگتا ہوا عقبی گوشے سے اُبھرا تو میری دیکھا دیکھی رشنی گال نے بھی اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ اسی طرح پیش قدمی کی۔ وہ جیپ کی دوسری سمت سے اُبھرا تھا اور یکدم اس نے کھڑکی کی سمت پر اُبھرتے ہی اندر موجود دشمنوں کو اپنی گولیوں سے نشانہ بنالیا۔ جیپ میں سوار دشمن اس سمت متوجہ ہوئے تو میں نے جیپ کے عقبی دروازے سے اُبھر کر پچھلی ٹوٹی ہوئی اسکرین سے ان پر گولیاں داغ ڈالیں۔ ان کی خوں ریزی میں ہمارے تین ساتھی کام آ گئے تھے۔ تاہم دشمنوں کا صفایا ہوگیا۔

ہم نے تینوں قیدیوں کو جلدی جلدی جیپ سے نیچے اتارا اور انہیں لے کر اپنی جیپوں کی طرف

دوڑے۔تب پھر اچانک رشنی گال کے ٹولے کے ایک ساتھی نے حلق کے بل چیخ کر رشنی گال سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ انداز مجھے انتباہ ہی لگا تھا۔ میں نے ذرا ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھا تو اس کی عقبی سمت میں جہاں قدرے ڈھلان کی جانب چٹیل سا میدان تھا، کئی مسلح افراد کا ایک پورا دستہ خچروں اور دو جیپوں میں اسی سمت بڑھا چلا آ رہا تھا۔

''بھاگو.........!'' میں حلق کے بل چیخا۔

''ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہوگا نادر!'' رشنی گال چلاّ کر پُر جوش آواز میں بولا۔ ''یہ لوگ اتنی آسانی سے ہمیں نہیں جانے دیں گے۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو، گال!'' میں نے اس کی بات رد کر دی۔ ''واپس چلو۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ہم تینوں قیدیوں کو ساتھ لئے اپنی جیپوں کی طرف دوڑے۔ اور پھر چشم زدن میں سوار ہو کر جیسے ہی روانہ ہونے لگے، دشمنوں کے دوسرے دستے نے ہمارے قریب پہنچتے ہی ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ دے ماری۔ رشنی گال تو اپنی جیپ آگے بڑھا لے گیا جبکہ میری جیپ اور میرے ساتھی دشمن دستے کی فائرنگ کی زد میں آ گئے۔ میرے دو ساتھی کرب ناک چیخوں کے ساتھ جیپ سے نیچے گرے تھے جبکہ جیپ کی کھڑکیوں کے شیشے گولیاں لگنے سے ٹوٹ کر کرچیوں میں بکھر گئے تھے۔ میں پھرتی سے نیچے جھک گیا۔ تینوں قیدی رشنی گال کی جیپ میں سوار تھے۔شکر تھا کہ ابھی میری جیپ کا کوئی ٹائر گولیوں کی زد میں نہیں آیا تھا۔

میں نے ذرا ہمت سے کام لیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھائی۔ عقب سے دشمنوں کی وحشیانہ اور اندھا دھند فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ اچانک سماعت شکن دھماکہ ہوا اور میری جیپ جس نے ابھی پوری طرح سے رفتار بھی نہیں پکڑی تھی، بری طرح ڈولنا شروع ہو گئی۔ بدقسمتی سے جیپ کا ایک ٹائر گولی لگنے سے برسٹ ہو چکا تھا۔

''سب نیچے اُترو!'' میں چلایا اور پھر اپنی گن سنبھالے ڈولتی جیپ سے چھلانگ لگا دی۔ جبکہ رشنی گال اپنے ساتھی ٹولے اور تینوں قیدیوں کو لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اب میرے پاس دشمنوں کی بھاری تعداد کے سامنے ڈٹ جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ہماری تعداد دشمنوں کی کثیر تعداد کے مقابلے میں مٹھی بھر تھی۔

چنانچہ ہم نے فوراً پوزیشن سنبھالی اور دشمنوں پر اپنی گنوں کے منہ کھول دیئے۔ خچر سوار تین چار مسلح دشمنوں کو تو میں نے پہلے ہی برسٹ میں ڈھیر کر ڈالا۔ تاہم انہوں نے بھی فوراً اپنی پیش قدمی روک کر خچروں اور جیپوں سے اتر کر مورچے سنبھال لئے۔

میرے ساتھیوں کی تعداد صرف پانچ تھی۔ اس کے باوجود ہم جم کر بے جگری سے لڑے تھے۔مگر میں جانتا تھا کہ ہم زیادہ دیر تک اچانک اُمڈ پڑنے والے دشمنوں کے اس بھاری مسلح دستے کے سامنے نہیں جم سکیں گے۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ جسے موقع ملے وہ پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے اپنے طور پر راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ خود میں بھی یہی حکمت عملی اپنانا چاہتا تھا۔

میں نے فوراً جوابی فائرنگ موقوف کر ڈالی۔ اس طرح دشمنوں کو میری موجودگی کا پتہ چلتا تھا۔ میں دھیرے دھیرے عقب میں کھسکنے لگا مگر دشمن میری توقع سے زیادہ ہوشیار اور چالاک ثابت ہوئے۔ وہ پہلے ہی ہم سب کو گھیرے میں لے چکے تھے۔ میرے دو ساتھیوں نے دشمنوں کے گھیراؤ کو توڑنے کی کوشش میں اپنی جانیں گنوا دیں تو میں نے خود سمیت اپنے باقی ساتھیوں کو ہلاکت میں ڈالنے کی بجائے ہتھیار پھینکنے کا


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دے ڈالا مگر انہوں نے میری بات نہ مانی اور بہ دستور اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ نتیجتاً ان تینوں کو بھی ہوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔ جبکہ میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی نہ تھا کہ میں ہتھیار پھینک دیتا۔ لیکن جیسے ہی میں نے خود کو دشمنوں کے حوالے کرنے کا ارادہ کیا تو میری چشم تصور میں نگینہ کا رنجور چہرہ رقصاں ہو گیا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ میرے ہتھیار پھینک دینے کے جود دشمن مجھے بھی بعد میں زندہ نہیں چھوڑتے۔ ابھی میں یہ ارادہ باندھ ہی رہا تھا کہ اچانک اردگرد سے مجھ ئی مہیب نالیں تن گئیں۔

میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے اپنی گن پھینک دی۔ دشمنوں کے تیور خطرناک نظر آ ہے تھے۔ پھر وہیں ان کے درمیان بحث چھڑ گئی۔ اگرچہ وہ اپنی مقامی زبان میں ہی آپس میں باتیں کر ہے تھے، جس سے بہرحال نابلد تھا۔ تاہم کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بحث مجھے زندہ گرفتار کر کے لے جانے یا ہری ہلاک کر ڈالنے کے سلسلے میں ہو رہی تھی۔ میرا رواں رواں وسوسوں کی زد میں مرتعش ہو رہا تھا۔ کچھ نہیں تھا کہ آئندہ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ بالآخر یہی فیصلہ ہوا کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے۔ یہ فیصلہ ادر ہوتے ہی انہوں نے مجھے بری طرح دھکیلتے ہوئے اپنی جیپ میں ڈالا۔ دوسری جیپ میں کچھ دشمن رشنی ال کے تعاقب میں روانہ ہو چکے تھے۔ مجھے جیپ میں سوار کرا دیا گیا اور یہ لوگ واپس پلٹے۔

ان لوگوں کے چہروں اور آنکھوں سے میرے لئے انتہائی درجے کی نفرت اور غیظ وغضب کی چنگاریاں وٹ رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے یہ لوگ ادھر ہی گولیوں سے بھون ڈالتے۔ جبکہ خود میں نے اپنے حواس پر قابو پا رکھا تھا اور سینے میں بے طرح دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ میں ہنوز فرار کے موقع کی ل میں تھا۔

میری عادت تھی کہ چاہے حالات کتنے ہی مایوس کن اور خطرناک کیوں نہ ہوں، میں امید اور حوصلے اور کر گزرنے کی جستجو ترک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یہ جیپ نسبتاً چھوٹی تھی۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ صرف چار مسلح افراد ہی موجود تھے۔ تین میرے اتھ عقبی نشستوں پر مجھے گن پوائنٹ پر لئے ہوئے تھے، جبکہ بعد میں جب جیپ روانہ ہوئی تو تیسرا بھی رائیور کے برابر والی سیٹ پر جا کر براجمان ہو گیا۔ جبکہ باقی دشمن خچروں پر سوار تھے اور وہ سب جیپ کی ناسب رفتار کے ساتھ دوڑے چلے آ رہے تھے۔

مجھے رشنی گال اور تینوں قیدیوں کی بھی فکر تھی جن کے تعاقب میں مسلح دشمنوں کی تقریباً نصف تعداد ایک پ اور خچروں پر روانہ ہو چکی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں بہ شمول رشنی گال اور تینوں قیدیوں کے کامیابی سے ا جانے کی بس دعائیں ہی مانگ سکتا تھا۔

جیپ مناسب رفتار سے ناہموار اور کچے بل کھاتے راستے پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑی جا رہی تھی۔ مجھے رفتار کرنے کے بعد کم از کم ایک بات تو میرے حق میں تھی کہ ابھی تک مجھے رسن بستہ نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی رے ہاتھ پیر آزاد تھے۔ انہوں نے مجھے نہتا کر کے صرف گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا اور یہی وہ موقع تھا ل سے ''بروقت'' فائدہ اٹھانے کے بارے میں میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ معاً ایک موڑ پر جیپ زی سے دائیں جانب مڑی تو میرے ساتھ چپکے ہوئے مسلح دشمن کا توازن ذرا دیر کو بگڑا۔ اس نے خود کو نبھالنے کی کوشش میں اپنی گن کا رخ غیر ارادی طور پر اس جانب کیا جدھر اس کا دوسرا ساتھی موجود تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کی گن پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت جمائی اور اس کے ٹرائیگر پر اپنی انگلی ا جنبش بھی دے ڈالی۔ اس کی گن شاید سنگل شاٹ پر ''ایڈجسٹ'' تھی۔ سماعت شکن دھماکا ہوا اور گولی کی

بھیانک قربت نے دوسرے ساتھی کو اگلا سانس بھی نہیں نصیب ہونے دیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے دوسری جارحانہ حرکت کر ڈالی اور کہنی کی زوردار ضرب پہلے والے کی ٹھوڑی پر رسید کر دی۔ گن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو میں نے گن جھپٹ کر اس کا رخ پھرتی سے ڈرائیور کے برابر کی سیٹ پر براجمان دوسرے ساتھی کی طرف موڑا جو میری جانب اپنی گن کا رخ موڑ چکا تھا۔ مگر لبلبی دبانے کا موقع میرے ہاتھ لگا۔ میری گن نے دوبارہ آتشیں قہقہہ اُگلا اور گولی اس کی پیشانی توڑتی ہوئی آر پار ہو گئی۔ پہلے والے نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کرنا چاہی تو میں نے گن کا ٹھوس بٹ اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ بے سدھ ہو گیا۔ ادھر ڈرائیور نے جیپ روکنا چاہی۔ میں نے اس کی گردن پر فائر کر دیا۔ وہ بھی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ جیپ بری طرح ڈولنے لگی تو میں نے برق رفتاری سے ڈرائیور کی آڑی ترچھی لاش کو زبردست ٹھوکر مار کر باہر دھکیل دیا اور خود اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی اس کی رفتار بڑھا دی۔

میری جیپ میں دشمن کا صرف ایک ہی ساتھی زندہ بچا تھا مگر وہ بے ہوش تھا۔ سردست مجھے اس کی طرف سے کوئی تشویش نہ تھا۔ باہر خچر سوار دشمنوں کو جب تک ''اندر'' کی صورتِ حال کا ادراک ہوتا، میں جیپ آندھی طوفان کی طرح دوڑا کر ان سے کافی دور نکل چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان کے توانا مگر سست رو خچر جیپ کی رفتار کا مقابلہ ہرگز نہیں کر پائیں گے۔ تاہم انہوں نے بے دریغ جیپ پر فائرنگ ضرور کر ڈالی تھی۔ ٹھک، ٹھک کر کے کئی گولیاں جیپ کی باڈی میں پیوست ہوئی تھیں مگر اب میں ان کے ہاتھ کہاں آنے والا تھا۔

میں نے جیپ کو دائیں جانب نسبتاً میدانی علاقے میں اُتارا اور ایک طویل چکر کاٹ کر واپسی کی جانب اس کا رخ موڑ کر رفتار بتدریج بڑھاتا چلا گیا۔

میں اب خچر سوار دشمنوں کی فائرنگ رینج سے دور نکل چکا تھا۔ معاً جانے کس طرح عقبی سیٹ پر بے سدھ پڑے اکلوتے دشمن کو ہوش آ گیا اور وہ خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جھپٹا۔ میری گن میرے پہلو میں پڑی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ اس کم بخت نے عقب سے اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے سے میری گردن کس لی تھی اور زور زور سے جھٹکے دینے شروع کر دیئے۔ میرے دونوں ہاتھ ہچکولے کھاتی اور پُرخطر راستوں پر دوڑتی جیپ کے اسٹیئرنگ پر جمے رہنے ضروری تھے۔ بہ صورت دیگر جیپ کسی وقت بھی ہزاروں فٹ گہری کھائی میں گر سکتی تھی۔ تاہم دوسری طرف اس حملہ آور کو بھی جواب دینا ضروری تھا جو اچانک ہی بلائے جان بن آیا تھا۔ حالانکہ مجھے اس کی طرف سے تقریباً دو گھنٹوں تک ''انٹا غفیل'' پڑے رہنے کی پوری توقع تھی۔ مگر وہ سخت جان واقع ہوا تھا اور جلد ہی ہوش میں آ گیا تھا۔

وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے سے میری گردن کو بدستور بھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے اپنی سانسیں سینے میں گھٹتی محسوس ہونے لگیں۔ یہ صورتِ حال بھی کم خطرناک تو نہ تھی۔ چنانچہ اس کا فوری حل بھی اچانک ہی میرے ذہن میں اُبھرا تھا۔

شکست خوردہ دشمنوں کا ٹولہ پیچھے رہ گیا تھا۔ سردست ان کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ میں نے اچانک بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ حملہ آور کو بھی ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس نے باوجود اس کے میری گردن تو نہیں چھوڑی البتہ اس کی گرفت ضرور ڈھیلی پڑ گئی۔ ادھر میں نے جیپ کے رکتے ہی اسٹیئرنگ چھوڑا اور ایک گھونسا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے بھیانک کریہہ چیخ اُبھری اور میں نے پھرتی سے اپنی گردن اس کے شکنجے سے چھڑا لی۔ اس نے اپنی تکلیف بھلا کر میرے پہلو میں رکھی گن پر جھپٹا مارا تو میں نے قدرے پلٹ کر اپنے ایک بازو کی کہنی اس کے چہرے پر دوبارہ رسید کر


Courtesy www.pdfbooksfree.pk


دی جو اس کے جبڑے پر لگی مگر اس نے گن پر اپنی گرفت جماتے ہی اسے اچک لیا۔ یہ خطرناک صورت حال تھی۔ میں بجلی کی طرح اپنی سیٹ سے تڑپا اور پلٹ کر اس پر جھپٹ پڑا۔ ہم دونوں اب جیپ کے عقبی حصے میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے تھے اور ہم دونوں کے ہاتھ گن پر مضبوطی سے گرفت جمائے ہوئے تھے اور کوئی بھی گن چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ تب پھر اچانک اس نے اپنے سر کی ٹکر میرے چہرے پر رسید کر دی۔ میرا دماغ ایک لمحے کو جھنجنا سا گیا۔ لامحالہ میری گرفت گن پر کمزور پڑی اور اس نے میرے ہاتھوں سے ایک جھٹکے کے ساتھ گن چھین لی۔ مگر جب تک وہ مجھ پر گن کی نال سیدھی کرنے کی کوشش کرتا، میں نے بھی پل کے پل سنبھلتے ہی ایک لات اس کے پیٹ پر ناف کے ذرا نیچے رسید کر دی۔ اس کے حلق سے بھیانک ڈکراہٹ نکلی اور وہ تکلیف کی شدت کو دبانے کے لئے جیسے ہی فطری ردِعمل کے تحت رکوع کے بل جھکا، میں نے گھٹنا اس کی پہلے سے مضروب اور پچکی ہوئی ناک پر رسید کر دیا۔

میرے یہ دونوں حملے کارگر ثابت ہوئے تھے جنہوں نے اسے بالکل ہی نڈھال کر کے رکھ دیا۔ میں نے گن بہ آسانی اس سے جھپٹ لی اور اس کے لہراتے اور بے سدھ پڑتے وجود کو ایک عدد لات رسید کر دی۔ وہ اچھل کر جیپ کے پچھلے کھلے حصے سے باہر جا گرا۔

میں نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جیپ اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

❄ ❄ ❄

دن کا اُجالا چاروں طرف پھیلنے لگا تھا۔ میں اپنے ٹھکانے پر بہ خیر و عافیت پہنچا تو نگینہ سمیت سب بے چینی کے ساتھ میرے منتظر تھے۔ مجھے زندہ سلامت دیکھ کر وہ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ بالخصوص انکل اعظم اور نگینہ۔ وزیر خان میرا تہہ دل سے شکر گزار تھا۔

رشی گال البتہ کچھ پریشان اور متفکر نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دشمنوں کے ٹولے نے ان کا کافی دور تک تعاقب کیا تھا۔ تاہم وہ اس کے نزدیک نہیں پہنچ پائے تھے اور وہ انہیں جل دے کر قیدیوں کو با حفاظت لے کر اپنے ٹھکانے تک آ پہنچا تھا۔

''لیکن نادر!...... ہمیں اب اپنا یہ ٹھکانا بدلنا پڑے گا۔'' وہ آخر میں اپنی تفکر آمیز پریشانی کی وجہ ظاہر کرتے ہوئے گہری متانت سے بولا۔

''تمہیں اس کا کیسے اندازہ ہوا؟'' میں نے اس کے تفکر بھرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''دشمنوں نے ہمارا خاصی دور تک تعاقب کیا تھا اور وہ لوٹ گئے تھے۔ ان کی سمت بالکل درست تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ مکمل تیاری اور بھاری تعداد کے ساتھ ادھر کا بھی رخ کر سکتے ہیں۔''

میں اس کی بات پر پریشان ہو گیا، پھر بولا۔ ''اگر یہ بات ہے تو پھر ہمیں فوراً سے پیشتر اپنا یہ ٹھکانا چھوڑنا ہو گا۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' وہ فوراً بولا۔

چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ دشمنوں سے چھینی ہوئی دو جیپوں کے علاوہ ہماری ایک جیپ اور بھی تھی۔ باقی بڑی تعداد میں خچر بھی تھے۔

ہم نے اسی وقت وہ ٹھکانا چھوڑ دیا۔ رشی گال کے ذہن میں ایک اور خفیہ ٹھکانہ تھا جو وہاں سے کم و بیش تقریباً پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم سب لگ بھگ ایک گھنٹے بعد وہاں پہنچ گئے۔

یہ مقام چاروں طرف سے برفیلی پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا اور یہاں خاصی روئیدگی بھی پائی جاتی تھی۔

مجھے یہ نیا ٹھکانا پہلے والے ٹھکانے سے نسبتاً زیادہ اچھا اور محفوظ لگا تھا۔

حالات اپنی جگہ پُرخطر تھے۔ میں چاہتا تھا کہ فی الفور نگینہ اور انکل اعظم خان کو یہاں سے واپس روانہ کردوں۔ لیکن یہ اتنی جلدی ممکن نہ تھا۔

یہ اسی روز سرِ شام کا ذکر تھا۔ ہم اس معاملے پر سر جوڑے گفتگو میں مصروف تھے۔ نگینہ کو میرے اس فیصلے سے سخت اختلاف تھا۔ وہ میرے بغیر یہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ جبکہ انکل اعظم کا بھی یہی خیال تھا۔ البتہ وزیر خان اپنے بھتیجے کے قاتل سنکھال کو لئے بغیر ہرگز نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کا یہ الگ اور ذاتی معاملہ تھا۔ میں اس پر زور نہیں دے سکتا تھا۔ البتہ نگینہ اور انکل اعظم خان سے میں نے پُرزور اصرار کیا کہ میری بات مان لیں۔ انکل اعظم نے تو بعد میں چپ سادھ لی مگر نگینہ اپنے فیصلے پر اٹل رہی تھی۔ یہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔

''نادر!.........تم آخر کب تک مجھے اس طرح آزمائش میں ڈالتے رہو گے؟'' نگینہ کا جیسے اب پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا تھا۔ اس کے لہجے میں کرب بھی تھا اور شکوہ بھی۔ وہ سرکش سی ہونے لگی تھی۔ اور اپنی جگہ درست بھی تھی۔ تاہم اس حقیقت کو تو وہ بھی جانتی تھی کہ میں یہ سب اسی کی خاطر ہی کر رہا تھا۔ میں نے اسے دوسرے انداز میں سمجھانا چاہا۔

''نگینہ! اُس موذی عاروب کا خاتمہ ضروری ہے۔ وہ ایک خطرناک وائرس کی طرح ہماری زندگی کا دشمن بن چکا ہے۔ اور پھر وزیر خان کا بھی تو معاملہ اٹکا ہوا ہے۔ جب تک میں سنکھال کو اس کے حوالے نہ کردوں، میری بے گناہی کیسے ثابت ہوسکتی ہے؟''

وہ شکوہ کناں نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر یکدم سسک کر بولی۔

''نادر! آخر یہ آزمائشیں کب ختم ہوں گی؟.........ایک کے بعد دوسری آزمائش، ایک اور امتحان۔ کہیں یہ میری جان ہی نہ لے لے۔''

میرا دل پسیج گیا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے اور ملائمت سے کہا۔

''نگینہ! میرا دل کہتا ہے، اب یہ آزمائشیں ختم ہونے والی ہیں۔ اب سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہے۔ شبِ ستم گزیدہ کے بعد سحرِ مسرت ضرور طلوع ہوگی۔ تم میری بات مان لو۔ انکل اعظم خان کے ساتھ چلی جاؤ۔ حالات ایسے رہے کہ میں تمہیں یہ خوش خبری بھی نہیں سنا سکا کہ ماں کا دل تمہاری طرف سے صاف ہو چکا ہے۔ یہی نہیں، انہوں نے تمہارے پپا (شاہ میر) کو بھی معاف کر دیا ہے۔ کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ اب تمہارے پپا ہمارے پاس گرین لاج میں ہیں اور تمہیں بھی ان کے پاس جا کر رہنا چاہئے۔''

میری بات پر نگینہ کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری تھی۔ مگر چہرے پر آزردگی جوں کی توں رہی۔

اچانک باہر گولیوں کی تڑتڑاہٹ اُبھری۔ میں بری طرح چونک گیا اور رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز تر ہوگئی۔ میں نگینہ کو وہیں چھوڑ کر گن سنبھالے چھولداری سے باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک رشنی گال بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''نادر!.........دشمنوں نے بھاری تعداد میں ہماری پناہ گاہ پر حملہ کر دیا ہے.........ہمیں نکلنا ہوگا۔''

میں اس کی بات پر پریشان ہوگیا۔ ''مم.........مگر.........انہیں یہاں ہمارے ٹھکانے کا علم کس طرح ہوا؟'' میں نے تفکر سے پوچھا۔ مگر رشنی گال میری بات سنی ان سنی کر کے واپس مڑ گیا۔

چھولداریوں کے باہر وقفے وقفے سے جاری رہنے والی گولیوں کی گھن گرج اب ایک تواتر سے ہونے لگی تھی۔ انکل اعظم خان اور نگینہ بری طرح پریشان اور ہراساں تھے۔ جبکہ وزیر خان آمادہ بہ جنگ نظر آ رہا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے پاس گن تھی۔ میں نے وزیر خان کو وہیں انکل اعظم خان اور نگینہ کے پاس رہنے کا کہا اور خود ...ر نکل آیا۔

فائرنگ دو اطراف سے ہو رہی تھی۔ رشنی گال کے ساتھی مورچے سنبھالے جنگ میں مصروف تھے۔ ...ازہ یہی ہوتا تھا کہ یہ حملہ غاصب سردار رامس کے جنگلی ٹولے کا ہی ہوسکتا تھا۔ ممکن ہے وہ ہمارے پہلے ...لے ٹھکانے پر پہنچے ہوں اور قدموں کے نشانات پر چلتے ہوئے یہاں آ گئے ہوں۔

اب میں بھی اس جنگ میں شریک ہو چکا تھا۔ مگر ذرا ہی دیر میں اندازہ لگا چکا تھا کہ دشمنوں کی افرادی ...ت بہرحال ہم سے زیادہ تھی۔

میرے پاس ایک گن تھی۔ جبکہ فاضل راؤنڈز کے دو کلپ میری پتلون کی بیلٹ میں اڑسے ہوئے ...ے۔ میں نے کچھ سوچ کر پھرتی سے اپنی جگہ بدلی۔ میں درحقیقت اس چھولداری کے ذرا قریب ہی رہنا ...ہتا تھا، جدھر نگینہ اور انکل اعظم خان موجود تھے۔ میں نے جیسے ہی اپنی جگہ بدلی، خود رو جھاڑیوں اور ...توں کے گھنے جھنڈ سے ہوتا ہوا دشمنوں کی صفوں کے ذرا نزدیک پہنچا تو مجھے سرمئی شام کی ملگجی تاریکی میں ...رچہ سنبھالے دشمنوں کی کثیر تعداد ہیولوں کی صورت نظر آئی۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ اچانک میں ...نے چار مسلح ہیولوں کو چھولداری کی طرف رینگتے دیکھا۔ یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا۔ بہ سرعت میں نے ...ی اس جانب رینگتے ہوئے حرکت کی تھی۔ نہ جانے ان خبیثوں کو کیسے اس بات کا ادراک ہوا تھا کہ ان کے ...ار اس چھولداری میں تھے۔

فائرنگ بدستور جاری تھی۔ سردست رائفلوں ہی کا استعمال ہو رہا تھا جس سے مجھے فوراً اتنا اندازہ تو ضرور ...ہوا تھا کہ دشمنوں کا اسلحہ صرف رائفلوں اور گنوں تک ہی محدود تھا۔ ان کے پاس بھاری ہتھیار نہ تھے۔ ...ے اس پر حیرت بھی ہوئی تھی۔ اگر یہ غاصب سردار رامس کا ٹولہ تھا تو ان کے پاس میں نے ہینڈ گرنیڈ کے ...ور راکٹ لانچر بھی دیکھے تھے۔

بہرطور میں جیسے ہی اپنی چھولداری کے ذرا قریب پہنچا تو میں نے ان چاروں مشتبہ حملہ آوروں کو ...لداری کا نشانہ بناتے ہوئے دیکھا۔ پل کے پل میں نے اپنی گن سیدھی کر کے ان پر برسٹ فائر کر ...۔ دو دشمنوں کو میں نے کریہہ چیخوں کے ساتھ ڈھیر ہوتے دیکھا۔ جبکہ دو نے فوراً خود کو نیچے گرا لیا تھا۔ ...میں سے ایک نے میری سمت پر برسٹ فائر کر دیا تھا۔ میں نے جھکائی دے کر خود کو گولیوں کی مہیب زد ...بچا لیا تو مجھے اگلے ہی لمحے دوسرا برسٹ چلنے کی بھی گھن گرج سنائی دی تھی۔ مگر یہ برسٹ مجھ پر نہیں داغا ...تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بدلی۔ دوسری سمت سے ذرا سر اُبھار کر دیکھا تو میں نے ان دو ...سے ایک دشمن کو اپنی پہلی والی جگہ کی سمت محتاط انداز میں بڑھتے دیکھا۔ جبکہ اس کا دوسرا ساتھی ...لداری پر اندھا دھند گولیاں برسا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے اس کا نشانہ لے کر لبلبی ...دی۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے اسے پل بھر میں واصل جہنم کر دیا۔

اس کے دوسرے ساتھی کو فوراً ہی میری پوزیشن کا اندازہ ہوا اور اس نے یکدم زمین پر لیٹ کر میری ...ب گن کا منہ کھول دیا۔ میں نے بہ سرعت خود کو جھکا لیا اور تیزی کے ساتھ پوزیشن بدلی۔ اب میں ''فائر ...و اور جگہ بدلو'' کی حکمت عملی کے تحت آخری دشمن پر بدستور گولیاں داغے جا رہا تھا۔ مگر میرا آخری دشمن ...محتاط ہو چکا تھا۔ وہ بھی بڑی سرعت اور چابک دستی کے ساتھ نہ صرف اپنی جگہ بدل رہا تھا بلکہ مجھ پر ...بل فائر داغے جا رہا تھا۔

اچانک میں نے چھولداری سے کسی کو گن سنبھالے باہر نکلتے دیکھا۔ میرا فاصلہ چونکہ اس سے خاصا

قریب تھا اس لئے میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ وزیر خان تھا۔ میں نے چلا کر اسے دوبارہ اندر جانے کا کہا تو وہ میری آواز پر ٹھٹکا مگر اس وقت قریب آتے آتے آخری دشمن نے اسے بدقسمتی سے اپنی گن کے نشانے پر لے لیا تھا اور جب تک وزیر خان کچھ سمجھتا، اس نے فائر برسٹ کر دیا تھا۔

وزیر خان کو چھولداری سے شاید اس کی موت ہی کھینچ لائی تھی۔ وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گرا تو مجھے قریب آئے آخری دشمن پر برسٹ فائر کرنے کا موقع مل گیا مگر میری گن سے خالی "کلچ، کلچ" کی آواز ابھری۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دوسرا میگزین کلپ گن کے ساتھ "اٹیچ" کیا اور دشمن کی سمت دیکھا مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔ میں تیزی کے ساتھ چھولداری کی طرف بڑھا۔ وہ اندر داخل ہوا مگر دوسرے ہی لمحے بری طرح ٹھٹک گیا۔ چھولداری کا عقبی حصہ چاک تھا اور سامنے فرش پر سردار آگرموشی خون میں لت پت پڑا نظر آیا۔ میں بری طرح دہل گیا اور اس کی جانب لپکا۔ اس کے سینے میں ایک لمبی قرولی عین دل کے مقام پر دستے تک پیوست تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا، وہ مر چکا تھا۔

میں اٹھ کر چاک شدہ حصے سے باہر آ گیا۔ اس دوران فائرنگ کا سلسلہ بتدریج موقوف ہونے لگا تھا۔ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے رشنی گال کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے یا پھر راہِ فرار اختیار کر لی تھی۔ مجھے نگینہ اور انکل اعظم خان کی پراسرار گمشدگی کی فکر ستا رہی تھی۔

میں محتاط انداز میں مگر دیوانوں کی طرح نگینہ اور انکل اعظم خان کو تلاش کرنے لگا کہ اچانک بیک وقت کئی مسلح افراد میرے دائیں بائیں نمودار ہوئے اور آناً فاناً مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ان کی وضع قطع سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ غاصب سردار رامس کے ہی آدمی تھے۔ میری مشکیں کس دی گئیں اور پھر مجھے ایک جیپ میں سوار کرا دیا گیا۔

میں نے ان سے نگینہ اور انکل اعظم کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنا چاہی تھی مگر یہ لوگ شاید میری زبان نہیں جانتے تھے اور مجھے محض درشت اور خوف ناک نظروں سے گھور کر رہ گئے۔

میں یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ ممکن ہے وہ دونوں ہی بدقسمتی سے ان کے ہتھے چڑھ گئے ہوں یا ان کے دوسرے ساتھیوں کی گرفت میں آ چکے ہوں۔

ہر سُو خاموشی کا راج تھا۔

مجھے غاصب سردار رامس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کی حالت خارش زدہ کتے کی سی ہو رہی تھی۔ وہ مجھے یوں خوف ناک نظروں سے گھورنے لگا جیسے میری بوٹیاں تک نوچ لے گا۔

میری زبان صرف اس کو ہی آتی تھی۔ وہ چند ثانیے جلنے کڑھنے اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے کے بعد غضب ناک لہجے میں بولا۔

"نادر!.........تم نے باغیوں کے ساتھ مل کر مجھے جو نقصان پہنچایا ہے، اس کی تلافی تو تمہاری موت بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن میں تمہاری زندگی کو اس قدر بھیانک کر دوں گا کہ تمہیں اپنی اذیت ناک زندگی کی نجات بھی صرف موت ہی کی صورت نظر آئے گی اور تم مجھ سے موت کی بھیک مانگو گے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "مجھے تم لوگوں کے داخلی معاملات سے نہ پہلے دلچسپی تھی اور نہ اب ہے۔"

"بکواس بند کرو مکار آدمی!" وہ مارے طیش کے دھاڑتے ہوئے بولا۔ "اگر یہ بات تھی تو پھر تم نے باغی ٹولے کے ساتھ ساز باز کر کے ہمارے اہم قیدیوں کو کیوں آزادی دلائی تھی؟"

"ان قیدیوں میں میرے اہم ساتھی بھی شامل تھے جنہیں تم نے بے گناہ قید میں رکھا ہوا تھا۔" میں نے


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی تڑا جواب دیا تو وہ چند ثانیے مجھے خشمناک نظروں سے گھورتا رہا، پھر دوسرے ہی لمحے ایک بدمست اور فاتحانہ قہقہہ لگا کر بولا۔

"باغی ٹولے کو تو ہمارے ساتھیوں نے چن چن کر ہلاک کر ڈالا ہے۔ اور سردار آگرموشی بھی ختم ہو چکا۔ بہت جلد میرے ساتھی دوسرے باغیوں سمیت رشنی گال اور تمہارے ساتھیوں کو بھی پکڑ کر یہاں لانے والے ہیں۔ ابھی تم انتظار کرو۔ پھر تمہاری نظروں کے سامنے تمہارے پیاروں کو اذیتیں دے کر جان سے ماروں گا تاکہ میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو سکے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے مسلح ساتھیوں سے کچھ کہا۔ وہ فوراً حرکت میں آئے اور مجھے پکڑ کر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

یہ وہی منحوس قید خانہ تھا جو تہہ خانے میں بنا ہوا تھا اور میں پہلے بھی یہاں مقید رہ چکا تھا۔ مجھے سردار رامس کی ان باتوں سے کچھ ڈھارس بندھی تھی کہ ابھی تک نگینہ، انکل اعظم خان اور باغی رشنی گال سمیت اس کے دیگر ساتھی ان کے ہتھے نہیں چڑھ سکے تھے۔

مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ کہاں غائب ہو گئے تھے؟......... جبکہ معزول اور بدنصیب سردار آگرموشی کا سفاکانہ قتل تو یہی ظاہر کرتا تھا کہ دشمنوں کا ایک ٹولہ عقب سے چھولداری پر حملہ کر کے اندر داخل ہوا تھا اور انہوں نے سردار آگرموشی کو قتل کر ڈالا ہوگا۔ پھر بعد میں وہ نگینہ اور انکل اعظم خان کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ مگر یہاں آ کر تو مجھے کچھ اور کہانی سنائی جا رہی تھی۔ میں بری طرح اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک چونکا دینے والا حوصلہ افزا خیال یہ بھی اُبھرا تھا کہ ممکن ہے، سردار رامس کے آدمی سردار آگرموشی کو ہلاک کرنے کے بعد نگینہ اور انکل اعظم خان کو اپنی گرفت میں لے جا رہے ہوں تو رشنی گال نے عین وقت پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر انہیں ان کے چنگل سے چھڑا لیا ہو۔ اس خیال میں پورا وثوق دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ میں بہرحال رشنی گال کی بے جگری اور بہادری کا معترف تو تھا۔

بہر طور اب دیکھنا یہ تھا کہ آگے کیا ہونے والا تھا؟ بقول اس خبیث سردار رامس کہ اس کے جنگجو ساتھی رشنی گال اور میرے دونوں ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ سر دست مجھے حالات مخدوش سے مخدوش تر ہوتے نظر آ رہے تھے۔

سردار رامس کے بھیانک اور خونیں عزائم نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ اس خبیث اور بے حد سفاک شخص نے اقتدار کے لالچ میں آ کر اپنے ہی سگے بھائی کو بالآخر قتل کر ڈالا تھا اور اس کے ہمراہ اس گھناؤنی سازش میں خود بدنصیب اور آنجہانی سردار آگرموشی کی بیوی ناگاسی بھی شامل تھی جس نے اب نئے سردار یعنی اپنے ہی دیور رامس سے شادی رچا لی تھی۔ مجھے ان کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر مجھے زیادہ فکر نگینہ اور انکل اعظم کی طرف سے لاحق ہو رہی تھی۔ اور میں یہ بھی دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ دونوں رشنی گال کے پاس ہوں اور محفوظ ہوں۔ سردار رامس کے سفاک آدمیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔

البتہ اس خونی جنگ میں مجھے وزیر خان کی موت کا زیادہ افسوس ہو رہا تھا۔ مگش پور کی بستی کے سردار زور آور خان نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا کہ اس کے بیٹے کو قتل کرنے والا میں نہیں بلکہ سنکھال نامی وہ کیلاشی باشندہ تھا جو عامل عاروب کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر اس نے میری ایک نہ سنی تھی اور بالآخر اپنے بھائی وزیر خان کو چند ساتھیوں سمیت میری راہ پر لگا دیا۔ تھا۔ اب کون جانتا تھا کہ وزیر خان کی موت ہی اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔ مگر وزیر خان اور علی الترتیب اس کے چند ساتھیوں کی موت کے بعد میرے لئے سردار زور آور خان والا معاملہ مزید پیچیدہ ہو گیا تھا۔ لامحالہ وہ مجھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



پر ہی شک کر سکتے تھے۔ اس کے بیٹے شہ زور کو ہلاک کرنے کے بعد زیر خان وغیرہ کو بھی میں نے ہی قتل کیا ہوگا۔ اب تو سنکھال ہی ایسا شخص تھا جو میری بے گناہی کو ثابت کر سکتا تھا۔ وہ نہ بھی کرتا تو کم از کم میرے لئے یہ ضروری تھا کہ میں اس خبیث کو زندہ گرفت میں لے کر مکش پور کے سردار زور آور خان کے سامنے پیش کر دوں تا کہ اس کی بیٹی اپنے جوان بھائی شہ زور کے قاتل کی حیثیت سے سنکھال کو پہچان سکے۔ گویا مجھے ابھی یہاں مزید پُرخطر مہمات سر کرنا تھیں۔ لیکن یہ معاملات تو بعد کی بات تھے۔ اس وقت میں خود دہرے تہرے حالات کا شکار ہو چکا تھا۔

سردار رامس کی قید میں آنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وہ خبیث مجھ پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ تہہ خانے کے سیلن زدہ اور گھٹن آمیز ماحول اور مخدوش حالات کی سنگینیوں میں میرے دل و دماغ کو ایک پل کے لئے بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ یہاں گھپ تاریکیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ میرے اندر وسوسوں اور اندیشوں کے سانپ کلبلاتے رہے۔

پھر اسی طرح کئی گھنٹے بیت گئے۔ نہ دن کا پتہ معلوم ہو رہا تھا نہ رات کا۔ کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا سوائے کالی گھپ تاریکی کے۔

میں ایک جگہ دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھا رہا۔ گھٹنوں پر گھنٹے گزرنے لگے۔ میں کبھی اُٹھ کر تاریکی میں بے چینی سے ٹہلنے لگتا تو کبھی بیٹھ جاتا۔ میرا سکون غارت ہو چکا تھا۔ مجھے کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔ چشم تصور میں بار بار نگینہ کا ستم رسیدہ چہرہ گردش کرنے لگتا تھا۔

جب حد سے زیادہ میرے اعصاب کشیدہ ہونے لگے تو میں نے پاگلوں کی طرح زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ مگر لگتا تھا شاید میری چیخیں، میری آوازیں اس منحوس تہہ خانے کی پُرہول فضا میں ہی آسیبی چمگادڑوں کی طرح گردش کر کے رہ گئی ہوں۔ باہر سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ قید تنہائی تھی جو مجھے کاٹنے لگی تھی۔ بالآخر چیختے چیختے میرا گلا دُکھنے لگا اور میں نڈھال ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔ میں بری طرح ہانپنے لگا۔ پھر مجھے نہ جانے کب نیند نے آلیا۔

نہ جانے کتنی دیر میں پڑا سویا رہا۔ بیدار ہوا تو میں نے روشنی دیکھی۔ وہ تہہ خانے کا دروازہ تھا۔ چار افراد کے ہیولے نظر آئے۔ ان میں سے تین مسلح نظر آ رہے تھے۔ جبکہ چوتھے کے ہاتھ میں کوئی ٹرے نما شے تھی۔ صرف وہی آگے بڑھا تھا۔ باقی تینوں گنیں تانے چوکس انداز میں وہیں کھڑے رہے تھے۔ اندر داخل ہونے والے نے ٹرے زمین پر رکھی اور پھر یہ سب واپس لوٹ گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔

ایک بار پھر وہی کالی تاریکی چھا گئی۔ میں اندھیرے میں ٹٹول کر ٹرے میں جو کچھ بھی رکھا تھا، جلدی جلدی اپنے بھوک سے اینٹھے ہوئے معدے میں منتقل کرنے لگا۔ پانی کی آدھ بھری چھاگل بھی تھی۔

بھوک پیاس کا کچھ تدارک ہوا تو ذہن بھی ذرا سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ خوراک اگرچہ ناکافی تھی مگر بہرحال تنِ مردہ میں کچھ تو جان پڑی تھی۔ سردست مجھے فرار کی ساری راہیں مسدود ہی نظر آ رہی تھیں۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کروں؟ حالات تھے کہ اوپر تلے پلٹا کھا رہے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں چومکھی حالات زدگی کا شکار تھا۔ کبھی فتح میرے نصیب میں آ رہی تھی اور کبھی دشمنوں کا مقدر بنتی۔

سوچ سوچ کر مجھے احساس ہونے لگا کہ مجھ سے کہیں فاش غلطی سرزد ہوئی تھی۔ مجھے عامل عارف کا قضیہ نمٹانے کی مہم مؤخر کر دینی چاہئے تھی۔ یہ کام بعد میں بھی انجام دیا جا سکتا تھا۔ مجھے نگینہ اور انکل اعظم کے ساتھ اس وادی سے فی الفور نکل جانا چاہئے تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو میرا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ مجھے یہ بات جاننے کی بے چینی لاحق تھی کہ خدانخواستہ نگینہ اور انکل اعظم بھی دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ



گئے ہوں۔ ویسے مجھے کچھ تسلی تو تھی کہ اس صورت میں وہ دونوں بھی یہاں میرے ساتھ تہہ خانے میں ہوتے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے وہاں قید خانے میں رہتے ہوئے کتنے دن بیت گئے تھے۔ تاہم میں نے گزرے ہوئے وقت اور گھنٹوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے آج دوسرا دن ہی ہوا تھا۔ چند گھنٹے اور گزرے تو چار مسلح اشخاص اندر داخل ہوئے۔ میں نے ان سے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ مجھے کوئی جواب دیئے بغیر گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ تہہ خانے سے باہر لے آئے۔ جس کے بعد مجھے سردار رامس کے سامنے پیش کیا گیا۔

میں نے خلافِ توقع اس کے چہرے پر درشتی کے بجائے اُلجھن آمیز فکرمندی کے تاثرات دیکھے۔ میں یہی سمجھا تھا کہ اب مجھے یہ خبیث شخص تختہ مشق بنانے والا تھا۔

وہ میری طرف خوف ناک نظروں سے چند ثانیے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ''تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تمہیں آسان موت دی جا رہی ہے۔''

میں اس کی اسرار بھری گفتگو پر بری طرح دہل گیا تاہم حلق تر کر کے بولا۔

''میں سمجھا نہیں.....اس مہربانی کی وجہ.....؟''

''اس بات کو چھوڑو۔'' وہ جھٹکے دار لہجے میں بولا۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔

میرے دونوں ہاتھ پشت کی جانب جکڑ دیئے گئے۔ میرا دل گویا گنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ مجھے پھانسی دی جانے والی تھی۔ یہ کرب ناک حقیقت میں کس طرح گوارا کر سکتا تھا۔ مگر یہ ہو رہا تھا، ہونے والا تھا اور میں یعنی نادر علی خان بالکل بے بس تھا.....کیا واقعی میں بے بس تھا؟.....کیا میری زندگی اتنی ہی سستی تھی کہ میں ان برف زاروں میں بے بسی کی موت مارا جاؤں؟.....میں نے تو آج تک حق و صداقت کے لئے جنگ لڑی تھی۔ پھر ایسی بے بسی والی موت میرا مقدر کیوں بننے والی تھی؟ اور وہ بھی بے گناہی کی موت!

'نہیں نادر علی خان!.....نہیں۔' میرے اندر دور کہیں کوئی چلایا تھا۔ جس کی بازگشت مجھے اپنی سماعتوں تک میں سنائی دی تھی۔

مجھے ایک جیپ میں سوار کرایا گیا۔ سردار رامس بھی دوسری گاڑی میں اپنے چند مسلح محافظوں کے ساتھ سوار ہوا۔ خچر سوار مسلح دستے بھی موجود تھے۔ پھر یہ مختصر قافلہ پھانسی گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

دیگر امراء بھی ایک الگ گاڑی میں موجود تھے۔ باغیوں کے حملے کے پیش نظر اس بار مسلح دستے کی تعداد دُگنی کر دی گئی تھی۔

مگر ابھی یہ قافلہ سردار رامس کی قلعہ نما رہائش گاہ سے صرف چند گز آگے ہی گیا تھا کہ اچانک شور مچ گیا۔ قافلے کو روکنے کا بگل بجا دیا گیا۔ سب لوگ وہیں رک گئے۔ جس جیپ میں مجھے سوار کرایا گیا تھا، وہ بھی ایک جھٹکے سے روکی گئی تھی۔ نہ جانے کیا انہونی ہو گئی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دوسرے بھی حیران پریشان اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے تھے۔ دو تین کچھ جاننے کی جستجو میں جیپ سے اترے اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہ جب پریشان اور بوکھلائے ہوئے لوٹے تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ دونوں اپنی زبانوں میں حواس باختہ لہجے میں اپنے ساتھیوں کو کچھ بتانے لگے۔ میں نے بھانپتی ہوئی نظروں سے ان کے چہروں پر تفکر اور پریشانی کے آثار نمودار ہوتے دیکھے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ جانے ایسی کیا بات اچانک رونما ہو گئی تھی جس نے پورے قافلے میں پریشانی، تشویش اور بے چینی کی لہر دوڑا رہی تھی اور قافلے کو اچانک روک دیا گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



میں نے بھی گردن موڑ کر جیپ کی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے وہاں سوائے افراتفری کے کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد قافلے کو واپسی کا حکم ملا۔ مجھے مسرت آمیز حیرت نے گھیر رکھا تھا کہ نہ جانے کاتب تقدیر نے میری تقدیر میں کیا لکھا تھا جو ظہور پذیر ہونے والا تھا؟

چونکہ ہم سردار رامس کی رہائش گاہ کے قریب ہی تھے، اس لئے فوراً ہی ہم وہاں پہنچ کر رکے۔ پھر مجھے جیپ سے نیچے اتارا گیا تھا۔ میری سب سے پہلے نگاہ سردار رامس کی گاڑی پر پڑی تھی اور یہ دیکھ کر مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا تھا کہ جیپ سے سردار رامس کے بے سدھ وجود کو چار افراد اٹھائے تیزی کے ساتھ رہائش گاہ کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ مجھے بھی اندر لایا گیا تھا۔ رہائش گاہ میں کہرام مچ گیا تھا۔ قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ سردار رامس کی اچانک طبیعت بگڑ گئی تھی۔

پھر میں نے سردار آگرموشی کی بیوہ اور رامس کی بیوی ناگاسی کو روتے پیٹتے دیکھا۔ البتہ مجھے دوبارہ اسی منحوس تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا تھا اور میرے دونوں ہاتھوں کی رسیاں بھی نہیں کھولی گئی تھیں۔

نہ جانے یہ کیا معاملہ تھا۔ سردار رامس کی اچانک طبیعت کیوں بگڑ گئی تھی؟..... یہ مجھے نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ میں بہرحال اس انہونی پر اللہ کا شکر ہی ادا کر سکتا تھا کہ جس نے میری آئی ٹال دی تھی۔

نہ جانے مجھے اب اور مزید کب تک یہاں مقید رہنا پڑتا۔ اس طرح عجیب و غریب خیالات اور حالات میں کئی گھنٹے بیت گئے۔ مجھے ایک بار پھر بھوک پیاس ستانے لگی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ رشنی گال اور اس کے باقی ساتھی میری رہائی کے سلسلے میں کیا منصوبہ بندی کر رہے تھے؟ مگر مجھے زیادہ بے چینی اس بات کی ستا رہی تھی کہ آخر سردار رامس کے ساتھ یوں اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا کیا تھا؟ اور آیا وہ زندہ بھی تھا یا نہیں؟

انہی پُرسوچ خیالات میں چند گھنٹے اور بیت گئے۔ میری اُلجھن آمیز پریشانی فزوں تر ہونے لگی اور مجھے بھوک سے زیادہ پیاس ستانے لگی تھی۔

میرے محتاط اندازے کے حساب سے مجھے ایک دن گزر چکا تھا۔ پھر دوسرے دن بھی مزید کئی گھنٹے بیت گئے تو مجھے خوراک اور پانی نصیب ہوا۔ تین مسلح افراد کے ساتھ وہ چوتھا شخص ٹرے لے کر اندر داخل ہوا تھا، میں نے باہر سے آنے والی مدھم روشنی میں ان چاروں کے چہروں کو بہ غور دیکھا تھا۔ مجھے وہ مغموم سے نظر آئے تھے مگر چونکہ وہ میری زبان نہیں سمجھ سکتے تھے اس لئے ان سے کچھ پوچھنے کا رہی تھا۔

اگلے روز پھر مجھے اسی طرح خوراک فراہم کی گئی۔ اس دوران میں نے یہ بات محسوس کی تھی کہ پہلے مجھے صرف دن میں ایک بار خوراک دی جاتی تھی اور وہ بھی ناکافی ہوتی۔ باقی سارا دن میں بھوکا پیاسا ہی رہتا تھا۔ مگر اب جب سے دوبارہ مجھے داخلِ زندان کیا گیا تھا تو مجھے نہ صرف دن میں دو بار خوراک دی جا رہی تھی بلکہ خوراک کی مقدار میں بھی کچھ اضافہ ہو رہا تھا۔ اس میں بھیڑ کے گوشت کے بھنے ہوئے پارچے اور تنوری روٹیاں بھی ہوتی تھیں۔ دودھ کا گلاس، پانی کی پوری بھری ہوئی چھاگل بھی ہوتی تھی، اُبلے ہوئے چاول بھی ہوتے تھے۔

میں اس خوشگوار تبدیلی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ بلکہ اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی تھی کہ جب مستقل طور پر میری پشت پر بندھے ہوئے دونوں ہاتھوں کی رسیاں بھی کھول دی گئی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھ پر اچانک یہ کس نوعیت کی مہربانیاں ہونے لگی تھیں۔

نہ جانے وہ کون سا پہر تھا کہ ایک روز تہہ خانے کا دروازہ کھلا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ رات کا کوئی درمیانی پہر تھا۔ پورے دن میں میرے تہہ خانے کا دروازہ صرف دو مرتبہ کھولا جاتا تھا اور اس دوران



مجھے دو بار خوراک وغیرہ پہنچائی جاتی تھی۔ جبکہ آج کے روز تیسری بار دروازہ کھلا تھا جو ظاہر ہے خلافِ معمول ہی تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی۔ میری مضطرب نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا، دو لحیم شحیم افراد اندر داخل ہوئے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا اور باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں حیران پریشان مگر خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ان کے آگے آگے چل پڑا۔

میرے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ اچانک کس نوعیت کی پراسرار کایا کلپ ہو گئی تھی؟.....اور اب میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟

بہرطور سر دست تو میں ان دونوں مسلح افراد کے آگے آگے گن پوائنٹ پر چلتا رہا۔ یہ لوگ مجھے ایک چکر دار زینے سے اوپر ایک راہداری میں لے آئے۔ میرا اندازہ درست تھا کہ یہ رات کا ہی کوئی درمیانی پہر تھا۔

نہ جانے یہ پراسرار حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا تھا۔ حالات کی عجیب طرفہ کاری جاری تھی۔

مجھے ایک شاہانہ طرز کے وسیع و عریض کمرے میں لایا گیا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ جبکہ وسط میں خوب صورت اور نشست گاہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ مجھے ایک نشست پر بیٹھنے کا حکم ملا۔ اس کے بعد ان دونوں مسلح افراد نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

اب ہم تینوں کے علاوہ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ میرے لئے یہ دونوں مسلح افراد اجنبی ہی تھے۔ مراد یہ کہ اس سے پہلے تہہ خانے میں خوراک لانے والے کے ساتھ جو تین مسلح پہرے دار آتے تھے، ان میں سے بہرحال یہ دونوں نہیں تھے۔

بہرطور میں حکم کے مطابق ایک آرام دہ نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ اور وہ دونوں لحیم شحیم مسلح کار نہایت مستعدی سے میرے عقب میں خاموش کھڑے ہو گئے تھے۔

کمرے میں روشنی تھی۔ اس کے باوجود کمرے کے محدود ماحول میں عجیب سا اسرار بھرا سکوت طاری تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اہم شخصیت ذرا ہی دیر بعد اندر داخل ہونے والی تھی اور پھر چند ثانیوں بعد جو متوقع ''اہم شخصیت'' زرق برق لباس میں اندر داخل ہوئی، میں اسے دیکھ کر بری طرح ٹھٹکا تھا۔

وہ ناگاسی تھی.....سردار رامس کی بیوی اور آنجہانی سردار آگرموشی کی بیوہ، ناگاسی۔ میں اسے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔

وہ بہت باوقار انداز میں چلتی ہوئی ایک دوسرے اندرونی دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی اور میرے سامنے والی نشست پر براجمان ہو گئی۔ ساتھ ہی مجھے بھی اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میری دھڑکتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ انداز و اطوار سے تمکنت ظاہر ہوتی تھی۔ چہرہ بھی شاداب اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

میں سردار رامس کی آمد کی توقع کر رہا تھا۔ لیکن اس کی بیوی ناگاسی سے باقاعدہ آج یوں ''ون ٹو ون'' سامنا ہو رہا تھا۔

میری حیرت بھری آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر اب میں حیرت کا سبب ڈھونڈنے کی بجائے اپنے ذہن کو تیزی سے کام میں لا رہا تھا۔

آنجہانی سردار آگرموشی، غاصب سردار رامس، بوڑھا وید، سردار رامس کا سالار، عامل عاروب اور رشنی گال کے علاوہ ناگاسی کا بھی ان افراد میں شمار ہوتا تھا جنہیں میری زبان آتی تھی۔ مگر صاف اور رواں زبان صرف دو افراد کو ہی بولتے سنا تھا یہاں میں نے۔ ایک بوڑھے وید کو، دوسرے عامل عاروب کو۔ باقی سب ''کام چلاؤ'' بولی بول لیتے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



میری نظریں چند ثانیے ناگاسی کے چہرے پر جمی رہیں، پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنی نظریں جھکا دیں۔

تب پھر ناگاسی نے کچھ کہا تھا جو میں نہ سمجھ سکا۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ بولا تھا۔ میں سمجھا تخاطب میں ہی تھا اس لئے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں میرے عقب میں کھڑے دو مسلح افراد پر جمی ہوئی تھیں۔ میں سمجھ گیا۔ ناگاسی نے انہی سے کچھ کہا تھا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ اب کمرے میں صرف میں اور ناگاسی تھے۔

مجھ پر ایک بار پھر حیرتوں کے دورے پڑنے لگے۔ نہ جانے یہ کیسا اور کیا اسرار تھا؟..... ایک سردار کی بیوی کا یوں نصف رات کے پہر میں میرے ساتھ یہاں تنہا بیٹھنا۔ غرضیکہ میں بری طرح اُلجھن کا شکار ہوگیا تھا اور بار بار میرے دل و دماغ میں یہی سوال اُبھر رہا تھا کہ آخر سردار رامس کہاں گیا؟ اور اس کی پری جمال بیوی.....؟ میں آگے کچھ نہ سوچ پایا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے ناگاسی نے ہولے سے میرا نام پکارتے ہوئے گویا مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"نادر! سردار رامس مر چکا ہے۔"

اس نے فقط اتنا ہی کہا اور میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ میں غیر یقینی نظروں سے اس کے چہرے کو تکنے لگا۔

"قبیلے کے قانون کی رو سے اب میں ہی سردار ہوں۔" وہ دوبارہ ہموار لہجے میں بولی تو میں نے اخلاقاً اظہارِ افسوس کے طور پر کہا۔

"مجھے بہت دکھ ہوا..... معزز سردار کو آخر اچانک کیا ہوگیا تھا؟"

میری بات پر اس کے عنابی اور گداز ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ اُبھری اور وہ بدستور اپنی سرگیں نگاہیں میرے چہرے پر جمائے بولی۔

"نہیں..... افسوس کرنے اور یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ سردار رامس کی اچانک موت کیسے واقع ہوگئی؟ کیونکہ مجھے بھی اس کا کوئی دکھ نہیں ہے۔"

مجھے اس کا لہجہ عجیب پراسرار لگا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے مزید بولنے کا منتظر تھا۔

"میں تم سے دوٹوک گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ اور اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے۔"

"جی مادام!..... میں سن رہا ہوں۔" میں نے بھی مختصراً کہا۔ البتہ میرے اندر بری طرح ہلچل مچی ہوئی تھی۔

"سردار رامس نے تمہیں پھانسی پر چڑھانے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ لیکن یہ میں نہیں چاہتی تھی۔" اس بار میں اس کی بات پر چونکا تھا اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"میں اس کرم نوازی کی وجہ جان سکتا ہوں؟"

"میں نے ہی اسے زہر دے کر ہلاک کیا تھا..... اور اس سلسلے میں عامل عاروب نے میری خفیہ طور پر مدد بھی کی تھی۔"

مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر ناگاسی کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ تم اس راز کو افشاء کرنے کی کوشش میں خود کو ہلاکت میں نہیں ڈالو گے اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس طرح تم اس فائدے سے محروم ہو جاؤ گے جو میری وجہ سے تمہیں پہنچنے والا ہے۔" وہ اتنا کہہ کر رُکی۔ گویا مجھے کچھ کہنے کا موقع دیا گیا ہو۔

مجھے اب کیا کرنا تھا اور کیا کہنا تھا؟..... میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن نے کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے محتاط لہجے میں سوال کیا۔



"اگر یہ بات ہے تو ظاہر ہے کہ میں اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی نہیں مار سکتا۔ دوسرے یہ کہ میں آپ کا شکر گزار ہوں، آپ نے ایک اجنبی کی جان بچانے کے لئے ایسا کیا۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس راز میں آپ عامل عاروب کو شامل نہ کرتیں۔ کیونکہ وہ بہرحال ایک دھوکے باز اور فریبی انسان ہے۔ آپ کو اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

عامل عاروب کے سلسلے میں یہ آخری بات میں نے قدرے ڈرتے ڈرتے کہی تھی۔ کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں میں درونِ خانہ نہ جانے کس قسم کے "روابط" استوار ہو چکے تھے۔ اور میرا عامل عاروب کے لئے اس قسم کا منفی تبصرہ کہیں ناگاسی کو ناگوار نہ گزرے۔ لیکن چونکہ ناگاسی نے مجھے دوٹوک گفتگو کرنے کا کہا تھا اس لئے میں نے کچھ ایسے انداز میں یہ بات کہہ دی تھی تاکہ ناگاسی بھی مجھے اپنا خیر خواہ سمجھے۔

میں نے دیکھا، میری بات پر اس کے چہرے پر ہلکی اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں دور کہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے سر کو ہولے سے تھپکی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔"

اسے اپنی بات کی تائید کرتے دیکھ کر بے اختیار میں نے اطمینان کی سانس لی تھی اور مجھے مزید کچھ کہنے اور پوچھنے کا حوصلہ بھی ہوا تھا۔ تاہم مجھے گہری اور پراسرار سازش کی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی سازش جو بڑی کامیابی کے ساتھ انجام پذیر بھی ہو چکی تھی۔

"اسے ہمراز بنانا میری مجبوری تھی..... درحقیقت جو میں چاہتی تھی، وہ بھی وہی چاہتا تھا۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بہت مختصر اور چھوٹے چھوٹے جملے کہنے کی عادی تھی۔

"یعنی..... سردار رامس کی موت.....؟" میں نے بھی لقمہ دیا۔

"ہاں....."

"کیا پوچھ سکتا ہوں کہ عامل عاروب کو سردار رامس سے کیا دشمنی تھی؟ کیونکہ وہ دونوں تو ایک دوسرے کے زبردست حلیف تھے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں..... یہ بات درست ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ لیکن یہ دوستی صرف مفادات کی حد تک تھی۔ سردار رامس کو تم سے خاص قسم کی پرخاش ہو چکی تھی۔ وہ تمہیں ہر قیمت پر پھانسی چڑھا دینا چاہتا تھا لیکن جب عامل عاروب کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کا شکار یعنی تم سردار رامس کی قید میں ہو تو اس نے سردار رامس سے دوستانہ درخواست کی کہ تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے۔ کیونکہ تم درحقیقت عامل عاروب کے ہی شکار تھے بلکہ تمہیں سردار رامس سے حاصل کرنے کا اہم ترین مقصد عامل عاروب کا یہ تھا کہ وہ تمہیں یرغمال بنائے رکھتے ہوئے تمہاری ساتھی نگینہ کو قابو میں کرنا چاہتا تھا۔" ناگاسی نے تھوڑے وقفے کے بعد ایک گہری سانس لے کر گویا بات سمیٹنے کی غرض سے کہا۔

"سردار رامس نے عامل عاروب کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا اس سلسلے میں کہنا تھا کہ تم ایک خطرناک انسان ہو اور عامل عاروب کی قید سے کسی وقت بھی دوبارہ نکل بھاگ سکتے ہو۔ لہٰذا اب تمہیں پھانسی دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔ یہ بات عامل عاروب کو بری لگی اور یوں دونوں دوستوں کے درمیان سرد جنگ شروع ہوگئی۔ مجھے ان ساری باتوں کا علم تھا۔ میں نے ایک روز عامل عاروب سے خفیہ ملاقات کی اور میں تمہیں پھانسی سے بچانا اور سردار رامس کو ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ مگر تمہیں بچانے والی بات عامل عاروب سے میں نے چھپا رکھی ہے۔ تاہم میں نے عامل عاروب سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ کسی طرح

سردار رامس کو ہلاک کرنے میں میری مدد کرے تو میں تمہیں اس کے حوالے کر دوں گی۔ اور یوں عامل عاروب نے ہی مجھے ایک ایسا خطرناک زہر فراہم کیا جس کے اثرات زہر خورانی نہیں بلکہ طبعی موت کی صورت ہی میں اُبھرتے تھے۔"

ناگاسی نے اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ میری حالت دگرگوں ہونے لگی۔ میں ایک بار پھر سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ناگاسی نے میری خاطر یہ سب کچھ کیوں کیا؟ سب سے پہلے سردار رامس سے خفیہ گٹھ جوڑ کر کے اپنے پہلے عمر رسیدہ شوہر آگرموشی کے لئے ہلاکت کا سامان پیدا کیا اور پھر سازش کامیاب ہوتے ہی ناگاسی نے عامل عاروب سے خفیہ گٹھ جوڑ کر کے اپنے دوسرے اور نسبتاً جوان شوہر رامس کو بھی ہلاک کر ڈالا اور اب..... یہ مجھ سے کیا چاہتی تھی؟ چاہئے تو اسے یہ تھا کہ عامل عاروب سے کئے گئے خفیہ معاہدے کی رو سے مجھے اس کے حوالے کر ڈالتی۔ لیکن اس نے ایسا کرنے کے بجائے مجھے یہاں بلا لیا اور میں سمجھ رہا تھا کہ اس خفیہ اور انتہائی رازدارانہ نشست سے صرف چند وہی افراد آگاہ ہو سکتے تھے جو ناگاسی کے قریبی وفادار تھے۔ یہ محلاتی سازشیں تھیں۔ تاریخ ایسے عبرت ناک واقعات سے بھری پڑی تھی۔ کبھی اقتدار کی ہوس تھی تو کبھی حسین عورت کے حصول کی۔ کبھی غلام آقا بن جاتا تو کبھی آقا غلام۔ حتیٰ کہ بادشاہوں تک کو گدا بنتے دیکھا۔

مجھے ان معاملات سے کوئی غرض نہ تھی۔ لیکن ناگاسی کی جانب سے ابھی تک میں ایک پراسرار اُلجھن کا شکار تھا کہ آخر اس نے یہ سب کیوں کیا؟..... میری خاطر بھی کیوں؟..... میرے دل میں آئی تو سہی کہ میں اس سے اپنے حوالے سے بھی دریافت کروں کہ آخر یہ عامل عاروب سے حسب منشاء اپنا کام کرانے کے باوجود اس کے خلاف دھوکا یا وعدہ خلافی کیوں کر رہی تھی؟ چند لمحوں کے سکوت کے بعد میں نے زبان کھولی۔

"سب سے پہلے تو میں آپ کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ آپ نے یہ سب میری خاطر کیا۔ لیکن اب جبکہ آپ مجھے عامل عاروب کے حوالے بھی نہیں کرنا چاہتیں تو میں اس کے لئے بھی آپ کا احسان مند رہوں گا۔ مگر اس طرح عامل عاروب آپ کا بھی دشمن بن سکتا تھا۔ مانا کہ وہ سردار رامس کو زہر دینے والا راز بھی نہیں اُگل سکتا کیونکہ اس سازش میں وہ خود بھی شریک رہا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کو اس سے خطرہ تو ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے آپ نے کیا سوچا ہے؟"

میری بات پر ناگاسی اپنی جگہ سے اُٹھی۔ میں نے بھی دانستہ ازراہِ احترام کھڑے ہونا چاہا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ وہ چند ثانیے دبیز قالین پر پُرسوچ انداز میں ٹہلتی رہی اس کے بعد دوبارہ اپنی نشست پر براجمان ہو کر میری طرف بہ غور تکتے ہوئے بولی۔

"تم ایک بہادر اور جری انسان ہو۔ میں جانتی ہوں کہ عامل عاروب کو صرف تم ہی موت کے گھاٹ اتار سکتے ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی تم اسے کئی بار نقصان پہنچا چکے ہو۔ وہ تمہاری طرف سے بری طرح خائف رہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کا قضیہ ہمیشہ کے لئے اب نمٹایا جائے۔ عامل عاروب کی موت تمہاری بھی سب سے بڑی خواہش ہو گی۔"

میں اب اس کی آغاز سے آخر تک ساری گفتگو کا مقصد سمجھ چکا تھا..... تاہم پھر بھی سردار رامس کے ایک سازش کے تحت قتل کے حوالے سے ابہام کا شکار تھا اس لئے ذرا محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"اب جبکہ ہمارے درمیان رازدارانہ دوستی کا رشتہ استوار ہو ہی چکا ہے تو میں اپنی آخری اُلجھن بھی دور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دینا چاہتا ہوں۔" میں نے ذرا توقف کیا اور اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آخر آپ کو اپنے دوسرے شوہر سردار رامس کو قتل کرنے کی ایسی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ حالانکہ معافی چاہتا ہوں، آپ نے اس کے ساتھ مل کر ہی اپنے پہلے شوہر سردار آگرموشی....."

"بتاتی ہوں۔" اس نے اچانک میری بات کاٹ کر سپاٹ لہجے میں کہا اور میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔ "درحقیقت میں دونوں بھائیوں کو دل ہی دل میں سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس کی بڑی ٹھوس اور اہم وجہ ہے۔" اس نے ذرا رک کر ایک گہری ہنکاری لی، پھر بولی۔

"میں ایک دوسرے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ بہت چھوٹا اور امن پسند قبیلہ تھا۔ میں وہاں کے سردار کی بیٹی تھی۔ جبکہ سردار آگرموشی کا قبیلہ ایک جارح اور سرکش قبیلہ تھا۔ میرے باپ کی ذرا سی غلطی پر سردار آگرموشی کے قبیلے نے اس پر چڑھائی کر دی۔ میرا باپ قتل کر دیا گیا اور ہمارے چھوٹے سے قبیلے کا شیرازہ بکھیر دیا گیا۔ مجھے بھی قیدی بنا لیا گیا۔ مگر بعد میں میرے حُسن سے دونوں بھائی یعنی آگرموشی اور رامس متاثر ہو گئے تھے۔ میں نے بھی اپنے قبیلے کا انتقام لینے کی خاطر ان دونوں بھائیوں سے خاموش انتقام لینے کی ٹھان رکھی تھی اور چونکہ اس وقت سردار آگرموشی ہی قبیلے کا سردار تھا اس لئے میں نے یہ چالاکی کی کہ اس کی بیوی بن گئی اور بعد میں خفیہ طور پر اس کے بھائی رامس کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے لگی۔ اس کا بھی میری وجہ سے اپنے بڑے بھائی سردار آگرموشی کی طرف سے دل خراب ہو چکا تھا۔ یوں وہ بغاوت پر اتر آیا اور یوں میں نے بعد میں ان دونوں بھائیوں کا خاتمہ کر ڈالا۔ تم اور تمہارے ساتھی رشتی گال نامی جس باغی کی پناہ میں تھے، وہ درحقیقت میرے ہی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور میرا منگیتر بھی تھا۔ ہم دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ مگر پھر حالات نے پلٹا کھایا اور سب کچھ تباہ و برباد ہوتا چلا گیا۔ مگر اب میری منزل قریب آ چکی ہے۔"

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوئی تو میں اس کے ان انکشافات پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ اب ساری بات واضح ہو چکی تھی۔ میں ناگاسی کے استقلال، ذہانت اور طویل منصوبہ بندی اور پھر اس کی کامیابی پر عش عش کر اٹھا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ تمتمایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اپنے عبرت سوز ماضی کے متعلق ذکر کرتے ہوئے اس کے سینے میں چھپی آتش انتقام، تمتماتی آنکھوں اور چہرے پر غیظ کی سرخی کی مانند مترشح ہونے لگی تھی۔ وہ اس وقت مجھے کسی منتقم ناگن کی صورت میں نظر آ رہی تھی۔ بہرطور یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ اور وہ خاصی حد تک اس میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے قبیلے کو دربدر کرنے اور اپنے باپ کے قتل کا دونوں بھائیوں (آگرموشی اور رامس) سے خاطر خواہ انتقام لے لیا تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے، عورت انتقام پر اتر آئے تو ناگن سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے اور اس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ تاہم میرے ذہن میں ایک سوال اُبھرا اور میں نے پوچھا۔

"کیا آگرموشی کے قبیلے نے آپ کو دل سے اپنا سردار تسلیم کر لیا ہے؟"

میرے استفسار پر اس کے عنابی ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری۔ "ہاں..... اس لئے کہ جن امراء کے انتخاب کے سلسلے میں، میں نے سردار آگرموشی کا ساتھ دیا تھا، ان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر تقریباً سب ہی قبیلے کے لوگ تھے۔ اب اگر عامل عاروب کا خاتمہ ہو جائے اور میں رشتی گال سے شادی کر لوں تو قبیلے کے قانون کی رو سے شادی کے بعد رشتی گال کو قبیلے کی سرداری از خود منتقل ہو جائے گی اور یوں میرا برسوں کا خواب پورا ہو جائے گا۔"

"عامل عاروب کے سلسلے میں جس وقت چاہیں مجھے آپ مہم پر روانہ کر سکتی ہیں۔" بالآخر میں نے گفتگو

سمیٹنے کی غرض سے کہا۔

''ہاں.........'' وہ بولی۔''لیکن تمہاری یہ مہم جوئی مجھے خفیہ رکھنا پڑے گی۔ تمہیں قید میں رکھتے ہوئے خفیہ طور پر فرار کروانا ہوگا۔ میں نے ایک تفصیلی خفیہ پیغام رشنی گال کو پہنچا دیا ہے اور تمہارے لئے یہ خوش خبری بھی ہے کہ تمہارے دونوں ساتھی نگینہ اور اعظم خان اس کی پناہ میں ہیں اور میں رشنی گال کی مکمل مدد کر رہی ہوں۔''

نگینہ اور انکل اعظم خان کی خیریت معلوم ہوتے ہی میں نے یک گونہ طمانیت بھری سانس لی تھی۔

''میرا خیال ہے اب تم نے ساری باتیں سمجھ لی ہوں گی۔''

''جی.........'' میں نے ہولے سے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔''میں تیار ہوں......... اور عالل عاروب کی سرکوبی کے لئے جس قدر ممکن ہو سکے ہمیں جلد سے جلد اقدام اٹھانا چاہئے۔'' یہ کہہ کر میں نے کسی خیال کے تحت آخر میں کہا۔''مگر میں سب سے پہلے اپنے دونوں ساتھیوں یعنی نگینہ اور اعظم خان کو بہ حفاظت واپس یہاں سے لوٹانے کا بندوبست کرنا چاہوں گا۔ کیونکہ وہ دونوں کسی وقت بھی میرے پاؤں کی زنجیر بن سکتے ہیں۔''

''یہ کام میں اپنے آدمی کے سپرد کرتی ہوں۔'' اس نے بلا تامل جواب دیا۔''میں ابھی اپنے ایک جاسوس کے ذریعے یہ خفیہ پیغام رشنی گال تک پہنچاتی ہوں۔ مگر اس سے پہلے تمہیں یہاں سے فرار ہونا پڑے گا اور منہ اندھیرے تم رشنی گال سے جاملو گے۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔'' اس نے بات ختم کر دی۔

میں نے بے اختیار اس معجزے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

میرے اور ناگاسی کے درمیان نصف رات کی یہ 'ون ٹو ون' ملاقات کافی حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ اندرونی محلاتی سازشوں نے کم از کم میرا کام ''آسان'' بنا دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میری جان بغیر کسی خون خرابے کے بچ گئی تھی بلکہ آئندہ کے لئے بھی راہیں ہموار نظر آنے لگی تھیں۔

ناگاسی نے اپنے جاسوس کے ہمراہ رات کے پچھلے پہر مجھے خفیہ طور پر ایک تیز رفتار جیپ میں سوار کر کے روانہ کر دیا۔

رشنی گال کا نیا ٹھکانا زیادہ دور نہ تھا۔ اسے اب کوئی خطرہ نہ تھا۔ میں وہاں پہنچا تو میں نے رشنی گال کو غیر معمولی طور پر خوش اور ہشاش بشاش پایا۔ نگینہ اور انکل اعظم خان بھی مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے تھے۔

میں نے رشنی گال کو اس کی سابقہ منگیتر ناگاسی کے ساتھ ہونے والی خفیہ نشست کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کر ڈالا۔ سردار راس کی موت اور ناگاسی کے قبیلے میں سرداری سنبھالنے پر رشنی گال اور اس کے ساتھیوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

تاہم رشنی گال نے مجھے بتایا تھا کہ اب وہ جلد از جلد ناگاسی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ قبیلے کے قانون کی رو سے عورت زیادہ عرصہ تک سردار نہیں رہ سکتی۔ اسے بہت جلد اپنے نئے جیون ساتھی کا انتخاب کر کے دستارِ سرداری اسے منتقل کرنا تھی۔ بہ صورت دیگر قبیلے کے معتبر امراء کے ہاتھ میں از خود اس کا فیصلہ چلا جاتا اور پھر وہ متفقہ طور پر قبیلے کے کسی بہادر شخص کو دستارِ سرداری سونپ دیتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہی معتبر امراء میں سے کوئی شخص سردار بن جاتا۔ یہ یہاں ہر قبیلے کا اپنا قانون تھا۔

چنانچہ ناگاسی بھلا یہ کیسے چاہتی کہ دستارِ سرداری کسی اور کو منتقل ہو جاتی۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنے سابقہ منگیتر رشنی گال کا انتخاب کر لیا تھا۔

میری حیثیت بہ دستور ایک مفرور قیدی کی تھی جس کا کام صرف اور صرف عالل عاروب کو خفیہ طور پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



ٹھکانے لگانا تھا۔ لیکن درپردہ ناگاسی اور متوقع سردار رشنی گال میری سپورٹ کرتے رہتے۔ تاہم رشنی گال نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ لوگ بعد میں میری موت کا یا جان سے مار دینے کا اعلان کر کے میرے قضیے سے بھی جان چھڑا سکتے تھے۔

منصوبے کے تحت سب سے پہلے نگینہ اور انکل اعظم خان کو فی الفور یہاں سے روانہ کر دیا جاتا۔ انکل اعظم خان تو خاموش رہے۔ لیکن ظاہر ہے نگینہ کو یہ کب گوارا تھا۔

انکل اعظم خان نے البتہ ایک گمبھیر مسئلے کی طرف میری توجہ دلاتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔

''نادر بیٹے! اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ لیکن مٹش پور کے سردار زور آور والا مسئلہ مزید گمبھیر اور تشویش ناک ہو چکا ہے۔ اس کے بھائی وزیر خان کی لاش سمیت اگر ہمارے ہتھے سنکھال چڑھ جاتا تو میں سمجھتا ہوں تمہارے لئے اچھا ہوتا۔ ورنہ وہ لوگ وزیر خان کا قتل بھی شہ زور کے قتل کی طرح تمہارے کھاتے میں ڈال دیں گے۔''

اس کی بات قابل غور تھی۔ مگر سنکھال کا زندہ حصول اتنی جلدی ممکن نہ تھا۔ پھر حالات بھی ایسے نہ تھے کہ جب تک انکل اعظم خان اور نگینہ کو یہاں روکا جاتا۔ ہم بہرحال دونوں طرف سے مفرور قیدی ہی تھے۔ ناگاسی سے معاملت کے باعث اب بظاہر ہمارا کہیں ٹھکانہ نہ تھا۔ موجودہ حالات کے پیش نظر میں بے اطمینان ہو چکا تھا اور رشنی گال اور اس کے باقی ٹولے کی جیسے لاٹری کھل گئی تھی۔ وہ عنقریب سرداری ٹولے میں شامل ہونے والے تھے۔ اس لئے اس موقع سے جس قدر اور جلد فائدہ اٹھانا تھا، اٹھالینا چاہئے تھا۔ میں نے انکل اعظم خان کو اسی تناظر میں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ چپ ہو رہے۔ بالآخر یہی طے پایا۔

نگینہ کی اس وقت بڑی غیر حالت تھی جب اسے انکل اعظم خان سمیت میں خود سے رخصت کر رہا تھا۔ مگر پھر میرے اور انکل اعظم خان سمیت رشنی گال نے بھی اسے سمجھایا تو اس کی کچھ ڈھارس بندھی تھی۔ رشنی گال نے یہ وعدہ بھی ہم سے کیا تھا کہ وہ میرا بھرپور ساتھ دے گا بلکہ عاروب کو ختم کرنا تو اب ہمارا مشترکہ مفاد بن چکا تھا۔

بالآخر ان کڑے حالات سے گزرتے ہوئے نگینہ اور انکل اعظم خان کو رشنی گال کے ایک مسلح دستے کی حفاظت میں وادی سے رخصت کر دیا گیا۔ وزیر خان کی لاش بھی ان کے حوالے کر دی گئی تھی۔ رشنی گال اس سے اگلے روز ناگاسی سے جاملا۔ البتہ اس کے بیس پچیس کے قریب مسلح ساتھی جو اب 'باغی' نہ رہے تھے ہوئے ساتھ اس خفیہ ٹھکانے پر موجود رہے۔

حالات کی کایا پلٹ میرے حق میں بدل گئی تھی اور اب مجھے عالل عاروب کی بیخ کنی کے ساتھ ساتھ سنکھال کو زندہ گرفت میں لینا تھا۔

ادھر اب رشنی گال ناگاسی سے شادی اور اس کے بعد دستار حاصل کرنے کی تیاریوں میں مشغول تھا اور ادھر میں رشنی گال کے ساتھیوں کے ساتھ اس برف زار ویرانے میں عالل عاروب کے خلاف فیصلہ کن ضرب و حرب کی منصوبہ بندی جوڑنے میں مصروف تھا۔

❋❋❋

عالل عاروب کے سلسلے میں ناگاسی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ممکن ہے میرے فرار کے ڈرامے کو وہ جھوٹ سمجھے اور یہ ممکن بھی تھا تو یہ عالل عاروب سے جنگ کرنے کا جواز بھی بن سکتا تھا۔

مگر میں جانتا تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ عالل عاروب ایک شاطر اور مکار انسان تھا۔ وہ زخمی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھ جاتا اور ڈسنے کے موقع کی تلاش میں رہتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



تاہم مجھے یہ قضیہ ضرور جلد از جلد نمٹانے کا کہا گیا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے ناگاسی کی طرف سے خفیہ ہی سہی، مکمل سپورٹ حاصل ہو گئی تھی۔

میں نے پہلا حملہ عامل عاروب کے ٹھکانے پر رات کے پچھلے پہر کیا تھا اور اپنے چند ساتھیوں کی جان کا نذرانہ دے کر اسے خاصا بھاری جانی نقصان پہنچایا تھا۔ اس دوران میں نے عامل عاروب کو ٹھکانے لگانے اور سنکھال کو زندہ گرفت میں لینے کی بھی جان توڑ کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

یوں پھر ہماری عامل عاروب کے خلاف ایسی گوریلا کارروائیاں معمول کا حصہ بن گئیں۔

عامل عاروب کا جلد از جلد قضیہ نمٹانے کی خاطر رشنی گال اور ناگاسی میری مکمل طور پر مدد کر رہے تھے۔ ادھر رشنی گال اور ناگاسی کی شادی عمل میں آ چکی تھی۔ بالآخر سرداری رشنی گال کو منتقل ہو گئی تھی۔

ہماری پے در پے گوریلا کارروائیوں سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ عامل عاروب کے گروہی ساتھی اب خوف زدہ ہو کر اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔

عامل عاروب کا کوئی ایک قبیلہ نہ تھا۔ صرف مخصوص گروہ تھا جو کیلاش وادی کے مختلف قبیلوں کے آدمیوں کو طے شدہ منصوبے اور پروگرام کے تحت اپنے گروہ میں شامل کر لیا کرتا تھا۔

اسی دوران ایک روز سردار رشنی گال کا ایلچی ناگاسی اور رشنی گال کا مشترکہ پیغام لے کر میرے پاس پہنچا۔ یہ زبانی پیغام تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ عامل عاروب کا قضیہ جلد سے جلد نمٹایا جائے۔ کیونکہ اس نے ان کے خلاف پروپیگنڈا اور بلا اشتعال جارحیت کا الزام لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس پیغام کے ساتھ ہی عامل عاروب پر مجھے آخری بار اور فیصلہ کن حملہ کرنے کی خاطر بھاری تعداد میں جدید ہتھیاروں سے لیس گوریلوں کی خاصی تعداد روانہ کر دی گئی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ جلد از جلد عامل عاروب کو ٹھکانے لگا دوں۔

میں جانتا تھا کہ اب عامل عاروب جیسے شاطر انسان کو اندازہ ہو چکا ہو گا کہ ناگاسی نے مجھے اس کے خلاف ہتھیار کی طرح استعمال کرتے ہوئے کیسی زبردست سازش تیار کی تھی۔

اس رات میں نے اپنے پورے ساتھیوں کے ساتھ عامل عاروب کے گروہ پر ہلہ بول دیا۔ بڑی زبردست مار ماری ہوئی۔ عامل عاروب کا بچا کھچا گروہ تتر بتر اور بری طرح انتشار کا شکار ہو گیا۔

اس حملے کے دوران مجھ پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ عامل عاروب حملے سے کئی گھنٹے پہلے ہی اپنے چند قریبی ساتھیوں کے ساتھ جن میں سنکھال بھی شامل تھا، نکل بھاگا تھا۔

یہ بات ہمیں اس کے گروہ کے ایک گرفتار پیرو نے بتائی تھی اور اس نے راستہ ہمیں سمجھا دیا تھا۔ بہرحال اسے چھوڑ دیا گیا اور باقی گروہ کے آدمی قیدی بنا کر سردار رشنی گال کے حوالے کر دیئے گئے۔

لیکن اب میرے ساتھ عامل عاروب کے تعاقب میں جانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔

یہی نہیں، سردار رشنی گال اور ناگاسی کے لئے بھی یہی کافی تھا کہ عامل عاروب کو بالآخر بے خانماں برباد کر کے وادی سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ نیز مجھے بھی یہی مشورہ دیا گیا تھا کہ اب میں بھی اپنی یہ مہم ترک کر کے وادی سے جلد از جلد نکل جاؤں۔ ورنہ ان دونوں کے لئے قبیلے میں میری وجہ سے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا۔

صورتِ حال گمبھیر اور خطرناک ہو گئی تھی۔ اگر میں سردار رشنی گال اور اس کی بیوی کی بات نہ مانتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ میں اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں ''پیارا'' کر دیا جاتا۔ بہرطور میں نے اللہ کا نام لیا اور ایک تیز رفتار جیپ میں خود ہی تنہا، عامل عاروب اور سنکھال کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔



❋❋❋

جیپ کی ٹینکی ایندھن سے بھری ہوئی تھی۔ ایک فاضل کین بھی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق عامل عاروب کو افغانستان کے سرحدی علاقے نورستان کے اریب قریب ہونا چاہئے تھا۔

بہ قول اس کے ساتھی کہ وہ سنکھال سمیت چار ساتھیوں کے ہمراہ چھ خچروں پر فرار ہوا تھا۔ نیز اس کی منزل ''نورستان'' ہی تھی۔ وہاں عامل عاروب کے پیش روؤں کا خاصا بڑا گروہ تھا۔ نورستان درحقیقت افغانستان کا ایک صوبہ تھا۔

میں جیپ کو ناہموار راستوں پر دوڑاتے ہوئے آبادی سے کوسوں دور نکل آیا تھا۔ میرے پاس تھوڑا بہت زادِ راہ بھی تھا۔ جیپ بہت طاقت ور تھی۔ حقیقت یہ تھی سردار رشنی گال اور ناگاسی کی مہربانی تھی کہ انہوں نے جیپ مجھے عنایت کی تھی۔ مگر عامل عاروب کے تعاقب کے لئے نہیں، بلکہ مجھے یہاں سے نکل جانے کی غرض سے۔ مگر میں واپسی کے سفر کی بجائے عامل عاروب اور سنکھال کے تعاقب میں روانہ ہو گیا تھا۔

جیپ میں فاضل ٹائر بھی موجود تھا۔ اپنی حفاظت کے لئے مجھے ایک طاقت ور ایم پی فائیو رائفل اور دو بھرے ہوئے فاضل کلپ بھی دیئے گئے تھے۔ نیز میری پنڈلی پر بندھی ہوئی ایک چھوٹی سی نیام میں قرولی بھی تھی۔ میں عامل عاروب کی موت بن کر اس کے تعاقب میں گامزن تھا اور شام کے آثار ہونے تک میں ایک پیالہ نما برف زار وادی میں پہنچ کر رکا۔ جیپ کا انجن میں نے اسٹارٹ رہنے دیا تھا۔ ورنہ اس غضب کی ٹھنڈ میں اسے سیلف اسٹارٹ کرنا ممکن نہ ہوتا اور دھکا لگانا پڑتا۔ جبکہ میں بہرحال تنہا جیپ کو دھکا لگا کر اسٹارٹ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے جیپ روکی تو اس کے انجن نے دھواں چھوڑنا شروع کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جیپ کے ''ریڈی ایٹر'' کا پانی خشک ہو گیا تھا۔ یہاں کہیں پانی کا حصول بھی سردست ناممکنات میں نظر آ رہا تھا۔ ناچار میں نے اپنے پینے والے پانی کی ایک ڈیڑھ بوتل ریڈی ایٹر میں انڈیل دی۔

سردی کے باعث مجھے پیاس سے زیادہ خوراک کی طلب ہو رہی تھی اور وہ میرے پاس بھنے ہوئے چنوں کی صورت میں موجود تھی۔ تاہم پانی کی ایک لیٹر کی بوتل بھی تھی۔ وادی میں شام اترتے ہی گویا رات کا گمان ہونے لگتا تھا۔ راستہ پُرخطر اور دشوار تھا۔ اس لئے پہلے میں نے صبح تک سفر مؤخر کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا کہ یہ تساہل کے زمرے میں آتا۔ عامل عاروب کے پاس خچر تھے۔ جیپ کے مقابلے میں اسے راستوں کی زیادہ سہولت تھی۔ جبکہ میرے لئے جیپ کا راستہ دشوار اور کہیں کہیں تو بالکل ہی ناممکن تھا۔ جس کے لئے مجھے ایک لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ حالانکہ میں نے سردار رشنی گال سے خصوصی طور پر یہ گزارش بھی کی تھی کہ مجھے جیپ کے بجائے خچر کی سواری عنایت کر دی جاتی۔ کیونکہ مجھے آگے کا راستہ سوائے خچر سواری کے عبور کرنا ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔ جانے کیا سوچ کر سردار رشنی گال نے مجھے جیپ دے دی تھی اور کہا تھا کہ ریمبور پہنچ کر میں اسے ایک ''وار'' نامی سرائے کے مالک سوریا کے حوالے کر دوں۔ پھر خود آگے چترال وغیرہ کی طرف نکل جاؤں۔ مگر چونکہ مجھے عامل عاروب کے تعاقب میں نکلنا تھا اس لئے یہاں نکل آیا تھا۔

بہرطور ذرا رک کر میں نے اندازہ لگایا کہ مفرور عامل عاروب کے تعاقب میں کہاں تک میں فاصلہ طے کر چکا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق مجھے اس کے اریب قریب ہونا چاہئے تھا۔ میں نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور آگے بڑھ گیا۔ مگر چند کلومیٹر چلا تھا کہ راستہ مسدود ہو گیا۔ مجھے کوئی ایسا راستہ بھی نظر نہ آ رہا تھا کہ میں جیپ کو دوسری سمت سے موڑ کر آگے سفر جاری رکھتا۔ بالآخر مجھے احساس ہو گیا کہ اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



پیدل سفر جاری رکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے جیب سے مختصر سامان کی کٹ سنبھال کر پشت پر باندھی، رائفل ہاتھ میں پکڑی اور جیپ کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

ایک سنگلاخ درّے سے اُبھر کر جب میں پیالہ نما وادی سے نکل کر ایک قدرے ڈھلان کے سرے پر نمودار ہوا تو مجھے سامنے خاصی تعداد میں روئیدگی اور کچھ برف سے ڈھکے ہوئے درختوں کا مختصر سا جنگل نظر آیا۔ بہ غور دیکھنے پر میرا دل یکبارگی ٹھٹکا۔ مجھے روشنی سی چمکتی نظر آئی۔ میں محتاط ہو کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا تو اچانک وہ روشنی ایک الاؤ میں تبدیل ہوتی دکھائی دینے لگی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔

مذکورہ روشنی والی سمت پر مجھے کسی مختصر سے پڑاؤ کا گمان ہوا۔ میں سنگلاخ اور برفیلی چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا خود رو جھاڑیوں کے جھنڈ کے نزدیک پہنچ کر رکا اور سامنے نظریں جما دیں۔ آسمان صاف اور شفاف تھا۔ تاروں کے جھرمٹ میں کسی شہزادے کے چہرے کی طرح دمکتے طباق چاند کی پراسرار روشنی میں مجھے الاؤ کے گرد بیٹھے چند افراد کے ہیولے نظر آئے اور ان کے قریب ہی اتنی ہی تعداد میں خچر بھی کھڑے دکھائی دیئے۔

میرا دل گویا کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ نس نس میں جوشِ غیظ کی حرارت لاوے کی طرح کھولنے لگی۔ مجھے پورا یقین ہوگیا تھا کہ یہ عامل عاروب اور اس کے ساتھیوں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتے تھے۔ تاہم فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث میں ان کے چہرے پہچاننے سے قاصر تھا۔ تصدیق ضروری تھی۔ میں برف سے ڈھکی خود رو جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ سے فائدہ اٹھاتا ہوا دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھنے لگا۔

جب میں ان کے تقریباً بیس پچیس گز کے فاصلے پر پہنچ کر رکا تو مجھے عامل عاروب اور اس کے پانچوں ساتھیوں سمیت سنکھال بھی نظر آ گیا۔

اپنے دشمن دیرینہ کو قریب پا کر میرا دل مارے جوشِ غیظ کے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ان پر شب خون مارنے کی سوچتا، اچانک مجھے اپنے عقب سے ایک سنسناتی ہوئی تیز غراہٹ سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھٹک کر مڑا۔ میں سرتاپا لرز گیا۔ میں نے اپنے عقب میں صرف چند گز کے فاصلے پر گوشت کے ایک سفید تودے کو کھڑے پایا۔ یہ برفانی ریچھ تھا..... خاصا بھاری بھرکم اور جسیم۔ وہ اپنے دونوں پچھلے پیروں پر کھڑا تھا اور کسی چھوٹے برفانی تودے کی طرح ہی دکھائی پڑتا تھا۔

مجھے ریچھ جیسے درندوں کا تجربہ تھا۔ عموماً یہ انسانوں سے کترایا ہی کرتے تھے۔ مگر بعض شرارتی اور ضدی یا بھوک کے مارے ہوئے ریچھ بسا اوقات مقابلے پر بھی اتر آتے تھے۔ مگر میں اس نازک وقت میں اس سے مقابلے کا بہرحال متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنے دھڑکتے دل پر قابو پایا اور پھر ریچھ کو مخصوص انداز میں ''ششکارے'' دینے لگا۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ پڑاؤ کی جانب بیٹھے دشمنوں تک آواز نہ جائے۔ ان کی شاید ابھی تک ریچھ پر نگاہ نہیں پڑی تھی۔

تب پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اُبھرا۔ میں اگر عامل عاروب سمیت اس کے ساتھیوں کو ریچھ کی جانب متوجہ کر دیتا تو وہ یقیناً اس سے اُلجھ جاتے اور میں اپنا کام بھی با آسانی نمٹا سکتا تھا۔

مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ ریچھ نے شاید چند گز کے فاصلے پر اپنے سامنے الاؤ کی روشنی دیکھ لی تھی۔ وہ آہستگی سے اپنے چاروں پیروں پر جھکا اور ڈولتا، دوڑتا پڑاؤ کی طرف لپکا۔ میرے ہونٹوں پر معنی خیز



مسکراہٹ عود کر آئی۔

ریچھ اور انسان کا پرانا ٹکراؤ ہے۔ وہ انسان کا دوست بننے میں بھی دیر نہیں لگاتا اور دشمن بننے میں بھی۔ عموماً انسانوں کے پڑاؤ میں اسے اپنی خوراک کی خاطر خواہ موجودگی کی توقع ہوتی ہے اور اس ریچھ نے بھی شاید اسی لئے ادھر کا رخ کیا تھا۔ مگر راہ پاتے ہی اس نے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ تاہم میں نے اسے جیسے ہی گویا ''پروانۂ راہداری'' جاری کیا تو اپنے اصل ''ہدف'' کی طرف بڑھ گیا۔ اب مجھے صرف تماشا دیکھنا تھا۔

میں تھوڑا اور نزدیک سرک آیا۔ اسی وقت میں نے عامل عاروب اور اس کے پانچوں ساتھیوں کو بری طرح بدکتے ہوئے دیکھا۔ ریچھ بڑے دھڑلے کے ساتھ ان کی طرف اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ دوڑا جا رہا تھا۔ انہوں نے ریچھ پر فائرنگ کر دی۔ رات کے پُرہول سناٹے میں ریچھ کی لرزا دینے والی چنگھاڑ اُبھری اور وہ مزید غضب ناک ہو کر ان پر جھپٹ پڑا۔

میں نے عامل عاروب کے دو ساتھیوں کو خونخوار گرفت کے نرغے میں پایا۔ اور پھر چشم زدن میں غضب ناک ریچھ نے اپنے تیز نوکیلے پنجوں سے ان دونوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ ان کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخوں نے ماحول کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

عامل عاروب اور اس کے باقی تینوں ساتھیوں پر دہشت ناک بوکھلاہٹ طاری ہوگئی تھی۔ یقیناً اتنے بڑے جسیم اور خونخوار ریچھ کو اچانک اپنے سامنے پا کر ان کی یہی کیفیت ہونی تھی۔ اور کچھ غلط بھی نہ تھی۔ اچھے اچھے شکاری بھی اس اچانک سچویشن پر بدحواس ہو جاتے تھے۔

البتہ انہوں نے ریچھ پر فائرنگ ترک نہ کی تھی۔ ریچھ کے جسم پر شاید کچھ زیادہ ہی موٹی چربی چڑھی ہوئی تھی اور یوں بھی میں جانتا تھا کہ جس ہلکی ساخت کے ہتھیاروں سے یہ لوگ اتنے بڑے درندے کو نشانہ مار رہے تھے، وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ہاں، اگر اس کی تھوتھنی پر دو چار اوپر تلے گولیاں داغی جاتیں تو اور بات تھی۔ مگر یہاں تو مسئلہ یہ تھا کہ بلی کی گردن میں گھنٹی کون باندھے؟

میں بڑی دلچسپی کے ساتھ ریچھ اور انسانوں کی یہ جنگ دیکھ رہا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے سوچا کہ ریچھ کا ''کام'' آسان کر دینا چاہئے۔

چنانچہ میں نے اپنی رائفل سیدھی کی اور سب سے پہلے عامل عاروب کے دو ساتھیوں کو نشانے پر لیا اور لبلبی دبا دیا۔ گولیوں کا برسٹ دھماکے سے بوچھاڑ کی صورت اُمڈا اور میں نے دونوں کو کریہہ چیخیں مار کر گرتے دیکھا۔ عامل عاروب اور سنکھال کے اچانک اس دوسری افتاد پر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ پھر عامل عاروب اور سنکھال نے ریچھ کو چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی تو ریچھ ان کی طرف دوڑا۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی ان کے تعاقب میں دوڑ لگا دی۔

ان دونوں نے جب ریچھ کو اپنے تعاقب میں آتے دیکھا تو سنکھال نے فوراً اپنی سمت بدل ڈالی۔ میں نے دوڑتے دوڑتے دیکھا کہ ریچھ اب عامل عاروب کے تعاقب میں تھا اور بہت غضب ناک ہو رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے عامل عاروب کا پاؤں رپٹا اور وہ گر پڑا۔

ریچھ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا اور خود میں بھی۔ مگر میں نے عامل عاروب کو چھوڑ کر سنکھال کا نشانہ لیا، اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر میں نے ایک گولی داغ دی۔ وہ چیخ مار کر گرا اور گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ادھر ریچھ کے خونی پنجوں سے بچنے کے لئے عامل عاروب اپنی کہنیوں اور پشت کے بل پیچھے پیچھے کھسک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی دہشت طاری ہوگئی تھی۔ پھر اس کی مجھ پر بھی نگاہ پڑ گئی تھی۔ وہ لرزتی آواز میں مجھ سے التجا کرتے ہوئے بولا۔

”نن.........نادر!..........مم.......... مجھے اس درندے سے بچالو.........بچالو مجھے۔“

میں زور سے چلّا کر بولا۔ ”تمہارا یہی انجام ہونا چاہئے تھا۔ اب آواز دو اپنے جھوٹے دیوتا دالبولا میزری کو کہ جس کی بھینٹ تم ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی کو چڑھانے والے تھے۔

”مم.......... مجھے معاف کر دو۔ مم.......... مجھے معاف کر دو۔“ وہ معافیاں مانگنے لگا۔ مگر ریچھ اپنے پورے بھاری بھرکم پہاڑ جیسے وجود کے ساتھ اس پر چڑھ دوڑا اور پھر اپنے نوکیلے شکاری دانتوں اور تیز پنجوں سے اسے نوچنے، بھنبھوڑنے لگا۔ عامل عاروب کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ اور پھر ریچھ کا سفید تھوتھنا اور پنجے عامل عاروب کے ناپاک خون سے رنگین ہو گئے۔ ریچھ نے اسے بری طرح بھنبھوڑ ڈالا تھا۔

عامل عاروب کے جہنم واصل ہونے کا یقین کرنے کے بعد میں سنکھال کی جانب متوجہ ہوا جو میری چلائی ہوئی گولی سے زخمی ہو چکا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں بری طرح چونک پڑا۔ وہ زمین پر لیٹے لیٹے قریب گری ہوئی اپنی رائفل اٹھانے کے لئے اس کی جانب رینگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ادھر میں نے جیسے ہی اس کی جانب قدم بڑھایا تو ریچھ ایک لرزا دینے والی چنگھاڑ کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوا۔

میں یک دم اپنی جگہ پر رک گیا۔ میں نے ریچھ پر گولی چلانے کی سرِدست ”بے وقوفی“ نہیں کی تھی اور اسی طرح کھڑا رہا۔ ٹھیک اسی وقت سنکھال نے یہ بے وقوفی کر ڈالی کہ اس نے اپنی رائفل پر قبضہ جماتے ہی مجھ پر گولی چلا دی۔ میں اگر بروقت زمین پر نہ لیٹ جاتا تو یہ گولی میرا کام تمام کر ڈالتی۔

ریچھ غضب ناک ہو کر سنکھال کی طرف پلٹا۔ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ریچھ میرے آخری اہم شکار کا بھی عامل عاروب جیسا حشر کرے۔ چنانچہ ادھر جیسے ہی ریچھ نے سنکھال کی طرف دوڑ لگائی، اس نے دہشت زدہ ہو کر ریچھ پر فائرنگ کر ڈالی۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ سنکھال اس کا شکار بن جائے۔ کیونکہ میں اسے زندہ اپنی گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اپنی رائفل سے ریچھ کے تھوتھنے کا نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی پیٹھ میری جانب تھی۔

میں نے چلّا کر سنکھال سے کہا۔ ”میری طرف رخ کر کے دوڑو۔ تاکہ میں اس کا نشانہ لے سکوں۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔“

میری بات پر سنکھال نے ایسا ہی کیا اور لنگڑاتا ہوا میری جانب دوڑنے لگا۔ اس کی رائفل خالی ہو گئی تھی۔ جسے اس نے پھینک دیا تھا۔ ریچھ اس کے تعاقب میں ذرا مڑا تو اس کا لمبوترا تھوتھنا میرے نشانے پر آ گیا۔ میں نے لبلبی دبا دی۔ گولیوں کا پورا برسٹ ریچھ کے تھوتھنے پر پڑا اور وہ آخری غضب ناک چیخ مار کر وہیں برف پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

❄❄❄

اس خوف ناک اور زبردست ہنگامے کے بعد ماحول پر ایکا ایکی پراسرار سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

سنکھال نے اپنی زخمی ٹانگ پر برف لگا لی تھی جس سے کسی حد تک خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور عجیب و غریب وحشت ناک نظروں سے اپنے ساتھیوں اور بالخصوص قریب پڑی نچی ہوئی عامل عاروب کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔

سنکھال متذکرہ بالا ان لوگوں میں سے تھا جسے میری زبان آتی تھی۔ مگر اس وقت وہ اپنا سر عجیب انداز میں ہلاتے ہوئے اپنی ہی بولی میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو، یہ سب بہت برا ہوا۔


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر وہ میری جانب متوجہ ہوا۔ اس کے چہرے پر خونخواری اور نفرت کی گہری پرچھائیاں اُبھر آئی تھیں۔ مجھ سے بولا۔

”تم ہم سب کے لئے واقعی بہت خطرناک ثابت ہوئے ہو۔ بہت خطرناک.........لیکن اب تمہارا اہم دشمن عامل عاروب تو ختم ہو چکا۔ اب میرا کیا کرو گے؟......... مجھے جانے دو۔“

”خبردار! یہاں سے ذرا بھی ہلنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔“

میں نے اسے گھورتے ہوئے غرا کر کہا تو میں نے دیکھا ایکا ایکی اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ عود کر آئی۔ مجھے اس کمبخت کی مسکراہٹ زہریلی لگی۔ وہ قامت میں مجھ سے دبتا ہوا ضرور تھا مگر جسم توانا تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا پڑا تھا۔

”تم مجھے نہیں مار سکتے نادر!......... اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مجھے کیوں نہیں ہلاک کرنا چاہتے۔ مجھے عاروب نے بتا دیا تھا۔“

”ہاں.........تم نے بالکل درست کہا۔“ یہ کہہ کر میں دانت پیس کر اس کی جانب بڑھا اور اپنی رائفل کو نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھما کر اس کی کنپٹی پر رسید کر ڈالا۔ وہ کریہہ چیخ کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کے بے سدھ وجود کو اپنے کاندھے پر ڈال کر واپسی کے سفر پر ہو لیا جدھر میری جیپ کھڑی تھی۔

جیپ زیادہ دور نہ تھی۔ میں رات کی تاریکی کے پچھلے پہر اس مقام تک پہنچا جدھر میری جیپ کھڑی تھی۔ میں نے بے ہوش سنکھال کو جیپ کے عقبی حصے میں پٹخا اور پھر اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط رسّی کے ساتھ باندھ کر میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور رائفل اپنے برابر والی سیٹ پر رکھ دی۔ پھر اگنیشن میں لگی ہوئی چابی گھمائی۔ مگر جیپ اسٹارٹ نہ ہوئی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سخت کڑکڑاتی سردی میں خاموش پڑے پڑے انجن واقعی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

میں نے جھلّا کر اسٹیئرنگ پر دو ہتڑ رسید کر ڈالے۔ تب پھر اچانک ایک مختصر اور نشیبی ڈھلان کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال اُبھرا۔ میں جیپ سے اُترا اور اپنے وجود کی ساری طاقت اپنے دونوں بازوؤں میں سمو کر جیپ کو دھکا لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ جیپ تھوڑا سرکی اور چیونٹی کی رفتار سے گھسٹتی رینگتی ہوئی ڈھلان کے قریب جا پہنچی۔ اور جیسے ہی اس کے اگلے دونوں ٹائر ڈھلان سے ذرا نیچے اترے تو میں یکدم چھلانگ لگا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور جلدی سے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ جیپ ڈھلان سے نیچے کی طرف تیزی سے اُترنے لگی تو میں نے فوراً سیلف لگا کر کلچ دبایا اور گیئر ڈال کر کلچ پلیٹ سے پاؤں ہٹا دیا۔ جیپ کو ایک دھچکا لگا اور پھر اس کا انجن یکدم غرا کر اسٹارٹ ہو گیا۔

ڈھلان سے اترنے کے بعد میں نے جیپ واپسی کی طرف موڑ لی اور مناسب رفتار سے آگے بڑھانے لگا۔ میری کیلاش وادی کی مہم بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ میں اب آگے کی سوچ رہا تھا۔ میں نے چترال تک اس جیپ کو استعمال کرنے کا ارادہ باندھ رکھا تھا۔ سنکھال کو ان حالات میں میرا پنڈی تک لے جانا مناسب نہ تھا۔ اس کے لئے مجھے بہرحال چترال کے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے مدد حاصل کرنا تھی اور وہیں میں نے انکل اعظم خان وغیرہ سے رابطہ کر کے اپنی خیریت اور کامیابی کی اطلاع دینا تھی۔

میں دشوار گزار راستوں پر مسلسل سفر کرتا ہوا بالآخر ”ریمبور“ کے راستے کیلاش وادی سے نکل آیا اور اب چترال کی سمت اُڑا جا رہا تھا۔

سنکھال کو ہوش آ گیا تھا اور اپنے رسن بستہ ہونے کے باوجود اس نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا تھا۔ مگر میں

تو جیسے اس کی طرف سے بہرہ بن چکا تھا۔ اس ویرانے میں اس کی چیخیں بھلا کون سننے والا تھا۔ بالآخر دن کی روشنی پھیلنے تک میں نے سیدھا قریبی پولیس اسٹیشن کا رخ کیا۔

وہاں کا تھانہ انچارج بھلا مانس تھا۔ میں نے اسے ساری کتھا سنا ڈالی اور ساتھ ہی میں نے اس سے فون کی اجازت بھی طلب کر لی جو اس نے مجھے دے دی۔ میں نے سب سے پہلے انکل اعظم خان سے ہی رابطہ کرنا ضروری سمجھا۔ انہیں مختصراً ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ذرا دیر بعد انکل اعظم نے ایس پی ظہیر قریشی کی مدد سے تھانہ انچارج انسپکٹر بہرام بزدار کو ہدایات دلوا دیں۔

اس کے بعد بھلے مانس انسپکٹر بہرام نے جیپ اپنی کسٹڈی میں لے لی اور سنکھال کو ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ پھر وہاں سے ہمیں اسلام آباد روانہ کرنے کے انتظامات بھی اس نے کئے۔

انکل اعظم خان کی وجہ سے باقی سارے کام آسان ہوتے چلے گئے تھے اور میں سنکھال کے ساتھ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترا۔ وہاں متعلقہ تھانے کی پولیس کے ہمراہ انکل اعظم خان، نگینہ اور ماں بھی میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔

ماں نے مجھے گلے لگایا۔ نگینہ نے پُرمسرت نگاہوں سے میرا استقبال کیا۔ اس کے بعد ہم سب پولیس کے مختصر قافلے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

بعد میں ماں اور نگینہ کو میں نے واپس گرین لاج روانہ کر دیا۔ جبکہ میں اور انکل اعظم خان ضابطے کی کارروائی نمٹانے متعلقہ تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایس پی ظہیر قریشی صاحب بھی بہ نفسِ نفیس ہمارے ساتھ تھے۔

مکش پور کی مذکورہ بستی کے سردار زور اور خان سے رابطہ کیا جاتا رہا۔ انکل اعظم خان نے یہاں پہنچ کر یہ عقل مندی کی تھی کہ سردار زور آور خان کے بھائی وزیر ان کی لاش بذاتِ خود ان کے حوالے کرنے کی بجائے ایس پی ظہیر کی معرفت اس تک پہنچائی تھی اور اس کے ساتھ ایک خصوصی نشست کے دوران ساری باتیں گوش گزار کر ڈالی تھیں۔ مگر سردار زور آور خان کی ایک ہی ہٹ تھی کہ جب تک اس کے بیٹے شہ زور کے قاتل کو وہ سامنے نہ دیکھ لے اور مزید یہ کہ اس کی بیٹی شہزادی اپنے بھائی کے قاتل کو نہ پہچان لے، وہ کسی بات کو تسلیم نہیں کرے گا۔ چنانچہ ہم نے سنکھال کو ساتھ لیا اور پولیس کی جمعیت کے ساتھ مکش پور پہنچے۔

سردار زور آور خان مجھے دیکھ کر چراغ پا ہو گیا تھا مگر جب میرے ساتھ سنکھال کو دیکھا تو فوراً اپنی بیٹی شہزادی کو طلب کیا۔ شہزادی قاتلانہ حملے اور اپنے جوان بھائی شہ زور کو قتل کرنے والے سفاک انسان سنکھال کو دیکھ کر فوراً چیخ پڑی۔ تب کہیں جا کر میری طرف سے سردار زور آور خان کا ابال کچھ سرد ہوا تو سنکھال کی حوالگی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

"یہ ہمارا مجرم ہے۔ اسے ہمارے حوالے کرنا ہو گا۔ اسے ہم خود سزا دیں گے۔" سردار زور آور خان نے آخر میں ایس پی ظہیر قریشی صاحب سے کہا۔

میں اور انکل اعظم خان خاموش تھے۔ ایس پی صاحب نے بردبارانہ لہجے میں اس سے کہا۔

"دیکھئے سردار صاحب! آپ لوگ اسٹیٹ سے باہر نہیں ہیں۔ اور دوسری بات جو سب سے اہم ہے وہ یہ کہ یہ آپ کا قبائلی جھگڑا بھی نہیں تھا۔ سنکھال ایک غیر معروف گروہ سے تعلق رکھتا تھا جس کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ یہ وادی کیلاش سے تعلق رکھتا تھا اور نہ ہی اس کی آپ سے کوئی دشمنی تھی۔ مگر بہرحال یہ قانون کا اور آپ کا مجرم ہے۔ اسے کڑی سے کڑی سزا دلوانے کا میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں اس پر نہ صرف آپ کے بیٹے کے قتل کی فرد جرم عائد ہو گی بلکہ آپ کی بیٹی شہزادی پر قاتلانہ حملے سمیت آپ کے بھائی وزیر خان



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرحوم کا قتل بھی اسی کے سر جائے گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ بہ صورت دیگر اگر آپ نے قانون کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تو ہو سکتا ہے اس کا فائدہ آپ سے زیادہ مجرم سنکھال کو ہو جائے اور آپ بھی بلاوجہ سرکار سے ٹکر لے کر معتوب ٹھہریں گے۔"

ایس پی ظہیر قریشی صاحب کی بات پر سردار زور آور کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے دیگر امراء و مشیروں سے صلاح مشورہ کیا، اس کے بعد چپ سادھ لی۔

میرے سر سے بوجھ اتر گیا۔ میں خود کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے اب میرے نامساعد حالات کے سمندر میں تیرتی ہوئی بے پتوار ناؤ کو ایک کنارہ، ایک ساحل ملنے والا تھا جہاں خوشیاں تھیں، بے پایاں مسرتیں تھیں۔ یا شاید یہ میرا وہم تھا۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ میری خوشیوں اور مسرتوں پر کوئی بڑا اگر خاموش طوفان ایک اور شب خون مارنے کے لئے تیار تھا۔

گرین لاج میں ماں اور نگینہ بے چینی کے ساتھ ہماری منتظر تھیں۔ شاہ میر کو ماں نے ایک الگ کمرہ دے رکھا تھا اور نگینہ بھی وہیں رہتی تھی۔

ہم نے بڑے عرصے بعد اپنی کامیابی کا جشن منایا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے گرین لاج سے عرصے سے روٹھی ہوئی خوشیاں دوبارہ لوٹ آئی تھیں۔

میں، ماں اور نگینہ بہت خوش تھے۔ میں سمجھتا تھا ماں نے شاہ میر کے سلسلے میں دشمنی کی ایک نئی مثال قائم کی تھی اسے معاف کر کے اور کڑے وقت میں اسے اور اس کی بیٹی کو اپنے ہاں پناہ دے کر......... مگر نگینہ بھی ماں کے اس حسن سلوک سے از حد متاثر ہوئی تھی۔ بہرطور نگینہ نے اب اپنے گھر جانے کی فرمائش کر ڈالی۔

"لو بیٹی! تم گھر جانے کی بات کر رہی ہو۔ میں تو تمہیں اپنی بہو بنا کر یہاں لانا چاہتی ہوں۔" ماں نے نگینہ کے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ملائمت سے کہا تو اس کا چہرہ شرم کے مارے گلنار ہو گیا۔ تاہم وہ سر جھکا کر ماں سے بولی۔

"ماں جی! اب تو آپ ہی میری ماں ہیں۔ لیکن مجھے اپنے گھر تو جانا ہے......... ابھی یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا۔"

"لیکن بیٹی! میں تو تمہیں یہ مشورہ دوں گی کہ اپنے انکل اعظم خان کے ہاں رہ لو۔ صرف چند دنوں کی تو بات ہے۔ میں اور نادر تمہیں عنقریب منگنی کی انگوٹھی پہنانے آ جائیں گے۔"

ماں نے بڑے پیار سے کہا تو بے اختیار انکل اعظم خان بھی نگینہ کے سر پر ازراہِ شفقت ہاتھ رکھتے ہوئے دھیرے سے بولے۔

"ہاں بیٹی! اب تم ہمارے لئے غیر تھوڑی ہو؟......... ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ تم میری بیٹیوں جیسی ہو۔ دیکھنا میں تمہیں کس طرح ایک باپ بن کر اپنے ہاں سے رخصت کروں گا۔"

باپ کے ذکر پر بے اختیار نگینہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہم سب اس کی آنکھوں سے اچانک ہی بہہ نکلنے والے ان آنسوؤں کا مطلب سمجھ چکے تھے۔

اچانک کال بیل بجی تو ملازم نے آ کر بتایا کہ کوئی کاشانہ صاحبہ آئی ہیں۔ میں ذرا چونکا۔ نگینہ نے فوراً آنسو پونچھ کر میری طرف دیکھا۔ میں بے اختیار ہولے سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس دوران خود کاشانہ کو دروازے پر جا کر اندر لے آیا۔ کاشانہ حسب معمول اپنے لاابالی لباس میں تھی۔ یعنی بیگی اسٹائل کھلی شرٹ اور نیچے بلیو جینز، پیروں میں جوگر۔ وہ بہت نکھری نکھری اور اُجلی نظر آ رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ میں نے جب نگینہ کا تعارف کروایا تو وہ بے اختیار خوشی سے بے قابو

ہو کر اس کی طرف بڑھی اور اسے گلے لگا لیا۔ نگینہ بے چاری ابھی تک حیران پریشان نظروں سے کبھی کاشانہ کو اور کبھی مجھے تکے جا رہی تھی۔

تب پھر میں نے نگینہ سے مختصراً الفاظ میں کاشانہ کا تعارف کروا دیا۔

''نگینہ! میری بہن!.....خبردار، کسی غلط فہمی کا شکار مت ہونا۔ نادر صاحب میرے اچھے دوست ہیں اور بس۔''

کاشانہ نے حسب عادت نگینہ سے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ بے اختیار نگینہ ہنس پڑی۔

''اللہ جانتا ہے، آج مجھے تمہیں اور نادر کو ساتھ دیکھ کر کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔'' کاشانہ نگینہ کو خود سے لگاتے ہوئے خلوصِ دل سے بولی۔ ''یو آر ریئلی اے لکی گرل۔ نادر جیسا بہادر اور پیار کرنے والا انسان تمہارا شریک حیات بننے والا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ مجھ سے بولی۔ ''نادر صاحب! اپنی اور نگینہ کی شادی کی تاریخ مجھے ضرور بتایئے گا۔ میں ایک مہینے پہلے ہی یہاں آ کر ڈیرا جما لوں گی۔ میں اپنی بہن نگینہ کی ہر رسم میں شریک رہنا چاہتی ہوں۔ بلکہ ہم دونوں شادی کی شاپنگ بھی اکٹھے ہی کریں گے۔''

وہ اپنی رو میں کہتی جا رہی تھی اور میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ جانے کیوں مجھے اس کا چہرہ تہہ در تہہ نظر آیا۔ اوپر چہرے سے خوشی کے سوتے پھوٹ رہے تھے جبکہ اس کی تہہ میں ان کہے درد کی دراڑی پڑی محسوس ہوتی تھی۔ جسے غالباً صرف میری ہی نظریں بھانپ رہی تھیں۔

کاشانہ کے اچانک آ جانے سے ایک بار پھر محفل گرم ہو گئی تھی۔ مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ کاشانہ کے ساتھ باتوں میں گزر گیا۔ وقت کے بیتنے کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ نگینہ بھی اب اس کے ساتھ اس مختصر عرصے میں خاصی گھل مل گئی تھی۔

کاشانہ نے جانے کی اجازت لی تو محفل برخواست ہوئی۔ اس کے جاتے ہی انکل اعظم بھی رخصت ہونے لگے تو نگینہ نے بھی جانے کی اجازت لی اور انکل سے استدعا کی کہ اسے گھر تک ڈراپ کر دیں۔

نگینہ کی بات پر ہم چونکے۔ البتہ انکل نے نگینہ سے کہا۔ ''نہیں بیٹی! تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''نہیں انکل! میں اپنے گھر جاؤں گی، پلیز!'' نگینہ نے بڑے رسان سے اصرار کیا تو ہم بھی چپ ہو رہے۔ تاہم میں نگینہ کو پنڈی تک چھوڑنے کے لئے تیار ہوا تو انکل اعظم خان نے کہا۔

''نہیں بیٹا! میں چھوڑ دوں گا.....کوئی مسئلہ نہیں۔''

مگر میں نہیں مانا۔ چنانچہ میں نے نگینہ اور شاہ میر کو اپنی جیپ میں سوار کرایا۔ شاہ میر واقعی زندہ لاش کی مثل تھا۔ اپنے جسم کے ایک ذرا سے وجود کو بھی وہ جنبش دینے سے قاصر تھا۔ ماسوائے آنکھوں کی پتلیوں کے۔ اب پتہ نہیں اس کی یادداشت بھی لوٹی تھی کہ نہیں۔ اور اگر لوٹ آئی تھی تو اسے ہمارے درمیان ضرور حیرت ہو رہی ہوگی۔

میں نگینہ کو لے کر پنڈی روانہ ہو گیا۔

دو ڈھائی گھنٹوں کے اندر اندر ہم پنڈی پہنچ گئے۔ میں نے بہ خیر و عافیت نگینہ کو اس کے باپ سمیت ان کی رہائش گاہ پر چھوڑا اور پھر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں اب نظر حیات کے سلسلے میں حکمت عملی تیار کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا وہ ایک زخمی سانپ کی طرح میری تاک میں ہوگا۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے اور اس کے سنپولیے بیٹے کبیر کو اب تک یقیناً ہمارے بارے میں علم ہو چکا ہوگا۔ اگلے روز مجھ سے نگینہ نے فون پر رابطہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''نادر! انکل نظر حیات اور کبیر آئے تھے، مجھ سے ملنے۔''

میں بری طرح چونکا۔

''کیا کہہ رہے تھے وہ دونوں خبیث؟.....تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا انہوں نے؟'' میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ بولی۔ تاہم اس کی آواز میں گھبراہٹ کا ارتعاش موجود تھا۔ ''مجھ سے ملنے آئے تھے اور محبت پوچھنے۔ دوبارہ پھر آئیں گے نادر!.....'' وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رکی تو میں نے فوراً اس کی پریشانی بھانپ کر پوچھا۔

''مگر کیا؟.....کوئی دھمکی تو نہیں دی ان خبیثوں نے تمہیں؟''

''نہیں.....ایسی بات تو نہیں تھی۔ لیکن.....انکل نظر حیات نے.....شاید میرا خیال غلط ہو، انہوں نے باتوں باتوں میں مجھ پر یہ جتانے کی کوشش کی تھی کہ اب میں انہیں ہی اپنا باپ سمجھوں۔ مزید یہ کہ وہ مجھے اپنی بہو بنانے کا بھی اشارہ دے رہے تھے۔

''کتا.....ذلیل.....خبیث!'' میں نے غضب ناک انداز میں نظر حیات کو گالیاں دے ڈالیں۔ ''تم نے ان کی حوصلہ افزائی تو نہیں کی؟''

''نہیں.....میرا رویہ شروع سے سرد رہا تھا۔ میں بھلا یہ کیسے بھول سکتی ہوں کہ کبیر نے تمہارے ساتھ مجھے بھی اپنے ساتھی کالا ناگ کے ذریعے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔'' نگینہ نے بھی تلخی سے کہا۔

میری طرح وہ کیلاش وادی کی وہ پہلی مہم نہیں بھولی تھی، جب میں اور نگینہ جہنم واصل عامل عاروب کے نرغے میں تھے اور اس وقت کبیر نے کالا ناگ کے ساتھ وہاں ہم پر حملہ کیا تھا اور ہم دونوں پر بے دریغ گولیاں برسانے کی ٹھانی تھی۔

''دیکھو نگینہ!'' میں نے اپنے طیش اور ابال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''نظر حیات اور کبیر سے تم زیادہ الجھنے کی کوشش مت کرنا۔ میں اس سے نمٹتا ہوں.....میری طرف سے ڈھیل ملنے پر وہ دونوں شاید اپنی اوقات بھول گئے ہیں۔''

اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ تاہم میں نے نگینہ کو ہدایت کر دی تھی کہ جس وقت وہ دونوں دوبارہ آنے کے پروگرام سے آگاہ کر دیں تو وہ مجھے بتا دے۔ میرا پورا وجود غیظ و غضب کی آگ میں پھنکنے لگا۔ مجھے نظر حیات اور کبیر کی اس جرأت پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ میرے دل میں تو آئی کہ اسی وقت نظر حیات کے ہاں پہنچ کر اس کی گردن مروڑ ڈالوں اور دیگر قضیوں کی طرح یہ آخری قضیہ بھی نمٹا دوں۔ مگر اب میں قانون کو ہاتھ میں لے کر اپنے آخری اور اہم ترین دیرینہ دشمن کو کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ غفورے کے ہم واصل ہونے کے بعد سے میری اور ماں کی قانونی پوزیشن مستحکم ہو گئی تھی جس کے بعد نظر حیات اور اس کے بیٹے، تعصب اور احساسِ کمتری کا مارا ہوا انسپکٹر اعجاز شمس اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تھے اور میں انہیں دوبارہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ انکل اعظم خان نے بھی مجھے یہی تلقین کی تھی۔

میں نے اب ان دونوں کینہ پرور باپ بیٹے سے اس وقت ہی نمٹنا مناسب جانا تھا جب وہ دوبارہ نگینہ کے ہاں آنے والے تھے۔

مجھے ان دونوں باپ بیٹے کی ڈھٹائی پر حیرت ہو رہی تھی۔ آخر یہ دونوں کس منہ سے اور کس برتے پر نگینہ سے ملنے آئے تھے؟ حتیٰ کہ نظر حیات نے اشاروں کنایوں میں نگینہ کو اپنی بہو کا بھی عندیہ دے ڈالا تھا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ کبیر نے نگینہ کو ہلاک کرنے کی مذموم کوشش بھی کی تھی۔ نگینہ کو تو اب کبیر

سے ہی نہیں نظر حیات سے بھی شدید نفرت ہو چکی تھی۔ مزید یہ کہ ان دونوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ نگینہ درحقیقت مجھ سے شادی کی خواہاں تھی۔

ٹھیک ایک دن بعد ہی شام چار بجے نگینہ کی مجھے اپنے ٹال پر کال موصول ہوئی کہ نظر حیات اور کبیر چھ بجے شام اس کے ہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں اسی وقت اپنی جیپ میں سوار ہوا اور پنڈی جا پہنچا۔

میں جب وہاں پہنچا تو مجھے خاصی تاخیر ہو چکی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ راستے میں دو بار میری جیپ خراب ہوئی تھی۔

میں وہاں پہنچا تو دونوں باپ بیٹا نگینہ کے ہاں تھے۔ نگینہ کو میں نے سخت طیش میں پایا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اب نظر حیات اور کبیر مجھے دیکھ کر کچھ پریشان اور بے چین سے ہو گئے تھے۔

میں نے ایک تیز سنسناتی ہوئی نظر ان دونوں باپ بیٹے کے چہروں پر ڈالی اور اچانک میری نگاہ قالین پر گری ایک سونے کی انگوٹھی پر پڑی جس میں ہیرا جگمگا رہا تھا۔ ایک جانب چھوٹی سی سرخ رنگ کی مخملی ڈبیہ بھی پڑی تھی۔ یہ دونوں چیزیں نظر حیات اور کبیر کے قدموں کے قریب پڑی ہوئی تھیں۔ کبیر نے جلدی سے یہ دونوں اچک لیں۔

''نگینہ! یہ سب کیا ہے؟.....ان دونوں نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی؟'' میں نے ان دونوں کی طرف بدستور گھورتے ہوئے دانستہ نگینہ سے پوچھا تو وہ تلخ لہجے میں جواباً مجھ سے بولی۔

''یہ مجھے انگوٹھی پہنانے آئے تھے۔''

میں بھنا کر رہ گیا۔ اور استہزائیہ نظروں سے دونوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اچھا..... بلی کو ابھی تک خواب میں چھیچھڑے نظر آ رہے ہیں۔'' میں نے ان دونوں سے سردست بات بھی نہ کرنے کی کوشش کی اور نگینہ سے پوچھا۔ ''تم نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟''

جواباً نگینہ بھی ان دونوں کی طرف دانت پیستے ہوئے دیکھ کر بولی۔

''فی الحال تو میں نے انہیں زبانی جواب دے دیا ہے کہ یہ دوبارہ یہاں آنے کی جرأت نہ کریں۔''

اس کے باوجود یہ دونوں بے غیرت باپ بیٹا یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟''

''نادر! زبان سنبھال کر بات کرو۔'' کبیر اپنی بے عزتی کے احساس تلے چراغ پا ہو کر بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کی جرأت پر ششدر رہ گیا۔ البتہ نظر حیات مجھ سے اب تک بری طرح خائف نظر آ رہا تھا۔

میں کبیر کو قہر ناک نظروں سے گھورتا ہوا چند قدم اس کی جانب بڑھا اور ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''اگر تم اس وقت یہاں نگینہ کے گھر نہیں ہوتے تو میں تم دونوں خبیث باپ بیٹا کو اس سے زیادہ بے عزتی کر کے یہاں سے دھکے دے کر نکالتا۔ تمہیں جرأت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی؟.....تم تو نگینہ کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔''

''وہ سب تمہاری وجہ سے تھا۔'' وہ بولا۔

''گیٹ آؤٹ..... گیٹ آؤٹ..... یہاں سے اپنی منحوس صورتیں لے کر فوراً دفع ہو جاؤ۔ ورنہ.....'' میں غصے سے بے قابو ہو کر مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔

''چلو بیٹے!.....چلو..... یہاں سے۔'' فوراً ہی نظر حیات نے اپنے بیٹے کا بازو پکڑا اور دونوں وہاں سے کھسک گئے۔

''مجھے تو اب ان دونوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔'' ان کے دفعان ہوتے ہی نگینہ نے مرتعش لہجے میں مجھ سے کہا تو میں اس سے بولا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk



''یہ دونوں ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ تم دیکھنا، میں ان دونوں کا بہت برا حشر کرنے والا ہوں۔''

نگینہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔ ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے نگینہ سے کہا۔

''نگینہ! ماں تمہیں انگوٹھی پہنانے کے لئے آنے والی ہیں۔''

اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی تھی۔ پھر اس کے گداز ہونٹوں نے جنبش کی۔

''تمہیں بہت جلدی ہو رہی ہے؟'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''ہاں نگینہ!'' میں نے ایک گہری ہنکاری لی۔ ''درحقیقت میری اب تک کی زندگی میں برائے نام ہی خوشیاں رہی ہیں۔ اور میری ماں.....'' میں نے تھوڑا توقف کیا۔ شاید میرے حلق میں کرب کی رقت اُتر آئی تھی۔ ''ماں بے چاری کی تو ساری زندگی دکھوں اور مصائب سے ہی عبارت رہی ہے۔'' میں نے کرب کی نمی کو محسوس کرتے ہوئے نگینہ کی طرف دیکھ کر گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''نگینہ! یہ تصور صرف میں ہی کر سکتا ہوں کہ ہم دونوں کی شادی پر ماں کے دل کو کس قدر مسرت ہو گی۔ نگینہ! مجھے پورا یقین ہے کہ جب وہ میرے سر پر سہرا دیکھے گی تو یہ خوشی اس کے اب تک کے سارے دکھوں کا ازالہ ماں بن جائے گی۔ گویا اسے ایک نئی زندگی مل جائے گی۔''

''انشاء اللہ.....ایسا ضرور ہو گا۔'' بے اختیار نگینہ نے وفورِ جذبات تلے کہا۔

''نگینہ! ماں منگنی کی اس رسم کو بڑی دھوم دھام سے ادا کرنا چاہتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے تم انکل اعظم خان کے ہاں شفٹ ہو جاؤ تو بہتر ہے۔''

''نہیں نادر!'' نگینہ نے دھیرے سے کہا۔ ''میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میری ایک دور کی رشتے کی خالہ اسلام آباد میں رہتی ہیں۔ میں نے انہیں فون کیا ہے۔ بے چاری سلائی کڑھائی کر کے گزارہ کرتی ہیں۔ مگر بڑی خوددار.....بہرحال میری بات انہوں نے مان لی ہے۔ وہ آج کل میں آنے والی ہیں۔ اور پھر میری سہیلیاں بھی تو ہیں۔ وہ بھی ادھر آ جاتی ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر میں امی کو منگنی کی تاریخ تو دے دوں نا.....دو روز بعد کی تاریخ طے رہے گی؟''

نگینہ نے اثبات میں ہولے سے اپنا سر ہلا دیا۔

***

اس روز منگنی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ میں ماں کا خوشی سے گلنار ہوا چہرہ دیکھ کر پھولے نہ سما رہا تھا۔ نگینہ کی اسلام آباد سے خالہ بھی آ چکی تھیں۔ ان کا نام رحمت خاتون تھا۔ ہم نے ان سے ایک رات بھی کی تھی۔ بھلی مانس اور نیک بزرگ خاتون تھیں۔ ہر وقت تسبیح ہاتھ میں رہتی تھی۔

منگنی کے تیسرے دن شادی کی تاریخ تھی۔ گویا چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ تھا۔

بالآخر وہ دن بھی آن پہنچا جب میں، ماں اور انکل اعظم کے ساتھ رسم منگنی کے لئے نگینہ کی طرف پنڈی روانہ ہوا۔

میں اور ماں اپنی جیپ میں تھے اور جیپ میں ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ افضل چاچا مرحوم کی بیوہ سکینہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔ جبکہ انکل اعظم خان اور ان کی فیملی اپنی الگ کار میں تھے۔

ہم پنڈی پہنچے تو میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ نگینہ نے اپنی رہائش گاہ کو بڑی خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔ اس کی رہائش گاہ کسی ہیرے کی مانند جگمگا رہی تھی۔ ایک اکیلی اور تنہا لڑکی کا یہ سارا انتظام اور انصرام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



یقیناً حیرت ہی کی بات تھی۔

بہرطور ہمارا استقبال اس کی قریبی، عزیز سہیلیوں اور ان کے والدین نے کیا تھا۔ اگرچہ منگنی کی یہ شاندار رسم کسی ہال وغیرہ میں بھی ہوسکتی تھی۔ مگر اس میں نگینہ کی خواہش کا دخل تھا کہ خوشیوں کے شادیانے اس کے گھر کے در و دیوار کے اندر گونجیں۔ خود اپنی طرح یہ اس کی ایک معصوم خواہش تھی اور مجھ پر تو ظاہر ہے اس کی ہر خواہش کا احترام کرنا لازم تھا۔ جانے کیوں اب میرے دل کو بھی نگینہ کو جلد سے جلد پانے کی خواہش بے چین کرنے لگی تھی۔ نگینہ کا بھی یہی حال تھا۔

گویا عرصہ دراز سے اب دو پیاسے دلوں اور بے قرار نگاہوں کو شب وصل کی گھڑیاں مطلوب تھیں۔ دل بے قرار اور نگاہِ تمنا نے بہت جدائیاں جھیلی تھیں۔ اور ان منتظر نگاہوں نے اپنے مقدر کے آسمان کی بے کراں وسعتوں میں اپنی خوش نصیبی کے چاند کو دیکھنے کی بارہا آرزوئیں کی تھیں، بہت دعائیں مانگی تھیں۔ اب یہ منزل دور تو نہ تھی۔ حالانکہ رسمِ منگنی تھی مگر نگینہ کو تو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔

میں اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا اور مجھے حقیقتاً اپنی قسمت پر رشک آنے لگا تھا کہ میں نگینہ جیسی معصوم، سندر، سجل اور حسین و جمیل اپسرا مثل لڑکی کا شوہر بننے والا تھا۔ محبت کی ملکیت کے الوہی احساس تلے میرا دل فخر سے لبریز ہوگیا۔ نگینہ کو دُلہن کی طرح سجانے اور اہتمام کرنے میں سارا ہاتھ کاشانہ کا ہی تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس نے منگنی سے دو دن پہلے ہی یہاں ڈیرے جما لئے تھے۔ وہ خود بھی بہت بنی سنوری ہوئی تھی اور خاصی پُرکشش نظر آرہی تھی۔

نگینہ کو گہرے سبز رنگ کا ریشمی شرارے والا لباس پہنایا گیا تھا جس پر زرتار کا خوب صورت کام کیا ہوا تھا۔ میک اپ بھی بڑا مناسب کیا گیا تھا۔ نگینہ کے چہرے پر حسن سے زیادہ حیا کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ کاشانہ نے بے اختیار بے تکلفی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے نگینہ کے ساتھ صوفے پر بٹھا دیا تھا۔

میں نے بھی موقع کی مناسبت سے اپنی تیاری کر رکھی تھی۔ لارنس پور کا تھری پیس کشمی سوٹ زیب تن کر رکھا تھا میں نے اور بالوں میں ''ہیئر جیل'' لگا کر الٹی کنگھی کر رکھی تھی۔

ماں نے بھی ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی اور ہمیشہ کی طرح باوقار نظر آرہی تھیں۔ جبکہ انکل اعظم خان نے گرے کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔

کاشانہ کی تو ادا ہی اسی کی طرح نرالی تھی۔ اس نے اسکن ٹائٹ آسمان اُردو میں ''تنگ موریوں'' والی پتلون پہن رکھی تھی جو اس کی گوری گوری اور بھری بھری پنڈلیوں کو جکڑے ہوئے تھیں۔ اوپر گلابی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کُرتہ تھا۔ نیچے کھسے۔ بڑا ہی عجیب گیٹ اپ تھا اس کا۔ مگر بہرحال اس کا حسن بھی جداگانہ ہی نظر آتا تھا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

ماں نگینہ کے دائیں طرف ساتھ بیٹھ گئیں۔ جبکہ نگینہ کی خالہ رحمت خاتون میرے بائیں جانب براجمان تھیں۔ انکل اعظم بھی ایک جانب اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ موجود تھے۔ ماں کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ نگینہ کا چہرہ گلنار تھا اور میں مسرور۔

ماں نے نگینہ کے لئے منگنی کی انگوٹھی بہت خوب صورت بنائی تھی۔

رسمِ منگنی کی ابتداء ہونے لگی۔ گانے باجے چل رہے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ پر سکھیاں خوشی کے گیت گا رہی تھیں۔ اس کے بعد ماں نے نگینہ کو انگوٹھی پہنا دی۔ بڑی خوشی اور محبت کے ساتھ اسے اپنے ساتھ بھینچ کر اس کا بوسہ بھی لے لیا۔

رات گئے ہم وہاں سے فارغ ہوئے۔ تین دن بعد شادی تھی۔ رسمِ حنا باقی تھی اور سب کچھ معمول کے



مطابق ہو رہا تھا۔ اور بظاہر سب کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ نگینہ کا شادی کے بعد رخصتی وغیرہ کا انتظام کسی ''میرج ہال'' کے بجائے اپنی ہی رہائش گاہ پر منعقد کرانے کا اصل مقصد یہی تھا کہ وہاں اس کا باپ شاہ میر تھا۔ جو ظاہر ہے، بستر پر تھا۔ بہرطور ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ جبکہ ہم نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ میری دعوتِ ولیمہ کا بندوبست بھی ''گرین لاج'' کے سامنے والے وسیع و عریض سرسبز گھاس کے میدان میں تھا۔

تین دن ہوتے ہی کتنے ہیں۔ پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ البتہ یہ الگ بات تھی کہ میرے لئے یہ تین دن کاٹنا دوبھر ہوگیا تھا۔

نگینہ کی طرف شادی کی تقریب عروج پر تھی۔ اس کی رہائش گاہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ نکاح ہوا، نگینہ سرخ عروسی جوڑے میں بہت ہی حسین اور پُرکشش نظر آرہی تھی۔ شادی کا ہنگامہ عروج پر تھا۔ اس کے بعد نگینہ کو میرے ہمراہ رخصت کیا گیا تو نگینہ نے باپ کے کمرے میں چلنے کی خواہش کی۔ ہم اس کے کمرے میں پہنچے۔ نگینہ بے اختیار بستر پر زندہ لاش کی مثل اپنے باپ شاہ میر کے وجود سے لپٹ کر رو دی۔ میرا دل پسیج گیا۔ ماں بھی ہمارے ساتھ وہاں موجود تھی۔ نگینہ نے اشک بار چہرے اور گلوگیر لہجے کے ساتھ باپ سے کہا۔

''پپا!.....کاش آپ مجھے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر آج رخصت کرتے۔ کاش.....کاش اس وقت کوئی معجزہ ہو جائے پاپا!'' وہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ میری نظریں شاہ میر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جہاں مجھے ہلکے سے غیر محسوس ارتعاش کا احساس ہوا۔ اس کے بعد میں نے شاہ میر کی آنکھیں بھیگتے دیکھیں تو میں نے دھیرے سے نگینہ کے کاندھے پر ہاتھ دھرا اور کہا۔

''نگینہ! تمہارے پپا کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ تمہیں وداع کر رہے ہیں۔''

نگینہ چونک کر اپنے باپ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر مزید رو پڑی۔ ٹھیک اسی وقت ماں آگے بڑھی۔ اس نے آہستگی سے شاہ میر کا بے جان سا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور نگینہ کے سر پر رکھ دیا۔ نگینہ نے چونک کر سر اٹھایا تو ماں کو اپنے باپ کا بے جان ہاتھ پکڑے اپنے سر پر رکھتے دیکھا تو بے اختیار ماں سے لپٹ کر رو پڑی۔

''بیٹی! دل چھوٹا مت کر.....سب کی کوششوں سے ایک دن شاہ میر اپنے قدموں پر ضرور کھڑا ہوگا۔ یہ میں کہہ رہی ہوں۔ تمہاری ماں.....یہ میرا وعدہ ہے۔''

ماں نے پُرعزم لہجے میں کہا اور نگینہ کو کچھ ڈھارس بندھی تو ماں نے مجھ سے پوچھا۔

''نادر بیٹے! شاہ میر کو گرین لاج پہنچانے کا تم نے بندوبست کر لیا ہے.....یہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔''

''جی امی!'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''انکل اعظم نے انہیں اپنی گاڑی میں لے جانے کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔ بس وہ وہیل چیئر لے کر آتے ہی ہوں گے۔''

اس کے بعد ہم تینوں مہمانوں کے جھرمٹ میں رہائش گاہ کے وسیع احاطے میں آگئے تو اچانک میری نگاہ سامنے کھڑے کبیر پر پڑی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ تھا اور چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ۔ کبیر جیسے زہریلے سنپولیے کو یوں اچانک اور غیر متوقع طور پر اس اہم موقع پر پا کر میرے اندر اندیشناک وسوسوں کے سانپوں نے کلبلانا شروع کر دیا۔ نگینہ اور ماں کی بھی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

''نگینہ!.....تم نے مجھے اپنی شادی پر نہیں بلایا۔ دیکھو، میں خود ہی آگیا۔ تمہیں مبارک باد دینے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk



اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔

اچانک میری نگاہ اس کے ہاتھوں میں تھمے ہوئے گلدستے پر پڑی تو مجھے گلاب کی پتیوں سے جھانکتی ہوئی مہیب نال کی جھلک نظر آئی جس کا رخ نگینہ کے سینے کی طرف تھا۔ میرے تن بدن میں جیسے سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ اور پھر اس سے پہلے کہ میں حرکت کرتا، ایک دھماکا ہوا اور نال نے آتشیں شعلہ اُگلا..... نگینہ کے حلق سے کرب ناک چیخ بلند ہوئی۔ گولی کی بھیانک قربت نے اس کے سینے کو پل بھر میں رنگین بنا دیا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ اُبھری اور بے اختیار اسے گرنے سے سنبھالنے کو میرے دونوں ہاتھ آگے بڑھے اور وہ ان میں جھول گئی..... کبیر کے ہاتھوں سے گلدستہ چھوٹ کر گر چکا تھا۔ اب پستول کی دھواں اُگلتی نال کا رخ میری جانب تھا۔ اس پر شدید دیوانگی کا دورہ طاری تھا اور وہ اسی لہجے میں بولا۔

"نادر!..... میں ہار گیا۔ مگر میں نے تمہیں بھی جیتنے نہیں دیا۔ تم بھی اب نگینہ کے ساتھ اوپر آسمانوں میں سہرا سجاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی نال کا رخ میری جانب موڑا تو اچانک ماں سامنے آ گئیں..... گولی چلنے کا دوسرا دھماکا ہوا اور ماں کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہو گئی۔

میرا سکتہ ٹوٹا اور پھر جیسے میرے اردگرد آتش فشاں کھولتا ہوا لاوا اُگلنے لگے۔ میں جنونی انداز میں کبیر پر جھپٹا اور اس کے ہاتھ سے پستول جھپٹ کر اسے دھکا دیا اور پستول میں جتنی بھی گولیاں تھیں اس پر صرف کر ڈالیں۔

مرتے وقت بھی کبیر کے چہرے پر عجیب سی طمانیت آمیز مسکراہٹ تھی۔ مہمانوں میں زبردست چیخ و پکار اور بھگدڑ مچ گئی۔

میں نے بیک وقت خون میں لت پت ماں اور نگینہ کو سنبھال لیا تھا۔ ماں شاید دم توڑ چکی تھیں۔ مگر نگینہ میں ابھی چند سانسیں باقی تھیں اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میری سانسیں جیسے نگینہ کی سانسوں کی ٹوٹتی ڈور کے ساتھ نتھی ہو چکی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری کائنات میرے ہاتھوں میں دم توڑ رہی ہو۔ میرے اندر دل و دماغ میں وحشتوں کے سناٹے چیخ رہے تھے۔

میں نے فوراً نگینہ کو اٹھانا چاہا۔ مگر نگینہ نے ٹوٹتی لرزتی آواز میں کہا۔

"نن..... نادر!..... مم..... مجھے آ..... آخری لمحات میں اپنے بازوؤں سے..... خود سے الگ نہ کرو..... آہ....."

"نن..... نگینہ! تت..... تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ مم..... میں..... تمہیں....." مجھ سے بولا نہ گیا۔ لفظ ٹوٹنے لگے۔ نگینہ کے لبوں نے جنبش کی۔

"میری قسم تمہیں..... نن..... نادر!..... مم..... مجھے اپنے ساتھ بھینچ لو..... مم..... میری سانسیں اُکھڑ رہی ہیں..... مم..... مجھے اپنے سینے سے لگا لو..... پپ..... پلیز!"

اس کا دم رکنے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نے اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

"نگینہ!..... نگینہ! تت..... تم مجھے..... چھچ..... چھوڑ کر نہیں جا سکتیں..... تت..... تم..... یہ..... مم..... میرے ساتھ بے وفائی نہیں....."

میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میں نے محسوس کیا کہ جیسے نگینہ کے نرم و نازک وجود میں ایک ٹھہراؤ آ گیا ہو۔ اس کا وجود ابدی سکوت میں ڈوب گیا تھا۔ میں سرتاپا لرز گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے آسمان ٹوٹ گیا ہو۔ جیسے..... جیسے زمین ہل گئی ہو..... جیسے قیامت آ گئی ہو..... اور سب کچھ ختم ہو گیا ہو۔



میں نے عالم وحشت کے سے انداز میں نگینہ کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ نگینہ مر چکی تھی۔ وہ..... وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر کبھی نہ لوٹنے والے سفر پر جا چکی تھی اور اپنی ان مٹ یادیں، کبھی نہ بھرنے والے زخموں کی صورت میں میرے لئے چھوڑ چکی تھی۔ لیکن..... میں یہ کیسے یقین کر لوں..... کہ نگینہ مر چکی تھی۔

"نن..... نہیں..... نہیں..... نگینہ!..... تت..... تم مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو؟..... پلیز آ جاؤ..... واپس لوٹ آؤ۔"

مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ میں دیوانوں کی طرح چلانے لگا۔ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے اعصاب منتشر ہو رہے تھے۔ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ میری جان نکل رہی تھی۔ میں پاگل ہو رہا تھا، ادھ موا ہو رہا تھا۔ میں..... نادر علی خان..... مضبوط اعصاب اور دل گردے کا مالک، نامی گرامی بدمعاشوں اور خطرناک ترین دشمنوں کو پچھاڑنے والا نادر علی خان جیسے زندہ گور ہو رہا تھا۔ نگینہ کی لاش کو خود سے لپٹائے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا..... اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

❋❋❋

ماں اپنی بہو کو عروسی جوڑے میں لے جانے کی بجائے کفن پہنائے اپنے ساتھ آخری سفر پر جا چکی تھیں..... دوہرے غموں کی اذیت ناکیوں کو زخمِ ناسور کی طرح سہنے کے لئے میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دی تھیں۔

ہسپتال سے لے کر پولیس اسٹیشن کی کارروائیاں نمٹائی جانے لگیں۔ مگر مجھے تو جیسے ہوش ہی نہ تھا۔ میرے ساتھ انکل اعظم خان اور کاشانہ تھے۔

کبیر میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا اور نظر حیات اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد پاگل ہو چکا تھا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو چکا تھا اور اسے پاگل خانے میں ایڈمٹ کر دیا گیا تھا۔

نگینہ اور ماں کی تدفین گرین لاج کے عقبی گوشے میں عمل میں لائی گئی تھی۔

چوتھے روز پتہ چلا کہ پاگل خانے میں نروس بریک ڈاؤن کے دوران نظر حیات کے دماغ کی نس پھٹ جانے کے باعث اس کی بھی موت واقع ہو چکی تھی۔

یہ پانچویں روز کا ذکر تھا۔

مجھے چپ سی لگ گئی تھی۔ میرے اندر سناٹے آن بسے تھے۔ مجھے کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اور میرا زیادہ وقت گرین لاج کے پچھواڑے ماں اور نگینہ کی قبروں کے قریب بیٹھے ان پر ہر روز نئے، تازہ پھول چڑھانے، پانی کا چھڑکاؤ کرنے میں گزرتا تھا۔ انکل اعظم خان اور بالخصوص کاشانہ مجھے اپنے تئیں حتی المقدور بھرپور سنبھالے ہوئے تھے۔

مگر میں نگینہ اور ماں کی جدائی کا غم بھلا کیسے بھلا سکتا تھا؟..... یہ زخم تو اب میرے جسم و جاں کا حصہ بن چکا تھا جو بھلائے نہیں بھولتا۔

ایک روز میں سرمائی دھوپ میں نگینہ اور ماں کی قبروں کے قریب زمین پر گم صم بیٹھا تھا کہ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ جانے کون دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے عقب میں آن کھڑا ہوا تھا۔

مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میری مہجور و غمگسار نظریں نگینہ کی قبر پر مرتکز تھیں کہ اچانک کسی نے میرے دائیں کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں جیسے بے حس ہو گیا تھا۔ جب میں کچھ نہ بولا تو مجھے ایک لرزتی آواز سنائی دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk


''نن.....نادر! پلیز.....خود کو سنبھالو۔''

اس آواز پر میں ذرا چونکا تھا۔ مگر میری یک ٹک اور گم صم نظریں نگینہ کی قبر سے نہیں ہٹتی تھیں۔ تاہم بے اختیار میرے کپکپاتے ہونٹوں سے برآمد ہوا۔

''میں زندہ ہوں.....نگینہ کے بغیر.....کیا یہ کافی نہیں؟''

''شاید!'' وہ ہولے سے بولی تھی۔ پھر میرے قریب زمین پر بیٹھ گئی۔ ''نادر! مجھے احساس ہے تمہارے غم کا۔لل.....لیکن کیا مرنے والوں کے ساتھ مرا جاتا ہے؟''

''نہیں.....لیکن میں مر رہا ہوں۔'' میرے لہجے میں شکستگی تھی۔

''مم.....مگر میں تمہیں ایسے نہیں مرنے دوں گی۔'' وہ بولی۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں بھی میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

میں نے کہا۔ ''اب میں کس کے سہارے جیوں گا؟''

''نادر.....!'' وہ ہولے سے بولی۔ ''میں تمہارے غم کا مداوا تو نہیں کر سکتی.....اور نہ ہی نگینہ جیسی محبت تمہارے دل میں جگا سکتی ہوں۔لل.....لیکن تم نے مجھے دوست تو کہا تھا نا.....تو کیا دوستی کے ناتے ہی سہی.....میں تمہارا سہارا نہیں بن سکتی؟.....کیا دوستی کے ناتے، دوستی کا حق بھی نہیں ادا کر سکتی میں؟''

اس کی بات پر میں نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

''لیکن میں نگینہ کو پھر بھی نہیں بھلا سکتا کاشانہ! تم خود کو اس صلیب پر نہ چڑھاؤ۔''

''مگر میں تمہیں چھوڑ کر بھی تو.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ مگر میں اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ کر خاموش ہو رہا۔ وہ پھر بڑے رسان سے بولی۔

''تمہاری خاطر نادر!..... مجھے سب کچھ عزیز ہے۔ بس یوں سمجھو، میں ایک ٹوٹے ہوئے اور بکھرے ہوئے نسان کو سمیٹنا چاہتی ہوں۔ اپنی خاطر نہ سہی، نگینہ کی خاطر ہی سہی۔ تم خود بتاؤ، تمہاری ایسی حالت پر نگینہ کی روح کو تکلیف نہیں ہو رہی ہو گی؟.....اور پھر تمہاری ماں کی روح، اپنے لختِ جگر کی اس حالت پر سکون حاصل کر سکتی ہے؟.....پلیز نادر!.....پلیز! میرا ہاتھ تھام لو.....محبت کے لئے نہ سہی محبت کی روح کے سکون کی خاطر.....اس دوستی کا ہاتھ تھام لو، جو عمر بھر قائم رہے گی۔''

اتنا کہہ کر اس نے اپنی نگاہیں جھکا دیں۔ میں یک ٹک اس کا چہرہ تکنے لگا۔

اس کا ہاتھ ابھی تک میرے کاندھے پر دھرا پڑا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سی غیبی طاقت تھی جس نے میرا ہاتھ اٹھا کر اپنے کاندھے پر دھرے کاشانہ کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا.....!

(ختم شد)